اردو کا ادبی تاریخی معاشی تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبۂ

ابوالمکارم صدّیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

باہتمام مرزا غلام جیلانی بیگ

عماد پریس میں چھپکر

دفتر رسالۂ ترقی حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

قواعد

۱۔ یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتہ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

۲۔ عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی ۱۵ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

۴۔ جو مضامین کسی وجہ سے ناقابلِ طبع متصور ہوں وہ خرچۂ ڈاک آنے پر واپس کر دئے جائیں گے۔

۵۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

۶۔ مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

۷۔ اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعہ خط و کتابت یا بالمشافہ طے ہوسکتا ہے۔

۸۔ قیمت معہ محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ ۵/ ششماہی ۳/ نمونہ ۸/

منیجر

ترقی

جلد۱ — بابتہ ماہ ربیع الاول مبارک ۱۳۴۲ھ — نمبر۱

فہرست مضامین

وجہ تعویق اشاعت۔ گو اوائل ربیع الاول مبارک میں پرچہ اس قابل ضرور تھا کہ شائع کر دیا جاتا۔ مگر مناسب یہی نہیں بلکہ خوش قسمتی سمجھی گئی کہ ہمارے معزز ناظرین کے پاس یہ پرچہ یوم المیلاد کو پہنچے۔ اس لئے مزید ایک ہفتہ ان خوش گوار گھڑیوں کے انتظار میں گزرا۔

نغمۂ میلاد۔ اس مختصر نظم میں ہمارے فاضل دوست مولوی عبد اللہ صاحب عمادی نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کی تبریک، حالات حاضرہ کا فوٹو اور ہمارے آقائے نامدار حضرت بندگان عالی مدظلہ کے اوصاف و دعائے ترقی عمر و درجات اور اپنے سلسلہ ملازمت وغیرہ کی کیفیت قلم بند کی ہے۔ گو مولوی صاحب موصوف اپنی ان بے نظیر خدمات کی وجہ سے جو انھوں نے علمی اور اخباری دنیا میں انجام دی ہیں کسی مزید تعارف کے محتاج تو نہیں مگر یہ بات دلچسپی سے دیکھی جائے گی کہ مولوی صاحب موصوف ترقی کے ذریعہ سے ایک شاعر کی حیثیت میں پہلے پہل پیش ہو رہے ہیں۔

اسوۂ حسنہ۔ انسانی اخلاق و تربیت کی اصلاح کے لئے زیادہ متمدن اور کامیاب طریقہ یہی ہے کہ نفوس قدسیہ کے سوانح لکھے اور پھیلائے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہستی جیسی جامع اور کامل تھی وہ روز روشن کی طرح ظاہر و مسلم ہے۔ ہمارے محترم دوست مولوی سید خورشید علی صاحب کی عنایت نے اس برج کامل کے مختصر مگر مفید حالات سے ترقی کے صفحات کو منور کر دیا ہے جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔

دسویں صدی ہجری کا مذہبی تلاطم ہند میں۔ مورخ کا سب سے زیادہ نازک اور اہم فرض واقعات کی چھان بین اور اظہار صداقت ہے ہمارے کرم فرما مولوی سید ہاشمی صاحب نے اپنے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل میں انھوں نے موقع بموقع مستند اور جامع تواریخ سے بھی استناد کیا ہے۔ مضمون اپنے طرز بیان اور اظہار واقعات میں انوکھا ضرور ہے۔ ہمارے فاضل دوست نے عہد اکبری کے ایک نہایت تاریک اور عبرت ناک صفحہ کو روشنی میں لانے کا فرض جس حسن سے ادا کیا ہے وہ قابل شکر ہے۔

سائنس کے شعبۂ برق کی ابتدا۔ زمانہ حال کے انکشافات جدیدہ میں برق نے اپنے محیر العقل کارناموں کی وجہ سے جو امتیاز حاصل کیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ ایسی فوق الفطرت کام دینے والی "برق" کی تاریخی کہانی ہے جس میں ہمارے لائق دوست چودھری برکت علی صاحب نے اس کی ابتدائی حالت پر روشنی ڈال کر بتلایا ہے کہ انسانی مادی ترقیات کے موجودہ عروج کی ابتدا کیسی حقیر تھی۔

ہم امید کرتے ہیں کہ مولوی صاحب موصوف "برقی رو کی ابتدا" پر بھی جیسا کہ انھوں نے اپنے مضمون کے آخری حصہ میں ذکر کیا ہے روشنی ڈال کر ہم کو مشکور فرمائیں گے۔

بہارا، بہار آگھر آئیا۔ اس نظم میں تئیس ۲۳ ماترے اور چودہ ماترے کے تہدی اوزان ہیں تئیس ۳۲ ماترے والے چھند میں میر کی ایک مشہور غزل ہے:- "اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے × اک درد جگر میں ہوتا ہے" اس مصرع میں جہاں × نشان کر دیا گیا ہے سولہویں ماترے پر بسرام یعنی ٹھہراؤ (Pause) ہے آواز قدرتی طور پر رکا ؤ سا لیتی ہے۔ بند کی ترکیب میں انگریزی عروض کو مدنظر رکھا گیا ہے اور دوسرا ماترہ صرف چودہ ماترے کا ہے۔ ہمارے عزیز دوست مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب نے انگریزی "لی رک" کا اردو میں خود انگریزی سے کہیں زیادہ سریلی زبان میں چربہ اتار کر اردو ادب میں ایک اضافہ ہی نہیں بلکہ احسان کیا ہے جس کے لئے اردو ادب ان کا رہین منت رہے گا۔

حکایت و شکایت۔ اردو ادب کے چراغ مولوی سید احمد حسین صاحب امجد کے کلام سے تقریباً ہر با مذاق روشناس ہے۔ ہم مشکور ہیں کہ مولوی صاحب موصوف نے اپنی ایک تازہ نظم ترقی میں شائع کرنے کے لئے ہمیں عنایت کی ایسی عنایات کے ہم آئندہ بھی مستحق اور امیدوار ہیں۔ فقط

جلد نمبر ۱

ربیع الاول مبارک [illegible]ھ

نغمۂ میلاد نبوی

نائب جناب رسالت مآب حضرت شہریار دکن سے خطاب

از عبد اللہ العمادی

مرحبا مقدم انوار ربیع الاول — بفر و تابانی و رخشانی جشن میلاد
مرحبا مولد پیغمبر وحی و تنزیل — که به یک نعرۂ تکبیر جهانے بگشاد
مرحبا نعرۂ تکبیر غزاۃ ایمان — حبذا غلغل تبلیغ دعاۃ ارشاد
قدم صدق تو بر دیدۂ سعد است و سعید — منت خاک تو بر چشم تبریز و مقداد
بر تو تنگ آمده اے نعرۂ حق ہفت اقلیم — وقت آنست که بیرون جهی از سبع شداد
کاز تکبیر زاو ضاع صلیب و ناقوس — دیرگاه است که با هند جگرخوار افتاد
مشرع شرع زبون و علم علم نگون — سر آزادۂ دین بر قدم استبداد
خوار و سرگشته و درمانده اسلام از ضلال — دهلی از شرک چو از کفر هلاکو بغداد

دیدگان اولی الابصار نظر بند عمی
جان حریت حق در گرو استبداد

در جہان جز بہ حرم کفر نہ بینی مخذول
بر زمیں جز بہ دکن شرع نیابی آزاد

گیتی از فرۂ توحید بداں مایہ تہی
کہ ز اسلام جز اینجا نتواں یافت مراد

این در دولت عثمان علی خاں باشد
کہ جز او ہیچ کسے داد حق و صدق نداد

آن عثمان و علی شان ابو بکر و عمر
زندہ زو گشت کہ قوم از اثرش زندہ شواد

حلقۂ بندگی سلسلہ داریم بہ گوش
ما ہمہ حلقہ بگوشان شہ از نسل و نژاد

خانہ پرورد وفا بندۂ دیرینہ شاہ
کہ بریں فخر گذشتہ صد و پنج و ہشتاد

شکر للہ کہ بدرگاہ شہ ذی النورین
تازہ گردید ز من رسم قدیم اجداد

قبلۂ دین نبی درگہ عثمان علی
کہ خدا حامی او باد و خلافت بخشاد

بعد ازیں جز بہ در شاہ نہ سایم جبیں
زیں سپس جز ز خداوند نہ جویم مراد

آنب کعبہ ایمان و حریم اسلام
تائب از دیر قسیس و کنشت الحاد

ایمن اینجا شدم از سوزش نار نمرود
فارغ اینجا شدم از فکر بہشت شداد

اے امام من و سلطان من و مہدی من
ہمہ کار تو سدید و ہمہ رائے تو سداد

ذات پاک تو بود چشم و چراغ مشرق
چشم زخمے بوجود تو ز مغرب مرساد

ہمہ اخلاف ترا مقتدر عز و جل
سطوت مہدی و محمود و ملک شاہ دہاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۱ نمبر ۱ ربیع الاول مبارک ۱۳۴۱ھ

عرضِ حال

تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم کی ترقی کی بنیاد علوم و فنون کی اشاعت پر رہی ہے۔ اور وہی قوم ترقی پذیر رہی جس نے علمی مشاغل کی ضرورت کو محسوس کیا اور علمی اشاعت کی سرپرستی کی۔ ہمارے اسلاف کے زرین کارنامے صاف بتلا رہے ہیں کہ آج تک کسی قوم نے نہ تو ایسا علمی مواد جمع کیا اور نہ علوم و فنون میں ایسی ترقی حاصل کی جیسا کہ انھوں نے کیا تھا۔ ہم ان ہی اسلاف کے اخلاف ہیں مگر یہ کس قدر افسوسناک واقعہ ہے کہ آج اقوام یورپ اس علمی مواد کی خوشہ چینی سے یہ عروج حاصل کریں اور ہم صرف پدرم سلطان بود پر گھمنڈ کئے ہوئے نشۂ غفلت میں سرشار چاہ ذلت میں غرقاب رہیں اکبر الہ آبادی کا یہ قول کہ:-

بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

مجاز نہیں بلکہ ہماری موجودہ حالت کا سچا فوٹو ہے۔ نہ ہم میں وہ مذہبی احساس ہے اور

نہ وہ علمی مشاغل۔ نہ وہ تمدن ہے نہ وہ اخلاق یہی وجہ ہے کہ ترقی کی دوڑ میں ہم اقوام عالم سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مگر اب یہ وقت نہیں کہ قوم کی زبون حالت کا مرثیہ پڑھا جائے کیونکہ اس تمام پستی اور بربادی کا علاج صرف علوم و فنون کی عام تعلیم واشاعت پر منحصر ہے نہ کہ مرثیہ خوانی پر۔

یہہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم یا کوئی ملک اس وقت تک حقیقی معنوں میں نہ ترقی کرسکتا ہے اور نہ ترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے جب تک کہ اس میں عام طور پر علمی ذوق نہ پیدا ہو اور اس کا قوی ذریعہ تالیف و تصنیف اور رسائل و اخبارات ہی ہیں جب سے دنیا میں فن طبع کی صورت نمودار ہوئی اشاعت علم میں نیا دور پیدا ہو گیا۔ جو کام پہلے قلمی نوشتوں سے ہوسکتا تھا اس کو فن طبع نے بالکل ایک ایسے درجہ میں قائم کردیا، جس کا تصور بھی پہلے نہیں ہوسکتا تھا۔ اور پھر اس کی ترقی پذیر صورت میں موقت الشیوع رسالوں نے اس قدر قوت بخشی جو محتاج بیان نہیں۔ یورپ کے اس دور ترقی کا بڑا راز اس کے موقت الشیوع اخبارات و رسایل میں مضمر ہے۔ ایک جدید علمی تحقیقات جس قدر ایک موقت الشیوع رسالے کے ذریعہ سے عام طور پر ملک میں پھیل سکتی ہے وہ اور کسی طریقہ سے ممکن نہیں۔

ارض مغرب کے ان رسائل کے نمونہ پر ہندوستان میں بھی رسالوں کا اجرا ہوا تھا چنانچہ تاج البلاد حیدرآباد میں مرحوم رسالہ "حسن" نے جو کامیابی و شہرت حاصل کی وہ ایک تاریخی واقعہ رہے گی۔ حیدرآباد ہندوستان میں وہ پہلا مقام ہے جہاں سے علمی رسالہ شائع ہوا۔ ہندوستان کے موجودہ مشہور رسالے سب "حسن" کے مرحوم ہوجانے کے ایک مدت بعد عالم وجود میں آئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری علمی کوششوں کی

رفتار جاری نہ رہی اس کے بعد مسلسل سکون رہا بالآخر "دکن ریویو" اور "صحیفہ" ماہواری نے علمی تازگی کی کوششیں کیں لیکن وہ بھی باقی نہ رہے۔

الحمد للہ کہ ہمارے اسلاف کی جگر کاوی کا وہ نتیجہ جو کتابوں کی صورت میں آج کل نظر آتا ہے ہمارے پاس ایک حد تک موجود ہے گو ان میں سے بعض کو ترجمہ نے اُردو کا جامہ پہنا دیا ہے مگر اس کے بعد بھی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس ذخیرہ کا زیادہ کیا بلکہ تمام حصہ ایسی زبان میں ہے جس سے خاص طبقہ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور عام اس سے محروم ہیں بس یہ ضرورت کہ عام اس سے فائدہ اٹھا سکیں بیحد ضروری ہے اس موقعہ پر ہم لارڈ رپن سابق وائسرائے ہند کے ارشاد کا وہ اقتباس درج کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۸۸۱ء میں پنجاب کے ایک ایڈریس کے جواب میں فرمایا تھا۔

"ہندوستان کے معاملات میں جہاں تک میری محدود واقفیت ہے میں ان خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں دیسی زبانوں کے توسل سے علوم و فنون کی اشاعت کی ترقی سہولت سے ہو سکتی ہے"۔

دیسی زبانوں میں اردو کو جو عام قبولیت اور عروج حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اس لئے اُردو ہی سے وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے اور یہ مسئلہ کہ اردو کے ذریعہ سے ہی عام طور پر علمی بیداری پھیل سکتی ہے خود اعلیٰحضرت **میر عثمان علیخاں بہادر** آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کے اس عظیم الشان کارنامہ کی بدولت حل ہو رہا ہے جو **عثمانیہ یونیورسٹی** کی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور جس کے لئے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اعلیٰحضرت بندگان عالی کی اس علم پروری اور خصوصاً زبان اردو

کی سرپرستی سے وہ مطلب بہت جلد حاصل ہو جائے گا جس کے لئے ہندوستان کے اخبار و رسائل اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کی ان تھک کوششیں جاری ہیں۔

یونیورسٹی کے مقاصد کو عام اور وسیع کرنے کے لئے ایک علمی رسالہ کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں علمی رسائل کا اس درجہ فقدان ہے جس پر خود سررشتہ تعلیمات اظہار افسوس کرتا ہے۔ اور یہ مسلم ہے کہ جب تک ملک سے بہ کثرت علمی رسائل شائع نہ ہوں ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ یہ ایسی کمی ہے جس کو ہر محب وطن بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔

بہر حال مدت سے ہم یہاں ایک علمی رسالہ کی کمی کو محسوس کر رہے تھے مگر بعض دنیوی علائق۔ اور کچھ مالی کمزوری۔ گرانی کا اشتداد۔ ہماری رکاوٹوں کا باعث ہوتے رہے اور ہم آج سے پہلے اس افسوسناک کمی کو پورا نہ کرسکے۔

الحمد للہ کہ خداوند جل شانہٗ نے آج ہمارے دل و دماغ کو ایسی طمانیت بخشی ہے کہ ہم "ترقی" کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عید میلاد مبارک کی محمود تقریب میں پیش کرکے بیحد مسرور اور اس مبدء فیاض سے ملتجی ہیں کہ وہ ہمارے ارادوں کو استقامت بخشے اور ہماری اس ناچیز کوشش کو مشکور فرمائے آمین۔

ترقی ایک طرف ارض مغرب کی ترقیات اور جدید علوم و فنون کو روشنی میں لائے گا اور اہل ملک کو بتائیگا کہ یورپ کی ترقی کا سرمایہ کیا ہے اور اس نے کس طرح آج یہ رتبہ حاصل کیا۔ اکتشافات جدیدہ کی حقیقت سے اہل ملک کو باخبر بنائے گا تو دوسری طرف ہماری قدیم علمی اور اخلاقی روحانی برکتوں کو زندہ رکھنے کے لئے جس کی موجودہ زمانہ میں شدید ضرورت نظر آرہی ہے سعی و کوشش کرے گا۔ اس طرح وہ دین و دنیا کے فوائد کو جمع کرنے والا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ

ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن آریائی و غیر آریائی دونوں کو روشنی میں لائے گا۔ مختلف اقوام نے اپنے اپنے دور میں جن جن علوم و فنون کو ترقی دی اس کو اچھی طرح واضح کرے گا۔ اور قدیم تاریخ و صنائع و عمارات کے متعلق جن پر آج یورپ بھی محو حیرت ہے ہر طرح مواد مہیّا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ ملک کی مشترکہ زبان اردو کا صحیح رواج نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ جو ملک کی ترقی کا بڑا آلہ ہے اس طرح وہ ہر طبقہ اور فرقہ کی دلچسپیوں کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔ واللہ المستعان۔

باوجود گرانی ہم نے اس امر کی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ عمدہ کاغذ اور اعلیٰ لکھائی چھپائی کے ساتھ قوم کے ہاتھ پہنچے۔ پس پبلک سے عموماً اور علم دوست حضرات سے خصوصاً توقع ہے کہ ہماری صدا پر لبیک اور خریداری سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

آخر میں ہم ان حضرات کا شکریہ ادا کرنے کا خوشگوار فرض ادا کرتے ہیں جنھوں نے "ترقی" کو اپنے فرائض میں خوش آیند بنانے میں حصہ لیا اور وعدہ فرمایا ہے۔

ابوالمکارم

اُسوۂ حسنہ

اسلام ایک تعلیم ہے اور اس تعلیم کا کامل ترین عملی نمونہ حضرت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس زندگی ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ دنیا میں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور نبی یا مصلح عالم کے سوانح زندگی اس احتیاط و جامعیت کے ساتھ محفوظ اور آفتاب درخشاں کی طرح منظر عام پر روشن اور نمایاں نہیں ہیں۔ یہ ایک اشرف ترین خصوصیت اسلام ہے اور اس ممتاز خصوصیت نے جو عظیم المنفعت ذریعہ ارشاد و ہدایت نہ صرف پیروان و حلقہ بگوشان اسلام کے لئے بلکہ سارے عالم کے لئے پیدا کیا ہے وہ ایک بہترین ثبوت ہے اس ارشاد ربانی کا کہ حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئی تھی وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

حیات اقدس کے پاکیزہ حالات قوائے فطریہ انسانیہ کے صحت استعمال کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ ہر سچے انسان کے لئے ان اخلاق عظیمہ کی پیروی موجب نجات ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان اعمال حسنہ اور خصائل کریمہ کا سچا ولولہ رکھے اور ان محاسن اخلاق کی اتباع اپنا نصب العین بنائے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اِس لئے مُبارک ہے وہ وقت جو اس "اسوہ حسنہ" کے نظارے میں بسر ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محاسن اخلاق کی تصویر دیکھنی ہو تو ان بزرگوں کی تقریریں سنو جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں سالہا سال بسر کئے آپ کے ہر وقت کے انیس و جلیس اور آپ کی ہر حرکت اور ہر ادا سے پوری طرح واقف تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت علی مرتضیٰؓ حضرت انسؓ اور حضرت ہندؓ ابن ابی ہالہ کے بیانات سننے کے قبل خود قرآن مجید میں اخلاق محمدی کے خط و خال کی زیارت ہوتی ہے

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ)۔

"تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا۔ اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے۔ اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے"۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)

"خدا کی عنایت سے تم اُن سے بہ نرمی پیش آتے ہو اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے"۔

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ "اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو"۔

ان قرآنی شہادتوں کے بعد "دنیا کے بزرگ ترین انسان" کے خصائل و عادات کی تفصیل حجلہ نشینان حرم نبوت کی زبان سے سنو۔ اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زمانہ طلوع آفتاب رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متردد دیکھکر فرماتی ہیں۔

"ہرگز نہیں خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا۔ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں

مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔ آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ ورنہ آپ اس سے بہت دور رہوتے۔ آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا تھا خدا اس سے انتقام لیتا تھا (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکام ربانی آپ اس پر حد جاری فرماتے تھے) آپ نے نام لیکر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کبھی کسی غلام کو۔ لونڈی کو کسی عورت کو خادم کو۔ جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ نے کبھی کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو۔ آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں ہنستے اور مسکراتے ہوئے۔ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

"آپ خندہ جبین نرم خو۔ مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے۔ بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کے ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے۔ کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور نہ منظوری ظاہر

فرماتے تھے (یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے) اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں۔ بحث و مباحثہ ضرورت سے زیادہ بات کرنا، اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔ کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے۔ کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا۔ جب آپ کلام کرتے صحابہ اس طرح خاموش ہو کر سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں باتیں چیتیں کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے۔ جن پر لوگ تعجب کرتے آپ بھی کرتے۔ کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعۃً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "دس برس کی طویل مدت میں جتنی خدمت آپ کی میں نے کی اس سے زیادہ آپ نے میری کی۔ جھڑکی دینا یا تحکمانہ

کام لینا تو کیا آپ نے کبھی یہ بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں کیوں کیا"۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ بیان کرتے ہیں کہ "آپ نرم خو تھے۔ سخت مزاج نہ تھے۔ کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے۔ کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے۔ لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے آپ نے انتقام لیا"۔

اسی ضمن میں ان مخالفین کی شہادت اور اعتراف بھی قابل ذکر ہے جن کے سینے بغض و کینہ کے جوش سے لبریز تھے۔ اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے۔ قرآن مجید میں بھی ان دشمنان اسلام کے اس اعتراف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (انعام) "ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تجھ کو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تجھ کو جھٹلاتے نہیں البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں"۔

آغاز نبوت میں جب حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئیگا تو سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ہاں۔ کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا"۔

ابو جہل کہا کرتا تھا "محمد۔ میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا۔ البتہ تم جو کچھ کہتے ہو

ان کو صحیح نہیں سمجھتا۔

نضر بن حارث کا بیان تھا کہ "اے قریش تم پر جو مصیبت آئی ہے اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے۔ محمدؐ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا۔ وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ۔ صادق القول اور امین تھا۔ اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے۔ کاہن ہے۔ شاعر ہے۔ مجنون ہے۔ خدا کی قسم میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ محمدؐ میں یہ کوئی بات نہیں۔ تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے"۔

سلاطین کی دعوت اسلام کے ضمن میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک قیصر روم کو پہنچا۔ ابوسفیان اتفاق سے اسی شہر میں موجود تھے۔ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے قبل ابوسفیان رؤسائے کفر میں سے اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔ اور اس مخالفت کا سلسلہ ہنوز قایم تھا۔ فرمان رسالت کے شرف صدور لانے پر قیصر روم نے چاہا کہ عرب کے کسی شخص سے اس حامل وحی ونبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اقدس کے متعلق حالات دریافت کرے۔ اس تقریب سے ابوسفیان قیصر کے دربار میں پیش ہوئے قیصر اور ابوسفیان میں اس موقع پر جو گفتگو ہوی وہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے:۔

قیصر۔ مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان۔ شریف ہے۔

قیصر۔ اس خاندان میں اور کسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے ؟

ابوسفیان - نہیں -

قیصر - جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر ؟

ابوسفیان - کمزور لوگ ہیں -

قیصر - اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں ؟

ابوسفیان - بڑھتے جاتے ہیں -

قیصر - کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے ؟

ابوسفیان - نہیں -

قیصر - وہ کبھی عہد اور اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے ؟

ابوسفیان - ابھی تک تو نہیں کی - لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قایم رہتا ہے یا نہیں -

قیصر - تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی ؟

ابوسفیان - ہاں -

قیصر - نتیجۂ جنگ کیا رہا ؟

ابوسفیان - کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ -

قیصر - وہ کیا سکھاتا ہے ؟

ابوسفیان - کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو - کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ - نماز پڑھو - پاکدامنی اختیار کرو - سچ بولو - صلۂ رحم کرو -

اس کے بعد قیصر نے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا - پیغمبر ہمیشہ اچھے

خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جاسکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

سید خورشید علی رضوی

بایں ہمہ یونانی متاخرین کے فلسفہ اشراقیہ اور قدیم مسلمان صوفیوں کے فلسفہ "ہمہ اوست" میں مقاصد و نتائج کے اعتبار سے اتحاد و مشابہت ضرور پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یونانی فلاسفہ، اگرچہ خالقِ حقیقی عزاسمہٗ کی ذات کو لامحدود اور انسان کے محدود علم و ادراک سے ماوریٰ بتاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کا قول ہے کہ اسی ذات تعالیٰ شانہٗ کی شعاعیں از خود پھیلتی اور چند "تنزلات" (یا ذات اصلی سے اور دوری) کے بعد ارواح و اجسام کی شکل میں متشکل ہو جاتی ہیں[1]۔ اور یا ان فیلسوفوں نے کائنات کے وجود خارجی سے انکار کیا اور یہ بیان کیا ہے کہ (انسان کے متخیلات کی طرح) یہ تمام مخلوقات خالق کل تعالیٰ شانہٗ کی ذات کے اندر ہے اور علٰحدہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔

فلسفۂ وحدت وجود کا بھی بظاہر خلاصہ یہی ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں میں اس عقیدت کو سب سے بڑی تقویت ان اولیا کے حالات و اقوال سے پہنچتی تھی جن پر مختلف ریاضات و مراقبات کی مشق سے ایک خاص قسم کی محویت و بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ اور قیس عامری کی طرح جس کی نسبت مشہور ہے کہ آخر میں "انا لیلیٰ"

نوٹ صفحہ ۱۵

[1] مثلاً دیکھو لٹ ریری ہسٹری آف پرشیا" جلد اول صفحات ۴۱۸ تا ۴۲۵ یہ حوالہ دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل یورپ کے ہر مشہور مصنف کے اقوال کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے ورنہ پروفیسر براؤن یا ان جیسے یورپ کے دیگر محققین نے اسلامی تصوف کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُسے پڑھ کر بعض اوقات ان اندھوں کی کہانی یاد آجاتی ہے جنھوں نے "ہاتھی" کے ایک ایک حصۂ جسم کو ٹٹول کر اپنے اپنے طور پر اس کی تعریف بیان کی تھی۔

[2] ملاحظہ ہو۔ زیلر کی کتاب "آوٹ لائن اوف گریک فلوسفی" صفحات ۳۲۹ تا ۳۴۰

پکارنے لگا تھا، ان حضرات کو بھی ہر طرف اور ہر جگہ "خدا" نظر آتا اور بعض اوقات وہ اپنی علیحدہ ہستی کو بالکل بھول جاتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ انہی مختلف خیالات و اقوال سے ساتویں صدی ہجری میں وحدت وجود کی وہ عمارت تعمیر ہوئی جسے ایک گروہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا نتیجۂ فکر و تلاش بتاتا ہے مگر یہ امر کسی قدر مختلف فیہ ہے کہ شیخ موصوف کی اصلی تعلیم کیا تھی، بہرحال مذکورۂ بالا خیال کے لوگوں نے جب یہ ثابت کرنا چاہا کہ خود اسلام کی تعلیم کا منشا یہی ہے تو اس میں ان کو قرآنی آیات کی بعض اوقات ایسی تاویلات کرنی پڑیں کہ بڑے بڑے مسلمان علما ناراض اور ان کے مخالف ہو گئے البتہ فلسفہ پسند طبائع اور معمولی مولویوں یا صوفیوں کے واسطے اس جدید فلسفے نے کافی سے زیادہ سامان دل کشی جمع کر دیا تھا اور فارسی شعرا کو اس سے زیادہ دلچسپ مضمون آزاد خیال ملاحدہ کو اس سے بہتر حیلہ نہ سوجھ سکتا تھا۔ لہذا مسلم الثبوت محدثین و علما کی مخالفت کے باوجود یہ فلسفہ آہستہ آہستہ مختلف صورتوں میں تقریباً تمام اسلامی ممالک میں پھیل گیا اور نویں صدی کے آخری نصف سے عہد اکبری تک ہم ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی مسئلہ وحدت وجود کا جابجا چرچا پاتے ہیں[1]۔

(۳) مہدویت کی تحریک | ان دو کے علاوہ تیسرا سبب جس نے ان دنوں ممالک ایران و ہند کے مسلمانوں میں مذہبی ہل چل ڈال دی "مہدویت" کی تحریک تھی کہ قدیم

---

[1] چنانچہ شیخ علی بن احمد (مہائمی)، شیخ عزیز اللہ اور میر عبدالواحد بلگرامی وغیرہ کا یہی زمانہ ہے جنھوں نے "وحدت وجود" پر خود مبسوط و مشہور کتابیں تحریر کی تھیں۔

پیشین گوئیوں کی بنا پر بعض لوگ خفیہ یا علانیہ "مہدیٔ موعود" ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ ان میں (بیرونی ملکوں کو چھوڑ کر) **میر سید محمدؒ** (جونپوری) خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ علمی قابلیت، ذاتی اوصاف اور فصاحت بیان کے اثر سے ہزاروں آدمی ان کے گرویدہ ہوگئے اور گجرات و دکن میں آج تک اس فرقے کے لوگ موجود ہیں۔

ملا عبدالقادر بداونی نے جو میر سید محمدؒ جونپوری کے حالات سے بخوبی واقف اور ان کی ولایت و بزرگی کا قائل ہے اپنی تصانیف میں کئی جگہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دعویٔ مہدویت سے ان کا مطلب محض مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح تھا[1]۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورۂ بالا اسباب سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو فاسد عقائد پھیل گئے تھے ان کی اصلاح کی شدید ضرورت تھی لیکن معلوم ہوتا ہے میر سید محمدؒ جونپوری کے بعد (وفات ۹۱۱ھ) ان کے خلف (خاص کر **شیخ علائی**) نے یہ خدمت جس جوش و خروش اور سختی سے انجام دینی چاہی اس نے مسلمان علما کو ان کا دشمن بنا دیا اور سلیم شاہ (سوری) کے زمانے میں اس فرقے کے لوگوں پر بہت کچھ جور و تشدد ہوئے اور یہ تحریک جبراً دبا دی گئی۔

شیخ مبارک ناگوری

انہی سختیوں کا ایک شکار شمالی راجپوتانے کا مشہور فاضل **شیخ مبارک** بن خضر ناگوری بھی تھا۔ اور بیرام خاں کی معزولی کے بعد

[1] مثلاً دیکھو منتخب التواریخ جلد اول حالات سلیم شاہ۔ جلد سوم صفحہ ۴۶ و ۶۷ وغیرہ نیز ملاحظہ ہو ترجمہ آئین اکبری دیباچہ بلوخمین صفحہ ۴ و ۵۔

جب دربار اکبری میں پھر انہی سنی علما کا رسوخ واثر بڑھا جو سلیم شاہ کے عہد میں مہدویوں کے سرگروہ شیخ علائی کے قتل (۹۵۵ھ) کا باعث ہوئے تھے تو پھر ان لوگوں پر جن کی نسبت مہدوی ہونے کا شبہ تھا سختیاں ہونے لگیں اور اسی بدگمانی کی وجہ سے شیخ مبارک کو بھی آگرے سے فرار ہو کر بہ مشکل اپنی جان بچانی پڑی اور اس کے نوجوان بیٹوں کی دنیاوی ترقی میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں

فیضی اور ابوالفضل | اس کے یہ دونوں فرزند علوم مروجہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے خاص کر بڑا بیٹا **ابوالفیض فیضی** زبان دانی اور قدرت شعر گوئی میں یکتائے روزگار سمجھا جاتا ہے اور اس کی یہ تعلی شاعری کی نظر سے قابل معافی ہوگی کہ :-

آنم کہ فنون ذو فنوناں دارم
انوار چراغ رہ نموناں دارم
ایں کالبدم ز خاک ہندست ولے
در ہر بن مو ہزار یوناں دارم

ہر صنف کے اشعار کے علاوہ جن میں بعض قصائد اور مثنوی **نل دمن** فارسی کی بہترین نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں، قرآن مجید کی بے نقط تفسیر (سواطع الالہام) اس کی عربیت کی حیرت انگیز یادگار ہے۔ لیکن گو فیضی کی شہرت نے بیس اکیس برس ہی کی عمر میں اسے اکبر کے دربار تک پہنچا دیا تھا (۹۷۴ھ) اور غالباً اپنی "آزاد خیالی" میں بھی وہ اپنے باپ اور بھائی سے کچھ کم نہ تھا، بایں ہمہ ابھی تک خود بادشاہ کی مذہبی خوش اعتقادی میں

کوئی کمی نہیں آئی تھی اور نہ شاید فیضی کو "دنیا سازی" کے فن میں وہ مہارت تھی جو اس کے "عزلت پسند" بھائی کی خصوصیت ثابت ہوئی۔

یہ شخص **ابوالفضل** (علامی) جس کا بیان ہے کہ اول اول علم کے شوق اور حکمت کی جستجو نے میرا دل دنیا سے سرد کر دیا تھا، جب واقعی "دنیا" میں داخل ہوا یعنی اپنے بھائی کی وساطت سے دوبارہ اکبر کی خدمت میں پہنچا (۹۸۱ھ) تو عجب نہیں کہ اپنی دنیا داری کی قابلیت دیکھکر خود حیران رہ گیا ہو کیونکہ تھوڑے ہی دن میں اپنی محل شناسی، اظہار بادشاہ پرستی اور مہذب خوشامد کی بدولت وہ اکبر کا ایسا عزیز مصاحب بن گیا کہ بادشاہ کو اس کے بغیر چین نہ آتا تھا اور اس کے سوا کسی کی رائے پسند نہ تھی۔

دربار ی علما

ابوالفضل نے بادشاہ کے مزاج میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جو کوششیں کیں ان کا دولت وجاہ طلبی کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان ذی اثر علما سے جنہوں نے اس کے باپ کے ساتھ سختیاں کی تھیں، انتقام لیا جائے لیکن بلوخ مین صاحب کی یہ عجیب رائے کہ اس مقصد میں ابوالفضل کو علمی فضیلت کی وجہ سے کامیابی ہوئی اس قدر ناواقفیت پر مبنی ہے جس کی آئین اکبری کے اس لائق مترجم سے توقع نہ تھی۔ درحقیقت دربار اکبری کے دونوں مشہور عالم یعنی مخدوم الملک **مولانا عبداللہ** سلطان پوری اور صدر صدور **شیخ عبدالنبی** علوم اسلامیہ کی مہارت میں وہ رتبۂ عالی رکھتے تھے کہ ابوالفضل کو ان کے سامنے زبان کھولنے کی بھی مجال نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اسی علمی تبحر و یکتائی نے جن کی بدولت اول اول خود اکبر ان کی جوتیاں سیدھی کرنی اپنا فخر

جانتا تھا[۱]، ان کو نقصان پہنچایا اور نہ وہ صرف محسود زمانہ ہو گئے بلکہ بادشاہ کی خوش اعتقادی اور سادگی دیکھ کر خود بھی سخت مغالطے میں پڑ گئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ دولت و سلطنت کی وسعت کے ساتھ اقبال مند اکبر کے جذبات مطلق العنانی میں بھی ترقی ہو رہی تھی۔ مذہب اسلام کی تعلیم جن گہرے اُصول پر مبنی ہے ان سے وہ کوئی آگہی نہ رکھتا تھا لیکن مسلمان بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اسے اکثر معاملات میں بے سوچے سمجھے شریعت اسلامی کی پابندی کرنی پڑتی تھی اور اس کورانہ تقلید نے ادھر تو اس کے مذہبی پیشواؤں کا رسوخ و تحکم بڑھا دیا اور ادھر اندر ہی اندر خود اس کی حکومت پسند طبیعت کو اپنی یہ مجبوری اور محکومی ناگوار گزرنے لگی اور سلطان علاء الدین خلجی کی طرح اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ملکی معاملات میں جن کی مصلحتیں مذہبی علما بخوبی نہیں سمجھتے ان علما کے احکام بھی واجب التعمیل نہ ہونے چاہئیں۔ اور یہی وہ راز تھا جسے ابوالفضل کی عقاب آسا نگاہ نے دربار میں پہنچتے ہی تاڑ لیا۔

اکبر کا مذہب سے انحراف

اب اُس نے بادشاہ کے مذکورۂ بالا خیال کی تائید میں وہ فقہی اختلافات بڑھا چڑھا کے اس کے کان میں ڈالنے شروع کئے جو سنیوں کے چار فرقوں میں پائے جاتے ہیں پھر ایک مجلس مناظرہ ترتیب دی گئی جس میں ہر جمعہ کو ان اختلافی مسائل پر بحث مباحثہ ہوتا تھا اور اس ردّ و کد میں بعض اوقات فریقین سخت کج بحثیاں اور ایک دوسرے کی ذات پر

---

[۱] یہ روایت شیخ عبدالنبی کے حالات میں محفوظ ہے کہ اول اول بادشاہ سلامت ان کے ایسے معتقد ہو گئے تھے کہ "کفش پیش پائے روی نہادند"! (منتخب جلد سوم ۸۰)

بھی حملے کرنے لگتے تھے۔ یہی ابوالفضل کی صحبت تھی اور انہی ناگوار مناظروں کے بعد اسے موقع ملا کہ "بادشاہے راکہ جوہرے نفیس و طالب حق بود۔ اما عامیٔ محض و متانف و متانس بہ کفرہ وار اذل در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میان رفت و سد سدید شرع مبین دین متین شکست و بعد از پنج شش سال خود اثرے از اسلام نہ ماند و قضیہ منعکس شد"[1]

سنی علما سے بدگمانی کے زمانے میں اول اول اکبر بعض شیعہ علما اور ایسے صوفیوں کی طرف مائل ہو گیا تھا جو عقائد میں نسبتہً زیادہ آزاد تھے لیکن جب تعریض کی نوبت "ائمہ اربعہ" سے گزر کر "ائمہ اثنا عشر" اور انبیا تک پہنچی تو یہ لوگ بھی گھبرا کر پیچھے ہٹے اور یہی حشر بعض پنڈتوں - پرتگیز - پادریوں اور نوساری (گجرات) کے پارسی موبدوں کا ہوا جنہیں باری باری سے تھوڑے تھوڑے دن کے لئے یقین ہو گیا تھا کہ بادشاہ ان کا مذہب قبول کر لے گا۔

دین الٰہی

اب میدان حریفوں سے خالی تھا۔ مجلس شاہی میں صرف ان کی قدر و رسائی تھی جو کوئی دین و مذہب نہ رکھتے تھے اور فقط بادشاہ کو خوش کرنا ان کا مقصود تھا۔ یہ فتویٰ کہ مسلمان بادشاہ "امام عادل یا اولو الامر" کی حیثیت سے مسائل فقہی میں اجتہاد کا حق رکھتا ہے، شیخ مبارک ناگوری کی کوشش سے ۹۸۷ھ ہی میں اکبر کو مل گیا تھا اور مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی سے بھی جبراً اس پر دستخط لے لئے گئے تھے[2]۔ لیکن کچھ عرصہ بعد نئے مجتہد

---

[1] بداونی جلد دوم صفحہ (۲۵۵)

[2] منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ (۲۷۰) و جلد سوم صفحہ (۸۲)

اور اس کے حاشیہ نشینوں کی روز افزوں آزادی کو اصولاً مذہب اسلام کی اتنی تقلید بھی گراں گذرنے لگی اور دو تین ہی سال کے اندر بعض دلائل اور پیشین گوئیاں سنا کر انھوں نے بادشاہ کو یقین دلا دیا کہ ایک ہزار برس کے دورے کے ساتھ شریعت اسلامی کا خاتمہ ہو گیا اب ایک نئے دین اور نئے پیغمبر کی ضرورت ہے اور وہ پیغمبر آپ ہیں۔ پھر "دین الٰہی" کے نام سے ایک شریعت مرتب کی گئی جس کے اصول و قواعد اسلامی تعلیم سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد تھے[1] غالباً ۹۹۰ھ سے اکبر نے "خلیفۃ الحق" کے لقب سے علانیہ اس جدید مذہب کی دعوت دینی شروع کی اور بعض پرجوش مریدوں نے تحریری اقرار لکھ دیا کہ وہ دین اسلام کو چھوڑ کر آئندہ دل و جان سے "دین الٰہی اکبر شاہی" کے عقائد و شعائر کی پابندی کریں گے[2]

مذہب سے اس انحراف نے یورپ کے بعض مورخوں کو اکبر کا بے حد مداح بنا دیا ہے کیونکہ یہ لوگ خود بھی آزاد خیالی و روشن دماغی کا ثبوت لامذہبی کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر "دین الٰہی" کے کچھ پارسی کچھ ہندو اور کچھ ایجاد بندہ'

---

[1] بظاہر یہی زمانہ ہے جب کہ ابو الفضل اپنی اس مخالفت اسلام کا گویا ایک شاعرانہ جواز پیدا کرنے کے لئے بر حسب حال رباعی پڑھا کرتا تھا کہ:۔

آتش بہ دو دست خویش در خرمن خویش | چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش | اے وائے من و دست من و دامن خویش

منتخب جلد دوم صفحہ ۱۹۹

[2] یہ اتنی تیز ترقی تھی کہ ملا شیری کو اپنے مشہور قطعے میں پیشین گوئی یا پیش بندی کرنی پڑی کہ:۔

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است | گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

[3] منتخب جلد دوم صفحہ (۳۰۴)۔

عقائد و شعائر تاریخوں میں محفوظ نہ رہ جاتے تو عجب نہیں کہ ہندوستان کے اس مغل بادشاہ کو تہذیب مغربی کی سرکار سے مفت میں "گوتم بودھ" یا "ارسطوئے ثانی" کا خطاب مل جاتا۔ پھر بھی ان مصنفوں نے مدح و ستایش کے جوش میں بعض عجیب عجیب غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں اور ان کی اجمالی تردید میں صحیح تاریخ کے طالب علم کو یہ بات یاد دلانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اکبر کا یہ مذہبی انحراف یا نیا دین سیاسی اعتبار سے بھی کسی مفید مصلحت اندیشی پر مبنی نہ تھا۔ درحقیقت ہندوؤں سے مصالحت کی قریب قریب تمام تدابیر، یعنی جزیہ کی منسوخی، ہندو رانیوں سے شادی یا ہندوؤں کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر عام مذہبی آزادی وغیرہ اکبر کے اس دعوئ اجتہاد و پیغمبری سے کئی سال پہلے عمل میں آچکی تھیں۔ گاؤکشی یا گوشت خواری کی خاص خاص دنوں میں ممانعت کا قانون غالباً دین الٰہی کے بعد نافذ ہوا مگر جہاں تک شاہی محلات کا تعلق ہے یہ احتیاط ہندو رانیوں سے شادی کے بعد ہی مقتضائے تہذیب و رواداری سمجھی جانے لگی تھی۔ اور تاریخی شواہد و قرائن سے کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ملتا کہ اکبر کے اس انحراف مذہبی یا نئے دین کے اجرا نے متین و سلیم الطبع ہندوؤں پر کوئی عمدہ اثر کیا۔ دین الٰہی کے اٹھارہ مریدان خاص کی فہرست مرتبہ بلوخ مین (ترجمہ آئین اکبری صفحہ ۲۰۹) میں بھی صرف ایک ہندو بیربر کا نام نظر آتا ہے جو ابتدا سے دربار اکبری کا ایک بے اصول خوشامدی مسخرہ تھا۔

دین الٰہی کے عقائد و شعائر یا اسے اختیار کرنے کے بعد مذہب اسلام کی توہین و مخالفت میں بادشاہ اور اس کے ہم نشین جو حرکتیں کرتے تھے ان کو

مفصل تحریر کرنے کی یہاں گنجایش نہیں۔ مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ مذاہب سے آزادی حاصل کر کے لا مذہب شخص بالعموم سب سے زیادہ اپنے سابقہ مذہب کا دشمن ہو جاتا ہے۔ اکبر و ابوالفضل وغیرہ کی بھی معلوم ہوتا ہے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ انہیں دین اسلام کے اصول و فروع میں نقص و خرابی کے سوا کوئی خوبی ہی نظر نہ آتی تھی اور کلمۂ طیبہ سے لے کر وہ اسلامی اذان، سلام علیک حتی کہ عربی زبان و حروف تک سے بیزار تھے، ڈاڑھی منڈانا اور بادشاہ کو سجدہ کرنا درباریوں پر فرض کر دیا گیا، اور شراب خواری (اعتدال کے ساتھ!) اور درندوں کا گوشت کھانا "مستحب"۔ اسی طرح، گویا شعائر اسلامی کی ضد میں، شاہی محل سرا میں سور اور کتے پالے گئے تھے اور یہ جذبۂ سگ پروری اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ بعض شاہی مصاحبین کتوں کی زبان اپنے منہ میں لے لیتے تھے[۱]۔

ایک نئی اسلامی قوت | مگر عین اس وقت کہ آغاز اسلام کے ایک ہزار سال بعد آگرے کے محلات اور فتح پور سیکری کے شاہی "عبادت خانہ" میں اس مذہب کا خاتمہ منایا جا رہا تھا، پرانی دہلی کے چھپروں میں بیٹھ کر ایک پردیسی درویش نے یکایک اس آگ کو ایسا بھڑکایا کہ جہاں گرمی نہ پہنچی تھی وہاں بھی اس کی روشنی پہنچ گئی۔

---

[۱] یہ اور مزید واقعات تفصیل کے ساتھ منتخب التواریخ کی دوسری اور جستہ جستہ تیسری جلد میں موجود ہیں (مثلاً دیکھو صفحات ۲۵۵ و ۲۶۸ و ۲۷۸ و ۲۸۸ و ۳۰۱ و ۳۳۱ و ۳۳۵ وغیرہ) نیز دیکھو دربار اکبری میں مسیحی وفود اور پرتگیز پادریوں کے خطوط کا انگریزی ترجمہ۔ رسالہ "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" اور بالواسطہ تصدیق کے واسطے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی ج دفتر اول مکتوب ۴۷ وغیرہ وغیرہ دین الٰہی کے عقائد و عبادات کو "دبستان مذاہب" (تعلیم دہم) میں مشرح طور سے بیان کیا ہے اور ملا عبدالقادر کی اکثر روایات کی آئین اکبری نیز اس کے کچھ بعد کی فارسی کتابوں سے بھی جا بجا تائید ہوتی ہے

ہماری مراد خواجہ باقی باللہ قدس سرہ سے ہے جو اسی دسویں صدی ہجری کے آخری یا گیارھویں کے ابتدائی سنین میں کابل سے دہلی تشریف لائے اور صوفیہ کرام کے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے طریقے پر معارف و حقائق اسلامی کی تعلیم دینی شروع کی اور اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہیے کہ غالباً آتے ہی آپ کا اثر "دین الٰہی" کے مختار کل اور نائب "خلیفۃ الحق" یعنی خاص شیخ ابوالفضل کے گھر میں محسوس ہوا اور اس کے داماد خواجہ حسام الدینؒ نے جاہ و مناصب کو چھوڑ کر اسی "تکئے" کی جاروب کشی اختیار کرلی...... اللہ اللہ[1]

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہند

اسی طرح معلوم ہوتا ہے دین الٰہی کے رکن رکین اُس علم و ذکاوت خداداد کے کرشمے بھی دیکھ چکے تھے جس نے ابوالفضل کو تہذیب مناظرہ کا اور اس کے بھائی کو ایک مرتبہ تفسیر لکھنے کا سلیقہ سکھایا تھا۔ یہ بزرگ جنھیں خود ان کے ہمعصر اور مشہور مسلمان عالم ملا عبدالحکیم (سیالکوٹی) نے اور اسلامی دنیا کے دوسرے مسلم الثبوت فاضل شاہ ولی اللہؒ (دہلوی) نے "مجدد الف ثانی" تسلیم کیا ہے[2] شیخ احمد (سرہندی) علیہ الرحمۃ والرضوان ہیں جنہوں نے عہد اکبری کے اواخر میں کچھ روز آگرے کے علمی مباحث میں شرکت فرمائی اور ۱۰۰۸ھ میں خواجہ باقی باللہ کی بیعت و جانشینی کا شرف حاصل کیا۔

---

[1] تذکرہ زبدۃ المعارف مؤلفہ مولانا محمد ہاشم بدخشانی ترجمہ اردو صفحہ ۱۳۷
[2] زبدۃ المعارف صفحہ ۱۷۸۔ نیز ملاحظہ ہو کلمات طیبات صفحہ ۱۶۳ وغیرہ مکتوب شاہ ولی اللہ قدس سرہ جس میں حضرت مجدد رح کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں ثابت کیا ہے کہ حضرت ممدوح "ارہاص" یعنی بنیاد "قطب ارشاد این دورہ اند"۔

حضرت مجدد کی دینی خدمات | امت اسلامی کے اس مایۂ ناز بزرگ (ولادت ۹۷۲ھ رحلت ۱۰۳۴ھ)

کی جلالت قدر یا خدمات دین کو بیان کرنے کی اس مضمون میں گنجایش اور خاکسار کاتب الحروف میں لیاقت نہیں۔ لیکن محض اجمالی اور تاریخی نظر سے اس قدر لکھنا ضروری ہے کہ حضرت مجددؒ ہی نے اسلامی تصوف کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور کئی صدی کے بعد پھر علمائے ظاہر و باطن کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع کر دیا۔

انہوں نے بعض حامیان ہمہ اوست کے اس خیال کی کہ عبد و معبود ذاتی اور نوعی اتحاد رکھتے ہیں، شدت سے مخالفت کی اور بتایا کہ جو اہل اللہ کبھی "انا الحق" یا اسی قسم کے دوسرے کلمات پکار اٹھتے ہیں، وہ ان کے غلبۂ حال کی ایک وقتی کیفیت ہے جو سالک پر وسط سلوک میں وارد ہوتی ہے ورنہ اس ذات قادر و توانا سے جو وجود ابدی و حقیقی ہے انسان فانی کو خالقی اور مخلوقی یا خواجگی اور بندگی کے سوا کوئی مماثلت نہیں اور انسان کا سب سے بڑا مرتبہ اور سب سے بڑی خداشناسی یہی ہے کہ اسے اپنی عبدیت و مخلوقیت کا مستقل اور دائمی احساس ہو۔ اسی ضمن میں آپ نے نہایت مدلل و مبرہن طریق پر بار بار اس کلی اصول کو واضح کیا کہ اسلامی تصوف محض شریعت کا خادم ہے اور اس کا معیار صحت اور مقصود ہی یہ ہے کہ سنت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی پیروی کا مخلصانہ اور والہانہ شوق پیدا کر دے جس کے لئے شریعت کا علم (ظاہری) اور اس پر عمل سیکھنا مقدم اور بہ نسبت تصوف کے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ فرائض و سنن شرعی کا ادا کرنا تصوف کے ذکر و فکر و مراقبہ سے ہزار درجے افضل ہے، اور علوم دینی کا ایک طالب علم بے علم صوفی سے

مرتبے میں کہیں اعلیٰ اور بلند تر ہے[۱]۔ انہی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ وحدت وجود پر آئندہ جس قدر عالمانہ اور محققانہ بحثیں کی گئیں سب میں مجددی تعلیمات کا اثر موجود ہے اور جن حضرات نے براہِ راست حضرت ممدوح رضؓ کے خالص شرعی تصوف کو قبول نہیں کیا ان کو بھی فلسفہ وحدت وجود کی بہت کچھ تحدید و ترمیم کرنی پڑی حتیٰ کہ ہندوستان کے طریقت دان علما اب اس فلسفے کو جس طرح سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اس میں اور حضرت مجددؒ کی تعلیمات میں بہت کم زیادہ تر پیرایۂ بیان ہی کا فرق رہ گیا ہے[۲]۔

شاہ عبدالحق اور ملا عبدالحکیم اسی آستانہ باقیہ کے فیض یافتہ اور حضرت مجددؒ کے ہمعصر شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ) اور کچھ بعد کے شخص ملا عبدالحکیم (سیالکوٹی رحلت ۱۰۶۷ھ) ہیں کہ بقول صاحب مآثر الکرام "در جمیع فنون درسی مثل او از زمین ہند برنہ خاست" مگر ان میں بھی حضرت محدث دہلویؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مشہور و کثیر تصانیف نے ممالک ہند میں علم حدیث کو جس وسیع

---

[۱] ملاحظہ ہو مجموعہ مکتوبات جلد اول صفحات ۲۹ و ۳۶ و ۴۰ وغیرہ وغیرہ واضح رہے کہ یہ فی نفسہ کوئی نئی بات نہ تھی اور تمام بڑے بڑے صوفیہ جیسے حضرت غوث اعظم شیخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحؒ قولاً و فعلاً بھی تعلیم دیتے آئے تھے کہ مسلمانوں کا تصوف و شعائر و عقائد اسلامی سے کچھ علیحدہ یا نئی یا غیر شئے نہیں بلکہ محض سالک پر شریعت ظاہر کی خوبیاں تفصیلاً منکشف کر دیتا ہے اسی اصل اصول کو حضرت مجدد نے کمال وضاحت و توضیح بیان فرمایا ہے۔

[۲] ہندوستان کے باہر بھی اسلامی ممالک میں جا بجا حضرت مجدد کی تعلیم شائع ہوئی آپ کے مجموعہ مکتوبات کا عربی زبان (نیز اردو) میں ترجمہ ہو چکا ہے اور شائد فارسی زبان کی بھی ایک کتاب ایسی ہے جسے خود عرب علمانے اپنی زبان میں ترجمہ کرنا اور پڑھنا پسند کیا! لیکن ان مکتوبات کی حیرت انگیز ادبی خوبیوں سے قطع نظر، یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا میں بہت کم کتابیں ایسی ہوں گی جن میں فلسفہ توحید اور مسائل الٰہیات کے رموز و غوامض کو اتنی فصاحت و واقفیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔

پیمانے پر شائع و روشناس کیا، پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور یہ تاریخی واقعہ ہے کہ یہ زیادہ تر حضرت مجددؒ اور حضرت محدث دہلویؒ کی سعی و جگر کاوی کا نتیجہ تھا کہ وہ بے رونقی جو علوم اسلامیہ کی درس و تدریس میں پیدا ہو رہی تھی، دفع ہو گئی کیونکہ گو ان حضرات سے پہلے درباری علما کے علاوہ دسویں صدی ہجری میں بہت سے صاحب درس و تصنیف علما موجود تھے اور ملا عبدالقادر بدایونی نے سو سے زیادہ مشہور مشائخ و علما کا تذکرہ کیا ہے (منتخب التواریخ، جلد سوم) جن میں سے اکثر حضرات سے یہ فاضل مورخ خود جا کر ملا تھا۔ لیکن جب اکبر کی آزاد خیالی نے ترقی کی اور دین الٰہی کے اجرا کے ساتھ اسلامی علوم کی مخالفت کا آغاز ہوا تو نہ صرف بہت سے علما اور مدرسین شاہی امداد اور جاگیرات سے محروم ہو گئے بلکہ بعض پر جنہوں نے سجدہ کرنے سے انکار یا بادشاہ کے نئے عقائد سے اختلاف کیا تھا بہت سی سختیاں کی گئیں[1] اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس بادشاہ کے آخری عہد میں اسلامی علوم پر ایک قسم کی افسردگی چھا گئی جسے دور کرنے کے لئے گویا ایسے ہی غیر معمولی قوت کے لوگوں کی ضرورت تھی جن کا ہم نے اجمالی حال بیان کیا۔

سید ہاشمی

---

[1] علوم اسلامی کی تدریس و اشاعت روکنے کے احکام اور علما پر تشدد اور بعض کی قید و جلاوطنی کے واقعات کیلئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد دوم صفحات (۳۰۶، ۳۶۳) وغیرہ اور جلد سوم (۸۸-۱۳۷) وغیرہ جس کے بالواسطہ اکبر نامہ کے آخری دفتر اور آئین اکبری سے بھی تصدیق نکلتی ہے۔

سائنس
کے
شعبۂ برق کی ابتدا

انسانی فطرت کا یہ کس قدر عجیب واقعہ ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ انسان کی عادت میں داخل ہو جاتی ہے یا جس قدر زیادہ کثرت سے اس کی نگاہ کے سامنے رہتی ہے اسی قدر انسان اس کو زیادہ بے توجہی کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس کی حقیقت اکثر ایک سر مکتوم بن کر رہ جاتی ہے اس کارخانۂ قدرت کے بے شمار حقائق ہیں جن کے کسی نہ کسی پہلو کی ہر روز انسان کی نگاہ کے سامنے نمایش رہتی ہے اور انسان انہیں نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا انسان کے اس تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ فہم و ادراک کے اس قدر ارتقاء پر بھی سینکڑوں حقیقتیں اس کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جاتی ہیں اور وہ ان کو کارخانۂ قدرت کا بھید سمجھ کر ٹال دیتا ہے۔

حرارت مظاہر قدرت میں سے ایک ایسا مظہر ہے کہ اس نے ابتدائے آفرینش ہی میں انسان کو اپنی ہستی کا ثبوت دے دیا ہوگا لیکن آج بھی کتنے ہیں وہ لوگ جو اس ہزار در ہزار بے توجہی کے عالم میں کبھی اپنے دل سے یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ آخر یہ چیز کیا ہے؟ آج ہم اس بات کا پتہ لگانا چاہیں کہ وہ چیز جسے ہم آگ کہتے ہیں اس سے بنی نوع انسان کی نگاہیں پہلے پہل کب آشنا ہوئیں

تو اس واقعہ کی ابتدا پر قدامت کے اتنے پردے پڑے ہیں کہ تحقیق تو ایک بڑی بات ہے وہاں تک توسن خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔ لیکن اتنی مدت کی واقفیت کے بعد بھی انسان اس کی اصلیت پر متوجہ نہ ہوسکا۔ چنانچہ فن سائنس کا وہ شعبہ جو حرارت کے نام سے موسوم ہے اس کی ابتدا ابھی کل کی بات ہے اس میں شک نہیں کہ آگ کی اصلیت کا مسئلہ یونانیوں یا ہندوؤں کے وقت یا اس سے بھی کچھ پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے بحث کو اس انداز سے اٹھایا کہ بحث کا وہ حصہ جو بدیہات سے ہونا چاہیئے تھا وہ بھی تخیل کے ایچ پیچ اور الفاظ کی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا۔

انسان نے پہلے پہل جب کھانے کی چیزوں کو ہنڈیا کے اندر پانی میں ڈال کر پکانا سیکھا ہو گا تو اس کے بعد بہت جلد یہ حقیقت بھی اس کی نگاہ کے سامنے آگئی ہوگی کہ پانی سے پیدا ہونے والی بھاپ جب ہنڈیا میں زور کرتی ہے تو ڈھکنے کو اچھال دیتی ہے۔ لیکن کتنی ہیں وہ ذی شعور ہستیاں جو اس واقعہ پر عالمانہ رنگ میں متوجہ ہوئیں اور استدلال کے زور سے اس کے پس و پیش پر حاوی ہو گئیں؟ **دخانی کلوں** کے کارنامے آج ہر کہ و مہ کی نگاہ میں ہیں۔ ان کلوں کے وجود نے دنیا کے کاروبار میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ دنیا کا وہ حصہ جو ان کلوں کا مالک تھا قوت اور شوکت کے آسمان پر پہنچ گیا اور جو ان کا مالک نہ ہوا اس کا نام و نشان تک مٹ گیا یا غلامی کی زنجیروں میں پھنس کر رہ گیا لیکن اس دنیا کا نقشہ بدل دینے والے ساز و سامان کی بنا کس اصول پر ہے؟ اس کے لئے وہی ہنڈیا اور بھاپ کی مثال دیکھ لو۔ یہ واقعہ ہمیشہ انسان کے تغافل پر شاہد رہے گا کہ

• دخانی انجن ابتداءً ایک سو بیس سال قبل مسیح ایجاد ہوا اور اس وقت سے لے کر

اس زمانہ تک کہ یورپ میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے دنیا کی کوئی قوم اور کسی قوم کا کوئی فرد بشر اس حیرت انگیز ایجاد سے فائدہ اُٹھانے پر متوجہ نہ ہوا۔ اس ایجاد کا شرف اسکندریہ کے ہیرو نامی ایک صاحب ہمت کا حصہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہیرو نے اپنے دست صنعت سے تیار کرکے جو کچھ دنیا کے سامنے رکھا وہ محض ایک کھلونا تھا لیکن پھر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ کھلونا اپنے اصول کی شوکت دنیا کو صاف صاف دکھا رہا تھا۔ اصول صاف ہو چکا تھا۔ اس کی کارگزاری بھی نگاہ کے سامنے تھی۔ صرف اس خیال کا پیدا ہونا باقی تھا کہ اس ایجاد سے کام لیا جائے، اور کس طرح کام لیا جائے؟ لیکن صدیاں گزر گئیں اور یہ خیال پیدا نہ ہوسکا۔ یہ خیال پیدا ہو جاتا تو پھر کوئی مشکل باقی نہ تھی۔ وہ سادہ مشینیں جو فن حیل کی زبان میں "قوائے آلیہ" کے نام سے مشہور ہیں، ان کے اصول بھی اسی تغافل کے زمانہ میں حل ہو چکے تھے اور یہی "قوائے آلیہ" ہر انجن کی جان ہیں۔ پھر دنیا میں جدت طراز مہندسوں کی بھی کمی نہ تھی، یہ واقعات نگاہ میں ہوں تو پھر یہ نتیجہ بیجا نہیں کہ دخانی انجن کا اصول طے ہو چکا تھا، پھر انجن کی ترتیب دینے اور اس اصول سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو سر و سامان درکار ہے وہ بھی موجود تھا۔ صرف انسانی دماغ میں ایک خیال کا پیدا ہونا باقی تھا اور افسوس کہ خیال کا پیدا ہونا آسان نہیں۔

اسی طرح ایک مسئلہ ضیا بھی ہے اور سچ پوچھو تو ضیا، اور حرارت کے مظہر قدیم سے توام ہیں۔ ابتدائے آفرینش میں انسان نے آنکھ کھولی ہوگی تو خورشید و روز کے تماشے اُس کی نگاہ کے سامنے تھے اور آج تک اسی دستور کی حکمرانی ہے لیکن کتنی ہیں

وہ حقیقت شناس نگاہیں جو ان واقعات کی کنہ و حقیقت کو تلاش کرتی ہیں اور کم فہموں کے لئے دلیل راہ بن جاتی ہیں؟ یہ حقیقت بھی ہزارہا سال تک انسانی توجہ کی منتظر رہی، اور وہ انسان پیدا نہ ہوئے جو اس فن کے مرد میدان تھے آج فن ضیا کے نام سے معلومات کا جتنا ذخیرہ ہے وہ سب زمانہ حال کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ہاں اس کا ایک حصہ البتہ زمانۂ قدیم کی بھی یاد دلا دیتا ہے لیکن یہ قدامت بھی کچھ ایسی قدامت نہیں کہ اس پر قدامت کا اطلاق صحیح سمجھا جائے۔ یہ حصہ فن مناظر کے نام سے مشہور رہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مناظر کی بحث یونانیوں کے وقت میں شروع ہوئی لیکن وہ زمانہ اس کی ابتدا کا زمانہ تھا اور سوء اتفاق سے افلاطون کے فلسفہ نے ارباب بصیرت کی نگاہوں کو ایسی غلط راہوں پر لگا دیا کہ بڑے بڑے عالی دماغ فلسفی بھی دھوکوں میں پھنس کر رہ گئے اور تلاش حقیقت کی منزلیں صعب سے صعب تر ہوتی گئیں اس غلط روی کا اثر فن مناظر پر بھی پڑا اور صدیوں میں اس بات کا فیصلہ نہ ہوسکا کہ جس کیفیت کو ہم رویت کہتے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر علمائے اسلام کا ایک گروہ افلاطون کے مسلک سے ہٹ کر تلاش کی اصلی راہیں اختیار نہ کر لیتا تو فن ضیاء کی ترقی بہت کچھ سست ہو جاتی۔ مسلمانوں نے مناظر کو اس انداز سے اٹھایا کہ فن کی راہیں روشن ہوگئیں چنانچہ ابن ہیثم اس دنیا کا سب سے پہلا شخص ہے جس نے آنکھ کی ساخت کو غور کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کی تشریح سے ثابت کیا کہ رویت کی پیدائش کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ یہ اسی کا پیدا کیا ہوا نتیجہ ہے کہ جس چیز کو ہم دیکھتے ہیں وہ منور بالذات ہے تو اس کی

ذاتی ضیاء کی شعاعیں، اور اگر منور بالذات نہیں تو اس کی اکتسابی ضیاء کی شعاعیں، ہماری آنکھ میں داخل ہوتی ہیں اور ان ہی شعاعوں سے رویت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ رویت، شعاع واحد کا نتیجہ نہیں بلکہ شئے مرئی کے ہر نقطہ سے شعاعیں ایک مخروط کی شکل میں آتی ہیں اور اسی قسم کے مخروطوں سے رویت حاصل ہوتی ہے۔ غرض ابن ہیثم اور اس کے مقلدین نے فن مناظر کو اس حد تک پہنچا دیا کہ ان کے وضع کئے ہوئے مسائل آج تک مسلم ہیں اور اس فن میں جو کچھ مزید ترقی ہوئی ہے اسے فن ریاضی کے ارتقائے مزید کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علمائے اسلام کے ذہن شعبۂ ضیاء کے بعض مہمات مسائل کی طرف بھی منتقل ہو چکے تھے تو تاریخ عالم کا ایک عجیب و غریب ورق نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ جب تک فن ضیاء کے کئی مرحلے طے نہ ہو جائیں ان مسائل کی طرف ذہن کا انتقال نہایت مشکل ہے اور جب یہ مسائل نگاہ کے سامنے آجائیں تو پھر اس فن کے کئی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک مسئلہ رفتار ضیاء کا مسئلہ ہے اور یہ ثابت ہے کہ اس مسئلہ کو بغداد کی مغل گردی سے ایک مدت پہلے بغداد کا مہندس ہبت اللہ حل کر چکا تھا۔

لیکن یہ زمانہ بھی کچھ دور کا زمانہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی زمانہ، فنون جدیدہ کی ابتدا کا زمانہ ہے۔ اسی زمانہ میں اس عمارت کی بناء قائم ہوئی جو آج اس رفعت و شان کی مالک ہے۔

برق بھی اسی قسم کی ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔ فاطر ہستی کی

صنعت تخلیق کا یہ زبردست مظہر بھی ابتدائے آفرینش سے انسان کی نگاہ کے سامنے ہے۔ دنیا برق وخرمن کے ہزارہا تماشے دیکھ چکی ہے۔ لکھوکھا انسانوں کی جانیں اس قہر الٰہی کی نظر ہو چکی ہیں۔ وہ کون ہے جو آنکھیں رکھتا ہے اور اس کی چشمک سے آگاہ نہیں؟ اور وہ کون ہے جو کانوں کا مالک ہے اور اس کی ہیبت ناک کڑک سے آشنا نہیں؟ لیکن انسان نے اس کھلی ہوئی حقیقت پر عالمانہ رنگ میں کب توجہ کی؟ اور اس پر توجہ کیونکر ہوئی؟ یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں انسان کی نگاہ نے ہزار سال تک اس ہیبت ناک منظر کو دیکھا اور اس کا دل ہزارہا سال تک ان حیرت انگیز نظاروں سے مرعوب ہوتا رہا۔ لیکن کیا اس نے کبھی اس بات پر بھی توجہ کی کہ کارگاہ عالم کا یہ ہیجان عظیم کن اسباب کی فتنہ زائی ہے؟ تاریخ سے اس بات کا تو پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی ہیبتناک عجائبات نے ہمیشہ انسان کی نگاہ کے سامنے ایک حیرت و استعجاب کا عالم کھڑا کر دیا اور وہ مبہوت ہو کر رہ گیا لیکن قدما کی تاریخ اس بات کی کوئی شہادت نہیں پیش کر سکتی ہے کہ حیرت کا پردہ چاک ہو جانے پر کسی عالی ہمت انسان کا دل اصلیت واقعہ کی تلاش پر بھی مائل ہوا۔ حقائق موجود تھے ہمتیں بھی پست نہ تھیں پھر وہ مسالہ جو ان حقائق کے ابتدائی مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے وہ بھی فراہم ہو چکا تھا اور اس پر بھی انسان کی توجہ ادھر ملتفت نہ ہوئی۔ یہ وہی راز ہے کہ خیال کا پیدا ہونا آسان نہیں۔

لیکن آخر وہ زمانہ بھی آگیا کہ باقی حقائق کی طرح اس کھلی ہوئی حقیقت نے بھی انسان کو اپنی ذات پر متوجہ کر لیا۔ پھر اس توجہ نے اس فن کو اور اس فن نے انسانی

کاروبار کو ترقی کے جس مقام پر پہنچا دیا وہ آج ہماری نگاہ کے سامنے ہے - وہی برق یعنی کارخانۂ قدرت کی ایک عظیم الشان قوت، جو پہلے انسان کی نگاہ میں اس سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی کہ ایک مایۂ حیرت اور برہم زن عافیت ہے اب انسان کے ہاتھ میں اس طرح مقید ہو گئی کہ انسان، زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے کام لے رہا ہے۔

اس مضمون میں ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ علم جو آج اس قدر بکار آمد ہے اس کی ابتدا کیونکر ہوئی اور یہ ابتدا اپنی نوعیت کے اعتبار سے کس قدر سادہ تھی - اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ علم و حکمت کا مسالہ کن مصیبتوں سے تیار ہوتا ہے اور انسان کا تخیل جب راہ راست پر آ جاتا ہے تو پھر سہولت کی راہیں کس طرح خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں -

تاریخ میں بعض اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ جس زمانہ کو فن برق کی ابتدا سمجھا جاتا ہے اس سے مدتوں پہلے ایشیا کے علماء برق کے بعض کوائف سے واقف ہو چکے تھے - چنانچہ یہ بات بہت غالب معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے طلسم و نیرنج کی بنا بیشتر برق و مقناطیس کے واردات پر تھی - چنانچہ بعض قدیم تحریروں میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں کہ فلاں شخص طلسمات کے تماشے دکھا رہا تھا کہ اس دوران میں اس پر بجلی گری اور اس کے خرمن حیات کو فنا کر گئی - اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں نے اس قسم کے خیالات کو قلم بند کیا ہے واقعہ کا بیان ان کا اصلی مقصود نہ تھا - ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس فعل کا ارتکاب جرم تھا اور بجلی کا گرنا اس کی آسمانی سزا - لیکن ہم اس قسم کے واقعات سے قیاس کر سکتے ہیں کہ متقدمین نے جن لوگوں کو

اس طرح آسمانی سزا کا مستوجب قرار دیا ہے وہ غالباً برق سے کھیل رہے ہوں گے اور برق کے تجربوں میں اس قسم کے صدموں کا شکار ہو جانا کچھ غیر متوقع نہیں۔ چنانچہ وہ زمانہ بھی ہماری نگاہ میں ہے جو فی الواقع اس فن کی باقاعدہ ابتداء کا زمانہ تھا اور اس فن کے ارباب تلاش برق کی اصلیت سمجھنے کے لیئے رعد کی کڑک اور ابر و باراں کے طوفانوں میں بادلوں کی بجلی پر تجربے کر رہے تھے۔

برق و مقناطیس کے مضمون ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح دست و گریبان ہیں کہ دونوں ایک ہی اصل کے شاخسانے بن گئے ہیں۔ اور آج ایک کو دوسرے سے الگ کر دینا ممکن نہیں۔ ابتداءمیں بلاشبہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جداگانہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن جوں جوں ان کے مسائل نگاہ میں آتے گئے ان کا تعلق ظاہر ہوتا گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ فن برق کی ابتداء کو تلاش کرنے میں مقناطیس کو بھی اس کے ساتھ رکھا جائے۔ اس شرط کا سہارا لے کر ہم حضرت مسیح سے چند سال پہلے تک اس مضمون کی ابتدا کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ چینیوں کی تحریروں سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ زمانہ مذکور میں چینی قافلے سفر کے دوران میں ایک قسم کا پتھر اپنے ساتھ رکھتے تھے جس سے تاتار کے بیابانوں میں رستہ پہچاننے میں انھیں بڑی مدد ملتی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے اس پتھر کو کب دریافت کیا؟ اور کس طرح دریافت کیا؟ ان سوالوں کا جواب معین نہیں ہو سکتا اور فن برق کی ابتدا کا نشان ان ہی سوالوں کے جواب پر موقوف ہے۔ بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ یہ پتھر جو بعد میں کہیں "رہنما پتھر" اور کہیں "قطب نما پتھر" یا "قبلہ نما پتھر" کے نام سے مشہور ہوا اس کے

وجود اور خواص سے دنیا حضرت مسیح سے دو ہزار چھ سو برس پہلے بھی واقف تھی۔
یہ پتھر حقیقت میں لوہے کی ایک کچی دھات ہے جسے غالباً زمین کے مقناطیسی اثر نے "مقنا دیا" (مقناطیس کر دیا) ہے یہ پتھر دنیا کے کئی حصوں میں ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ قدیم کے لوگوں نے اس واقعہ کو بھی دیکھ لیا ہوگا کہ قطب نما پتھر لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کھینچ لیتا ہے اور لوہے کے ٹکڑے اس کے ساتھ اس مضبوطی سے چمٹ جاتے ہیں کہ قدماء کا اس کو ذی روح سمجھ لینا کچھ خلاف توقع نہیں کیونکہ روح ایک ایسی چیز ہے کہ اس قسم کے واقعات کی توجہ کیلئے قدما کی نگاہیں اس پر آسانی سے پڑ سکتی تھیں۔
یہ پتھر ان لوگوں کے لئے بلاشبہ ایک مایۂ استعجاب اور نمونۂ عجائبات ہوگا اور بہت سے لوگ اس اعجوبۂ روزگار کو اپنے پاس رکھنے کے متمنی رہتے ہوں گے۔
یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو انسان کھلونا سمجھ کر ہاتھ میں لیتا ہے اسے کھلونے ہی کی طرح استعمال کرتا ہے اور جہاں تک اس کی قوت اختراع کام دیتی ہے کھلونے سے کھیلنے کے نئے نئے طریقے وضع کرتا جاتا ہے پھر کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ اسی کھیل کے دوران میں کسی جدت طراز نے اس پتھر کو آزادانہ لٹکا کر بھی دیکھ لیا ہو؟ پتھر کو اس وضع میں رکھا ہوگا تو اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ لٹکتا ہوا پتھر جھول جھال کر آخر سکون میں آجاتا ہے۔
اور ہر حال میں سکون کے وقت اس کی ایک ہی وضع ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد مزید مشاہدوں نے یہ بات بھی ثابت کر دی ہو گی کہ سنگ مذکور کا جو سرا سکون کے وقت شمال کی طرف رہتا ہے وہ ہمیشہ اسی سمت کا نشان دیتا ہے اور

دوسرا سرا ہمیشہ جنوب نما رہتا ہے۔ پتھر کو سمتوں کے پہچاننے میں استعمال کرنے سے پہلے ان مرحلوں کا طے ہو جانا ضروری تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تمام مرحلے اپنی طبعی ترتیب سے طے ہوتے گئے ہوں گے۔

اس کے بعد جب یہ معلوم ہوا ہو گا کہ سنگ مذکور لوہے کو چھو کر اس میں بھی ویسی ہی خاصیت پیدا کر دیتا ہے تو یہ بلاشبہ اس فن کی ترقی کا دوسرا قدم تھا۔ قدماء سنگ مذکور کی اس خاصیت سے بھی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ سنگ مذکور کو سخت لوہے پر ایک خاص انداز سے رگڑا جائے تو لوہا بذات خود ان ہی خواص کا مالک بن جاتا ہے اور سنگ مذکور کی طاقت میں اس عمل سے کوئی فرق نہیں آتا۔ چنانچہ وہ لوگ لوہے کے اس قسم کے ٹکڑوں کو **مقناطیس** کہتے تھے۔ یہ اصطلاح یونانیوں کی وضع کی ہوئی ہے اور ملک **شام** کے اس مقام کی مناسبت سے اختیار کی گئی ہے جو یونانیوں کے وقت میں **مقنیسیا** کہلاتا تھا۔ وجہ مناسبت یہ ہے کہ اس قسم کا پتھر اس مقام پر بکثرت ملتا تھا۔

اسی زمانہ میں اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی مشاہدہ میں آیا۔ یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ **کہربا** کے ٹکڑے کو رگڑا جائے تو اس میں ہلکے اجسام مثلاً چھوٹے چھوٹے تنکوں یا کاغذ کے پرزوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کا ایک یونانی فلسفی نے ۶۰۰ قبل مسیح تک پتہ دیا ہے لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب واقعہ مذکور قلم بند ہو گیا تھا اور یہ ضروری نہیں کہ ہر واقعہ مشاہدہ میں آتے ہی قلم بند ہو جائے۔ خصوصاً جب ہم اس زمانہ کے کوائف پر غور کرتے ہیں تو یہ بات یقین کی سرحد میں آجاتی ہے

کہ کہرباؔ کی خاصیت غالباً زمانہ مذکور سے پہلے مشاہدہ میں آچکی تھی - اس زمانہ میں بیسیوں حقائق تھے جو مدت تک زبان زدِ خلائق رہتے تھے اور قلم بند ہونے کی نوبت نہ آتی تھی - اس میں شک نہیں کہ کہربا کی خاصیت بہ ظاہر قطب نما پتھر کی خاصیت سے مختلف معلوم ہوتی ہے چنانچہ قطب نما پتھر صرف لوہے کو کھینچتا ہے اور رگڑا ہوا کہربا ہر قسم کے ہلکے اجسام کو جذب کر لیتا ہے لیکن جن لوگوں کی نگاہیں برق و مقناطیس کے مسائل سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ تھوڑی ہی سی ترقی کے بعد دونوں کے مباحث دست و گریباں ہو جاتے ہیں -

اس کے بعد تمام تاریخ فن پر ایک خاموشی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین میں سے جو لوگ طبعیات کے مسائل پر غور کرنے کے عادی تھے انھوں نے ان واقعات کو التفات کے قابل نہیں سمجھا اور وہ فن جو آگے چل کر عظیم الشان کارناموں کا مالک بننے والا تھا اس کی ابتدا ایک کھیل ہو کر رہ گئی - اس میں شک نہیں کہ عرب کے مسلمانوں نے مقناطیس کے خواص پر توجہ کی اور اس سے **قطب نما** (کمپاس) تیار کر کے جہاز رانی میں مدد لی - لیکن عرب کی طبیعت، نظریات کی بہ نسبت عملیات کی زیادہ شائق تھی - وہ مقناطیس کے اصولوں کو اس حد تک ترقی نہ دے سکے کہ اس میں فن کی حیثیت پیدا ہو جاتی - پھر اس کے بعد سنہ ۱۶۰۰ء تک ہزارہا انسانوں نے کہربا اور تنکوں کی آویزش کے تماشے دیکھے ہوں گے اور مقناطیسی پتھر سے فائدہ

---

* کہربا ایک قسم کا معدنی بیروزہ ہے جسے زمین کے نیچے دبے ہوئے صنوبر کے درختوں کا گوند سمجھنا چاہئے - قرنہا قرن تک مٹی میں دبے رہنے کے بعد اس نے معدنیات کی شکل اختیار کر لی ہے -

اٹھایا ہوگا۔ لیکن اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ کسی صاحب دل کا قدم ترقی کی طرف بھی اٹھا ہو۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں البتہ اس خاموشی کا پردہ چاک ہوا اور انگلستان کے ایک طبیب نے قطب نما پتھر اور رگڑے ہوئے کہربا کے خواص پر توجہ کی۔ اس کی توجہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جذب کچھ کہربا ہی کا خاصہ نہیں۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں کہربا کی طرح رگڑا جائے تو ان میں بھی یہی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس طبیب کی توجہ بھی بے وقت کی راگنی تھی جس پر اس کے سوا کوئی دوسرا متوجہ نہ ہوا اور کہربا کا مسئلہ تماشے کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد پھر ایک صدی اسی خاموشی میں گزر گئی۔ تاہم اس طبیب کے انکشاف سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لوگوں کی نگاہیں کہربا کی خصوصیت سے ہٹ کر مسئلہ کی عمومیت پر مائل ہوگئیں۔ اور یہ بلا شبہ ایک بڑی کامیابی تھی جس نے فن کی اصلی ترقی کا دروازہ کھول دیا۔ پھر سترھویں صدی کے اختتام تک اس مضمون میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ کسی خاص چیز کا التزام باقی نہ رہا۔ اس زمانہ میں علما نے یہ بات معلوم کر لی کہ اگر ضروری شرائط ملحوظ رہیں تو رگڑنے سے تمام اجسام میں وہی کہربا کے سے جذب کی خاصیت پیدا ہو سکتی ہے۔

خشک ہنائی کاغذ کے ٹکڑے کو کپڑوں کے معمولی برش سے رگڑ دو تو کاغذ چھوٹے چھوٹے تنکوں کو کھینچنے لگے گا۔ لاکھ کو کپڑے سے رگڑو تو اس میں بھی یہی خاصیت پیدا ہو جائے گی۔ گندک کو رگڑ کر دیکھو تو اس میں بھی یہی رنگ نظر آئے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اجسام بعض سے زیادہ مؤثر ہیں لیکن یہ اصلیت کا اختلاف نہیں محض مدارج کا اختلاف ہے۔

غرض جب کہربا کی خصوصیت جاتی رہی تو خیال کے لئے راستہ صاف ہو گیا اب لوگوں نے اسی تماشے کو بڑھانا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تماشے میں علمی رنگ بھی پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بجائے اب مشینیں بننے لگیں کہ امتحان کے لئے پیمانۂ عمل وسیع ہو جائے۔ پہلے پہل یہ مشینیں گندک کی بنائی جاتی تھیں۔ گندک کے گولے میں دھری ڈال کر گھماتے تھے اور گھومتے ہوئے گولے کو ہاتھ سے رگڑتے جاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ گندک کی جگہ شیشہ نے لے لی۔ اور گولوں کی بجائے شیشہ کے استوانے استعمال ہونے لگے۔ ان ابتدائی مشینوں سے کامیابی کا رستہ یہاں تک صاف ہو گیا کہ ان کی مدد سے چھوٹے چھوٹے برقی شرارے پیدا ہو سکتے تھے۔

ان ہی ابتدائی تجربوں سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ برقی ہیجان میں آئے ہوئے شیشہ کے استوانے کو کسی اور چیز سے چھو لیا جائے تو اس میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اسی طرح دو چیزوں میں یہی کیفیت پیدا کر لی جائے تو وہ اپنی جگہ دوسری ہلکی ہلکی چیزوں کو تو بدستور جذب کرتی ہیں۔ لیکن ان دونوں کو آپس میں ایک دوسرے کے قریب لاؤ تو دونوں میں ایک دوسرے سے دور ہٹ جانے کا تقاضا نظر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی ابتدا میں اسی سادہ سی مشین سے یہ بات معلوم ہوئی کہ روئی کے لمبے لمبے تاگوں کو ریشمی تاگوں کے ساتھ لٹکا کر اس مشین سے ملا دیا جائے تو برقی اثر ان تاگوں کے ساتھ ساتھ تین سو گز تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر چند سال بعد یہ امر مشاہدہ میں آیا کہ وہی تاگے بھیگے ہوئے ہوں تو تین سو گز کی بجائے چار سو گز

تک کام دے سکتے ہیں۔

اب کھیل کی بجائے ان تجربوں میں علمی رنگ آ رہا تھا اور لوگوں کی طبیعتیں نتائج کے ارتباط اور با اصول استدلال پر مائل ہوتی جاتی تھیں۔ اب ان میں بالتدریج فن کی حیثیت پیدا ہوتی گئی۔ پھر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان سادہ مشینوں میں وقتاً فوقتاً اصلاح ہوتی جائے چنانچہ پہلا قدم جو اصلاح کی طرف اٹھا وہ یہ تھا کہ مشین کے ساتھ چمڑے کی گدی استعمال ہونے لگی، یہ گدی شیشہ کے استوانہ کے ساتھ رگڑ کھاتی ہے تو شیشہ برقی ہیجان میں آجاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ تجربہ کرنے والا رگڑنے کا کام اپنے ہاتھ سے لیا کرتا تھا۔ اس اصلاح سے مشین مقابلۃً زیادہ کارآمد ہوگئی پھر اس کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ مشین سے جو برقی اثر حاصل ہوتا ہے اسے جمع کر لینے کا انتظام کر لیا جائے۔ اس مطلب کے لئے مشین کے ساتھ "بستاور" کا اضافہ ہوا۔ اور "بستاور" کے وجود سے بڑے بڑے برقی شرارے پیدا کرنے کا انتظام ہوگیا۔ پھر ان شراروں کی نوعیت دیکھ کر اس بات کو سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ انسانی تگ و دو کے حاصل میں بھی اس ابر وباراں کے طوفان میں نمودار ہونے والے خوف ناک "نائرۂ آتش" کی سی خو بو ہے جس کی چمک آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دیتی ہے اور اس کی کڑک سے دل دہل جاتے ہیں۔

آج کل جو مشینیں استعمال ہوتی ہیں ان میں رگڑ کی ضرورت نہیں۔ ان میں گندک اور ربڑ کے امتزاج سے تیار کی ہوئی، یا شیشہ کی بنی ہوئی، دو گول تختیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان تختیوں پر دھات کی باریک باریک پتیاں سلسلہ وار چپکا دی جاتی ہیں۔ تختیاں ایک دوسرے کے قریب رہتی ہیں اور متضاد سمتوں میں گھومتی ہیں ان تختیوں کو

برقی ہیجان میں لانے کے لئے اس طریقہ سے کام لیتے ہیں جو فن برق کی اصطلاح میں امالۂ برقی کے نام سے مشہور ہے۔ تختیوں کی ایک جوڑی کی بجائے اسی طرح کی کئی جوڑیاں ایک ساتھ استعمال کی جائیں تو وقت واحد میں بہت سا برقی اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حال میں انگلستان کے ایک شوقین رئیس نے اپنے ذاتی دار التجربہ میں اسی طرح کی ایک بہت بڑی برقی مشین تیار کر رکھی تھی۔ اس میں تین فٹ قطر کی ایک سو ساٹھ تختیاں تھیں اور اس کی کارگزاری کا یہ عالم تھا کہ استعمال کے وقت جب اس سے بجلی کے شرارے پیدا ہوتے تھے تو اس کڑک کے ساتھ پیدا ہوتے تھے کہ آس پاس والوں کے کان بہرے ہو جاتے تھے۔

حال میں بعض اس قسم کی برقی مشینیں بھی تیار ہوئی ہیں جن میں صرف گندک اور ربڑ کے امتزاج سے تیار کی ہوئی تختیوں سے کام لیا گیا ہے اور ان تختیوں پر دھاتی پتیوں کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ مشینیں نہایت عمدہ کام دیتی ہیں لیکن اس قسم کی تمام برقی مشینیں صرف علمی اور تاریخی دلچسپی کا سامان ہیں اور تجارتی کاروبار اور دیگر انسانی ضروریات کی بہم رسانی میں کچھ بکار آمد نہیں۔ چنانچہ ان مشینوں سے برقی شرارے تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ان سے مسلسل برقی "رو" حاصل کر لینا ممکن نہیں اور کاروبار میں کام لینے کے لئے برق کا مسلسل "رو" میں ہونا ضروری ہے۔ برقی قوت مہیا کرنے کا انحصار اگر اسی قسم کی مشینوں پر رہتا تو اس میں شک نہیں کہ عملیات میں کوئی بیش قرار فائدہ مترتب نہ ہوتا۔ اس سے نہ برقی تاروں میں کام لیا جا سکتا ہے نہ ٹیلیفون میں۔ نہ اس سے برقی روشنی ہو سکتی ہے۔ نہ برقی موٹر چل سکتے ہیں۔ اس فن میں عملیات کی طرف جو پہلا قدم اٹھا اور جس نے آگے چل کر دنیا کے کاروبار میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا وہ برقی موجوں کا اختراع ہے جن سے برقی قوت "رو" کی شکل میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس شعبہ کی ابتدا بھی بہت دلچسپ ہے لیکن یہ بحث اس صحبت کا حصہ نہیں۔

برکت علی

پیارا پیارا گھر اپنا

۱

وہ چین کہاں اپنے گھر کا، وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا، وہ راحت کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا

۲

سکھ چین اگر دنیا میں ہے، اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سکھ کا سہارا گھر اپنا
دکھ درد کی گر کوئی دوا ہے، اپنے گھر کی ہی سیوا ہے
دکھ کا مداوا گھر اپنا

۳

وہ گھر والی سندر چتر، گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلاسا گھر اپنا
آرام ہمیں دینے والی، آپ مصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا

۴

آنکھوں کے تارے لاڈلے گھر کے، سب مل کر گھر سر پہ اٹھاتے
دودھوں نہایا گھر اپنا
کھیلتے ہنستے روٹھتے منتے سنتے کہانی سوتے سلاتے
بسا بسایا گھر اپنا

۵

ہم پر جان چھڑکنے والا، وہ پروان چڑھانے والا
پالنے والا گھر اپنا
وہ بلوان بنانے والا، وہ انسان بنانے والا
ڈھالنے والا گھر اپنا

۶

وہ پاک ہوا اپنے گھر کی، پیار کی جلا اپنے گھر کی
دل میں سمایا گھر اپنا
ایثار وفا اپنے گھر کی، وہ درد دیا اپنے گھر کی
روح پہ چھایا گھر اپنا

۷

جز بنیاد وطن کی گھر ہے، وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
اپنے گھروں کا گھر اپنا
اپنے گھر پہ نثار وطن ہے، اور وطن کے صدقے گھر ہے
وطن کا شیدا گھر اپنا

۸

وطن کی چاہت اپنے گھر سے، وطن کی طاقت اپنے گھر سے
وطن کا پیارا گھر اپنا
وطن کی دولت اپنے گھر سے، وطن کی عزت اپنے گھر سے
راج دلارا گھر اپنا

محمد عظمت اللہ خاں

حکایت و شکایت

اللہ اللہ دیکھ لی صورت تری — پھر ملایا تجھ سے قسمت نے مری
مدتوں کے آج بچھڑے پھر ملے — اب کروں گی میں گلے مل کر گلے
تجھ سے کرنی ہے شکایت ہجر کی — سخت مشکل ہے حکایت ہجر کی
پیارے ہاتھوں میں اٹھا لے پیار سے — پھر لگا لے لعل گوہر بار سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

سینہ جب تیروں سے چھلنی ہو گیا — ابر رحمت اس کے دل کو دھو گیا
اس کا ملنا اور بھی تڑپا گیا — ہجر کا دکھ وصل میں یاد آ گیا
مٹ گئی اس کی محبت دیکھ کر — دل بھر آیا اس کی صورت دیکھ کر
وصل میں اظہار فرقت دیکھیے — منہ پہ منہ رکھ کر شکایت دیکھیے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

ایک مدت سے بھری بیٹھی تھی میں — بن کے شیشے میں پری بیٹھی تھی میں
مل گیا آخر نواز ندہ مرا — اختر طالع ہے تابندہ مرا
ہجر کے ہاتھوں عجب اندھیر تھی — منہ لگانے ہی کی گویا دیر تھی

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت بد حالاں و خوش حالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — از درون من نجست اسرار من
اب مرا ہمراز مجھ کو مل گیا — ہاں مرا دمساز مجھ کو مل گیا
مدتوں میں نے اٹھائیں سختیاں — اب سناؤں گی اسے سب داستاں
قصۂ غم اے مرے دلدار سن — سن مری جان میرا حال زار سن
لب پہ لب ہو کر لب محبوب سے — کہہ رہی ہوں آہ کس اسلوب سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

کرتی ہے دیوانی کس کی جستجو — بولتی ہے کس کے منہ سے دیکھ تو
دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
آہ دل میں ہو رہی ہے کیوں کلبل — ہاں نفخت فیہ من روحی نہ بھول
آہ اک سوکھی ہوئی ڈالی ہے تو — آہ بالکل عقل سے خالی ہے تو
بے سمجھ جان اپنی تو کھوتی ہے تو — باوجود وصل یہ روتی ہے تو

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

سید احمد حسین امجد

حکایت و شکایت

اللہ اللہ دیکھ لی صورت تری ۔ پھر ملایا تجھ سے قسمت نے مری
مدتوں کے آج بچھڑے پھر ملے ۔ اب کروں گی میں گلے مل کر گلے
تجھ سے کرنی ہے شکایت ہجر کی ۔ سخت مشکل ہے حکایت ہجر کی
پیارے ہاتھوں میں اٹھالے پیار سے ۔ پھر لگالے لعل گوہر بار سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

سینہ جب تیروں سے چھلنی ہو گیا ۔ ابر رحمت اس کے دل کو دھو گیا
اس کا ملنا اور بھی تڑپا گیا ۔ ہجر کا دکھ وصل میں یاد آ گیا
مٹ گئی اس کی محبت دیکھ کر ۔ دل بھر آیا اس کی صورت دیکھ کر
وصل میں اظہار فرقت دیکھئے ۔ منہ پہ منہ رکھ کر شکایت دیکھئے

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

ایک مدت سے بھری بیٹھی تھی میں ۔ بن کے شیشے میں پری بیٹھی تھی میں
مل گیا آخر نوازندہ مرا ۔ اختر طالع ہے تابندہ مرا
ہجر کے ہاتھوں عجب اندھیر تھی ۔ منہ لگانے ہی کی گویا دیر تھی

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

من بہر جمعیتے نالاں شدم ۔ جفت بد حالاں و خوش حالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من ۔ از درون من نجست اسرار من
اب مرا ہمراز مجھ کو مل گیا ۔ ہاں مرا دمساز مجھ کو مل گیا
مدتوں میں نے اٹھائیں سختیاں ۔ اب سناؤں گی اسے سب داستاں
قصۂ غم اے مرے دلدار سن ۔ سن مری جاں میرا حال زار سن
لب پہ لب ہو کر لب محبوب سے ۔ کہہ رہی ہوں آہ کس اسلوب سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

کرتی ہے دیوانی کس کی جستجو ۔ بولتی ہے کس کے منہ سے دیکھ تو
دو دہاں داریم گویا ہمچو نے ۔ یک دہاں پنہاں ست در لب ہائے وے
آہ دل میں ہو رہی ہے کیوں ملول ۔ ہاں نفخت فیہ من روحی نہ بھول
آہ اک سوکھی ہوئی ڈالی ہے تو ۔ آہ بالکل عقل سے خالی ہے تو
بے سمجھ جان اپنی تو کھوتی ہے تو ۔ باوجود وصل یہ روتی ہے تو

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

سید احمد حسین امجد

پروفیسر الیاس برنی

کا مشہور و مقبول سلسلہ منتخبات نظم اردو

۱۔ **معارف ملت** ۔ حمد، نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ ۔ جلد اول ۔ جلد دوم ۔ جلد سوم ۔

۲۔ **مناظر قدرت** ۔ اوقات ۔ مقامات ۔ مخلوقات اور واقعات کی تصاویر کا دلکش مرقع ۔ جلد اول ۔ جلد دوم ۔ جلد سوم ۔

۳۔ **جذبات فطرت** ۔ سب دلوں کی کہانی چند شاعروں کی زبانی بقول غالب ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جلد اول ۔ جلد دوم ۔ جلد سوم ۔

نوٹ ۔ ہر حصہ کی چوتھی جلد زیر ترتیب ہے ۔

اپنی غیر معمولی شہرت اور قبولیت کی بدولت اب یہ سلسلہ کسی مزید تعارف اور سفارش کا محتاج نہیں رہا ۔ اس کی کتابیں اردو کے شائقین میں ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں اور ہندوستان کے اکثر صوبوں کے مدارس میں داخل نصاب ہو چکی ہیں ۔ جلد پاکیزہ قیمت فی جلد مجلد صرف ایک روپیہ

اسرار حق

مرتبہ

پروفیسر الیاس برنی ایم ۔ اے

آیات قرآنیہ ۔ احادیث نبویہ ۔ ارشادات صدیقین و اکابر دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ۔ ان سب کا نہایت جامع اور مربوط انتخاب ۔ اور ان کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لب لباب جس سے خود بخود اسلام کے حقائق و معارف اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں ۔ تصوف کی تحقیق و تصدیق میں بعض لحاظ سے یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے ۔ قابل دید ہے ۔

حجم تقریباً چار سو صفحہ جلد پاکیزہ قیمت صرف (۱۲/)

مندرجہ بالا کتابیں ملنے کا پتہ ۔ سمی احمد صدیقی ۔ بر دولت خانہ محمد الیاس برنی صاحب ترپ بازار حیدرآباد دکن

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابو المکارم صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

باہتمام مرزا غلام جیلانی بیگ

شمس الاسلام پریس میں چھپکر

دفتر رسالہ ترقی اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتہ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی ۵ ا تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جوابطلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمۂ طالب جواب

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچۂ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط وکتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعۂ خط وکتابت یا بالمشافہ طے ہوسکتا ہے۔

(۸) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ (صہ) ششماہی (سے/) نمونہ ۸ر

منیجر

ترقی

جلد ۱ — بابتہ ماہ ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ — نمبر ۲

اگرچہ ہمارے لئے یہ امر تشکر و امتنان کا موجب ہے، کہ علم دوست حضرات نے ہمارا امید سے بڑھ کر خیر مقدم کیا، لیکن علمی رسائل کی بقا و ارتقا کا مسئلہ ارباب حل و عقد سے پوشیدہ نہیں، اس لئے ہم اپنے معزز ناظرین و ہمدرد معاونین کی موجودہ مہربانیوں میں کسی قدر زیادتی کے خواہاں ہیں، امید ہے کہ ہماری یہ استدعا قبولیت کا شرف حاصل کرے گی۔

اسوۂ حسنہ۔ اس عنوان کے تحت، محترمی مولوی سید خورشید علی صاحب کا مضمون گزشتہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے، جو مکمل نہیں۔ کاتب کی فروگذاشت سے مضمون کے ختم پر لفظ "باقی" نہ لکھا جا سکا، مضمون ہذا اسی سلسلہ میں ہے، اور یہ مبارک سلسلہ ہمارے محترم دوست کی عنایت سے چندے اور جاری رہے گا۔

حیات تمدن۔ ہمارے فاضل دوست مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مولوی فاضل "رسالہ معارف" (علی گڈھ) اور "صحیفہ" ماہواری (حیدرآباد) کے ممتاز مضمون نگاروں میں تھے، صاحب موصوف کے علمی مشاغل کی ایک زندہ یادگار حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔ ہم شکر گزار ہیں کہ عنوان بالا کے تحت مولوی صاحب نے اپنا ایک مفصل مضمون جو حضرت آصفجاہ کی سوانح عمری کہلایا جا سکتا ہے ترقی کے لئے عنایت فرمایا۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں عہد اسلامی کے مختصر حالات "تبصرۃ" اور دوسرے حصہ میں حضرت آصفجاہ کے سوانح قلمبند کئے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ "ترقی" کے صفحات میں اس قدر گنجائش نہیں، کہ مضمون ایک دو نمبروں میں ختم ہو اس لئے کچھ عرصہ تک اس سلسلے کے جاری رہنے کی توقع ہے۔

تصحیح۔ گذشتہ نمبر کے صفحہ سات کی تیرھویں سطر کے آخری حصہ میں اس طرح صحت فرمائی جائے

"یہ لوگ تمہارے آس پاس سے منتشر ہو جاتے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترقی

جلد (۱) ——— ماہ ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ ——— نمبر (۲)

فصل الخطاب

جناب رسالت مآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ

حقیقی موضوع شاعری

از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا (لاہور)

اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

ہندوستان میں جس وقت بیداری کے دوسرے معنے خواب غفلت تھے، جب اسلامی جذبات کے مضحکے اڑائے جاتے تھے، جب قومیت کا احساس موجود ہی نہ تھا اس وقت سب سے پہلے اسلام کے جس فرد کامل نے اعلائے کلمۃ اللہ کا آوازہ بلند کیا اور اس صور اسرافیل کو تا بفلک پہنچایا، وہ ڈاکٹر اقبال کی اور صرف ڈاکٹر اقبال کی پاک ہستی تھی، جو حقیقت میں تحریک حریت اسلامی کی، من حیث الشرع والدین اولین محرک ہے، اکبر، آزاد، ظفر، محمد، شوکت، سب اسی خرمن کے خوشہ چیں ہیں اور سب کے دلوں میں اسی کے تعلیمات صدق و صفا سے گرمی پیدا ہوئی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی نظموں سے تو ایک دنیا مستفید ہو رہی ہے مگر ان کی نثر سے بہت کم لوگوں کو استفادہ کا موقع ملا ہے، میں چاہتا ہوں کہ عنوان فوق کے تحت میں ممدوح کا ایک خاص مضمون آپ ترقی میں درج فرمائیں جو اہل نظر کے لئے ایک سرمایۂ بصیرت ہوگا۔ واللہ الموفق۔ عمادی۔

(۱)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحات تاریخ کے لیے خط پاشان کا حکم رکھتی ہے لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانان ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل انھیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے شاعری کیسی نہ ہونی چاہئے اور کیسی ہونی چاہئے یہ وہ عقدہ ہے جسے جناب رسالت مآب صلعم کجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔

(۲)

امرالقیس نے اسلام سے (۴۰) سال پہلے کا زمانہ پایا ہے، روایت یوں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ہے "اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" یعنے وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلہ میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امرالقیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنھوں نے حضور سرور کائنات سے یہ رائے ظاہر کرائی۔ امرالقیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوش ربا داستانوں اور جانگداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان، ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دو جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امرالقیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بیخودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے، کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں

یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی اچھا شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری درحقیقت ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے، جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے، اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے، نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔

(۳)

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ حتیٰ انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے کہنے والے کو زندہ دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر اک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گوں کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، ان کا نقش پردہ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے حضور

خواجۂ دو جہاں (بابی انت وامی) نے جو قدر اس شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے، کہ صنعت حیات انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

(۴)

ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی، ایک مقصد وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنے قومی زندگی جو زندگی آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اسی غایت آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہئے، اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہئے، کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں، اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انھیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو چیتیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ مصور فطرت کو اپنی زنگار رنگ نگار آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے، یہ پیش پا افتادہ فقرہ، جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی، اجتماعی، انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دیکر چھین لی جائے۔

غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقا کیا ہونی چاہئے۔

اُسوۂ حَسَنَہ

بسلسلۂ اشاعت گزشتہ

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و عادات و خصائل سے ذاتی طور پر کماحقہ واقفیت رکھنے والے آپ کے ہم عصر راز داں رفقا اور مخالفین کے ان بیانات کے بعد جو اوپر نقل کئے گئے ہیں، اس قسم کے خیالات کا معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو اس اُنیسویں بیسویں صدی میں یورپ کے حالیہ علوم و تہذیب و تمدن میں نشو نما یافتہ دماغ حیات اقدس کے جزئی اور تفصیلی واقعات کا غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے بعد قایم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈشی کانتہ چٹا پادھیائے آنجہانی جنھوں نے مذاہب عالم کی تحقیق و چھان بین میں اپنی عمر صرف کر دی اور جو متعدد السنہ مغربیہ کے ماہر کامل ہونے کے علاوہ ایک متبحر فاضل بھی تھے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس مذہب کا سرچشمۂ ہدایت خدا کا ایک ایسا نبی ہے جس کا تاریخی وجود مسلم و متحقق ہی نہیں، بلکہ جس کے عالم شباب، شکل و شمائل، عادات و خصائل، یہاں تک کہ ذاتی خصوصیات کا ہم کو ایسا ہی علم ہے جیسا آلیور کرام ول یا نپولین بونا پارٹ کے متعلق یہ اور بات ہے کہ جس طرح مسیحی اور دوسرے مذاہب کے مصنفین صدہا سال سے اس نبی برحق (روحی فدا) کو (معاذ اللہ) سب و شتم سے یاد کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح اگر تمہارا جی چاہے تو اس کو برا بھلا کہہ لو۔ لیکن یہ امر محال ہے کہ تم اس مہتم بالشان شخصیت کے تاریخی وجود کی نسبت ذرا بھی شک کر سکو، جس کی مقدس اور پر تنویر ذات کا نقش زمانہ کی لوح پر اس انداز سے ثبت ہوا ہے کہ مسیحی دنیا کا منہ اس کو دیکھ کر فق ہو جاتا ہے۔ لیکن مسیحی ناحق پریشان ہوتے ہیں۔

اگر ان کو جناب رسالت مآب علیہ التحیتہ والسلام کی سیرت کا کما حقہ علم ہو جائے اور وہ یہ جاننے لگیں کہ جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی شرافت اور سچائی اور محبت کا کیسا بے نظیر نمونہ تھی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی تحسین و تعظیم کی نظر سے دیکھنے لگیں یا جس وقعت و عظمت و محبت کی نظر سے تمام مسلمان دیکھتے ہیں۔ زرتشت۔ سری کشن یہاں تک کہ خود بدھ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات جس ابہام و اسرار کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے اس کا ایک شائبہ بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق نہیں پایا جاتا۔"

ایک اور موقع پر ڈاکٹر نشی کانتھ نے لکھا ہے کہ :-

"پیغمبر اسلام صلعم نے اپنی نسبت جو کچھ دعوےٰ کیا یعنی یہ کہ وہ لفظ رسول کے اعلیٰ ترین مفہوم کے لحاظ سے رسول خدا تھے، اس کے تسلیم کرنے میں کسی منصف مزاج شخص کو انکار نہ ہوگا جس کے دل میں اپنے خاص مذہب یا فرقہ کی بیجا حمایت کی خواہش موجزن نہ ہو اور جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات اور تعلیم اور خصوصاً قرآن مجید کا مطالعہ کرے، جسے "تزک محمدی" کا خطاب دیا گیا ہے، جتنی حدیثیں ہم تک پہونچی ہیں ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں غیر معمولی سچائی، انصاف، فیاضی، سخاوت، نیکی اور پاکیزگی موجود تھی گزشتہ تیرہ سو سال سے بنی نوع انسان کا ایک تہائی حصہ انھیں انسان کامل کا بہترین نمونہ سمجھتا چلا آتا ہے۔"

ڈاکٹر نشی کانتھ اپنے ایک دوسرے دلچسپ اور عالمانہ مضمون میں لکھتے ہیں :-

"جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاص اور سچائی، جو مقصد آپ کو اس دنیا میں لایا تھا، اس کی تکمیل میں آپ کی جان بازانہ مصروفیت اور وہ احسانات عظیم جو آپ نے اپنے ملک پر کئے یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کا اعتراف آپ کے مخالفین تک کو ہے۔ لیکن جس بات کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں خود میں سب سے زیادہ استحسان کی نظر سے دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے دنیا کے لئے انسان کامل کی ایک قابل

تقلید یادگار چھوڑی ہے۔ آپ کو محض ایک ترانہ سراداعی یا ایک تخیل آشنا راہب یا ایک مسلوب الجذبات ولی یا ایک رقیق القلب خیر خواہ خلایق ہی نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ آپ نمونہ تھے، اس کامل شان انسانی کا جو طاقت اور قوت کے جوش سے لبریز تھی، جس میں جسم اور دماغ اور روح عجب خوش آیند تناسب کے ساتھ نشوونما پاکر منتہائے کمال کو پہونچے تھے آپ ایک ہی وقت میں پیغمبر، بادشاہ، سپہ سالار، مدبر اور واضع قوانین سبھی کچھ تھے۔ تاریخ کے بے شمار ورق الٹ ڈالو، لیکن تم کو ایک بھی مثال ایسی نہ ملے گی، جس میں کوئی دوسرا شخص آپ کا مقابلہ ان عظیم الشان اور کثیر التعداد طاقتوں میں کرسکے جو آپ کی ذات میں جمع تھیں اور جن کو آپ نے ایسے عالمگیر اغراض میں صرف فرماکر ایسی شاہنشاہانہ کامیابی حاصل کی"

(باقی) سید خورشید علیؒ

قند پارس

لمعات مولوی مسعود علی صاحب بی اے محوی

برخیز، نگاہِ یار، برخیز
اے فتنۂ روزگار، برخیز

بنما، بہ جہاں رخ تجلّی
اے شعلۂ بے شرار، برخیز

اے سرو، رواں فروز گیتی
با نازکرشمہ بار، برخیز

تا گردن عالمے بہ بندد
اے کاکل تابدار، برخیز

مے ماند، نہ ساغر و نہ ساقی
ازمیکدہ، مے گسار، برخیز

بنشیں بہ خیال دوست بنشیں
برخیز بہ فکر یار، برخیز

در بند غم است بندۂ تو
اے خواجہ بہ زینہار، برخیز

منع است سوال زاں شہ حسن
درویش، زرہ گزار، برخیز

محوی نہ جہاں است جائے آرام
زیں کلبۂ تنگ و تار، برخیز

خدا سے جنگ

مادہ کی بغاوت

مغربی مادہ پرستی کی دہل بلند بانگ سے ساری فضاء عالم گونج اٹھی ہے اور انسانی اعمال و اخلاق کو ہر چہار طرف سے اس نے اس طرح چھا لیا ہے کہ کسی دوسری آواز کو مسموع بنانا مشکل ہے۔ کسی حریف کو کامیابی کے ساتھ زیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے زور بازو کا پوری طرح اندازہ کر لیا جائے۔ اس بنا پر ذیل میں ایک فریقانہ وکیل کی حیثیت سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ علمی و اصولی طور پر پہلے **مادیت** کو اپنی انتہائی قوت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے تاکہ جب فتح شکست کا فیصلہ ہونے لگے تو وکلا کے حریف کو لب کشائی کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے۔
وما توفیقی الا باللہ۔

عام خیال یہ ہے کہ انسان دو بالکل مختلف بلکہ متضاد چیزوں سے بنا ہے۔ ایک کا نام بدن، جسم یا مادہ ہے اور دوسرے کا ذہن، نفس یا روح۔ مادہ ایک فانی بے حس و ادراک ٹھوس ممتد یا پھیلاؤ والی شئے ہے۔ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے اس میں تغیر و تبدل واقع ہو سکتا ہے بخلاف اس کے روح ایک قطعاً غیر منقسم ناقابل فنا اور بسیط جوہر ہے، اس میں نہ تو کوئی امتداد ہے

لے۔ اس مضمون کے لکھتے وقت زیادہ تر حسب ذیل کتابیں پیش نظر ہیں:۔

(۱) تاریخ مادیت از البرٹ لینغ۔
(۲) معمۂ کائنات از ارنسٹ ہیکل۔
(۳) جدید مذہب زردشتی (ماڈرن زوراسٹرازم) از ہیول لینگ۔
(۴) ہکسلے کا مشہور مضمون "مادی اساس حیات" (فزیکل بیس آف لائف)۔
(۵) ایک آدھ تاریخ فلسفہ مثلاً ویبر کی۔

نہ کسی طرح کی کمی بیشی اور تبدیلی کا امکان ہے، شعور و ادراک اس کا خاصہ بلکہ اس کی ذات میں داخل ہے۔ فلاسفہ میں اس دوئی کے قائلین کا لقب **ثنویہ** ہے۔ ارسطو اور ڈیکارٹ اسی گروہ کے علم بردار ہیں۔

لیکن چونکہ فلسفہ کو کثرت اور تعدد سے قدرتی بعد ہے، اس لئے وہ اس دوئی پر قرار پذیر نہیں ہو سکتا تھا، اور لازمی طور پر وحدت کی جستجو میں ایک فریق اس امر کا مدعی بن گیا کہ حقیقی اور جوہری وجود صرف روح کا ہے، باقی عالم جسمانیات کی ہستی ظل اور پرتو یا خود روح کے آفریدہ تصورات سے زیادہ نہیں۔ اس مسلک کا وسیع ترین اصطلاحی نام **تصوریت** ہے، جس میں فلاطون سے لیکر ہیگل[1] تک نہایت ہی متفاوت اور متبائن الخیال فلاسفہ شامل ہیں۔ دوسرے سرے پر **مادیت** کا یہ ادعا ہے کہ نہیں جو کچھ ہے بس مادہ ہی مادہ ہے، جن افعال کو روح کی جانب منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی مادہ ہی کی قوتوں کا ایک کرشمہ ہیں۔ ذیل میں **وحدیت** (مانزم) کے اسی آخر الذکر مذہب کی معبری اور وکالت مقصود ہے۔

اگرچہ بقول **البرٹ لینج**[2] کے "مادیت اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود فلسفہ" اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ بہ حیثیت فلسفہ کے ایک مستقل و منضبط اسکول کے اس کی بنیاد تقریباً چوبیس سو سال پہلے **دی مقراطیس**[3] کے ہاتھ پڑ چکی تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ **دی مقراطیس** اور اس کے اتباع **اپی کورس**[4] وغیرہ کی مادیت کی بساط ایک نظریہ اور تخمین سے زائد نہ تھی۔ مگر عہد حاضر میں

---

[1] جرمنی کے متاخرین فلاسفہ میں سب سے بلند پایہ خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۸۳۱ء میں مرا۔

[2] ۱۸۲۸ء تا ۱۸۷۵ء اس کی تاریخ مادیت جو تین ضخیم جلدوں میں ہے یورپ بھر کے لٹریچر میں اس موضوع پر غالباً اس سے بہتر اور جامع تر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اصل جرمن میں ہے انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

[3] مادیت کا ابوالآبا اور رسالمات کے نظریہ کا کہنا چاہئے، کہ بانی اول ہے۔ اجزائے مادی مقراطیسی اسی کے نام سے مشہور ہے (سنہ ۴۲۰ ق م)۔

[4] سنہ ۳۴۱ تا سنہ ۲۷۰ ق م۔ مادیت کا نہایت زبردست اور بیباک حامی تھا۔ اور اخلاق میں لذتیت کے بدنام مذہب کا بانی ہے۔

علم کیمیا، تشریح، عضویات، علم الجنین وغیرہ کی تحقیقات، خوردبینی مشاہدات اور نظریۂ ارتقا نے اس ظن و تخمین کو ایک سائنٹیفک حقیقت بنا دیا ہے جس کا توڑ ہمارے نزدیک صرف برکلے کی انتہائی تصوریت[1] (آئیڈیلزم) ہے۔ بعض باتیں بچپن سے سنتے سنتے اس طرح ذہن میں جم جاتی ہیں کہ بلا ادنیٰ ثبوت کے بھی ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں اس لیے مادیت کے تائیدی دلائل و شواہد پر بحث سے پہلے دم بھر کے لئے مذہب و روایت سے خالی الذہن ہوکر یہ معلوم کرلینا چاہیئے کہ وجودِ روح کے عالمگیر اعتقاد کی بنا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ روح جسم کی طرح کوئی مرئی یا محسوس شئے نہیں ہے، نہ اس کے وجود کا ادعا بالواسطہ یا براہ راست شہادت حسی پر مبنی ہے۔ ابتداءً روح کا خیال جن علم النفسی اور عضویاتی (فزیالوجیکل) محرکات سے پیدا ہوا اولاً تو ان کی کاتی پردہ دری ہوچکی ہے۔ دوسرے یہ موقع ان کے چھیڑنے کا نہیں ہے۔ سردست ہم کو صرف اس شئے سے بحث ہے جس کی بنا پر انیسویں صدی کے علم الحیاتی انکشافات کے بعد بھی لوگ روح کے اقرار پر مضطر ہیں اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ بات کسی طرح دل میں نہیں اترتی کہ انسانی فکر و استدلال کی محیر العقل قوتیں مٹی اور پتھر جیسے بے حس و حرکت اجسام ہی کا ایک مظہر ہیں۔ اور گلیلیو و نیوٹن کے اندر جسم خاکی کے ڈھیر کے علاوہ کوئی اور شئے کارفرما تھی۔ یہ کسی طرح تصور میں نہیں آتا کہ عقل و فہم کی وہ قوتیں جن سے فلسفہ و حکمت کے عجائب صادر ہوتے ہیں، وہ ذرات مادی کی محض کسی مخصوص تالیف و حرکات کا نتیجہ ہیں۔

ہم کو اعتراف ہے کہ یہ اشکال و استبعاد بے بنیاد نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی خفیف تامل کے بعد صاف نظر آنے لگتا ہے کہ اس کی بنا ایک طرح کے محض نفسیاتی مغالطہ پر ہے۔ چونکہ روح کا وجود فقط انسان کے ساتھ مختص خیال کیا جاتا ہے اور مادہ سے بالعموم ذہن کا

---

[1] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم جسمانیات کی ہستی ذہن یا روح کے آفریدہ تصورات سے زیادہ نہیں ذہن کے باہر مادہ کا کوئی وجود نہیں مزید تفصیل کیلئے خود برکلے کی اصل کتاب "مبادیٔ علم انسانی" اور "مکالمات" مطبوعہ شبلی اکاڈمی کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

انتقال بے جان یا غیر عضوی اجسام کی جانب ہوتا ہے، اس لئے جب کوئی شخص مادہ اور روح پر ایک ساتھ مقابلتہً غور کرتا ہے تو ایک طرف تو اس کے پیش نظر عقل انسانی کے کارنامے ہوتے ہیں دوسری طرف راستہ گلی کے افتادہ کنکر پتھر، بیچ کی کڑیوں سے ذہن بالکل غیر ملتفت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک سنگریزہ اور اصل الانواع کے مصنف (ڈاروِن) کے مابین جو بعد المشرقین ہے اس کا قطع کرنا انسان کی سمجھ کے لئے نہ صرف عسیر الفہم بلکہ قطعاً ناممکن ہے اور وہ یقیناً یہ ماننے پر بے بس ہے کہ ریل، تار اور ہوائی جہاز کے موجدین کے اندر کوئی ایسی فوق الفہم شے کام کر رہی ہے جو پتھر اور لوہے بے حس و حرکت پاروں سے نہ صرف مدارج میں مختلف بلکہ اپنی ماہیت و نوعیت میں تباین ہے۔ ایک شخص جس نے کبھی ایک گز کی دیوار اٹھتے نہ دیکھی ہو اس کو اگر تم دفعتہً سینکڑوں فٹ بلند اہرام مصری یا قطب مینار کے پاس لے جا کر کھڑا کر دو تو کیا وہ مشہور حکایت کے تین احمقوں کی طرح ان کی بلندی سے حیرت زدہ ہو کر ان کی تعمیر کی نسبت عجیب و غریب نظریات نہ قائم کرے گا؟ لیکن اگر یہی شخص چند دن کسی شہر میں رہے جہاں ہر روز چھوٹے بڑے مکانات بنا کرتے ہیں، پھر اس کو نیویارک کی سر بفلک عمارتوں کے نیچے بھی لیجا کر کھڑا کر دو جب بھی وہ ان کو اپنے ہی جیسے پانچ چھ فٹ کے آدمیوں کا کارنامہ خیال کرے گا، اور یہ کبھی نہ کہے گا، کہ اُن کے بنانے والے کیسے لمبے تھے!

اسی طرح علم الحیات کے ایک بے تعصب متعلم کے لئے جو غیر عضوی مخلوقات اور پروٹوپلازم[1] سے لیکر انسان تک سلسلہ ارتقا کی مختلف کڑیوں سے باخبر ہے، یا کم از کم ایک مرتبہ غور سے ہیکلے کی کتاب "کائنات میں انسان کی جگہ" یا **ارنسٹ ہیکل** کا کارنامہ "تخلیق کی تاریخ طبعی" پڑھ چکا ہے اس کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ انسان کی عقل و حکمت کا سرچشمہ نوامیس سے ماورا کوئی فوق الفطرۃ اور کلیتہً متباین الماہیتہ غیر فانی مبدء ہے، جو انسان کا کالبد تیار کرنے کے بعد الگ سے اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، اور اس کالبد کے برباد ہونے کے ساتھ ہی، وہ اس طرح پرواز کر جاتا ہے جیسے قفس کی تیلیاں ٹوٹنے کے ساتھ طائر۔ اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ مدارج ارتقا سے

---

[1] اس اصطلاح کی تفصیل آگے آتی ہے ۱۲

کوئی مفصل بحث کی جاسکے اس لئے ہم صرف ایک عام فہم تشریح اور چند موٹی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں۔

روح کا لفظ عوام سے لیکر حکما تک ایسے مبہم اور غیر معین معنے میں استعمال کرتے ہیں کہ کبھی تو وہ نہایت وسیع ہو جاتا ہے اور کبھی نہایت تنگ۔ ہم سہولت فہم کے لئے افعال نفس کے تین مراتب قایم کرتے ہیں جن کے مجموعہ کو روح سمجھنا چاہیئے۔

(۱) افعال حیات (۲) حس و حرکت اور (۳) فکر و شعور۔

اوّل الذکر میں عمل ہضم، نمو اور تولید جنس کی قوتیں داخل ہیں عضوی یا جاندار مخلوق کی سرحد کی یہ اولین منزل ہے۔ نباتات کا کوئی فرد ان سگانہ افعال حیات سے خالی نہیں ہوتا۔ اب انسان کی جگہ بے جان یا غیر عضوی اجسام خصوصاً **بلور (کرسٹل** جس کی ساخت ہمیشہ ایک خاص **اقلیدسی** شکل کی ہوتی ہے) وغیرہ سے کسی درخت اور پودے کا موازنہ کرو۔ تو ان دونوں میں تم کو اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز فرق نہ معلوم ہوگا کہ نمو وغیرہ کے افعال کلنشا کسی غیر مادی چیز کو سمجھنے لگو۔ چنانچہ عوام سے لیکر علمائے مذہب و فلسفہ تک میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے، جو یہ مانتے ہوں، کہ درختوں کے خشک ہونے، پتیوں اور پھولوں کے مرجھا جانے کے بعد کوئی مجرد غیر فانی روحانی ہستی ان سے نکل کر علٰحدہ قایم رہتی ہے دوسرے طبقہ میں ہم نے جن افعال کو داخل کیا ہے، وہ اگرچہ حیات نفسی کا پہلا قدم نہیں ہے لیکن بلحاظ اپنی اہمیت کے سب پر مقدم ہے۔ اس لئے کہ روح یا عقل انسانی کی تعمیر کا ہیولیٰ اور اساس احساس اور حرکت (جس کو علی العموم حرکت ارادی یا حیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے) ہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر **بوس** کے تجربات و تحقیقات نے دنیائے سائنس میں اس حقیقت کو قریباً مسلم الثبوت بنا دیا ہے کہ حس و حرکت بھی نباتات ہی سے شروع ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس مضمون کے مباحث کو زیادہ تر گرد و پیش کے معمولی حوادث و مشاہدات پر مبنی رکھنا منظور ہے۔ اس لئے تائید مادیت کی ایک زبردست سائنٹفک شہادت سے سردست چشم پوشی کرنا پڑتی ہے اور ہم یہ مانے لیتے ہیں، کہ حرکت ارادی اور احساس کی ابتدا حیوانات سے ہوتی ہے۔ اب تم ادنیٰ درجہ کے حیوانات

مثلاً اسفنج (جس کی نسبت مدتوں کی بحث وتحقیق کے بعد یہ طے پاسکا، کہ نباتات نہیں بلکہ حیوانات کی صنف میں شامل ہے) کا مقابلہ چھوٹی موٹی وغیرہ جیسے نباتات سے، جس میں نمایاں طور پر ایک طرح کا حس نظر آتا ہے کرو، تو کیا پھر بھی تم کو ان دونوں میں اتنا متحیر تفاوت محسوس ہوتا ہے کہ اسفنج وغیرہ میں کسی غیر مادی مبدء (پرنسپل) کے قبول کرنے پر مضطر ہو۔

آخرالذکر صنف میں **شعور** سے مراد اپنی ذات کی شخصیت یا انانیت کا ادراک اور علم العلم ہے، یعنے کسی ذہن کا یہ جاننا، کہ وہ جانتا ہے، یا بالفاظ دیگر یوں کہو، کہ ان حوادث و احساسات سے باخبر ہونا، جو اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ان ہی احساسات یا حوادث ذہنی کو خاص خاص سلسلوں میں مربوط کرنا، جزئیات کی باہمی تالیف وتحلیل سے کلی نتائج اخذ کرنا، اور ان کلی نتائج سے نامعلوم جزئیات کے متعلق رہنمائی حاصل کرنا، یہی چیزیں عمل **فکر** یا **سوچنا** ہیں، جن کو منطق اصطلاح میں **استقرا** اور **قیاس** کہا جاتا ہے۔ بہت سے علمائے نفسیات فکر وشعور کو قریب المعنی بلکہ ہم معنی لفظوں کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ نوعی لحاظ سے یہی افعال حیات ذہنی کا منتہائے کمال ہیں، اور بالعموم انسان یا **غیر مادی روح** کے ساتھ مختص سمجھے جاتے ہیں۔ خود حکما و فلاسفہ کے مابین ان کے بارے میں شدید اختلافات ہیں۔ اور متعدد نظریات قایم ہو گئے ہیں۔ شوپنہائر[1] کے نزدیک بلاتفریق ادنیٰ و اعلیٰ تمام حیوانات ذی شعور ہیں، لیکن محققین علمائے حیوانات فکر وشعور کو صرف ان حیوانات تک محدود مانتے ہیں، جن میں الگ الگ آلات حس اور ایک مرکزی نظام عصبی پایا جاتا ہے مثلاً فقاری (ریڑھ والے) اور ذوات الثدی (پستان والے) حیوانات (ہیگل کی کتاب "معمۂ کائنات" باب ۱۰)۔

لیکن ہمارے نزدیک تم کو علم الحیوانات کے دفاتر کی ورق گردانی کی مطلق احتیاج نہیں اگر تم اپنے روزمرہ کے معمولی مشاہدات ہی کا ایک بار تامل و بے تعصبی سے اعادہ کرسکو، تو ڈیکارٹ کی اس کوتاہ نظری کا پردہ فاش ہو جائے گا، کہ فکر وشعور کی مزیت کا دعویدار تنہا انسان ہی ہے۔

---

[1] ہیگل کا معاصر اور جرمنی کا مشہور فلسفی ہے اس کا فلسفہ "فلسفہ ارادہ" کہلاتا ہے۔ جو کچھ ہے ارادہ ہی ارادہ ہے تمام کائنات مادی اور غیر مادی کا مبدء حقیقی ارادہ ہی ہے سنہ ۱۸۶۰ء میں فوت ہوا۔

چند دن کا ذکر ہے کہ میرے اٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں بہت سی چڑیوں نے کئی آشیانے بنا لئے تھے۔ اکثر لڑتی اور بے حد شور مچایا کرتی تھیں، جس سے پڑھنے لکھنے میں خلل پڑتا تھا۔ میں اپنے پاس چھڑی یا رومال رکھ لیتا تھا، جس کو ہلا ہلا کر اڑا دیا کرتا تھا۔ لیکن کیا ذہین جانور ہے! جب چند دفعہ دیکھ لیتا کہ میں خالی اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا چھڑی ہلایا کرتا ہوں تو پھر اس بے اثر دھمکی سے ذرا بھی نہ ڈرتا، اور برابر اپنی جگہ پر جما ہوا چیخا کرتا۔ آخر دق ہو کر میں قریب سے جا کر ہانکتا، تین ہی چار بار ایسا کرنے سے یہ ہوتا تھا، کہ میں اپنی کرسی پر سے اٹھنا چاہتا اور وہ اڑ بھاگتا، بلکہ میرا سر اوٹھانا ہی اس کو بھگا دینے کے لئے کافی ہوتا۔ مگر ظالم کو جب متعدد تجربات سے یقین ہو جاتا، کہ یہ بھی محض تہدید ہے، تو پھر سر ہلانا کیا کرسی سے اٹھ بیٹھنا بھی بے سود ہوتا تھا۔ اور جب تک میں پاس نہ پہنچ جاتا وہ اپنی جگہ سے نہ جنبش کرتا۔ کیا یہ تجربات و واقعات کے استقصا سے نتائج کلیہ اخذ کرنے اور قیاسات بنانے کی وہی قوتیں نہیں ہیں، جو ارسطو اور مل کی منطق کا موضوع ہیں اور جو انسان میں ترقی پا کر سائنس و فلسفہ کے انکشافات کی موجب ہوتی ہیں؟ کتے کو جس دسترخوان سے دو چار روز برابر ہڈی مل جاتی ہے، وہاں وہ بالمرہ عین اسی وقت پر روزانہ آ کھڑا ہوتا ہے (وقت یا زمانہ کے انداز کی یہ کیسی استعجاب انگیز مثال ہے!) کیا یہ نفس کا وہی فعل نہیں ہے جو گداگر کو روز اس دروازہ پر گھسیٹ لاتا ہے، جہاں سے اس کو ٹکڑہ روٹی ملتی ہے؟ سرکسوں میں تم نے دیکھا ہوگا، کہ سکھلائے ہوئے شیر، گھوڑے، بندر، اور ہاتھی وغیرہ عقل و ذہانت کے کیسے عجیب عجیب تماشے دکھلاتے ہیں، کہ آدمی کی بھی عقل دنگ رہ جاتی ہے! اس بیان سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالنا چاہیئے، کہ انسان اور حیوان کی عقل میں کوئی فرق نہیں، فرق ہے اور نہایت عظیم ہے۔ لیکن نوعیت کا نہیں، بلکہ فقط مدارج کا ہے، جو خود نوع انسان کی مختلف نسلوں، قوموں اور افراد میں باہم پایا جاتا ہے۔ ڈارون اور آسٹریلیا کے ان وحشی آدمیوں کے مابین، جو تین چار سے آگے گنتی نہیں جانتے، اس سے کسی طرح کم فرق نہیں ہے جتنا ان وحشی انسانوں اور بندروں کی ترقی یافتہ جنس شمپنزی[1] کے مابین ہے۔

---

[1] اس کی اگر تم انسان کے پہلو میں محض تصویر دیکھ لو تو جب بھی تم پر یہ اثر پڑیگا کہ دو نوں میں بس مدارج ہی کا فرق ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ حیوانات میں سرے سے کسی درجہ کا بھی فکر و شعور نہیں پایا جاتا، تو بھی ہمارے نزدیک ان فلاسفہ کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانات کے باقی تمام افعال ذہنی کو فقط مادہ اور مادی قوتوں کا معلول یقین کرتے ہیں، یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ انسان کے ایک یا دو (فکر و شعور) مخصوص ذہنی قویٰ کا مبدء کوئی فوق الفطرت غیر مادی ہستی ہے۔ کیا مادہ کی جو طاقت سماعت، بصارت، لمس وغیرہ کے احساسات، حرکت ارادی اور حافظہ وغیرہ تمام حیوانی افعال کا مظہر بن سکتی ہے، وہ صرف فکر و شعور ہی کی تخلیق سے عاجز ہے؟ کیا ڈیکارٹ کا یہ دعویٰ، کہ حیوانات تو سرتاسر مادہ ہی کی ایک میکانکی مخلوق یا مشین ہیں، لیکن انسان کے اندر ایک مجرد روح کارفرما ہے، ہٹ دھرمی سے زیادہ وقعت رکھتا ہے؟

بہرکیف اگرچہ اسفنج سے لیکر انسان تک ارتقائے ذہنی کے اتنے ان گنت مدارج ہیں کہ ان کے اجمالی ذکر کے لئے بھی ایک دفتر چاہیئے، لیکن ان میں سے اگر دس بیس بھی وضاحت کے ساتھ کسی بے تعصب سوچنے والے کے پیش نظر ہوں تو اس کو بلا کسی دلیل کے ازخود اس بات کا اذعان ہو جائے گا کہ انسان بھی انہیں معمولی قوانین فطرت کا آفریدہ ہے جن کے ماتحت اور ساری مخلوق ہے "وہ نہ آسمان سے ٹپکا ہے، نہ احشاء ارض سے بنا بنایا نکل پڑا ہے" اور اتنا تو کم از کم مذکورۂ بالا تقسیم کے تین موٹے موٹے مدارج کو سامنے رکھنے سے بھی ہونا چاہیئے، کہ جو تحیر اور استبعاد براہ راست کنکر پتھر اور عقل انسانی کے مقابلہ سے پیدا ہوتا تھا وہ قابل لحاظ حد تک گھٹ جاتا ہے اور جو چیز پہلے قطعاً ناقابل تصور تھی، وہ محقق نہ سہی، لیکن بہراتب قابل تصور ضرور ہو گئی ہے۔ لہذا اب ہم اس قابل التصور

حقیقت کے ایجابی دلائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

مادیت کے قائلین کا دعویٰ ہے کہ ذہن کی مختلف قوتیں عضو دماغ (بھیجا) کے مختلف حصوں کے اسی طرح مختلف افعال ہیں، جس طرح معدہ کا فعل عمل ہضم ہے، جگر کا تولید صفرا اور زبان و

لب کی حرکات کا تلفظ و گویائی۔ یا اور زیادہ صاف مادیانہ لہجہ میں یوں کہہ سکتے ہو کہ فکر و شعور دماغ کے ذرات مادی کی مخصوص ترکیب و حرکات کا ویسا ہی ایک خاصہ، معلول یا قوت ہے جیسا کہ پانی کے مخصوص اجزائے ترکیبی کا خاصہ سیلان، لوہے کے سالمات کے التصاق کی معلول صلابت، اور مقناطیس کے اندر قوت کشش۔ لہٰذا سب سے اوّل یہ جان لینا چاہئے کہ کوئی عضوی فعل کسی عضو کی جانب، کوئی ترکیبی خاصہ اجزائے ترکیبی کی جانب کوئی معلول کسی علت کی جانب اور کوئی قوت کسی خاص جسم کی جانب کیوں اور کس بنا پر منسوب کی جاتی ہے۔

اس کا ایک اور صرف ایک جواب ہے یعنے سلسلہ علت و معلول اور اشیار کے افعال و خواص اور قویٰ کے علم کا واحد ذریعہ واقعات و حوادث کا استقرار ہے اور پھر اس استقرا کی مختلف تجربات سے تائید و تصدیق۔ استقرار اور تجربہ ہی یہ تبلاتا ہے کہ عمل ہضم جگر نہیں بلکہ معدے کا وظیفہ اور تولید صفرہ معدہ نہیں جگر کا فعل ہے۔ جب کبھی ہاضمہ بگڑتا ہے یا صفراوی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں تو اس کے مقابل میں معدہ اور جگر میں کوئی نہ کوئی نقص ملتا ہے۔ لکنت کا مرض ہمیشہ آلات نطق کے ایک خاص خلل کا معلول ہوتا ہے۔ اگر ڈماستھینز (یونان کا شہرۂ آفاق مقرر) اور برک کی زبان بند کر دیجاتی، یا لب سی دئے جاتے، تو آج ہم تک ان کی مقرری کا شہرہ نہ پہنچتا۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کے خاص خاص مقداروں میں ملنے سے ہوا کبھی نہیں، بلکہ ہمیشہ پانی ہی بنتا ہے اس لئے ان کا ترکیبی خاصہ سیلان یقین کیا جاتا ہے لوہے کی صلابت یا ٹھوس پن کی علت بجز اس کے ذرات کی قربت یا التصاق کے اور کیا ہے، چنانچہ جب حرارت کے ذریعہ سے پگھلا کر تم التصاق ذرات کو گھٹا دو تو وہ پانی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ مقناطیس میں کشش کیوں مانی جاتی ہے، صرف اس لئے کہ جب وہ لوہے سے ایک فاصلہ پر ہوتا ہے تو اپنی طرف اس کو ہمیشہ گھسیٹتا ہے۔ اب آؤ ذرا اسی معیار پر عضو دماغ اور افعال روح کے باہمی تعلقات کی جانچ کریں جس کے لئے دو تین قسم کے مختلف مشاہدات و تجربات کا ایک جا کر دینا کافی ہوگا۔

۱۔ عقلی اور ذہنی تفاوت کے ساتھ ساتھ دماغ کے حجم اور وزن میں بھی ہمیشہ فرق ہوتا ہے

چنانچہ انسان کا دماغ اپنے جسم کے تناسب سے، تقریباً تمام حیوانات سے بڑا اور وزنی ہوتا ہے، یورپی اقوام کے دماغ کا وزن اوسطاً ۴۹ ½ اونس ہوتا ہے۔ زنگیوں کا ۴۴ سے کچھ کم، اور ایک ابلہ آدمی کا مشکل ہی سے ۲۳ اونس سے کبھی زیادہ نکلتا ہے۔ معمولی عقل و فہم کے لئے کم از کم ۳۴ اونس وزن ہونا چاہئے۔ علیٰ ہذا حجم کے لحاظ سے جرمنی، فرانس، انگلستان اور امریکہ کے لوگوں کا دماغ بالاوسط ۹۲ مکعب انچ ہے۔ زنگیوں کا ۸۳ اور آسٹریلیا کے وحشیوں کا ۷۵ ہوتا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک جسمی نشو و نما اور انحطاط کے ساتھ ساتھ عقل میں جو ارتقا اور تنزل ہوتا رہتا ہے، اس کا تم خود روزمرہ مشاہدہ کرتے ہو جسمانی بیماریوں کا دماغ کے کاموں پر جو نامدفوع اثر پڑتا ہے، اس سے کون انکار کرسکتا ہے معدہ میں کچھ خرابی واقع ہوتی ہے یا قبض وغیرہ کی شکایت ہوتی ہے، تو پڑھنے لکھنے کے کام میں کیسی ابتری پڑجاتی ہے جس وقت دماغ تھک جاتا ہے، آسان سے آسان کتاب کا سمجھنا مشکل پڑجاتا ہے سرسام جنون وغیرہ کی بیماریاں، جن سے عقل میں فتور آجاتا ہے اس کے سوا اور کیا ہیں، کہ عضو دماغ کے نظام عمل میں ایک خاص قسم کا خلل لاحق ہوجاتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہاضمہ کے فتور کا منشا معدہ کا کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے غرض یہ ہے، کہ عقل (روح) اور جسم (دماغ) میں ایسی ناقابل انفکاک وابستگی ہے، کہ اول الذکر کو آخر الذکر سے جدا کرنا ویسا ہی ہے جیسا کہ حرارت کا آگ سے۔

۲۔ وظائف الاعضا کی تحقیقات نے اس حقیقت کو قطعاً غیر مشتبہ بنا دیا ہے کہ ذہن کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام افعال دماغ کے خاص خاص حصوں کے ساتھ وابستہ ہیں یہاں تک کہ اگر کسی آدمی کا کاسۂ سر (یعنے صرف کھوپڑی) اس طرح اتار لیا جائے کہ وہ مرنے نہ پاوے تو عضویات کا ایک ہوشیار عالم سماعت، بصارت، گویائی، حافظہ، ارادہ، حتیٰ کہ عقل و شعور کے مراکز دماغی کو یکے بادیگرے برباد کرکے، ان افعال ذہنی کو ایک ایک کرکے باطل یا فنا کرسکتا ہے کبوتر اور کتوں وغیرہ پر اس قسم کے تجربات کئے بھی گئے ہیں۔ کیا اب بھی دماغ کے ان حصوں کی حیثیت

مشین کے ان مختلف پرزوں سے زیادہ ہے جن میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام انجام دیتا ہے اور کیا افعال ذہن کے میکانکی ہونے کا یہ ثبوت نہیں ہے؟

۳- ہمارے برتر سے برتر اور پیچیدہ سے پیچیدہ افکار ذہنی کی اگر تحلیل کی جائے تو وہ بھی مفرد و بسیط احساسات پر منتہی ہوں گے لیکن خود یہ احساسات بسیط کیا تمام تر آلات حس، نظام عصبی اور مرکز دماغی کے جسمی یا مادی اعضا پر موقوف نہیں ہیں؟ ایک آدمی اگر تمام آلات حس سے محروم کر دیا جائے تو کیا پھر بھی وہ بطلیموس اور کوپرنیکس کا نظام ہیئت مرتب کر سکے گا کسی شخص کو اگر پیدائش کے دن سے (۳۰) ، ۴۰ سال کی عمر تک ایک تاریک کمرہ میں اس طرح پرورش کرو کہ زیست بھر کی غذا، ہوا اور روشنی تو پہنچ جائے، لیکن اس سے آگے اس کے احساسات نہ ترقی کرنے پاویں، تو کیا پھر بھی وہ اپنی عقل کے لحاظ سے ان حیوانات سے پست تر نہ ہوگا، جن پر تشرف و تفوق کا ہم کو بلا قید و استثنا ادعا ہے؟

۴- اگرچہ بالعموم لوگ یہی سمجھتے اور مانتے ہیں کہ روح کا وجود صرف انسان میں ہے، باقی اور تمام حیوانات اسی معمولی بے جان مادہ سے بنے ہیں، ان کے سارے افعال حیات و ذہن پتھر اور لوہے ہی جیسے اجسام کی مخصوص ترکیب و حرکات کے معلول ہیں لیکن جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اگر یہ قبول کر لیا گیا، کہ عمل ہضم و تولید اور حس و حرکت وغیرہ نباتی اور حیوانی قوی بے حس و حیات ذرات مادی ہی کی کیمیاوی تالیف اور میکانکی حرکات کا کرشمہ ہیں، تو پھر قانون ارتقا کی مدد سے آخر تک راستہ صاف ہے، اور انسان کے اندر کسی غیر مادی مبدا کی کارفرمائی کا ادعا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اصلی مرحلہ اس عظیم الشان خلیج کے پاٹنے کا ہے، جو عضوی اور غیر عضوی یا جاندار اور بے جان مخلوقات کے مابین حائل ہے۔ اگر یہ پٹ گیا، یعنے قطعیت کے ساتھ ثابت ہو گیا، کہ زندگی اسی طرح بیجان عناصر مادی کی کیمیاوی اور میکانکی ترکیب اور حرکات کا ایک خاصہ ہے، جیسا کہ عناصر مائی کی ترکیب کا خاصہ سیلان اور ذرات آہنی کے التصاق کا خاصہ صلابت تو اس کو مادیت اپنی آخری فتح جانتی ہے۔ سائنس کی رہنمائی میں یہ ہفتخواں بھی بڑی حد تک طے ہو چکا ہے۔ عضوی علم کیمیا کی تحقیقات اور خوردبینی مشاہدات نے ہم کو نہ صرف اوس نقطہ تک پہنچا دیا ہے، جو ہکسلے کے لفظوں میں مادی اساس حیات (پروٹوپلازم) کے لقب کا بجا طور سے مستحق ہے

بلکہ اس کے ایک ایک عناصر ترکیبی ٹھیک ٹھیک اوسی صحت سے دریافت ہو چکے ہیں جیسے پانی ہوا وغیرہ کے جس طرح آکسیجن و ہیڈروجن کے ملنے سے پانی بنتا ہے نیٹروجن و ہیڈروجن کے امتزاج سے نوشادر (امونیا) اور کاربن و آکسیجن جب باہم ملتے ہیں تو کاربونک آیسڈ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ مرکبات ثلثہ جب خاص خاص مقادیر و حالات میں باہم ترکیب پاتے ہیں تو پروٹوپلازم کا مرکب در مرکب وجود میں آتا ہے، جس میں تمام لوازم حیات پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس مادی اساس حیات کے کیمیاوی اجزا کے ٹھیک ٹھیک اوزان تک دریافت ہو چکے ہیں مثلاً کاربن ۵۵ ء ۲ ۵ فی صدی ہوتا ہے اور آکسیجن ۲۳ ء ۲۱ فی صدی وکذالک الی الآخر۔ یہاں تک کہ علم الحیات کے حلقوں میں یہ امید باندھی جا چکی ہے کہ وہ دن بھی آکر رہے گا جب لیبوریٹری میں زندگی اپنے عناصر کیمیاوی کی تالیف سے اسی طرح تیار کی جا سکے گی جس طرح آج پانی وغیرہ بنایا جاتا ہے (دیکھو ہکسلے کا مضمون فزیکل بیس آف لائف)۔

ان تمام باتوں پر بھی یہ کھٹک دل سے نہیں نکلتی۔ یہ مانا کہ زندگی کے عناصر ترکیبی اسی طرح معلوم ہو گئے ہیں جس طرح کہ پانی اور ہوا کے، اور یہ بھی قبول ہے، کہ ان عناصر سے زندگی ایسے ہی خلق کی جا سکتی ہے، جیسے عناصر مائی کی ترکیب سے پانی، لیکن پھر بھی کسی طرح یہ بات عقل میں نہیں سماتی، کہ قطعاً بیجان اور بے حس عناصر یا ذرات مادی کے اجتماع سے حیات و احساسات کی کل متضاد صفتیں کیسے پیدا ہو جاتی ہیں! ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ کیا یہ ایسا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی یہ کہے، کہ دو اور دو مل کر پانچ بن جاتے ہیں؟ یہ کھٹک بالکل بجا ہے اور مادیت کا کوئی دعوی دار اس گرہ کو نہیں کھول سکتا ہے۔ یہاں حکمت و فلسفہ سب کا جواب لا ادری ہے مگر یہ وہ معمہ ہے، جس کی تخصیص خالی حیات و احساسات کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ عضوی اور غیر عضوی ساری مخلوقات کے صفات و خواص اور سلسلہ علت و معلول کا ہر ذرہ مابعد الطبیعات کے اسی لاینحل عقدہ سے بندھا ہے۔

آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسی مادے یا ہوائیں ہیں، اب تم تبلاؤ کہ ان دو ہواؤں کے

ملنے سے پانی کیسے بن جاتا ہے، جس کے افعال و خواص اپنے اجزائے ترکیبی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کیا قیاس یہ نہیں چاہتا کہ دو ہوائیں مل کر تیسری ہوا ہی بننا چاہئے؟ فرض کرو آکسیجن اور ہائڈروجن کے ملنے سے پارہ بنتا ہوتا، تو کیا پھر تم کسی مخصوص علاقہ یا مناسبت کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتے تھے، کہ نہیں ان کی ترکیب سے تو پانی ہی بننا چاہئے؟ کہربا کو تاریکی میں اون پر رگڑنے سے بجلی پیدا ہوتی ہے، چقماق اور فولاد کے تصادم یا رگڑ سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں، اب مابعد الطبیعات کے نقطۂ نظر سے دیکھو کہ بجلی اور چنگاریوں کو دو جسموں کی رگڑ سے کیا مناسبت ہے؟ بجز اس کے، کہ ہم ہمیشہ ایسا ہوتے دیکھتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں، کہ ایک دوسرے کا خاصہ یا معلول ہے۔ مادیت کا بھی اس سے زیادہ کچھ اور مطالبہ نہیں ہے، کہ جس طرح پانی کے اجزائے ترکیبی کا خاصہ سیلان ہے، اور کہربا اور اون کی رگڑ کا معلول بجلی ہے، اسی طرح پانی، نوشادر اور کاربونک ایسڈ کی ترکیب کا خاصہ معلول حیات و احساس ہے۔

باقی اگر تمہاری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یکسر بے جان مادہ کی ترکیب سے کیسے حس و حیات پیدا ہو سکتی ہے تو اپنے سمجھانے کے لئے تمام ذرات مادی (سالمات) کو زندہ اور ذی احساس مان لو جیسا کہ بعض حکماء اور فلاسفہ کہتے بھی ہیں۔ یا اگر کسی کی تسکین اس سے ہوتی ہے، کہ جس وقت پانی نوشادر اور کاربونک ایسڈ باہم ملتے ہیں عین اسی وقت ایک فوق الفطرت ہستی (خدا) ان اجسام ثلثہ کے مجموعہ کے اندر ایک غیر جسمی مبدء حس و حیات اسی طرح داخل کر دیتی ہے، جیسے پنجرے میں چڑیا تو وہ یہی مانے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ جو کچھ ذہنی افعال و خواص کے لئے قبول کرو گے۔ وہی تم کو غیر ذہنی افعال و حوادث کے لئے بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر عناصر حیات کے اجتماع کے وقت، زندگی اور احساس خدا اپنی طرف سے ڈال دیتا ہے، تو اجزاء مائی کی یکجائی کے وقت سیلان، اور کہربا کے رگڑ کے وقت بجلی بھی خدا اپنے طرف سے خلق کر دیتا ہے غرض یہ ہے، کہ کائنات کے کسی ذرہ میں جب کوئی تغیر ہوتا یا کوئی معلول و خاصہ ظاہر ہوتا ہے، تو خدا کا ہاتھ پردے کے پیچھے سے کارفرما ہوتا ہے متکلمین کا ایک بڑا گروہ (اشاعرہ) اور بعض فلاسفہ

اسی کے قائل ہیں، مادیین کا مدعا بڑی حد تک اس میں بھی حاصل ہے، اس لئے کہ ان کے دعاوی کا نچوڑ یہی ہے، کہ عقل و حیات کے واقعات و حوادث کو کائنات کے غیر عضوی حوادث سے الگ اور مافوق نہ قرار دیا جائے۔ جو ایک کے لئے مانا جاتا ہے، وہی دوسرے کے لئے بھی مانا جائے۔

ان چند صفحات سے امید ہے کہ مادیت کا مفہوم و مدعا اور اس کے دلائل کی نوعیت اچھی طرح ذہن نشین ہو گئی ہوگی۔ آخر میں اب ہم بس ایک مختصر یکجائی اعادہ پر قناعت کرتے ہیں۔

مادہ اور قوت (انرجی) دو چیزیں قدیم اور غیر فانی ہیں، ایک کا دوسرے سے انفکاک ناممکن ہے، نہ مادہ بے قوت کے پایا جا سکتا ہے، نہ قوت بے مادہ کے۔ جس طرح مادہ کبھی مطلقاً نیست نہیں ہوتا بلکہ صرف صورت بدلتی رہتی ہے، اسی طرح قوت بھی کبھی معدوم محض نہیں ہوتی۔ بلکہ پنہاں یا آشکارا کسی نہ کسی حال میں موجود رہتی ہے۔ حرکت، حرارت مقناطیس وغیرہ کی مختلف قوتیں ایک دوسرے میں منقلب ہوتی رہتی ہیں۔ لوہے یا پتھر کے دو ٹکڑے باہم تھوڑی دیر تک رگڑو۔ اور پھر ان کو چھوؤ تو گرمی محسوس ہوگی، تم سمجھتے ہو کہ رگڑ کی حرکت فنا ہو گئی، نہیں، بلکہ وہ ایک دوسری قوت یعنے حرارت میں تبدیل ہو گئی ہے ریل کے انجن میں جو کوئلہ جلتا ہے، جب وہ بجھ جاتا ہے، تو تم خیال کرتے ہوگے کہ اس کی پیدا کی ہوئی آگ یا گرمی فنا ہو گئی۔ یہ نہیں ہوا، بلکہ وہی گرمی ہے، جو اسٹیم وغیرہ کے مدارج طے کرنے کے بعد ریل کی حرکت بن جاتی ہے، اور تم کو گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اجرام سماوی سے لے کر سمندر کی تہ تک جو کچھ ہے یا ہوتا ہے، مادیت کی رو سے سب اسی ازلی اور عدیم الفنا مادہ اور قوت کی نیرنگیوں کا تماشا ہے۔ ارضی و سماوی عضوی اور غیر عضوی ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ اور تمام حوادث بلا استثنا رمادہ ہی کے ناقابل تقسیم ذرات مع قوت کے باہمی اجتماع اور تعامل یا فعل و انفعال کے معلول ہیں حیات

حس و حرکت اور فکر و شعور تک جن کا منشا، لوگ ایک غیر مادی جوہر کو جانتے ہیں، اسی طرح مادہ کی قوت کے مختلف مظاہر ہیں، جس طرح حرکت، حرارت، بجلی، مقناطیس، روشنی وغیرہ جو قوت پتھر کو زمین پر گراتی ہے، سمندر کی موجوں کو چاند کی طرف کھینچتی ہے، سیارات کو چکر میں اور ثوابت کو ساکن رکھتی ہے، وہی پروٹوپلازم میں حیات، خون میں گردش، جگر میں مولد صفرہ، زبان میں ذائقہ شناس، دل میں حرکت، اور دماغ کے بھورے مادہ میں فکر و شعور ہے
یہ ہے مادیت کی حقیقت اور اس کا بے جھجک ادعا۔

لیکن اس ادعا کی ساری عمارت جس اساس (وجود مادہ) پر قائم ہے، خود اس کی ماہیت معلوم کرنے کے بعد مادیت کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ ع

خواب تھا، جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

عبدالباری

کلام غالب (اردو) کی شرحیں

اپریل سنہ ۲۲ء کے رسالۂ اردو میں دیوان غالب کی شرحوں پر مولوی سید ہاشمی صاحب کی تنقید دیکھ کر ہیجمداں کو میدان تنقید میں ایک نئے پہلوان کی آمد نظر آئی، مشتاق ہو کر شریک نظارگیاں ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی طمطراق کو بھی نقاد صاحب نے شرحوں میں شامل کر لیا ہے۔ اس سبب سے کہ "منتخب اشعار کے نکات و معانی کو انھوں نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے" اس فقرہ کو دیکھ کر خواہ مخواہ ان نکات و معانی کا اشتیاق پیدا ہوا، مگر نقاد صاحب نے تشنہ ہی رکھا ایک نکتہ بھی نہ بیان کیا کہ ڈاکٹر بجنوری کی نکتہ سنجی سے نقاد صاحب کی طرح اور لوگ بھی محظوظ ہوتے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ زبان اردو کے اہل ادب جو اس عہد حاضر میں موجود ہیں سب نے اس مضمون کا رسالۂ اردو میں شائع ہونا حیرت کی نظر سے دیکھا۔ سارا مضمون لایعنی و لغو ثابت ہوا جیسے ایک برچھیت انیاں بتا تا، قرولیاں کرتا، پیترے بدلتا، تماشائیوں کے سامنے سے گذرا اور ہار جیت کے عین مقام پر گھوڑے سے گر پڑا۔ کیا رسالۂ اردو ایسے ہی تماشہ دکھانے کے لئے شائع ہوا ہے، جس کو نفس حقیقت سے کچھ بحث ہی نہیں ہے۔

غرض جس طرح بجنوری صاحب ایک نمود بے بود دکھا کر رہ گئے اسی طرح ان کے ستائشگر ہاشمی صاحب بھی برق خلب کی طرح چمکے تو سہی مگر لوگ تشنہ کے تشنہ رہے۔ یادگار غالب پر تنقید کرنے میں سید ہاشمی صاحب کا یہ فقرہ صفحہ اردو (۲۵۰) میں میری نظر سے گذرا "اسی قسم کے ذومعنی اشعار کی چند اور مثالیں تحریر کرنے کے بعد مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں...... " یہاں نقاد نے ذومعنی کو دومعنی والا شعر سمجھا ہے۔ جس طرح جہلا کا خیال ہے کہ عربی میں ذومعنی اس بات کو کہتے ہیں، جس کے دو معنی نکلیں یعنی ذو کے معنی دو کے ہیں جیسے کھیرا ککڑی کے بیج، یعنی تخم خیارین کے معنی جہلا یوں سمجھتے ہیں کہ خیا کھیرا ریْن ککڑی، مولوی

ہاشمی صاحب نے غالب کے جن اشعار کو ذو معنی کہا ہے یہ وہی اشعار ہیں جن کے دو دو معنی مولوی حالی صاحب نے بیان کئے ہیں یعنی

ع دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔

ع ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

عبرت کا مقام یہ ہے کہ اس تحقیق پر علما کے مقابلہ میں قلم اٹھایا جاتا ہے خصوصاً مولوی حالی صاحب کے بتائے ہوئے معنوں میں گفتگو کی گنجائش نکالی جاتی ہے جو برسوں غالب کی صحبت میں فیض یاب رہے۔ اس نئی کھیپ کے چھٹ بھیوں کی درازدستی دیکھئے کہ صفحہ اردو (۲۵۳) میں مولوی حالی صاحب کے بتائے ہوئے معنی لکھ کر نقاد صاحب فرماتے ہیں" راقم الحروف کے نزدیک ان معنی میں سب سے اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا درحقیقت مرزا غالب نے یہاں فلسفۂ رواقیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ خود ہستی کا مقتضی اور لازمہ فنا یا نیستی ہے" اب مولوی حالی صاحب کی طرف سے یہ ہیچمداں جواب دینے کو موجود ہے کہ جو شخص ذو کو دو کے معنی پر سمجھے وہ فلسفۂ رواقیہ و اشراقیہ کو خاک سمجھے گا۔ فلاسفہ کا عقیدہ تو یہ ہے کہ ہست کبھی نیست نہیں ہوسکتا اور نیست کسی طرح ہست نہیں ہوسکتا، یہ آپ سنی سنائی بے سمجھے اڑائی ہے (ہستی کا مقتضی نیستی ہے) آپ سے یہ بات پوچھنا بھی تضیع اوقات ہے آپ کیا سمجھیں گے، کہ مطلق ہستی کا مقتضی مطلق نیستی ہے یا کچھ واجب و ممکن کی بھی قید ہے، یہ مصرع کہ

"انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں"

مولوی حالی صاحب کے معنی کی تصدیق کر رہا ہے کہ "تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے" یعنی عشق میں فنا ہوجانا ہستی کی رونق ہے۔ یہ فنا ہونا تو عین ہستی ہے اس کو فلسفہ سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو صوفیہ کرام کا مسلک ہے، اس کو مطلق نیستی کہہ دینے سے معلوم ہوا کہ فلسفہ و تصوف دونوں بوجہ اتم نقاد صاحب کو حاصل ہیں۔ آپ خود ذو معنی ہیں ماشاء اللہ۔

مولوی حالی صاحب غالب کے اس شعر میں ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

لکھتے ہیں کہ "اپنے تئیں خس اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے"۔

جناب ہاشمی صاحب صفحہ (۲۵۳) کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہے، شاعر کا اصلی مطلب یہ ہے کہ دیس اور پردیس کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر نہ ہو سکے۔ اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا جیسا گھانس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض کوڑا ہے"۔ یہاں جناب نے کوڑے کے لئے بھٹی لکھی ہے، زباں دانی کی خوب داد دی ہے۔ دوسرے مال مسروقہ پر یہ دعویٰ کرنا کہ راقم الحروف کا کلام ہے بڑے شرم کی بات ہے۔

مولوی حالی صاحب پر صفحہ (۲۵۴) میں آپ نے یہ بھی چوٹ کی ہے کہ "اکثر وہی اشعار چھوڑ دئے گئے ہیں جو زیادہ پیچیدہ وادق اور زیادہ شرح طلب تھے"، نقاد صاحب کے اس غتربود پر حیرت ہوتی ہے خود ہی تو یادگار غالب کو شروح میں شمار کر لیا ہے، یہ محض بیجا حرکت ہے، حالی صاحب نے سوانح عمری غالب کی لکھی ہے، اس کے ضمن میں ان کے کلام کے خصوصیات کا ذکر ضرور تھا، جن اشعار میں وہ خصوصیات پائے جاتے ہیں، انھیں کو انتخاب کر لیا ہے، تمام اشعار کو توجہ کے قابل وہ کب سمجھتے تھے، خود ہاشمی صاحب اسی صفحہ میں گواہی دیتے ہیں کہ "مرزا غالب کے شاگرد اور مداح ہونے کے باوجود مولوی حالی صاحب مرحوم اس رائے کے اثر سے محفوظ نہ تھے، جو مرزا کے اردو کلام کے متعلق ان کے اکثر ہمعصروں نے قائم کر رکھی تھی، ہمارے خیال میں یہ رائے کسی محکم و واضح اصول پر مبنی نہ تھی"۔ آپ کا خیال حالی و غالب کی رائے پر تفوق رکھتا ہو۔ اس کو رسالۂ اردو کے ناظرین شاید مان جائیں ورنہ ہم تو اپنے منہ میاں مٹھو سمجھتے ہیں۔ غالب نے کیا خود اپنے دیوان کے صدہا شعر نہیں کاٹ دئے جس کے بارہ میں حالی لکھتے ہیں کہ "اس انتخاب کے وقت بہت سے اشعار، جو فی الواقع نظر کرنے کے قابل تھے، ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا"۔ غرض جن اشعار کو غالب نے خود

کاٹ دیا یا جن کو حالی فی الواقع نظری کرنے کے قابل سمجھتے تھے، لیکن ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا، آپ کے خیال میں وہ سب فلسفیانہ خیالات و جذبات صادقہ پر مشتمل ہیں جن کی تمیز نہ غالب کو تھی نہ حالی کو، یا آپ حق تنقید ادا کر رہے ہیں، یا ناظرین رسالہ کو بہکا رہے ہیں، اس موقع پر آپ کا فرض تھا کہ یادگار غالب میں چند اشعار حالی نے ایسے بھی لکھے ہیں، جو مرزا نے کاٹ دئے تھے، ان میں سے بعض اشعار کے خیالات عالیہ ناظرین کے سامنے پیش کریں ورنہ یہ سب دعویٰ بے دلیل، ڈاکٹر بجنوری کی طمطراق سے کم نہیں، اور جو شخص شرح غالب پر تنقید کرنے بیٹھا ہے، اس کے لئے قابل شرم ہے کیا زبانی جمع و خرچ و لاف و گزاف سے دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے؟

یادگار غالب کے بعد وثوق صراحت کی تنقید ہوتی ہے، اس میں نقاد صاحب سے چند مقامات نقل کر دینے کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ ایک ضروری بات، جس سے نقاد کو نہ چوکنا چاہئے یہ تھی کہ جن مقاموں میں شارح نے غالب کے کلام میں تصرف کر دیا ہے اس کی گرفت کرنا واجب تھا۔ مثلاً غالب کا مصرع۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

وثوق صراحت میں اس طرح منقول ہے۔ ع

تیوری جو ہے چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

اتنا بھی آپ سے نہ ہو سکا تو تنقید و محاکمہ کس برتے پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد ناظرین رسالۂ اردو کو انتظار بلکہ حد کا اشتیاق تھا کہ سید ہاشمی صاحب اب مولانا شوکت میرٹھی کی شرح کی طرف متوجہ ہوں گے، اس لئے کہ انھوں نے جابجا غالب کے کلام میں اصلاح کی ہے۔ جس کا کچھ حال روزنامہ ہمدم میں، جو لکھنؤ سے جالب شاگرد غالب نکالا کرتے ہیں، کئی سال پیشتر چھپ چکا ہے، اور شاگرد نے استاد کے کلام سے ان کے تصرفات دفع کرنے کی ایسی سعی بلیغ کی کہ اس دن سے مولانا شوکت کی زبان بند ہو گئی، جیسے دزد کی جیب سے مال مسروقہ نکل آیا اور وہ حیران ہو کر رہ گیا۔ نقاد صاحب نے اپنے مضمون کی تمہید میں

جن شرحوں کے نام گنوائے ہیں، اس کے اعتبار سے اب اسی شرح کا نمبر تھا، اس میں شارح نے غالب پر اعتراض بھی بہت کئے ہیں، مگر ہاشمی صاحب صاف اس کا ذکر اڑا ہی گئے گویا ان کے تصرفات واعتراضات کو بجا سمجھے مثلاً غالب کے اس مصرع پر۔ ع

موج مئے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

شارح میرٹھی نے یہ اصلاح دی کہ۔ ع

موج مئے کی رگ بط مینا کی گردن میں نہیں

اور لکھتے ہیں کہ " اس اصلاح کی خوبی نکتہ سنجان تجدید ہی سمجھیں گے۔ جو لوگ غالب کو معلوم سمجھتے ہیں یا تعصب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کا کانشنس ان کو ضرور سمجھا دے گا مگر وہ اقرار نہ کریں گے۔ غالب کے مصرع میں (آج) کا لفظ حشو تھا۔ اس کے نکل جانے سے کیسی لطافت پیدا ہو گئی " یہ تو کھلا کھلا اعتراض و صلاح ہے لیکن جہاں حضرت شوکت نے چپکے سے لفظ بدل کر شعر کو کچھ معنے پہنا دئے ہیں۔ اس کی نگرانی تو آپ پر حتماً واجب تھی کہ آپ موجودہ شرحوں پر تبصرہ لکھنے بیٹھے ہیں۔ غرض اس شرح کا تبصرہ نہ کرنا اور اس شرح کو گنتی میں بھول جانا آپ کے مافی الضمیر کی پردہ دری کرتا ہے۔ کاش آپ اتنا ہی لکھ دیتے کہ جب سے حضرت جالب نے مولانا شوکت کے تصرفات کو فاش کر دیا، ان کی شرح بھی وثوق صراحت کی طرح اعتبار سے ساقط ہو گئی، اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے تو مرزا کے کلام کو ستیاناس کر دیا۔ ذو معنی کے علاوہ اس میدان تنقید میں آپ کی زبان سے وضاحت اور وقیع کا لفظ بھی جاہلوں کا تراشا ہوا نکلا، مگر یاد رکھیئے جیسے مکان متوعہ چوک، اور جائداد متفروقہ (فرق شدہ) اور زمین معنوتہ (عنایت کی ہوئی) مضحکہ خیز الفاظ ہیں ویسے ہی وضاحت و وقیع بھی ہیں۔

سید نوازش علی لمعہ

ترقی کی خواہش ایک فطرتی خواہش ہے ہر انسان اپنے اپنے نقطۂ خیال کے تحت ہر وقت ترقی کا خواہاں رہتا ہے۔ قناعت اور موجودہ حالت پر صابر رہنے کی تحریک بھی ایک اچھی اور مفید تحریک ہے کیونکہ اس سے انسان کی مختلف قوتیں اور جذبات اپنی حدود میں قایم اور ثابت رہ کر اپنی استقامت اور برجستگی کا عملی رنگ میں ثبوت دیتے ہیں اور انسان اپنے اس عمل اور استقامت سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باوجود ترقی کی خواہش کے فطری ہونے کے بھی جائز حدود میں رہ کر جائز قیود کی پابندی کر سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان ترقی کا خواہشمند نہیں رہتا اور اس کی فطرت میں یہ خیال اور یہ جذبہ ودیعت نہیں کیا گیا تو یہ بات صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ انسان اپنی فطرت کی اس واجبی خواہش کو دور نہیں کر سکتا اور نہ اس سے اعراض کر سکتا ہے۔

قناعت اور صبر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انسان واجبی اور جائز ترقیات کی خواہشات سے دست بردار ہو جائے اور اپنے فطرتی جذبات کا اس صورت میں خاتمہ کر دے، قناعت، رضا اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ موجودہ حالت پر صابر اور شاکر رہ کر انسان ان جائز منازل اور جائز شوارع کی تلاش میں لگا رہے جو ناجوازی کی حدود سے دور رہ کر پا سکتا ہو۔

یہ دنیا اور جو کچھ اس میں مہیا کیا گیا ہے اس کا بہت سا حصہ انسان ہی کی خاطر مہیا کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سامان سے صرف انسان ہی کام لیتا یا لے سکتا ہے کوئی دوسری ہستی انسان کے مقابلہ میں اس سامان سے کام نہیں لیتی اور نہ لے سکتی ہے۔

انسان کو خدا نے متمدن الطبع بنایا ہے جو ہستی متمدن الطبع ہوگی لزوماً اس کی فطرت خواہاں ترقی اور عروج رہتی ہے کیونکہ تمدن یا حسن تمدن نام ہی ترقی اور عروج کا ہے دوسرے

الفاظ میں تہذیب کیا ہے؟ وہی ترقی اور عروج۔ اگر یہ مواد خواہش ترقی اور عروج انسان کا
ایک فطرتی خاصہ نہ ہوتا تو اس وقت یا گذشتہ زمانوں میں جو اس کائنات کو عروج اور رونق رہی ہے
وہ نام کو بھی نہ ہوتی۔ ہر شخص اور ہر متنفس خواہان ترقی رہ کر یہ تحریک قومی رنگ میں بھی کرتا ہے
ہر قوم یقیناً خواہان ترقی رہتی ہے، یا اس کا یہ فرض اولین ہے کہ ترقی کی تلاش میں رہے،
جس طرح شخصیتوں کی جداگانہ فطرت ہوتی ہے، اسی طرح قومیں بھی اپنی اپنی جگہ ہر جداگانہ فطرت
رکھتی ہیں۔

ہر قوم یا ہر قومیت کے واسطے ایک کرہ ہوتا ہے جیسے کہ ہر شخصیت کے لئے بجائے خود ایک شخص کرہ ہوتا ہے،
قومی ترقی اسی صورت میں موزوں اور مفید ثابت ہوتی ہے جب اپنے قومی کرہ کے اندر رہ کر ہو مچھلی کا کرہ پانی،
اور ہرن کا کرہ خشکی جنگل و بیابان، اگر مچھلی جنگل اور بیابان میں رہ کر زندہ رہنا چاہے تو مشکل اور اگر آہو
سمندر اور دریا میں رہے تو نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ تہذیب اصولاً ایک ہی مرکز رکھتی ہے لیکن پھر
بھی ہر قوم اور ہر قومیت کا کرۂ تہذیب کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتا ہے سرما بھی ایک موسم ہے
اور گرما بھی، لیکن دونو کے مقتضیات میں گونہ فرق ہے، اگر کوئی شخص سرما کے کپڑے گرما میں
استعمال کرے تو وہ ایک تکلیف دہ راستہ لیتا ہے۔

ترقی کی دو موٹی قسمیں ہیں:۔

(الف) علمی ترقی۔

(ب) عملی ترقی۔

ان دونو کا آپس میں واسطہ اور تعلق ہے اور دونو میں ایک نسبت ہے کوئی شخصیت
اور کوئی قومیت اور قوم اس وقت تک عروج و ترقی نہیں پا سکتی جب تک وہ صحیح رنگ میں
علمی مواد کی وارث تسلیم نہ کی جائے۔ علم اور علمی ترقی کا صرف یہی مطلب نہیں کہ لوگ کالجوں سے
ڈگریاں پا کر نکلیں یا ان کے ناموں کے ساتھ دُم چھلے بھی لگے ہوں۔ علم اور علمی ترقیات سے
مراد قومی نقطۂ خیال کے تحت ان ضروریات سے آگاہ ہونا اور ان باتوں کا جاننا ہے جو

ایک شخصیت اور قوم کے واسطے ذریعۂ ترقی اور موجب حفظ ہو سکتے ہوں۔ ان میں سے بڑھ چڑھ کر سیرت اور کیرکٹر کی صحت اور مضبوطی ہے جو علم اور جو معلومات انسان کے کیرکٹر کو صحیح اور مضبوط نہیں بنا سکتے وہ علم اور وہ معلومات محض کھیل اور سراب ہیں۔ جیسا ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوم کا علم وافی اور معلومات قیمتی ہیں تو ہمیشہ اس کا مطلب یہی نہیں ہوا کرتا کہ وہ قوم یا اس قوم کی اکثر شخصیتیں بہت سی علمی معلومات رکھتی ہیں، بلکہ یہ بھی کہ اس قوم اور اس قوم کی شخصیتوں کا کیرکٹر اور سیرت استوار اور مضبوط ہے۔ ترقی کی دوسری قسم عملی ہے اس کا جزو اعظم بھی حسن سیرت اور حسن کیرکٹر ہی ہے۔ بیشک علمی عملیات میں اور بھی بہت سی باتیں شامل ہیں اور وہ بھی لازمی ہیں، جیسے عمل سائنس، عمل تجارت، عمل زراعت، عمل تصنیف و تالیف، عمل ادبیات، عمل فصاحت و بلاغت، عمل سیاست، اور عمل معیشت وغیرہ وغیرہ لیکن ان سب عملیات کی قیمت صحیح اس صورت میں پڑ سکتی ہے کہ ان کے ساتھ حسن سیرت بھی ہو۔ دوسری سب باتیں اور ترقیات دراصل ایک کسب اور ایک مشغلہ ہیں، سیرت اور کیرکٹر ہی ایک ایسا عمل ہے کہ جس سے تمام دوسری فضیلتیں کوئی قیمت پا سکتی ہیں۔

جو قوم اور جو شخصیت سیرت اور کیرکٹر میں ترقی کرتی ہے وہ رفتہ رفتہ دیگر سب باتوں اور سب شعبوں میں بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ باوجود حسن سیرت کے بھی بعض دوسری باتوں میں کوئی شخصیت یا کوئی قوم پچھڑی ہے تو اس میں صرف ایک رسمی نقص ہے جو پورا ہو سکتا ہے، لیکن اگر باوجود سب قسم کی علمی اور دیگر عملی ترقیات کے سیرت میں حسن، مضبوطی، وجاہت اور کیرکٹر میں نفاست اور استقامت نہیں ہے تو انسان انسانیت کے پائے سے گرا ہوا رہے گا، کیونکہ انسان کی انسانیت کا جوہر اصلی حسن سیرت ہی ہے، دیگر ترقیات دراصل نشانات اور علامات ہیں، اصلی ترقی سیرت ہی کی ترقی اور استواری متصور ہو سکتی ہے۔

ہمارا یہ منشا نہیں کہ دوسری ترقیات علمی اور عملی سے لوگ مجتنب اور غافل رہیں اور ادھر

توجہ نہ کریں یا دوسری قسم کی ترقیات ترقیات نہیں ہیں، بلکہ منشا یہ ہے کہ دوسری قسم کی ترقیات سیرت کی مضبوطی اور حسن کے بغیر ایک تماشا اور کھیل ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ اس وقت وہی قومیں اور وہی شخصیتیں ترقی یاب ہیں، جو سیرت اور کیرکٹر میں نامور اور مضبوط ہیں جن کی سیرت درست اور مضبوط ہے وہی علمی دوڑ میں بھی بازی لیجاتی ہیں اور انھیں کے سر پر اس بازی کا سہرا بندھتا ہے۔

علمی ترقیات اور علمی عروج کی غرض و غایت کیا ہے؟ اور اخیر پر انسان کن باتوں اور کن امور پر نظر کیا کرتا ہے؟ سیرت اور کیرکٹر پر۔ جب یہ صفات معدوم ہوتی ہیں تو دیگر سب باتیں ہیچ معلوم دیتی ہیں۔ وہی تعلیم اور وہی علمی زندگی احسن اور خوب ہے کہ جس میں خوبی سیرت کا ثبوت مل سکے۔

یورپ کی ترقیات کے سامنے ہم ہر وقت سر جھکاتے اور عش عش کرتے ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں کہ یورپ کی نسلیں اس وقت اکثر مادی امور میں ترقی یافتہ ہیں لیکن اس کی وجہ بھی وہی حسن سیرت اور استواری سیرت ہے، یورپ کی علمی مجالس اور علمی محافل کیوں دن بہ دن ترقی یاب ہیں؟ کیوں ان کی استواری قابل رشک ہے؟ کیوں یورپ کے رسائل اور اخبارات اور سلسلہ تصانیف و تالیف ایک بڑی حد تک چلتا رہتا ہے؟ اور کیوں لوگ جوق جوق اس طرف گرتے جاتے ہیں؟ اس واسطے کہ وہاں کی علمی جماعتوں کے خیالات حسن سیرت کے تحت ایک استقامت رکھتے ہیں، اور لوگ حسن سیرت کے تحت ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں کیوں یورپ میں قومیت کی بنیاد دن بدن مضبوط ہوتی جاتی ہے کیوں وہاں کی قومیت کھوکھلی اور بودی نہیں ہے؟ اس لئے کہ اس میں حسن سیرت کا زور اور غلبہ ہوتا ہے؛ وہاں کی نسلیں کالجوں اور اسکولوں میں تعلیم پاکر سیرت مضبوط بناتی ہیں اور لوگ حسن سیرت کے شیدائی ہوتے ہیں۔ جن اقوام میں پڑھنے اور علم سے مراد صرف ڈگریات لینا اور چند معلومات کا اضافہ ہی ہے۔ ان کی نگاہوں میں سیرت کا حسن اور کیرکٹر کی استواری کوئی حسن اور رو جاہت

نہیں رکھتی۔

ہر قسم کی ترقی کے واسطے سب سے اول نصب العین کی ضرورت ہے۔ جب تک ہمارے ذہن میں کوئی نصب العین نہ ہو تب تک ہم ترقی کے زینے کیونکر آسانی سے طے کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنا لازمی ہے کہ ہمیں کن کن امور میں درحقیقت ترقی کی ضرورت ہے اور کہاں تک ہم تعرج کی گھاٹیاں طے کرسکتے ہیں خیالی علوم اور قیاسی فلسفہ بھی قوموں کی ترقی کے واسطے ایک اچھا مددگار ثابت ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جب تک اقتصادی مراحل طے نہ ہوں تب تک محض اجتہادات اور خیالات سے کیا کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

ترقی ہوسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب تک ترقی کے قدردان قوم میں پیدا نہ ہوں تب تک کچھ فائدہ نہیں۔ ترقی کی اور بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ ترقی جو صرف اپنی ذات پر ہی ختم ہوجاتی ہے جیسے زید کا علم پڑھ کر معلومات کا بڑھانا دوسرے یہ کہ ایسے معلومات سے بہ مختلف الصور کام لینا۔ اس دوسری صورت میں جب تک دوسرے لوگ ایسے شخص کی محنت کا قدردانی کی صورت میں صلہ نہ دیں اور قومی رنگ میں اس کی حمایت نہ کریں، تب تک ترقی کی رفتار تیز نہیں ہوسکتی۔ جس ملک میں فن اور علم، محنت اور اجتہاد و قیاس کی قدر نہیں ہوتی اور قیمت نہیں ڈالی جاتی، اس میں ترقیات کی بنیاد مضبوط نہیں ہوسکتی۔ **رسالہ ترقی** جو قومی نقطۂ خیال کے تحت جاری ہو رہا ہے۔ اسی صورت میں ترقی کرسکتا ہے کہ جب لوگ اور قوم اس کی ترقی اور اشاعت کی خواہاں ہو۔

ترقی کرنے سے پہلے سوچو کہ:۔

ہمیں کس قسم کی ترقی کی ضرورت ہے؟

ہمارے کرہ کے موافق کونسی ترقی ہے؟

ملک اور قوم میں ترقی اور ترقی کنندہ کی قدردانی لازمی ہے۔

ترقی کے ساتھ حسن سیرت بھی ہو۔

سیرت اور کیرکٹر کا مفہوم موٹے الفاظ میں کیا ہے؟ دھن کا پکا اور کھرا ہونا خواہ کیسی ہی دھن ہو۔ سیرت ہمیشہ اچھی ہی نہیں ہوتی، کیونکہ دھن بھی ایک ہی رنگ نہیں رکھتی، بری دھن بھی ایک سیرت ہے جو اس کا شیدائی ہے وہ بھی گویا ایک حسن سیرت رکھتا ہے اچھی سیرت اور اچھا کیرکٹر واقعی ایک حسن اور خوبی ہے اور بری سیرت ایک برائی لیکن باعتبار استقامت اور پختگی دھن ایک سیرت سیہ کی صورت میں بھی وضعداری رکھے جانا ایک حسن سیرت ہے۔ جو شخص برائی میں بھی ایک استقامت رکھتا ہے مضرات اور برائیوں میں بھی اپنی دھن کا پکا ہے وہ اس وجہ سے قابل تعریف ہے گو اخلاقی رنگ میں اس پر حرف گیری کی جا سکتی ہو۔ زید اگر کسی کمزوری میں بھی دھن کا پکا اور سیرت کا مستقیم ہے تو اچھائی اور نیکی میں اس کی دھن اور اس کی سیرت اور بھی قابل ستائش ہوگی، اور یہ کہا جائے گا کہ جو ہستی ایک نقص کی صورت میں اس قدر راست گو اور پختہ کار ہے وہ ایک اچھائی اور نیکی کی صورت میں کیسی پختہ اور صداقت پسند نہ ہوگی۔

بہر حال وہی لوگ ترقی پاتے اور ترقی یاب ہوتے ہیں۔ جو دھن کے پکے اور سیرت کے مضبوط ہیں۔ ہر ایک قسم کی ترقی حسن سیرت اور استواری سیرت ہی کے تحت انصرام پا سکتی ہے۔ دھن کی پختگی حسن سیرت اور استقامت سیرت اخلاق کا شروع اور خوبیوں کا دیباچہ ہے۔

سلطان احمد

حیات تمدن

عہد سلف ۔ نظام آصفی

تمہید

کل میسر لما خلق لہ ۔ روح ترقی[1] کے مبارک سراپا حقیقت خواب کا جس نے بالآخر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تعبیری صورت اختیار کی ایک جز نظام آصفی بھی تھا۔ بیداری کے لئے جس چیز کی ملک کو ضرورت ہے وہ اس کی تاریخ ہے۔ زندہ قومیں اپنی قومیت کی بقا کا انحصار اسی پر سمجھتی ہیں کہ اپنی تاریخ بچہ کی گھٹی میں داخل ہو، قوم کا بچہ آنکھ کھول کر تاریخی سبق لئے بڑا ہو کر اپنے کاموں کی بنیاد رجال قوم کے نقش قدم پر رکھے اور مرنے کے بعد اسی سلسلہ فہرست میں اس کا نام داخل ہو۔ تاریخ ہی وہ تمام قوم کی زندگی کا محور ہو، جس پر ملک کی عزت مبنی ہے، ہمارے خواب غفلت کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے نصاب میں یہ تو داخل ہے کہ انگلستان نے خود میگنا چارٹا حاصل کیا اور تاج برطانیہ کے سایہ میں ہندوستان نے دستور کی شکل دیکھی، لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں کہ حضرت آصف جاہ نے رعایائے آصفیہ کو کیسا مبارک دستور مرحمت فرمایا، جس کے شکرانہ میں رعایائے آصفیہ کو تا ابد رطب اللسان رہنا چاہئے۔ یہ مبارک نام ایسا ہے کہ ہر بچہ کی زبان پر عقیدت و ارادت کے ساتھ آنا چاہئے۔ اسی افسوسناک نقص کے دور کرنے کے لئے یہ کتاب تیار کی گئی ہے اور اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اس مبارک سیر

---

[1] صاحب مضمون کی ایک تصنیف جس میں اس سوال کا کہ "حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا" جواب دیا گیا ہے۔

کی طرح اس کو بھی حسن قبول عطا ہو۔ یہ کتاب اور آئندہ ایسے تصانیف کے سلسلہ کا آغاز جس سے سلطنت کی عظمت اور خاندان شاہی کے ساتھ ارادت و عقیدت کا لازوال تاج ہر ایک نسل پیچھے آنے والی نسل کو اور زیادہ مرصع کر کے امانت پہنچاتی جائے۔ آمین۔

حضرت آصف جاہ کی لائف لکھتے ہوئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عہد اسلامی کے متعلق ایک تبصرہ قلمبند کیا جائے چنانچہ یہ حصہ اول اسی ضرورت سے مرتب کیا گیا ہے۔

حیات تمدن

حصہ اول

عہد سلف

غزوات نبی علیہ السلام

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ ایسے وقت میں جب کہ فاطر السموات والارض یا شاہد ہستی مطلق کا جمال جہاں آرا کسی قوم میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا، ایسے مقام میں جہاں ہر طرف پہاڑیوں کے جمے ہوئے قطار در قطار تودوں اور سخت زمین کے سوائے کوئی سرسبزی یا دل لبھانے والی چیز نظر نہیں آتی، امین قوم نور دو عالم حسن مجسم اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کی مبارک تعلیم آغاز کرتا ہے اور (۱۳) سال کی مسلسل کوشش کے بعد جب اس کا صلہ یہ دیکھتا ہے کہ قوم دنیا کو اس کے وجود سے خالی کرانا چاہتی ہے تو صدیوں کے آبائی وطن سے چھپے چھپے جدا ہوتا اور اسی خطہ کی ایک سرزمین میں جہاں کسی قدر سرسبزی بھی ہے ہجرت کرتا ہے۔ اب (۶۰۰) قابل جنگ مردم شماری ہو جاتی ہے، قوم بزور شمشیر اس آواز توحید کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ بدر صداقت (۳۱۳) جانبازان راہ توحید کی ضعیف جماعت میں یہی دعا کرتا ہے " اواللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج مار ڈالی گئی تو پھر کبھی زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی " محبت حق کی سرشار یہ چھوٹی جماعت

اپنے سے سہ چند دولت اور رسم پرستوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ ہر طرف مخالف جماعتیں جن میں یہ مہاجر گھرے ہوئے تھے ان کے خلاف اکساتے ہیں۔ دس ہزار مختلف اقوام و قبائل کا مجمع خود دار الہجرت کو گھیر لیتا ہے۔ منافق ہیں کہنے لگتے ہیں "پیغمبر کہتا ہے کہ میرا دین مشرق و مغرب میں پہنچے گا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ جائے ضرور کو بھی نہیں نکل سکتے"۔ پیغمبر عرب کے فدائی سلمان فارسی کے مشورہ کے مطابق خندق کھود کر حفاظت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور بالآخر مجمع باہمی نا اتفاقی سے خود ہی پریشان ہو جاتا ہے۔ اب ایک مختصری حکومت قایم ہو جاتی ہے جس میں آس پاس کی زمینیں شامل ہوتی ہیں، قریش صلح کرتے ہیں، سچائی کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے، قاصد کو مار ڈالنے کی وجہ سے شاہ غسان کے مقابلہ کے لئے تین ہزار کی جمعیت شام کی سرحد پر بھیجی جاتی ہے، یہ ایک حیرت انگیز نظارہ ہے کہ ایسی بے سروسامان جماعت ایک شاہی فوج کے سامنے صف آرا ہوتی ہے، جس میں قیصری قواعد داں باقاعدہ فوج کے دستے بھی شامل ہیں اور جس کی تعداد ایک لاکھ بیان کی گئی ہے۔

بالآخر ہجرت سے آٹھ سال کے بعد، قریش کی عہد شکنی کی وجہ سے امام طیبۃ و الحرم دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ وطن میں آتا ہے، اور بقول امیر علی یہ ایک بے مثل عجیب و غریب سماں ہے کہ ایسی بڑی فوج کے ایسے آباد اور دولت مند شہر میں داخلہ کے وقت صرف چند پیشقدمی کرنے والے معدودے چند بارہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس مارے جاتے ہیں، کوئی لوٹ مار مطلق نہیں ہوتی، نہ کسی قسم کے احتیاطی تدابیر اختیار کئے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان لیجاتی ہے، معدودے چند جو اپنے سابقہ جرائم کے لحاظ سے واجب القتل قرار دئے گئے تھے، ان میں سے بھی صرف چار اپنی کرتوت سے مارے گئے۔ قوم کا ستم اٹھایا ہوا سپہ سالار یہی حکم دیتا ہے، "جاؤ تم سب آزاد ہو"، فاتح مفتوح سب ایک ہو جاتے ہیں۔

اب ایک ۳۰ ہزار کی بھوکی پیاسی خستہ حال فوج کے ساتھ، سالار عرب رومیوں کی مدافعت کے لئے موسم گرما میں اس سنگلاخ سرزمین کو طے کرتا ہوا ارض مقدس کے قریب قریب

تبوک میں پہنچتا ہے، جہاں ہر طرف پانی ہے، قدرت کے حسن کی رنگ برنگی بہار ہے پہاڑ بھی ہیں تو رنگا رنگ، نظر فریب، سرسبزی ہے، بڑے بڑے آباد شہر ہیں، دولت کے انبار ہیں۔ مقامی مسیحی رُوسا، اسلام کے پُرامن سایہ کے نیچے، شدید، بیجا ٹکسوں اور مذہبی ظلم و تعدی کے ہاتھ سے، جزیہ دے کر آسایش و راحت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں، اس وقت مسیحی، قیصری حکومت میں نابود ہو رہے تھے۔

امیر قافلہ کا آخری حج ادا ہوتا ہے، جس میں ایک لاکھ سے زائد دل بادل انسان توحید کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کے اونٹ کا کجاوہ اور چادر ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہیں۔ اس کی زبان سے لبّیک بحجۃ لا سمعۃ فیہا و لا ریاء کی آواز بلند ہوتی ہے۔ جب اس طرح خدا کا وعدہ سچا ہو چکا اور فتح و نصرت حاصل ہو چکی تو سالارِ عالم رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ہو رہتا ہے۔

فتوحات صحابۂ کرام | لیکن اس کی مبارک تعلیم جاری ہے، وہ ضعیف و خستہ حال، جو شام و مصر سے چھوٹا موٹا سامان تجارت اپنے خشک ملک کے لئے لاتے تھے، نہ صرف ان ممالک کے حکمران بن جاتے ہیں، بلکہ تمام آباد و متمدن دنیا دیدہ و دل ان کے لئے فرش راہ بنا دیتی ہے "شام کا ملک جس میں رومیوں کی سلطنت ۷۰۰ برس سے چلی آرہی تھی (۷) برس کے اندر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اخیر بادشاہ ساسان کو تخت سے اتار دینے، اور اس کے ملک پر جو اتنے زمانہ دراز سے شاہان شاہ کی ملک چلا آتا تھا، قبضہ کر لینے کے لئے دو مہینے کافی ہوئے"[1]

دس سال کے اندر کل عراق، ایران، شام اور مصر میں اسلامی عدل، مساوات، مذہبی رواداری، بہبودی و رفاہ عامہ کی عملداری تھی۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس ضعیف جماعت کی نہ صرف ایسی عظیم الشان ملک گیری، بلکہ وہ حسن انتظام، کہ مفتوحہ قوموں کی پوری پوری مذہبی آزادی کے ساتھ اس قدر وسیع حصۂ کرۂ ارض اسلامی دنیا ہو جائے، ایک ایسی بے مثال برق خرامی

---

[1] تمدن عرب صفحہ (۱۳۷)۔

ہے جس کی نظیر نہ سکندر کی ملک گیری ہے نہ رومنس کی ملک رانی، لی بان کے الفاظ میں دنیا میں کبھی ایسے متحمل اور روادار ملک گیر نہیں ہوئے، اور نہ ایسا نرم و مہربان کوئی مذہب ہوا[1]۔"

ہند پر اولاً بحری پیشقدمی

ہندوستان پر یہ پیشقدمی اولاً بحری راستہ سے آغاز ہوئی ہے اس لئے کہ ہند و عرب میں یہی راستہ نزدیک ہے۔ بقول لی بان "عربوں کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ ابتدائے زمانہ تاریخی سے شروع ہوئے ہیں، جس وقت یمن کے بندروں سے ہندوستان کو جہاز جانے لگے وہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بہت ہی قریب تھا[2]"

جزیرہ نما عرب میں ایک ضابطہ کے قیام کے ساتھ ہی ساحل عرب سے روانہ ہونے والے جہازوں نے عربوں کے لئے تمام سمندر کھول دئے، اس وقت کوئی بحری بیڑہ ایران اور ہندوستان میں ان کو روکنے والا موجود نہ تھا۔

فاروق اعظم کے والی بحرین و عمان، عثمان بن ابی العاصی ثقفی نے سنہ ۱۵ھ م سنہ ۶۳۶ء (فتح مدائن کے ایک سال بعد) جہازوں پر فوج سوار کرا کے تانہ پر بھیجدی (یہ وہی تانہ ہے جو بمبئی کے قریب ہے اور جہاں آثار صحابہ کا وجود مانا گیا ہے) عثمان نے اپنے بھائی حکم کو بروص[3] پر بھی بھیجا، اور دوسرے بھائی مغیرہ بن ابی العاصی کو دیبل[4] پر جہاں انہوں نے غنیم پر فتح پائی[5]۔ فاروق اعظم بحری فوج کشی کو اس بناء پر پسند نہ فرماتے تھے کہ ۲۰ جہازوں کا ایک بیڑا جو روم بھیجا گیا تھا، طوفان میں غرق ہوا تھا، چنانچہ اس کے بعد بحری فوج کشی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، اور اسی وجہ سے ہندوستان کی اس پہلی بحری فوج کشی پر جوان کی بلا اجازت ہوئی تھی، ان کا عتاب صادر ہوا۔ بہر کیف فوج کشی کی مسدودی سے قطع نظر عربوں کا تجارتی اثر جہازوں کے

---

[1] ۔ تمدن عرب صفحہ (۵۴۴)۔
[2] ۔ تمدن عرب صفحہ (۵۰۳)۔
[3] ۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اس کو گجرات کا بڑوچ قرار دیا ہے۔
[4] ۔ سندھ کا مشہور قدیم بندرگاہ۔
[5] ۔ فتوح البلدان بلاذری طبع یورپ صفحہ (۴۳۲)۔

ذریعہ سے روز بروز بڑھتا جا رہا تھا (جو ہماری دوسری تصنیف "سواحل ہند پر مسلمانوں کا تمدن" کا موضوع ہے)۔

فوج کشی براہ خشکی | اب اسلامی فوجیں یا سر بازان راہ خدا ساسانیوں کے پائے تخت سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایران چونکہ اس وقت بڑے بڑے جاگیر داروں میں منقسم تھا لہذا کسریٰ کا خاتمہ ہونے کے بعد بھی ہر صوبہ میں معرکہ آرائی درکار ہوتی تھی۔ چنانچہ تقریباً ۹ سال کے بعد اسلامی فوجیں ۲۳ ھ م ۶۴۴ ع میں نہر مکران پر پہنچ گئیں۔ اور نامۂ فتح کے ساتھ چند ہاتھی بھی مدینہ میں بھیجے گئے۔

(مکران[1] کا نصف حصہ آج کل بلوچستان کہلاتا ہے۔ بقول عبد الحلیم صاحب شرر اس زمانہ میں سارا بلوچستان سندھ میں ہی شمار کیا جاتا تھا اور راجۂ سندھ کے قبضہ میں تھا۔ بلوچ[2] کے نام نے ہنوز کسی حصہ ملک کو اپنا نہیں بنایا تھا۔ مکران وسیستان سے سندھ کی حدیں ملی ہوئی تھیں)

اس سرزمین کی جو کیفیت فاروق اعظم کے روبرو پیش کی گئی اس کے سننے کے بعد فرمان ہو گیا کہ دریا کے اس پار فوج کشی نہ کی جائے۔ اسی کے قریب قریب ایک ایرانی غلام کے خنجر سے فاروق اعظم کو وہ شہادت نصیب ہوئی جو صحابۂ کرام کو بظاہر اس دلفریبیوں سے بھری زندگی میں سب سے زیادہ مرغوب چیز تھی۔ اگرچہ بقول آغا خاں "فاروق اعظم کی قابل افسوس شہادت سے اسلام کو ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا اثر اب تک زائل نہیں ہوا"، لیکن ابھی وہ فاروقی اصول بحال و برقرار تھے اور ان کا اثر زندہ تھا چنانچہ خلافت عثمانی میں کابل، غزنی اور موجودہ بلوچستان، مستقل اسلامی صوبے بن گئے۔ مہلب نے کابل کے راستہ سے ہندوستان میں قدم رکھا۔

۱ ویلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض کی تصدیق سامنے آتی ہے جس کے بعد بجائے نظام مساوات وجمہوریت شان حکومت قیصری کا انداز پیدا ہونے لگتا ہے بقول

---

[1] الفاروق مولفہ مولانا شبلی صفحہ (۱۹۰)۔ [2] جلد اول تاریخ سندھ صفحہ (۴)۔

ابن عمر سنت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عوض سنت کسریٰ و قیصر کی تقلید ہونے لگتی ہے۔ قصہ مختصر جب ایک زبردست سلطنت قایم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد زیادہ تر باغراض سیاست فارورڈ پالسی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

فتح سندھ | **حجاج بن یوسف** عربوں کے پاس اپنے سیاسی اغراض کے پورا کرنے میں کیسا ہی ظالم مشہور ہو لیکن یہی حجاج اس وقت کی اسلامی دنیا سے باہر اسلامی تہذیب کا راہ نما بنتا ہے، اس کی قران مجید کی خدمت مشہور ہے، اسلامی دور دورہ سے ذرا پیشتر جب ساسانیوں نے ایران میں آخری سنبھالا لیا تھا، تو ایرانی تاجدار نے سندھ پر حملہ کرکے سندھ کے راجہ سی ہرس کو شکست دیکر مار ڈالا تھا اس کے بعد اس کا بیٹا ساہسی تخت نشین ہوا جو لاولد تھا۔ اس کے مرنے کے بعد حکومت بجائے خاندان اہل شمشیر، ایک پنڈت برہمن کے بیٹے **چچ** کے ہاتھ آئی جو اس کے دربار میں با اثر بن گیا تھا۔ **چچ** کا زمانہ آغاز حکومت تقریباً وہی ہے، جب کہ بنی امی عربی علیہ السلام نے مدینہ میں ہجرت فرمائی۔ اسی کے قریب قریب زمانہ میں مشہور چینی سیاح **ہیون چوئنگ** نے ہندوستان کی سیاحت کی ہے (سنہ ھ م سنہ ۶۲۹ ع سے سنہ ۲۶ ھ م سنہ ۶۴۵ ع تک) چچ نے طوائف الملوکی دور کی اور ایک سلطنت کی بنا ڈالی (اس وقت دریائے بیاس کے کنارہ ایک حصہ ملک ترک نسل حکمرانوں کے قبضہ میں بھی تھا)۔ برہمنی مذہب دوبارہ قایم تو ہو گیا تھا، لیکن عوام میں بدھ کا اثر باقی تھا، بدھ کی عبادت گاہیں آباد تھیں اور مرتاض بدھ ملک میں ہر طرف عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک کی معاشرت میں مختلف طبقات میں باہم منافرت کی ایک خلیج حائل تھی۔ جاٹ اور لوہان جو قدیم قومیں تھیں ان سے نہایت ذلت کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چچ کے بعد اس کا بھائی چندر جس کو بدھ مذہب سے عقیدت تھی اور اس کے بعد چچ کا بیٹا داہر تخت نشین ہوا، جو غالباً بدھ کا مخالف تھا (اس لئے ممکن ہے کہ وہ عوام الناس میں ہر دلعزیز نہ ہو) کہا جاتا ہے کہ نجومیوں کے قول سے وہ اپنی بہن سے عقد نکاح رسماً عمل میں لایا تھا اور اس فعل کی وجہ سے بھی عام طور پر ہر دلعزیز نہ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک عرب محمد علافی نے ابن اشعث کو قتل کرکے عمان سے جہاز کے ذریعہ سے (جو کھلا ہوا راستہ تھا)۔ اہل قبیلہ

کے ساتھ سندھ میں پناہ لی تھی، اس کی مدد سے راجہ داہر کو ایک دوسرے راجہ کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی، اس نے ان نووارد عربوں کی قدر و منزلت کی، اور ان کو اپنے دربار میں جگہ دی، یہ گویا حجاج کے ساتھ چھیڑ تھی، اس کے ساتھ ایک اور واقعہ ہو گیا، اسلامی اثر سمندر کے راستہ سے تجارتی طور پر دن بدن بڑھ رہا تھا، سیلون کا راجہ مسلمان ہو چکا تھا، عرب تاجر وہاں بس گئے تھے، سیلون سے چند جہاز مسلمانوں کو لئے ہوئے عرب جا رہے تھے، سواحل ہند پر دیبل کے میدلوگوں سے بعض دریائی لٹیروں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے ان جہازوں کو گھیر کر سامان لوٹ لیا اور چند مسلمان لڑکیوں کو بھی پکڑے گئے، گرفتار ہونے کے وقت، ایک لڑکی بے تحاشا چلا اٹھی یا حجاج، اس یا حجاج کی خبر نے حجاج کے دل کو اس طرح تڑپا دیا جس طرح آئندہ زمانہ میں یا معتصم نے معتصم کو۔

ساحل ہند پر مسلمانوں کے توطن کے جو روایات ہیں، ان میں کہا جاتا ہے کہ حجاج کے ظلم سے عرب ساحل ہند پر آ کر بس گئے، دراصل حجاج کا ظلم نہیں بلکہ اس کی ہمدردی تھی، چونکہ اس کا ظلم اسلامی تاریخ میں ضرب المثل ہے لہذا بدنصیبی سے اس کی ہمدردی بھی داخل ظلم ہو گئی۔

فتح سندھ کے تفصیلی دلچسپ واقعات سلطنت آصفیہ کے بحر کرم سے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اردو میں جمع کر دئے ہیں، اور ان سے صاف صاف نظر آتا ہے کہ یہ ملک گیری اگرچہ خلافت راشدہ کے مبارک زمانہ میں نہ تھی لیکن وہ اصول ابھی تک اس قدر تازہ تھے کہ قریب قریب وہی اثر یہاں بھی مترتب ہوا، جو شام، مصر، عراق وغیرہ ممالک مفتوحہ خلافت راشدہ میں، جس طرح شام، مصر ہمیشہ کے لئے اسلامی خطہ بن گیا، یا یوں کہو کہ اصلی باشندے مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح سندھ بھی نیک مزاج فاتحین کے اعلیٰ اور رحم دل برتاؤ کی بدولت، اس قدر اسلامی رنگ میں آ گیا کہ آج اس کی آبادی میں دوسرے صوبہ جات ہند سے یہ حیرت انگیز تباین ہے کہ ۲۵ لاکھ کی آبادی میں تین ربع سے زیادہ مسلمان آباد ہیں، کثرت آبادی میں ہندوؤں کے قائم مقام یہاں سندھی مسلمان ہیں۔ گویا مسلمان اصلی باشندہ ملک ہو گئے جیسے شام و مصر میں، یہ حیرت انگیز فرق اس امر کا

قومی ثبوت ہے کہ جس قدر رواداری برتی جائے اسی قدر اس کے نتائج قومی اور دیرپا ہوتے ہیں، اس آبادی میں گو عربی نسل بھی ضرور ہے، لیکن بڑا حصہ ان سندھی مسلموں کا ہے جن میں اگرچہ (۳۰۰) ذاتیں بیان کی جاتی ہیں، لیکن اخوت اسلامی اور عربی تہذیب کی بدولت سب ذاتیں ملی جلی رہتی ہیں، اور ہر ہر ذات کے جدا رہنے کے قدیم دیسی قواعد ٹوٹ گئے ہیں۔

یہ مشہور فاتح سندھ **محمد بن قاسم** اگرچہ سترہ سال کا کم عمر نوجوان ہے لیکن اپنی رائے تدبیر اور کیرکٹر میں ۶۰ سالہ ثابت ہوتا ہے اور اس کی عالی شربی اور بے داغ کیرکٹر کا نمونہ آئندہ بہ مشکل ملتا ہے۔ دراصل تمام انتظام سندھ سے سینکڑوں کوس کے فاصلہ پر **بصرہ** میں حجاج نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور وہیں سے تمام تفصیلی ہدایات وصول ہوتے تھے، ہر تین دن میں ٹپہ پہنچتا تھا۔ اگرچہ پیشقدمی خشکی کے راستہ سے ہوئی تھی، لیکن پانچ منجنیق جہازوں کے ذریعہ سے لائے گئے جن میں سے ہر ایک کے چلانے کے لئے (۵۰۰) آدمی درکار ہوتے تھے، یہ منجنیق **دیبل** کے محاصرہ میں کس مقام پر کس طور سے قایم کی جائے، اس میں بھی حجاج کی ہدایت کے مطابق عمل کیا گیا اور **عروس** نامی منجنیق نے **دیبل** کے مشہور مندر کو منہدم کر دیا۔

یہی حجاج ہمیشہ خطوط میں اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے، اور یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ جہاں کوئی قدیم مقام یا مشہور شہر ہو تو وہاں مسجد و منبر ضرور قایم کئے جائیں۔

جس قدر جلد اسلامی اثر پھیل رہا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ راجہ داہر کے پاس جو سفارت بھیجی گئی، اس میں مولانا اسلامی نام ایک دیسی نومسلم بزرگ بھی تھے، جو دیبل کے ہندو شرفا میں سے تھے، محمد بن قاسم حیدرآباد سندھ کے حوالی میں دریائے سندھ سے پار اترا، ہندوستانی اعتقادات نجوم سے ہراسان ہو رہے تھے، ۱۰ رمضان ۹۳ھ ۷۱۲ء کو معرکۂ کارزار میں داہر اس بوقلموں دنیا سے اٹھ گیا اور محمد بن قاسم کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا، بہت جلد تمام سندھ سے ملتان تک اس کا قبضہ ہو گیا، کشمیر تک اس کے حدود قلم و وسیع تھے (اس زمانہ میں پنجاب کا بایں ہیئت کذائی نام و نشان نہ تھا، بلکہ وہ سندھ میں ہی داخل تھا، پنجاب میں

اسلامی آبادی جو زیادہ ہے اس کی وجہ بھی یقیناً یہی برکات قرون اولیٰ ہیں، انہی مقامات میں اسلامی آبادی زیادہ پائی جائے گی جو زیادہ تر سندھ و ملتان کے مابین ہیں)۔

محمد بن قاسم کا طرز عمل | محمد بن قاسم کے طرز عمل کو خود راجہ داہر کے وزیر سی ساکر نے اس طرح ادا کیا ہے "منصف مزاج امیر نے جو آئین و قوانین جاری کئے ہیں ان سے تمام ممالک ہند میں اس کی عظمت و لیاقت کا سکہ بیٹھ جائے گا، آپ تمام رعایا اور مالگذاروں کو خوش رکھتے ہیں، قدیم مروجہ طریقہ ہی سے اور گزشتہ ضوابط کے مطابق آپ مالگذاری وصول کرتے ہیں کسی نئی مستزاد رقم یا جدید ٹیکس کا بار آپ کسی شخص پر نہیں ڈالتے اور اس کی پابندی صرف خود ہی نہ کرتے بلکہ اپنے تمام عہدہ داروں اور سرداروں کو بھی انہی ضوابط کی پابندی کے لئے ہدایت کرتے رہتے ہیں"۔ مندر علی حالہ آباد رہے، حجاج کے فرمان موجود ہیں کہ کوئی شخص اپنی مذہب کی پیروی سے نہ روکا جائے، مسیحیوں کو جو رعایتیں شام میں حاصل تھیں، وہی ہندوؤں کو سندھ میں گویا اہل کتاب کا سا برتاؤ روا رکھا گیا۔

انتظام حکومت بھی ان کے ہاتھ میں بحال رکھا گیا، جس کا ایک مادی ثبوت (قطع نظر روایات کتابی کے) وہ ہندو برہمن موجود ہیں، جو **عامل** کے لقب سے مشہور ہیں۔ پہلی صدی ہجری کا آخری حصہ ہے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے فتوحات کا دور دورہ ہے، محمد بن قاسم کی طرح قتیبہ ترکستان میں بڑھتا چلا جا رہا ہے، حجاج نے دونو سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ تم دونو کو بڑھتے ہوئے **چین** تک جانا چاہئے۔ اللہ کا نام لے کر بڑھتے چلے جاؤ، جو پہلے مملکت چین میں داخل ہوگا۔ اس کو اپنے تمام مفتوحہ بلاد اور نیز اپنے ہمسر سپہ سالار پر حکومت ملے گی۔

(باقی آئندہ)

مرتضیٰ

صلی اللہ علیہ

سراپا جلوۂ حق ہے، رسول اللہ کا جلوا
پڑا ہے عالم تنزیہ پر تشبیہ کا پردا
مہ و خورشید سایہ ہے کف پائے محمدؐ کا
وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

تعدد صرف اسماء میں ہے لیکن ذات ہے یکتا
ید بیضا و شمع طور میں ہے ایک ہی جلوا
مسمیٰ ہے وہی واحد احد، محمود و احمدؐ کا
وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

اوجالا ہر طرف پھیلا ہے خورشید رسالت کا
اسی شعلہ سے روشن ہے چراغ ملت بیضا
اسی کا نور آنکھوں میں، اسی کا دل میں ہے جلوا
وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نورہا پیدا
زمین از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

وہی ناقہ، وہی محمل، وہی مجنوں، وہی لیلا
وہی خورشید تاباں ہے وہی مہ ہے وہی ہالا
وہی ہے ساکن کعبہ، وہی ہے ساکن طیبا
وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

چلا منزل بمنزل گھر سے جب ماہ شب اسریٰ
ضیاء رخ سے نجم طالع کون و مکان چمکا
فرشتے تو فرشتے، خود خدائے پاک کہتا تھا
وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

لب خندانش را عشاق وَانْشَقَّ الْقَمَرُ خوانند
نگہ را صاحبان دل ز نشتر تیز تر خوانند
غبار خاک پائش سرمۂ اہل نظر خوانند
دو چشم نرگسینش را کہ مَازَاغَ الْبَصَرُ خوانند
دو زلف عنبرینش را کہ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ

ہوئی جب بو البشر کی مجلس عیش و طرب برہم رکھا سجدہ میں سر اور یوں کہا با دیدہ پرنم
خداوندا بحق رَحمَةً لِلعَالَمِین اِرحَم اگر نام محمد را نیاورد ے شفیع آدم
نہ آدم یافتے توبہ، نہ نوح از غرق نجینا

انیسؔ خستہ حالاں ہے غریبوں کے لئے ہمدم ہر اک اس چشمۂ رحمت سے ہے سیراب بیش و کم
ہے عالم کے لئے رحمت، وجود رحمت عالم اگر نام محمد را نیاورد ے شفیع آدم
نہ آدم یافتے توبہ، نہ نوح از غرق نجینا

کہاں امجدؔ کہاں ذکر حبیب حضرت یزداں کہاں ممکن کہاں واجب کہاں سبحان کہاں سبحاں
نہیں ہے کُنتُ کنزاً مخفیاً کی شرح کچھ آساں ز سر سینہ اش جامی الم نشرح لک بخواں
ز معراجش چہ می پرسی کہ سُبحَانَ الَّذِی اَسرٰی

سید احمد حسین امجد

رباعیات

ہستی و ثبات شادی و غم میں نہیں اک دم میں جہاں ہے اور اک دم میں نہیں
کچھ شک نہ رہا کہ واہمہ ہے خلاق عالم مجھ میں ہے میں تو عالم میں نہیں

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے
دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کر لیں پہلے تھا ستارہ اب وہ سیارہ ہے

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آب شور ہے یہ دنیا میں ڈوب کے مرگیا مگر پیاسا ہوں

عزلت بے عین علم ذلت سمجھو اور زہد کی زے نہ ہو تو علت سمجھو
حاصل نہ ہو عز علم و زہد اس کو اگر عزلت ہرگز نہیں اسے لت سمجھو

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے
اور طول امل فسون و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے عصہ سے گریز
وہ خوک ہے اور یہ سگ دیوانہ ہے

حیدر یار جنگ نظم طباطبائی

انجام کار ہستی

دیکھو بہ چشم عبرت ، انجام کار ہستی
ناعی ہیں زندگی کے لیل و نہار ہستی
آبادیوں میں پنہاں ، بربادیوں کی علت
لایا خزاں کی آمد ، دور بہار ہستی
ہے ورطۂ ہلاکت ، بحر بقائے عالم
سمجھے ہوئے ہیں جس کو دار القرار ہستی
صہبائے کیف آور ، دو روزہ زندگی ہے
ترشی چکھی قضا کی اترا خمار ہستی
ایک ایک قدم پہ کانٹے لاکھوں بچھے ہوئے ہیں
ہے لالہ زار دنیا ، ایک خارزار ہستی
تیری حیات فانی ! دیکھی نظر فریبی
دل سے نکل چکا ہے بالکل وقار ہستی
آیا تھا اس جہاں میں کیوں رہرو عدم ! تو
کیا لے چلا جہاں سے ، اے داغدار ہستی ؟
میدان میں عمل کے ہو کچھ تو گام فرسا
کچھ نقش چھوڑتا جا یاں ، یادگار ہستی
علم و عمل کی وسعت ، محتاج حوصلہ ہے
سمجھو بساط کوشش ہے کارزار ہستی
زاد معاد کی جو ، کچھ جستجو نہیں ہے
کیا بن گئے جہاں میں ، جاگیردار ہستی
رب جلیل ! تیری ہی ذات لم یزل ہے
ہے لازوال تو ہی ، اے کردگار ہستی !
یارب کہیں ٹھکانے ، لگ جائے خاک میری
اڑتی پھرے فضا میں ، مشت غبار ہستی

ہستی ، نشان فنا کا ، **نوشابہ** حزیں ہے
گر ہے اجل پیام ختم بہار ہستی

نوشابہ خاتون قریشی

نغمۂ مرگ

۱۔ زبانِ زیست کر چکی تمام اپنی داستاں
کھنڈی شراب زندگی مٹا نظام جسم و جاں
اسی کا نام موت ہے، یہی ہے خوابِ جاوداں!

۲۔ نہ جس کے بعد ہوش کی رہے طلب، وہ بیہشی
جو ہم گرہ بہ دامنِ ابد، وہ عہد خامشی
وہ اک سرورِ سرمدی، وہ اک نشاطِ بےخودی....
اسی کا نام موت ہے، یہی ہے خوابِ جاوداں!

۳۔ وہ آگ، اہلِ عشق کو اجالتی ہے جس کی ضو
وطن پرست قلب میں بھڑک رہی ہے جس کی لو
وہ قطرۂ بحیرہ جو کے حق میں وصل ساز رو
وہ کہنگی سے مخلصی، لباس نو۔ حیات نو....
اسی کا نام موت ہے، یہی ہے خوابِ جاوداں!

۴۔ وہ رازِ آفریدگی وہ رمزِ بندہ پروری
وہ خانہ زادِ خاک کا عروجِ روشن اختری
عروجِ گل، مآلِ دم، کمالِ جسم عنصری
زمیں سے ہو کے ایک جاں، زمین سے اسکی برتری
مصائبِ حیات سے جو ہے نجاتِ آخری......
اسی کا نام موت ہے، یہی ہے، خوابِ جاوداں!

سید ہاشمی فریدآبادی

النساء

دکن کا واحد اور پہلا زنانہ ماہوار پرچہ زیر ادارت بیگم صاحبہ

عالیجناب سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا حیدر آباد سے

ہر ماہ ہلالی کو نکلتا ہے قیمت سالانہ ؏ دفتر النساء صغرا منزل

ہمایوں نگر سے طلب کر لیا جائے

بیگم صاحبہ کی مندرجہ ذیل تصانیف دفتر النساء سے ملتی ہیں

مشیر نسواں ۸ر تحریر النساء عہ سفینۂ نجات ۴ر

مجموعۂ نصائح ۵ر سفرنامۂ عراق عہ سیر بہار و بنگالہ ۸ر

سفرنامۂ پونہ و مدراس وغیرہ ۸ر روزنامچۂ دہلی و آگرہ وغیرہ عہ

پروفیسر الیاس برنی

کے

مشہور و مقبول سلسلہ منتخبات نظم اردو

۱۔ **معارف ملت**۔ حمد، نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ۔ جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم۔

۲۔ **مناظر قدرت**۔ اوقات۔ مقامات۔ مخلوقات اور واقعات کی تصاویر کا دل کش مرقع جلد اول
جلد دوم۔ جلد سوم۔

۳۔ **جذبات فطرت**۔ سب دلوں کی کہانی چند شاعروں کی زبانی بقول غالب۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم۔

نوٹ ہر حصہ کی چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔

اپنی غیر معمولی شہرت اور قبولیت کی بدولت اب یہ سلسلہ کسی مزید تعارف اور سفارش کا محتاج نہیں رہا۔ اس کی کتابیں اردو کے شائقین میں ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں اور ہندوستان کے اکثر صوبوں کے مدارس میں داخل نصاب ہو چکی ہیں۔ جلد پاکیزہ۔ قیمت فی جلد مجلد صرف ایک روپیہ۔

اسرار حق

مرتبہ

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

آیات قرآنیہ۔ احادیث نبویہ۔ ارشادات صدیقین و اکابر دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان سب کا نہایت جامع اور مربوط انتخاب۔ اور ان کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لباب جس سے خود بخود اسلام کے حقائق و معارف اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں تصوف کی تحقیق و تصدیق میں بعض لحاظ سے یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ قابل دید ہے۔ حجم تقریباً چار سو صفحہ جلد پاکیزہ قیمت صرف (سے)

مندرجہ بالا کتابیں ملنے کا پتہ

سمی احمد صدیقی۔ بر دولت خانہ محمد الیاس برنی صاحب سیا بازار حیدرآباد دکن

رجسٹرڈ آصفیہ (۲۳)

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابو المکارم صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

باہتمام مرزا غلام جیلانی بیگ

شمس الاسلام پریس میں چھپکر

دفتر رسالہ ترقی اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتہ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصول پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی ۵ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط وکتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعہ خط وکتابت یا بالمشافہ طے ہوسکتا ہے۔

(۸) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ (صہ/) ششماہی (سے/) نمونہ ۸/

منیجر

ترقی

جلد ۱ — ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۴۱ھ — نمبر ۳

فہرست مضامین

کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے تمام مشائخ وارباب طریقت شیخ ابوسعیدؒ کے تابع اور معتقد تھے۔

مختلف مقامات پر پھرنے کے بعد شیخ کی زندگی کا آخری حصہ اپنے وطن ہی میں گزرا اور وہیں شعبان ۴۴۰ھ میں رحلت کی۔ آتشکدہ آذر میں لکھا ہے کہ جنازے کے ساتھ ان کے مرید حسب وصیت یہ شعر پڑھتے جاتے تھے کہ ؎

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار دوست بہ نزدیک دوست یار بہ نزدیک یار

نفحات میں اس شعر کی بجائے یہ رباعی نقل کی ہے :-

"خوب تر اندر جہاں زیں چہ بود کار دوست بہ دوست رفت و یار بہ یار

از ہمہ اندوہ بود ایں ہمہ شادی آں ہمہ گفتار بود ایں ہمہ کردار"

اور عجب نہیں کہ اس رباعی کو کسی قدر غیر متعارف بحر میں دیکھ کر صرف دو زیادہ صاف و رواں مصرعوں میں ڈھال لینا بعد کے لوگوں کی یا خود صاحب آتشکدہ کی ذہانت کا نتیجہ ہو!

مختلف تذکروں میں شیخ ابوسعیدؒ کے علمی کمالات اور خوارق و کرامات کی متعدد روایتیں محفوظ ہیں، لیکن عام طور پر ان کی شہرت کا بڑا سبب ان کی فارسی رباعیات ہیں اور جس قدر زیادہ اور عمدہ رباعیات کا مجموعہ ان کے نام سے منسوب ہے، غالباً کسی دوسرے فارسی سخنور کی تصنیف سے نہ ہوگا، لیکن ان سب رباعیات کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہنا کہ وہ واقعی شیخ ابوسعیدؒ کا نتیجۂ فکر ہیں، نہایت دشوار و بحث طلب امر ہے، جرمانیہ میں بڑی تحقیقات کے ساتھ شیخ کی تقریباً سو رباعیاں مع جرمنی ترجمے کے چھاپی گئی تھیں اور ملک روس میں شیخ ابوسعیدؒ کے حالات اور کلام کے متعلق بعض محققانہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

چند روز ہوئے ایک صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے میں بھی شیخ کی رباعیات پر کسی نے ایک بسیط مضمون لکھا ہے، لیکن ہمیں اس موقع پر ان رباعیات کی اصلیت کی پیچیدہ بحث کو چھیڑنا منظور نہیں ہے، ہم یہاں، ناظرین ترقی کی دلچسپی کے واسطے صرف چند رباعیات نقل کرنی چاہتے ہیں، جس سے شیخ کے طرز کلام اور کمال شاعری کا

کچھ اندازہ ہو سکے، اور اس انتخاب کے لئے ہم نے صرف وہ مجموعہ سامنے رکھنے پر اکتفا کی ہے جو "رباعیات شیخ ابوسعید ابوالخیر" کے نام سے مطبع کریمی لاہور میں شائع ہوا تھا۔

یورپ کے بعض مستشرق شیخ ابوسعیدؒ کو متصوفانہ شاعری کا بانی قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیخؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بایزید بسطامیؒ کے انتہائی فلسفہ "وحدت وجود" کی بذریعۂ شاعری تعلیم دی اور تشبیہہ واستعارات کا وہ پیرایہ اختیار کیا جسے بعد میں عطارؒ اور مولانائے رومؒ جیسے اساتذہ نے نہایت ترقی دی، لیکن جہاں تک ہم نے غور کیا یہ رائے صرف اس حد تک صحیح نظر آتی ہے کہ دوسرے شعرائے صوفیہ کی طرح شیخ ابوسعیدؒ کے کلام میں بھی احوال قلبی اور واردات باطنی کا جابہ جا بیان آجاتا ہے، ورنہ ان کی رباعیات میں شاعرانہ رنگینی اور تخیل کی بلند پروازی کا حکمت وفلسفہ سے کہیں زیادہ دخل ہے اور ظاہراً شیخ عطارؒ یا مولانائے رومؒ کی طرح شیخ ابوسعیدؒ نے اپنی شعر گوئی کا کوئی خاص مقصد قرار نہیں دیا ہے۔

مگر مذکورہ بالا قول سے بھی طرفہ تر پروفیسر نکلسن کی یہ رائے ہے کہ شیخ ابوسعیدؒ نے اپنی رباعیات میں تصوف کا جو رنگ بھرا تھا بعد کے تمام رباعی نویس حتیٰ کے عمر خیام کا کلام بھی اسی رنگ سے رنگین ہے،..... لیکن کہاں عیش بے خودی کا دلدادہ اور شراب بے نیازی کا متوالا خیام اور کہاں شیخ ابوسعیدؒ کہ عشق حقیقی سے بے تاب ہے اور آتش فراق سے برابر جل رہا ہے بلکہ اماں رحمۃ اللہ تعالیٰ

اے خواجہ ترا غم جمال ماہست واندیشۂ باغ و راغ و خرمن گاہست
ما سوختگان عالم تجریدیم مارا غم لا الٰہ الا اللہ ہست

اور یہ ایسے عشق کا غم ہے جس کی دنیا میں راحت وآرام کا نام نہیں اور جہاں راحت کی امید ہوتی بھی ہے تو اس شرط پر کہ دکھ اٹھایا جائے اور تکلیف برداشت کی جائے،

درکشور عشق جائے آسائش نیست آنجا ہمہ کاہش ست افزائش نیست
بے درد و الم توقع درماں نہ بے جرم وگنہ امید بخشائش نیست

آخری شعر میں شیخؒ نے فلسفۂ حیات کا یہ لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ تکلیف سے نجات حاصل

کرنے کی خواہش فطری ہے، لیکن جو لوگ اس لطف و مسرت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں انھیں پہلے درد و الم کے واسطے بھی تیار رہنا چاہئے، کیونکہ جیسے مسرت کا احساس اور طلب ہے لازم ہے کہ وہ رنج و تکلیف کی لذت سے بھی آشنا ہو، اور اگر عالم سرخوشی میں یا ہنگامی مسرت پاکر کوئی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے تو وہ اس کا خمیازہ بھی کھینچتا ہے، اس مضمون کو کس خوبی سے دوبارہ تحریر کرتے ہیں کہ :۔ رُباعی

کارم ہمہ نالہ و خروش است امشب نے صبر پدیداست و نہ ہوش ہست امشب
دوشم خوش بود ساعتے پندارے کفارۂ خوش دلیٔ دوش است امشب!

جس نے خلقت انسانی کے اس راز کو سمجھ لیا وہ اس زندگی میں خود درد و غم کا خواہاں اور مشتاق نظر آتا ہے کیونکہ یہی درد "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کی بشارت اور خلقت انسانی کے بنانے والے، محبوب حقیقی عزوجل کی شان صناعی ہے :۔ رُباعی

سرمایۂ غم ز دست آساں ندہم دل بر نہ کنم ز دوست تا جاں ندہم
از دوست کہ یادگار دردے دارم آں درد بہ صد ہزار درماں ندہم

رباعیات سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ شیخ ابوسعیدؒ مسئلہ وحدت وجود کے جس طرح اسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے خود قائل ہیں یا اس کی تعلیم دیتے ہیں، ایک رباعی میں انھوں نے فقر و فنا کی تعریف بیان کی ہے، ممکن ہے کہ اس سے کسی کو مغالطہ ہو۔ رُباعی

آں راکہ فنا شیوۂ و فقر آئین است با کشف یقین نہ معرفت نے دین است
رفت او ز میاں ہمے خدا ماند خدا "اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ ھُوَ اللہ" این است

لیکن ظاہر ہے یہاں بندے اور خدا کا (نعوذ باللہ) اتحاد ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہنا کہ انسان کی حقیقت عدم ہے اور اگر وہ اپنی سراب ہستی کے دھوکے سے آزاد ہو جائے، یعنے اپنے فنا کی حقیقت کو پالے تو پھر وہ معدوم اور صرف وجود حقیقی عز اسمہ باقی رہے اور یہ وہ مضمون ہے، جسے خواجہ حافظؒ جیسے پختہ کار صاحب صحو بھی کبھی کبھی کہ گزرتے ہیں

دوسرے شیخ کی دوسری رباعیوں میں "غیریت" کے فرق کو برابر ملحوظ رکھا ہے اور اتحاد وعینیت ایک طرف وہ معشوق حقیقی کے وصل کی بھی اہلیت اپنے میں نہیں پاتے:-

رُباعی

وصل تو کجا و من مہجور کجا دُردانہ کجا حوصلۂ مور کجا
ہرچند زسوختن، ندارم باکے پروانہ کجا و آتش طور کجا!

شیخ کے موضوع شعر پر اس مختصر بیان کے بعد مناسب ہوگا کہ اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ان کی چند انتخابی رباعیات نقل کردی جائیں کہ ناظرین ترقی ممدوح کے محاسن کلام سے لطف اندوز ہوسکیں۔

۱۔ شان رحمت وغفاری:

رُباعی

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر وگبر وبت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

۲۔ عشق دوام اور اس کے لوازم:

رُباعی

ما عاشق وعہد جان ما مشتاق ست مائیم بہ درد عشق تاجاں باقی ست
غم نقل و ندیم درد ومطرب نالہ مے خون جگر، مردم چشمت ساقی ست

۳۔ بلند خیالی:

رُباعی

زاں مے خورم کہ روح پیمانۂ اوست زاں مست شدم کہ عقل دیوانۂ اوست
بروئے بہ من آمد آتشے با من زد زاں شمع کہ آفتاب پروانۂ اوست

۴ - ضبط و رازداریٔ عشق:

رُباعی

اے دل چو خدنگت رگ جاں بکشودت منمائی بہ کس خرقۂ خوں آلودت
مے نال چناں کہ نشنوند آوازت می سوز چناں کہ بر نیاید دودت

۵ - استغنا:

رُباعی

طالع سر عافیت فروشی دارد ہمت ہوس پلاس پوشی دارد
ایں جا کہ بہ یک سوال بخشند دو کون استغنائم سر خموشی دارد

۶ - شکوۂ فراق:

رُباعی

اول ہمہ جام آشنائی دادی آخر بہ ستم زہر جدائی دادی
چوں کشتہ شدم بگفتی ایں کشتہ کیست داد از تو کہ داد بے وفائی دادی

رُباعی

اے کاش مرا بہ نعمت آلائیندے آتش بہ زندے و بہ بخشائیندے
در چشم عزیز من نمک سایندے وز دولت جدا شدن نفرمایندے!

۷ - دعا:

رُباعی

اے خالق ذوالجلال ہر جانورے وے رہبر و رہنمائے ہر بے خبرے
بستم کمر امید بر درگہ تو بکشائے درے کہ من ندارم خبرے

"راقم ریش"

(از ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی ایم۔اے پی ایچ۔ڈی)

حضرات! میں اس وقت جو آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ میں اپنی تقریر کا جوہر دکھاؤں یا یہ کہ جو کچھ میں کہوں اسے آپ مان لیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ سے جو جدید طریقۂ تعلیم قائم کیا گیا ہے اس کے متعلق اپنے خیالات سادہ الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کروں اور ہمارے خسرو ذی شان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ نے جس دوراندیشی کے ساتھ اس نئی درسگاہ کی بنیاد رکھی ہے اسے بہ حد مقدور بیان کروں، یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی نیا کام شروع کیا جاتا ہے تو اس سے چند لوگوں کو اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہی حال ہماری جامعۂ عثمانیہ کا بھی ہے۔ پچھلے دو مہینے کے عرصہ میں یعنے جب سے میں نے اپنی خدمت کے اہم کام کو شروع کیا ہے میں نے کئی بار سنا ہے کہ ہماری جامعہ کے طریقۂ تعلیم کی نسبت کچھ اعتراضات اور شبہات ہیں۔ جو غالباً محض اس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کہ یہ فرض کر لیا گیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں کا بہترین نمونہ ہیں، پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں یونیورسٹی کی تعلیم کے متعلق اپنے خیالات بیان کروں اور ہندوستان اور یورپ کی اعلیٰ تعلیم کا مقابلہ کروں تاکہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے طرز عمل سے جو امور پیچیدہ ہو گئے ہیں ان کی حقیقت آپ حضرات پر کھل جائے۔

تعلیم کے دو حصے ہیں ایک تو وہ تعلیم جو مکتب (یا اسکول) کے آخر درجے میں

ختم ہوتی ہے یہ ابتدائی یا بنیادی تعلیم ہے اور اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں آپ اسے ادنیٰ تعلیم کہہ سکتے ہیں۔ جب تک ادنیٰ تعلیم درست نہ ہو اعلیٰ تعلیم کے ثمرات نہیں مل سکتے اعلیٰ تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جس طریقے پر ہو رہی ہے اسی کی تقلید اب تک علاقۂ سرکار عالی میں بھی کی گئی اور اس وقت تک جو تعلیم ممالک محروسہ میں ہوتی رہی ہے، وہ اسی نقطۂ نظر سے کہ برٹش انڈیا میں جا کر وہاں کی کسی یونیورسٹی سے ڈگری لیں، برٹش انڈیا کی یونیورسٹیوں نے طلباء کے ذہن میں یہ مرتسم کر دیا ہے کہ تمام محنت، تمام کوشش، مصروفیت صرف امتحان کے لئے ہے، جہاں امتحان ختم ہوا تعلیم بھی ختم ہو چکی، امتحان کے بعد کتابیں طاق میں رکھ دینی چاہئیں، پھر ملازمت کی تلاش شروع کریں اور اس میں اپنی عمر ختم کر دیں ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ منجملہ یورپ کے اور کارخانوں یا کلوں کے ایک کل یونیورسٹی بھی ہے، جس کی قیمت کروڑ دو کروڑ روپیہ ہے، جہاں ایسی ایک کل خرید لی گئی اس سے نوکری پیشہ اشخاص ڈھل کر نکلتے ہیں اور اس طرح ثمر مقصود ہاتھ آتا ہے۔

مگر حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم کا ہرگز یہ منشا نہیں اور اگر واقعی اعلیٰ تعلیم کا منشا یہی ہے تو

وائے گر از پئے امروز بود فردائے

یونیورسٹیوں کی یہ شکل نہ تو یورپ میں دکھائی دیتی ہے اور نہ قدیم ہند یا عرب درسگاہوں میں جو یورپ کی یونیورسٹیوں کے مماثل تھیں، جس چیز کو ہم قدیم زمانے میں مدرسہ کہتے تھے وہی آج کل یونیورسٹیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسکول کو اس زمانے میں مکتب کہتے تھے، جب ہم قدیم مدارس یا یونیورسٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے معلموں اور متعلموں کے سچے شوق، طریقۂ تعلیم اور خلوص نیت کا اندازہ کرتے ہیں تو ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانے کے مدرسے اور آج کل کی یونیورسٹیاں ایک ہی چیز ہیں۔ مثال کے طور پر آپ بغداد کے "مدرسۂ نظامیہ" کو یاد کیجئے۔ مدرسۂ نظامیہ کا

طالب علم ہونا ہی گویا فضیلت کی سند اور کمال کا تمغہ تھا اور اس امر کا ثبوت کہ فلاں شخص پوری طرح جانتا ہے کہ حصول علم کا مقصد کیا ہے۔ یعنے جس علم کو اس نے حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے اسی میں عمر بسر کرنے کا عزم راسخ رکھتا ہے اور واقعی وہ اس میں ایسا منہمک ہوا کہ گویا دنیا و مافیہا سے اسے تعلق باقی نہیں، ایسی مثالیں ایک دو نہیں سینکڑوں ملیں گی۔ ایک شخص سے جو فقہ میں کمال حاصل کرتا ہے، خلیفہ قضاۃ کے قبول کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ اور وہ اس سے صاف انکار کر دیتا ہے، وہ اس امر کو پسند کرتا ہے کہ حجرۂ درس میں رہے، طلبہ کو درس دے اور اس طرح اپنی زندگی بسر کر دے۔ ایسے لوگ اپنی طالب علمانہ زندگی پر حکومت کو کبھی ترجیح نہیں دیتے تھے۔ البتہ ان میں سے بعض لوگ ان حکومت والے منصبوں کو قبول کرتے تھے لیکن یہ وہی لوگ ہوتے تھے، جو اس کی اہمیت کو محسوس کر لیتے تھے اور یہ سمجھتے کہ یہ کام بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے علم و دانش سے انسانوں کی خدمت کریں۔ بہر حال وہ درسگاہ کوئی کل یا مشین نہ تھی، جس سے اعلیٰ حکام بنائے جاتے تھے، زمانۂ حال میں بھی یورپ میں یونیورسٹیوں کا مقصد یہی ہے کہ طلباء واقف ہوں کہ دماغی اور ذہنی ترقی میں دنیا اس وقت کہاں تک پہنچی ہے اور خود ان کو اس میں کیا حصہ لینا چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ انسان کے علم کی اور سابقہ تحقیقات کی تنقیح کی جائے، اس وقت مختلف علوم کی عمارتیں اسی اصول پر مبنی ہیں، یونیورسٹی کا کام یہی ہے کہ رفتار علم کو ترقی دے اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک یونیورسٹی میں ایک شوق و ذوق نہ ہو کہ گزشتہ تحقیقات میں اضافہ کیا جائے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ علم کے مسائل اپنی زبان کے ذریعہ طلباء کو سمجھائے جائیں تاکہ وہ حقیقت میں جزو دماغ ہو جائیں، جب تک ہم یہ نصب العین نہ رکھیں گے، اس وقت تک کسی یونیورسٹی کا کوئی فائدہ نہیں برٹش انڈیا کی یونیورسٹیوں نے اپنی پچاس سال کی عمر میں

اس کو پورا نہیں کیا، کسی یوروپین یونیورسٹی میں جاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں اسی پچاس سال کے عرصہ میں کس قدر ترقی ہوگئی ہے، میں مثال کے طور پر یہ بیان کروں گا کہ ہندوستان میں باوجود صدیوں کے میل جول کے مسلمان سنسکرت کو مشکل سمجھتے ہیں اور ہندو عربی کو، مگر یورپ کی ہر یونیورسٹی میں سنسکرت اور عربی تو ایک طرف ان سے کہیں زیادہ غیر مانوس قدیم زبانوں کے جاننے والے موجود ہیں، اگر آپ ایک بڑا عالم یا پنڈت چاہتے ہیں تو یورپ کی یونیورسٹیوں میں آپ کو ایک نہیں بہتیرے ملیں گے، چنانچہ اسی لئے سرکار انگریزی عربی اور سنسکرت کے ہندوستانی طلبا کو جرمانیا، فرانس، ولندیز (ہالینڈ) کی تعلیم گاہوں میں بھیجا کرتی ہے، ان ملکوں کے تعلقات ہندوستان سے بہ ظاہر کم ہیں لیکن کتابی ذرائع سے وہاں کے تربیت یافتہ لوگ خصوصاً تاریخ، فلسفے اور لسانیات کے علما اس دور دراز ملک سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، یہ سن کے شاید آپ کو تعجب ہوا ہو لیکن یہ مطلق تعجب کی بات نہیں، سچ ہے کہ علم کسی کی جائداد نہیں، جس نے اس کی طلب میں کوشش اور محنت کی اس نے اسے حاصل کیا۔

جن قوموں کی خواہش ہے کہ تہذیب یافتہ اقوام کی مجلس میں جگہ پائیں ان کو یہ امر خوب اچھی طرح دل نشین کر لینا چاہیئے کہ بغیر علمی میدان میں قدم مارے ہوئے، وہ کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتیں، پس ان کو لازم ہے کہ اپنی محنت اور کوشش سے تحصیل علم کریں اور یہ تحصیل علم ایک محدود دائرہ میں مقید نہ ہو بلکہ نرے حصول علم سے گزر کر تفحص و تحقیق کی بلند پایۂ عمارت تک پہنچ جائیں تاکہ اپنے علم و تحقیق کے ذریعے سے علم انسانی میں اضافہ کر سکیں اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ علم کو علم ہی کے لئے حاصل کیجئے نہ نوکری یا کسی اور مقصد کے لئے یہ سچ ہے کہ پیٹ پالنے کی فکر بھی ضروری ہے اور تحصیل علم کسی شخص کو فکر معاش سے مستغنی نہیں کر سکتی، لیکن فرق یہی ہے کہ وہاں اصل مقصد علم ہے اور یہاں پیٹ، پس ایک سچے طالب علم کا مسلک وہی ہونا چاہیے

جیسے ایک شاعر نے اس طرح عبارت کیا ہے ؎

آں مال کہ در ذیل کمال آمدہ است
مال است مرا چہ طرفہ مال است مرا

یورپ کی یونیورسٹیوں میں جاؤ تو معلوم ہوگا کہ پروفیسروں کو دو یا تین ہزار روپیہ تنخواہ ملتی ہے، لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی اکثر پائے جاتے ہیں جو کبھی مدرسہ میں بھی قدم نہیں رکھتے۔ یہ کیوں؟ وہ نمک حرام نہیں ہیں اور نہ تعلیم وتعلم سے جی چراتے ہیں، اگر کوئی پروفیسر درس دینے کے لئے مدرسہ میں نہیں جاتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے فن کے متعلق جو مختلف قسم کا مواد اس نے مدتوں کی محنت اور تلاش سے اپنے کمرے میں جمع کر رکھا ہے۔ وہ مدرسے میں موجود نہیں اس کا کمرہ اس کی درسگاہ ہوتا ہے۔ وہاں طلبا اس سے صرف کتابی چیزیں نہیں سیکھتے بلکہ ان کو اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ علمی زندگی کیا ہوتی ہے۔ طلبا سے وہ نہ صرف دوستانہ برتاؤ رکھتا ہے بلکہ ان کو اپنی امید سمجھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انھیں میں سے مجھ سے زیادہ لایق افراد پیدا ہوں گے اگر ایک بھی اس سے نامور تر نکل آئے تو وہ خوش ہوتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ یونیورسٹی کا کام یہ نہیں ہے کہ اتنے طالب علموں کو امتحانوں میں کامیاب کرایا یا اتنوں کو نوکریاں دلوائیں یہ کام البتہ فنی تعلیم گاہوں کا ہے۔ برٹش انڈیا کی یونیورسٹیوں کو اس معیار کے قایم کرنے سے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کے زمرے میں میں خود داخل ہوں کیونکہ یہیں سے میں نے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے کی ڈگریاں لیں۔ لیکن یہاں کی یونیورسٹیوں کے عیوب میرے پیش نظر ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیوں کو ہمیں بہ غور مطالعہ کرنا اور ان کی تقلید کرنا چاہئے بڑی ہٹ دھرمی ہوگی اگر ہم اچھی چیز کو دیکھیں اور پھر بھی اس سے دور رہیں۔ کیا یورپ میں کوئی یونیورسٹی ایسی ہے۔ جو

کسی غیر زبان میں تعلیم دیتی ہے؟ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا، کیونکہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یورپ کی ہر یونیورسٹی ملکی زبان میں تعلیم دیتی ہے لیکن جب یہی یورپ کا طریقہ آپ کے گھر میں رائج کیا جائے تو آپ برا مانتے ہیں۔ اگر ہمارے طلبا انگریزوں کی سی انگریزی نہ بول سکیں تو اس سے کوئی ہرج نہیں ہے کسی زبان کا جاننا اچھا ہے لیکن اس سے وہ علمی فوائد حاصل نہیں ہوتے جو اپنی زبان میں تعلیم دینے سے مترتب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے طریقۂ تعلیم میں کسی شعبے کی تنقیدی تعلیم نہیں دی جاتی اگر یہ تعلیم کہیں ہے تو میں کہوں گا کہ وہ کس مولوی یا پنڈت کے پاس ہے جس کو امتحان اور نوکری سے بحث نہیں یہ درست ہے کہ قدیم مدرسوں کی تعلیم پرانی ہوگئی ہے۔ اور تقویم پارینہ ہونے کے لحاظ سے اس کی قیمت بھی گھٹ گئی ہے۔ لیکن باوجود پرانی ہوجانے کے اس کا اصلی جوہر ایک حد تک اب بھی باقی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ جو چیز پرانی ہوگئی ہے اس کو نیلام کردینا چاہئے یا پرانی بارہ دری کھود کر نئی طرز کا بنگلہ بنادیا جائے یہ مناسب ہے۔ لیکن جو عقلمند ہے وہ پرانی عمارت کی اینٹ اور چونے کو خراب نہ ہونے دے گا بعض نئی روشنی کے شیدا تو شاید یہ بھی کہیں کہ نیا سامان "جان کمپنی" سے منگواؤ اور پرانا پھینک دو۔ لیکن ایسا کرنا نہ صرف روپیے کا بلکہ پشتہا پشت کی محنت اور دماغ سوزی کے بیش بہا نتائج کا برباد کرنا ہوگا۔ تمدن اور شائستگی کا جز قدیم اور جدید دونوں تعلیموں میں موجود ہے۔ لیکن ہم کو اس زمانے کی ضروریات کے مطابق قدیم تعلیم میں اصلاح و ترمیم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی تعلیم میں قدیم اور جدید اجزا کو مناسب مقداروں میں ملاکر ایک ایسا نسخہ مرتب کریں جو ہمارے قومی امراض کو دور کرنے میں کارگر ہو۔ بطور ایک جملۂ معترضہ کے میں اس مقام پر یہ عرض کروں گا کہ مسلمان حضرات مانتے ہیں کہ سنسکرت اچھی اور ایک مقدس زبان ہے، لیکن اس کی خوبی اور اہمیت کا وہ پورا اندازہ نہیں کرتے،

مگر یورپ کے لوگ جو ہندوستان سے ہزار ہا کوس دور ہیں سنسکرت کی علمی قدر و قیمت سے واقف ہیں وہاں جو لوگ لسانیات کا علم حاصل کرتے ہیں، ان کے لئے سنسکرت ایسی ہی ضروری تصور کی جاتی ہے جیسے لکھنا پڑھنا سیکھنے کے حروف تہجی۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ سنسکرت سے فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے جو نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ یہ خیال کرنا کہ ہم کو پرانے علوم کی ضرورت نہیں یہ تقویم پارینہ ہیں، پس نئی جنتری خریدنی چاہئے، سخت غلطی ہے، یہ کس قدر باعث افسوس ہوگا کہ ہم پرانی تاریخ اور پرانی السنہ کے ان بدیہی فوائد سے دست بردار ہوجائیں، جو یورپ نے ان سے حاصل کئے ہیں۔ ہمارے لئے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اپنے علوم کی خدمت اس طرح پر کریں کہ ان میں جو پرانا پن آگیا ہے، اس کو جدید مغربی علوم کی مدد سے دور کریں، جب ہم علوم کو مشرقی یا مغربی قدیم یا جدید کہتے ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان میں کوئی اصولی فرق ہے، حقیقت میں اس طور کی تقسیم محض بیان کی سہولت کی غرض سے ہے اور مشرقی یا مغربی علم سے علم کا وہ حصہ مراد ہے، جس کی تکمیل مشرقی یا مغربی ممالک میں ہوئی اس طرح قدیم یا جدید علم سے علم کا وہ حصہ مراد ہے، جس کی تدوین قدیم یا جدید زمانے میں ہوئی، جو علوم آپ کے یہاں آج سے چھ سو برس پہلے مکمل ہوچکے تھے، وہ "قدیم علوم" کہلاتے ہیں اور ان علوم میں جو اضافے اس زمانے کے بعد سے آج تک ہوئے وہ "جدید علوم" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، پس یہ واضح ہوگیا کہ پرانے علوم وہ بنیاد ہیں جن پر موجودہ عالیشان عمارت قائم ہے پرانے علموں کی تحقیق و تنقید سے اس زمانے میں بطور جدید ان میں ترقی ہوئی اور دنیا میں ایک نیا دور پیدا ہوگیا۔ پس ان دونوں حصوں کے حاصل کرنے میں ہمیں کسی طرح تامل نہ ہونا چاہئے غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بعض علوم صرف ہندوؤں میں تھے اور بعض صرف مسلمانوں میں، قدیم تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پرانے ہی علوم پڑھنا چاہئے، بعض حضرات کا

شاید یہ بھی خیال ہو کہ علوم کو اس حد تک اور اسی صورت میں حاصل کرنا چاہیے جیسا کہ مسلمانوں یا ہندوؤں میں یا کسی خاص ملک میں اب تک دستور رہا ہے، ان حضرات کی خدمت میں میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ایسا دستور العمل ہم کو غلط راہ پر لے جائے گا اور علم تک نہیں ہاں جہل بلکہ تباہی تک پہنچائے گا، برائے خدا علم کو کسی زمانے، ملک یا ملت تک محدود نہ سمجھئے، یہ محض اتفاق ہے کہ کسی مقام میں کسی خاص علم کی ترقی ہوئی، جو قوم سربرآوردہ ہوتی تھی وہ اس علم کو اختیار کرتی اور اس میں ترقی کرنے کی کوشش کرتی تھی، جب وہ قوم سیاسی وجوہ سے پریشان ہو جاتی تھی تو دوسری جگہ کام ہوتا تھا۔ مثلاً کسی زمانہ میں دہلی دارالعلم تھی۔ اس کے بعد لکھنو مرکز علم و فن بنا، اس کے بعد رام پور میں علم کا چرچا رہا جو لکھنو سے بھی چھوٹی ریاست تھی، اب حیدرآباد علوم و فنون کا مرکز ہے، علم کسی کی ملک نہیں، جب کوئی مورخ تحقیق کرے گا تو دیکھے گا کہ کس کس بادشاہ اور کس کس قوم نے بجائے خود کیا کیا کیا ہے، علوم ایک قوم سے دوسری قوم کے پاس جاتے ہیں، ایک ملک میں پیدا ہوتے ہیں، مگر اکثر دوسرے ملک میں جا کر نشو نما پاتے پھر وہاں سے بھی دوسری جگہ جاتے اور ایک مدت کے لئے اس غیر ملک میں متمکن ہوتے ہیں، مسلمانوں میں چار سو یا پانچ سو سال تک اچھی رفتار سے مختلف علوم کو ترقی ہوتی رہی اس کے بعد غیر محسوس طریقے پر علمی زوال شروع ہو گیا۔ اس انحطاط کے شروع ہونے کے زمانے کی تصانیف کو آپ دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ ان میں وہی اگلی باتیں الٹ پھیر کر آنے لگیں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ دماغ کی امنگ گھٹ رہی ہے، جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حالت بد سے بدتر ہوتی گئی، متاخرین نے بجز قدماء کے اقوال نقل کرنے کے کچھ نہ کیا، اگر کوئی محقق اتفاق سے پیدا بھی ہو جاتا تو جلد اس کا اثر زائل ہو جاتا اور آسان پسندی جو جمود کا لازمہ ہے، بغیر کسی دقت کے پھر اپنا تسلط جما لیتی اس جمود اور اضمحلال کے زمانے میں

دوسری قومیں علم کے میدان میں برابر رواں رہیں، جب یونانی سو گئے تھے، تو علوم گویا مردہ ہو گئے تھے، اس کے ایک عرصے بعد مسلمانوں نے وہ علوم سیکھے اور ان کو ترقی دی، اسی طرح مسلمانوں کے بعد یورپی قوموں کی باری آئی، جب کہ جمود کی کئی صدیاں ان پر گزر چکی تھیں، انھوں نے علوم کو نہ صرف اس حد تک سیکھا جہاں تک یونانیوں اور رومیوں نے ان کی تحصیل کی تھی، بلکہ اور قوموں کے علمی کارناموں پر بھی نظر دوڑائی اور جہاں سے جو کچھ ملا اسے اپنی تحقیق کے دائرے میں شامل کیا جو کچھ ایک بار انھوں نے سیکھ لیا، اس پر ہرگز قناعت نہیں کی، بلکہ اور زیادہ سیکھنے کی فکر میں رہے، چنانچہ گزشتہ چند صدیوں سے مختلف مشرقی زبانوں کی تحصیل شروع ہوئی، پہلے عبرانی کی طرف توجہ ہوئی۔ یہ آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ عبرانی سامی خاندان کی ایک زبان ہے، جس میں "توراۃ" نازل ہوئی اور اس لئے یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے وہ مذہبی اہمیت رکھتی ہے، عبرانی اور عربی آپس میں ہم رشتہ ہیں کہ ان دونوں کو ہم دو بہنیں کہہ سکتے ہیں، اس لئے عبرانی کے سلسلہ میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی بھی سیکھی جانے لگی، اس طرح یورپ والوں کو مختلف علوم پر مسلمان علماء کی تحریروں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ کوئی ڈیڑھ سو برس ہوئے کہ سنسکرت کی تحقیق شروع ہوئی، ابتداءً محض ہند قدیم کے حالات و خیالات دریافت کرنا مقصود تھا، لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ ہند کی پرانی زبان یورپ کی تمام اہم زبانوں کے ساتھ خاص رشتہ رکھتی ہے، اور اسی انکشاف پر آریائی لسانیات کی شاندار عمارت کی بنیاد پڑی۔

الغرض یورپ والوں نے ان زبانوں سے جن کو ہم اپنی میراث سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں ہم سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ ترقی کے میدان میں سرگرم رفتار رہے اور ہم ایک جگہ پر کھڑے رہے بلکہ کچھ پیچھے کی طرف ہٹ گئے، پس ہم کو چاہیے کہ ہمارے

اس ٹھیر جانے یا پس پا ہو جانے کے زمانے میں اہل مغرب نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کارگر تدبیریں عمل میں لائیں ورنہ ہمارا علم نا مکمل اور تاریخ علوم ناقص رہ جائے گی۔ ان تدبیروں میں سب سے بہتر تدبیر یہی ہے کہ ہم مغربی زبانوں کو سیکھیں تاکہ ہم یورپی مصنفوں کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں، جیسے ہماری زبانوں کو سیکھ کر انھوں نے ہمارے علماء کے خیالات سے فائدہ اٹھایا۔ زبان ہی ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے علوم کے راز ہم پر روشن ہو سکتے ہیں اور اس لحاظ سے "جامعہ عثمانیہ" میں بی۔ اے کے درجہ تک انگریزی زبان کی تحصیل لازم قرار دی گئی ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ نہ صرف انگریزی بلکہ اس کے علاوہ اور ایک آدھ یورپی زبان کا سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اس ضرورت کے ثابت کرنے کے لئے اس کی حاجت نہیں کہ میں کوئی طول طویل بحث کروں۔ نقطہ یاد دلا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ خود انگلستان کی یونیورسٹیوں میں بعض مضامین کے لئے جرمانی اور فرانسیسی کا سیکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

جو طلبا یورپ کی یونیورسٹیوں میں ادب، تاریخ، لسانیات یا فلسفہ کی تحصیل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے ہی لاطینی اور یونانی زبانوں میں کافی مہارت پیدا کر چکے ہوں، طب اور قانون کے لئے بھی لاطینی ضروری تصور کی جاتی ہے، یہ الفاظ دیگر یورپ میں اعلیٰ تعلیم اور تمام تمدن اور شایستگی کی بنیاد لاطینی اور یونانی پر قایم ہے اس واسطے ان زبانوں کا جاننا شایستگی کا لازمہ خیال کیا جاتا ہے، علاوہ ان کے یورپ کی موجودہ زبانوں میں سے بھی کم سے کم فرانسیسی کا جاننا ضروری سمجھا جاتا ہے، پس ظاہر ہے کہ خود جن لوگوں کی مادری زبان انگریزی ہے، جب انھیں کے لئے وہ کافی نہیں تو ہندوستان کے لوگوں کے لئے محض انگریزی کیوں کر کافی سمجھی جا سکتی ہے، اب ہم کو یہ دیکھنا ہے

کہ آیا ہمارے لئے بھی اعلیٰ تعلیم اور شایستگی کی بنیاد لاطینی اور یونانی پر قایم کی جاسکتی ہے، اس کے جواب میں ہر شخص کہے گا کہ یہ ممکن نہیں، ہمارے لئے عربی فارسی اور سنسکرت سے البتہ وہی کام لیا جاسکتا ہے، ہمارے ہاں جس طرح ساٹھ ستر برس تک عربی فارسی اور سنسکرت ہی کی تعلیم، تعلیم سمجھی جاتی تھی اور باقی سب لغو اسی طرح یورپ میں اب سے تین سو برس پہلے تک یہ خیال تھا کہ جو شخص لاطینی اور یونانی جانتا ہے، وہی عالم کے خطاب کا مستحق ہوسکتا ہے، اس زمانے میں جو لوگ علمی تصنیف و تالیف کرنا چاہتے تھے، وہ مجبور تھے کہ لاطینی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں، اس سے بلا شبہ ایک فائدہ تھا کہ لاطینی چونکہ یورپ کے تمام ملکوں میں تقریباً یکساں طور پر رائج تھی ایک جگہ کی تحقیقات سے دوسری جگہ کے لوگ بھی برابر فائدہ اٹھاتے تھے، مثلاً انگریز علماء جو کچھ لکھتے اس سے جرمانی اور فرانسیسی بغیر بلا دقت فائدہ اٹھاتے اور اور ممالک میں جو تصنیفیں ہوتیں ان سے انگریز مستفید ہوتے، مگر انہی مختلف ملکوں کے علما میں جو اب تک اپنی ملکی زبان میں کچھ لکھنا خلاف شان سمجھتے تھے رفتہ رفتہ یہ خیال پھیلا کہ ملکی زبان ان کی توجہ کی محتاج ہے وہی لوگ جو یورپ کی علمی دنیا میں ایک زبان واحد کو لازم جانتے تھے، آخر یہ کہنے لگے کہ لاطینی میں جو ایک مردہ زبان ہے ہر خیال کا اظہار آسانی اور روانی کے ساتھ ممکن نہیں اظہار خیالات کے لئے مادری ہی زبان موزوں ہوگی۔ ایک اس سے بھی اہم وجہ لاطینی کے رفتہ رفتہ ترک ہوجانے اور ملکی زبان کو اس کا قایم مقام بن جانے کی یہ تھی کہ اگرچہ لاطینی کی تعلیم عام تھی اور آج بھی اس کی تحصیل کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، تاہم وہ نسبتاً ایک چھوٹے سے طبقہ (یعنی علماء) تک محدود تھی اور اب وہ زمانہ آگیا تھا، جب کہ یورپ میں ایک نئی زندگی ظہور کر چکی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں ایک امنگ تھی، ہر کس و ناکس علم کے حاصل

کرنے کا خواہشمند نظر آتا تھا، یہ ضرورت کسی مردہ زبان کے ذریعے پوری نہیں ہوسکتی تھی، پس نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف ملکوں کے علما، اپنی اپنی زبان میں لکھنے لگے اور اسی نئے طرز عمل کے فیض سے وہ تمام انسانی دماغ میدان عمل میں آئے جو اب تک بے کار پڑے ہوئے تھے، کام کرنے والوں کی اس کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم و فنون اس قدر عام ہوگئے کہ آج یورپ کا ہر ملک اور اس کے ہر ملک کا ہر فرد علم اور دولت دونوں پر قابض ہے اس مثال سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہئے اور جو فائدہ زبان کی وحدت میں سمجھا جاتا ہے، اس کو اس بڑے فائدے، یعنے اشاعت علوم پر یقیناً قربان کردینا چاہئے۔ جو رکاوٹ یورپ میں لاطینی نے پیدا کررکھی تھی وہی آج ہمارے ملک میں انگریزی کی وجہ سے ہے، پس جس طرح یورپ والوں نے اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر ملکی زبانوں کو تحصیل علم کا ذریعہ بنایا ہم کو بھی چاہئے کہ ہم ملکی زبانوں کو اپنا ذریعۂ تعلیم بنائیں مگر خیال رہے کہ یورپ والوں نے لاطینی کی تحصیل چھوڑ نہیں دی، بلکہ اس سے جو فوائد حاصل تھے ان کو اپنے قبضے میں رکھا، پس ہم کو بھی چاہئے کہ "انگریزی" کو ایک لازم چیز سمجھیں تاکہ یورپ کی علمی تحقیقات سے ہم مستفید ہوتے رہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غیر زبان کو وہ جگہ نہ دیجئے جو اسے ملنی فطرۃً ناممکن ہے، میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانیوں میں جو قابلیت غیر زبانوں کے حاصل کرنے کی ہے، اس میں سوا روسیوں کے کوئی اور قوم مشکل سے ان کا مقابلہ کرسکتی ہے مگر باوجود اس کے عام طور پر دیکھئے گا کہ برسیں انگریزی تعلیم میں گزر گئیں لیکن ہنوز روز اول ہے، میں اور کسی کو کیوں کہوں خود اپنی مثال دیتا ہوں کہ ایک معمولی بات کو انگریزی میں جس طرح ایک انگریز ادا کرے گا، میں نہ کرسکوں گا، بیس برس سے زیادہ انگریزی کی مزاولت رہی، اس کے مقابلہ میں میں صرف سات برس

جرمانیا میں رہا، لیکن جرمانی زبان بہتر بول سکتا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں مجھے رات دن اس سے کام تھا اور بغیر اس کے گزیر نہ تھا مگر اپنی زبان میں اظہار خیالات کی قابلیت ان دونوں سے بہتر پاتا ہوں۔ غرض کہ مشکل سے مشکل مسائل جس خوبی اور پائیداری کے ساتھ مادری زبان کے ذریعہ انسان کے جزو دماغ ہوتے ہیں وہ کسی غیر زبان کے ذریعہ ممکن نہیں اور اسی لئے جامعۂ عثمانیہ میں ہم اپنی زبان میں تعلیم دیتے ہیں۔ اکثر ملکوں میں مختلف زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے، اور وہاں کے لوگ محنت کر کے اپنی ضرورت کے مطابق کافی مہارت ان غیر زبانوں میں بہم پہنچا لیتے ہیں۔ اور ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن یہ الٹی گنگا بہتے کہیں نہیں دیکھی کہ ایک ایسی زبان ذریعۂ تعلیم بنائی جائے، جس سے ہزاروں کوس کی دوری اور غیریت ہو۔ یورپ کے بعض ملکوں میں تو یہ حال ہے کہ کوئی شائستہ شخص ایسا نہ دکھائی دے گا، جو تقریر و تحریر میں دو سے زیادہ زبانوں پر خاصا قادر نہ ہو، چنانچہ سویس (سوٹزرلینڈ) نیدرلینڈز (ہالینڈ) ڈنمارک وغیرہ میں عام طور پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جرمانی، فرانسیسی اور انگریزی وغیرہ بے تکلف لکھ بول سکتے ہیں، مگر یہ سب وہی لوگ ہیں، جن کو تعلیم ان کی مادری زبان میں دی گئی ہے اور اس وجہ سے انہوں نے آسانی سے علاوہ مختلف علوم کے مختلف زبانیں بھی سیکھ لیں، ان کے دماغ پر وہ بار ہرگز نہیں پڑتا جو ہندوستان میں طالب علم کو برداشت کرنا پڑتا ہے، پچاس برس قبل ایک چیز ہندوستان میں کسی لحاظ سے قائم ہوئی ہو تو ضرور نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی تقلید کی جائے اس غیر موزونی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ کمیشن پر کمیشن قائم ہوتے ہیں اور تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ان کمیشنوں سے اتنا تو نتیجہ نکلا کہ خدا خدا کر کے یونیورسٹیوں سے الحاق کا طریقہ اٹھتا جاتا ہے، اب یہ رائے عام ہو گئی ہے کہ الحاق توڑ دیا جائے اور یونیورسٹی ایک مرکزی تعلیم گاہ ہو، جیسے کہ قدیم زمانے میں

کہ مدرس خود ممتحن ہوتا تھا اور اب بھی یورپ میں یہی ہوتا ہے، ورنہ ہندوستان میں تو یونیورسٹی ایک امتحان خانہ ہے، اس الحاق کے غلط طریقے کو بھی جامعۂ عثمانیہ نے ترک کیا ہے۔ سیڈلر کمیشن نے اصولاً مان لیا کہ تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہئے، لیکن اس عذر کی بنا پر کہ دیسی زبانوں میں کتابیں موجود نہیں، اس اصول پر عمل کرنے کی صلاح نہیں دی، اب سوال یہ ہے کہ کتابیں کہاں سے آئیں انھیں کون مہیا کرے؟ حقیقت میں یہی کام یونیورسٹیوں کا تھا کہ وہ کتابوں کے مہیا کرنے میں جد وجہد کرتیں مگر یہ کام ان کے لئے کڑوا تھا۔ "پٹنہ یونیورسٹی" نے میٹرک طلبا کو اجازت دی ہے کہ وہ امتحان میں جواب انگریزی یا مادری زبان میں دیں، مگر میں اس کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کسی کام کو اسی طرح بے دلی کے ساتھ کرنے سے اس کا نہ کرنا لاکھ درجے بہتر ہے، بخلاف اس کے ہمارے سرپرست علم و تعلیم **شاہ والا تبار** نے جب ایک حقیقی جامعۂ تعلیم کے وجود میں لانے کا ارادہ فرمایا تو نہایت دوراندیشی سے سب سے پہلے ایک "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" کی بنیاد ڈالی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ درسگاہ کے کھلتے ہی تقریباً ہر علم پر **اردو** میں درس شروع ہو گیا، جس کی کامیابی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہ پروفیسر جنھوں نے خود انگریزی میں تعلیم پائی تھی، اب آسانی کے ساتھ بے تکلف اردو میں درس دیتے ہیں، اگر آپ ان استادوں کے درس سنیں گے تو آپ کو ان میں کوئی چیز غیر مانوس نہ معلوم ہوگی، شروع میں آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ بعض نئے نئے الفاظ تقریر میں آ رہے ہیں، لیکن دماغ میں برابر پہنچ جاتے ہیں آپ فوراً کہیں گے کہ الفاظ تو غیر مانوس نہیں غالباً خاص مفہوم کے ادا کرنے کے لئے معین کر لئے گئے ہیں، میں خود پہلے دن ایک جماعت میں گیا تو ایک "کیمرج" کے تعلیم یافتہ پروفیسر اردو میں درس دے رہے تھے اور مجھے گونہ تعجب ہوا کہ مطلق کسی قسم کا تکلف محسوس نہ ہوتا تھا۔

میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری اس طولانی تقریر کو دلچسپی کے ساتھ سنا مگر قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں، ایک استدعا آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

جو کام شروع کیا گیا ہے وہ اصولاً درست اور مفید ہے، پس ہم سب کو کامیابی کا یقین ہونا چاہئے اور اس لئے اس کار خیر کو پوری ہمت، پورے شوق اور پورے جوش کے ساتھ چلایئے۔ بے دلی یا سہل انگاری کو اس میں ہرگز کام نہ فرمایئے اگر یہ کام بے دلی سے کیا جائے گا تو یقیناً نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ اگر کہیں خامی ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش چاہئے، اصول جو ہم نے اختیار کئے ہیں، ان میں کوئی سقم نہیں مگر تمام اصول کا یہ حال ہے کہ جب ان پر عمل کیا جاتا ہے تو انواع و اقسام کی دقتیں پیش آتی ہیں، لیکن ان دقتوں سے ہمت نہ ہارنا چاہئے بلکہ ان کو ثابت قدمی سے رفع کرنا چاہئے، افسوس ہے کہ اس وقت جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ میں سے سوا میرے کوئی صاحب اس جلسہ میں موجود نہیں، لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ ان تمام حضرات کی طرف سے بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا سب کا مطمح نظر یہ ہے کہ ہم اس جامعہ میں اپنے سے بہتر افراد پیدا کریں، ہمارا کام صرف چند عہدہ دار پیدا کر دینا نہیں ہم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے، اگر آپ نے سمجھ کر کام ہمارے ہاتھ میں دیا ہے تو اس اعتبار کو قوی کیجئے، اور چند دن صبر کیجئے، مدد نہ کیجے تو کوئی شکوہ نہیں، لیکن مدد نہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ راستے میں روڑے اٹکائیے اور دلچسپی سے پہلے دل برداشتگی کو ظاہر کیجئے۔ برائے خدا جامعۂ عثمانیہ کا مدار ذاتیات پر نہ رکھئے کسی شخص کی کامیابی یا ناکامی پر کسی اصول کی کامیابی یا ناکامیابی کو منحصر نہ کیجئے آج آپ نے یہ کام میرے حوالہ کیا ہے ممکن ہے کہ میں کل سرخ رو ہوں اور ممکن ہے کہ زرد رو ہوں، لیکن یہ نتیجہ کسی حال نہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کام کی تکمیل سے ہاتھ اٹھالیں، بلکہ آپ کو ثابت قدم رہنا چاہئے آپ اپنے دلوں میں ٹھان لیجئے کہ اگر ایک شخص ناکام ہوگا تو ہم دوسرے کو لاکے بٹھائیں گے دوسرا بھی ناکام رہے گا تو تیسرے کو اور اسی طرح چوتھے اور پانچویں کو، لیکن اس کام کی تکمیل سے ہم کبھی منہ نہ موڑیں گے، کیونکہ ہماری قومی زندگی یا موت کا دار و مدار اسی کام پر ہے۔

کلامِ غالب (اردو) کی شرحیں

بہ سلسلہ گزشتہ

رسالۂ اردو بابتہ اپریل ۱۹۲۲ء میں غالب کے اردو کلام کی شرحوں پر جو تنقید کی گئی ہے، اس میں سب سے آخر مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر کی شرح کا نمبر ہے، یہ تنقید نہایت شرح و بسط کے ساتھ کی گئی ہے گویا سابقہ تمام تحریر اس تنقید کی تمہید ہے، چنانچہ رسالہ کے صفحہ ۲۶۱ میں "تحسین و اصلاح" کے عنوان سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی نے اپنی شرح میں چالیس پچاس جگہ غالب کے اشعار کی تعریف کی ہے اور سو سوا سو مقام پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کیے ہیں اور جابجا خود اصلاح دے کر گویا کلام غالب کی خامی ظاہر کی ہے مضمون نگار صاحب نے اس مضمون میں چند ایسے اشعار کی شرح نقل کی ہے، جس سے اپنے خیال میں نواب صاحب موصوف کا غالب پر معترض ہونا ثابت کیا ہے اور خود ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نواب صاحب غالب کی استادی کے معترف ہیں اور ان کو خدائے سخن مانتے ہیں اور ان کے بعض اشعار کی تعریف کو حد امکان سے باہر بتاتے ہیں یہ سب کچھ لکھ کر پھر نواب صاحب کو غالب کا مخالف بھی قرار دیتے ہیں یہ عجب قسم کی منطق ہے اور غضب یہ کیا ہے کہ نواب صاحب کی عبارت میں تصرف و تحریف سے کام لیا ہے جیسا کہ ناظرین پر آئندہ ظاہر ہوگا، اب ہم اصل مضمون کو لکھ کر اس کا جواب لکھتے ہیں۔

غالبؔ

ڈھونڈھے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی ‌‌ ‌ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر کے معنے اور تشبیہہ کی خوبی بیان کرنے کے بعد نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "شعر میں یہ کہنا کہ ایسا ہو اور ویسا ہو شعر کو سست کر دیتا ہے اس کے برخلاف اگر یوں کہتے کہ

تیری صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

تو زیادہ لطف دیتا"۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں دو جگہ تصرف و تحریف سے کام لیا ہے

(۱) نواب صاحب شرح میں لکھتے ہیں "تیری صدا ہے جلوہ برق فنا مجھے، اگر ہوتا تو زیادہ لطف دیتا، مضمون نگار صاحب نے ہے کی جگہ ہو لکھ کر اعتراض کر دیا حالانکہ خود نواب صاحب کے قول کو نقل کیا ہے کہ شعر میں ایسا ہو ویسا ہو کہنا شعر کو سست کر دیتا ہے پھر نواب صاحب تیری صدا ہو کس طرح لکھتے۔

(۲) اس سے بڑھ کر تحریف یہ کی ہے کہ نواب صاحب کی تحریر میں سے تھوڑی سی عبارت کم کر کے یہ اعتراض کر دیا کہ "اگر نواب صاحب کے خیال کے مطابق دوسرے مصرع کو بدلا جائے تو پہلے کا کیا حشر ہوگا" یہ سراسر حق پوشی اور ناحق کوشی ہے نواب صاحب نے صرف ایک مصرع بدلنے کے لئے نہیں کہا ہے بلکہ وہ مضمون شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اگر اس مضمون کو انشا میں ڈھالا ہوتا الخ" یعنے اس مضمون کو شعر میں اس طرح ڈھالتے کہ دوسرا مصرع تیری صدا ہے جلوہ برق فنا مجھے آسکتا تو خوب ہوتا۔

نواب صاحب کے قول میں سے (اس مضمون کو انشا میں ڈھالا ہوتا) اتنی عبارت کم کر دی اور اعتراض کر دیا۔ اس طرح کی تحریف کر کے تو معاذاللہ خدا کے کلام پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔

غالبؔ

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

اس شعر کی شرح لکھنے کے بعد نواب صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "جلاد اور واعظ میں

چنداں مناسبت نہیں ہے اگر واعظ کی جگہ قاضی کہتے تو اچھا تھا کہ وہی قتل کا فتویٰ دیا کرتا ہے،، اس پر مضمون نگار صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ قاضی صرف نکاح خوانی کی خدمت کو انجام دیتا ہے اور خود فارسی شعرا کے ہاں بھی غزل میں اس کا استعمال شاید مشکل سے کہیں ملے گا،، اب اس اعتراض سے ناظرین حضرت نقاد کی تحقیق کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتب فقہ باب القضا میں قاضی کے جو کچھ فرائض لکھے ہیں، اس سے قطع نظر ایک طفل مکتب جس نے گلستاں پڑھی ہو یا ایک معمولی استعداد کا شخص جو منتخب اللغات اور غیاث اللغات دیکھ سکتا ہو وہ اس بات کو بتا سکتا ہے کہ لفظ قاضی کے کیا معنے ہیں اور اس کے کیا فرایض ہیں۔ چنانچہ گلستاں کے باب اول کی تیئیسویں حکایت میں سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں " پدر و مادر بعلت حطام دنیا مرا بخون در سپردند و قاضی بکشتنم فتویٰ داد،، اب یہاں فتویٰ داد کے معنے حضرت نقاد ہی بتائیں (ایضاً باب ہشتم) ؎

قاضی کہ بہ رشوت بخورد پنج خیار ثابت کند از بہر تو دہ خربزہ زار

اس شعر سے بھی قاضی کے فرایض ظاہر ہیں۔ اب رہا فارسی شعرا کے ہاں غزل میں اس کا استعمال مشکل سے کہیں ملنا جو لکھا ہے جو بیشک جس شخص نے گلستاں بھی نہ پڑھی ہو، اوس کو مشکل ہی سے ملے گا۔ حافظ ؎

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہہ (حافظ) مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

قاضی ار با ما نشنید برفشاند دست را (سعدی) محتسب گرمے خورد معذور دارد مست را

غالبؔ

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق جو پاؤں اوٹھ گئے وہی ان کے علم ہوے

نواب صاحب نے اس شعر کی شرح لکھنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ " پاؤں اٹھنے کو علم اٹھنے سے تعبیر کرنا تکلف ہے، اس مضمون کو یوں کہنا تھا۔ ع

اٹھا وفا سے ہاتھ تو اونچے علم ہوئے"

اس پر مضمون نگار صاحب تحریر کرتے ہیں کہ "راقم الحروف نواب صاحب کے اس مصرع کا مطلب ہی نہ پا سکا، اس مصرع کو اختیار کرنے کے بعد شعر کا یا خود اس مصرع کا مفہوم کیا ہوگا" میں عرض کرتا ہوں کہ ذوق شعر نہ ہونا اور بات ہے ورنہ اس میں پیچیدگی ہی کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل ہوس کی خیر ترک عشق ہی میں ہے اس کا وفا سے ہاتھ اٹھانا ہی گویا علم فتح بلند کرنا ہے، یہ امر ارباب ذوق سے مخفی نہیں ہے کہ علم کو اونچا کرنے کے لئے ہاتھ کا اٹھانا لازم ہے، مرزا غالب نے بھی اوٹھنے ہی کے لفظ سے مضمون پیدا کیا ہے، یعنے انھوں نے نبردگے لحاظ سے پاؤں اٹھنا لکھا تھا، اس لئے کہ پاؤں اٹھنا فرار کرنے کو کہتے ہیں چونکہ پاؤں کے اٹھنے سے علم کا اٹھنا لازم نہیں آتا، اس لئے نواب صاحب نے لفظ عشق کی مناسبت سے وفا سے ہاتھ اٹھانا کہا تا کہ تشبیہہ کی صورت پیدا ہو کر شعر میں خوبی پیدا ہو جائے مرزا کے کلام میں فقط لفظ کا لحاظ ہے، تلمیح و تشبیہہ نہیں ہے۔ کما لا یخفیٰ علیٰ من لہٗ ذوق سلیم

غالبؔ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس شعر کے پہلے مصرع کے عوض نواب صاحب نے جو چند مصرعے لکھے ہیں، ان پر یہ اعتراض ہے کہ "ان میں سے ایک مصرع بھی مرزا غالب کے اصلی مصرع سے بہتر اور قابل ترجیح نہیں ہے" میں عرض کرتا ہوں کہ یہ تقریر نواب صاحب کے مقصد سے کوسوں دور ہے یہاں بات کا تبنگڑ بنایا گیا ہے نواب صاحب نے یہاں مصرع لگانے کا طریقہ بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "قلم ہونا اتنی چیزوں کے ساتھ لکھتے ہیں اور اتنے پہلوؤں سے مصرعے پہنچائے جا سکتے ہیں، مرزا مرحوم نے ان میں سے ایک پہلو اختیار کیا ہے، جس میں قلم کا ضلع ہے یعنے "لکھتے رہے الخ" اس کے بعد نواب صاحب

لکھتے ہیں کہ " ایسے مقام پر جہاں بہت سے مضمون ربط کھاتے ہوں شاعر ضلع بولنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جب دوسرے مضمون میں کوئی معنے کا حسن بڑھا ہوا نہیں ہے تو جس مضمون میں لفظی مناسبت ہو اسے کیوں چھوڑے اس سبب سے کہ شاعر کی طبیعت میں تناسب موسیقی فطری ہوتا ہے، اس سے ترجیح بلا مرجح ہونا محال ہے اور اتنا ہی ضلع کا خیال رکھنا حسن کلام ہے کہ دو مصرعوں میں یا دو فقروں میں ربط پیدا ہو جائے اس سے زیادہ حرص کرنا معنے کو خراب کرتا ہے" اس کے بعد نواب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مرزائے مرحوم نے اس شعر میں کسی قدر اپنے طرز کے خلاف کیا ہے کہ ضلع کے پہلو کو اختیار کیا"، اب اہل علم اس تمام تحریر کو اور معترض صاحب کے اعتراض کے مفہوم کو ملاحظہ فرمائیں اور انصاف کریں۔ ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

(۵) مضمون نگار صاحب آخر میں تحریر کرتے ہیں کہ " نواب حیدر یار جنگ صاحب نے چند اشعار میں اصلاح دینے کے علاوہ ایک جگہ تو یہ ستم کیا ہے کہ مرزا غالب کو لکھنؤ کے ایک نیم خواندہ کاپی نویس کے ہاتھ سے اصلاح دلوائی ہے" یعنے اس شعر کی شرح میں کہ

ع۔ پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے۔

لکھتے ہیں کہ "عود ہندی میں پیچ کا لفظ مصنف کی زبان پر تذکیر ہے، مگر اس شعر میں بہ تانیث ہے، غالبًا یہ سبب ہوا کہ پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں چھپا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا، پھر مصنف نے بھی اسے یوں ہی رہنے دیا" میں عرض کرتا ہوں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا ست

نواب صاحب نے کاپی نویس کے ہاتھ سے اصلاح نہیں دلوائی ہے، یہ کوئی علمی مسئلہ نہ تھا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کاپی نویس کی جو زبان تھی اسی طرح اس نے اس لفظ کو لکھ دیا ہوگا۔ ورنہ مرزا صاحب نے جب ایک جگہ اس کو مذکر لکھا ہے تو یہاں مونث لکھنے کا

کیا سبب ہے، اس لئے نواب صاحب نے گمان ظاہر کیا اور لکھا کہ غالباً ایسا ہو گا چنانچہ خود مضمون نگار صاحب نے بھی یہی کیا ہے، یعنے ایک دوسری طرح سے اپنا قیاس قائم کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ " اگر مرزا غالب پہلے اس کو مذکر سمجھتے تھے تو بعد اس شہر کی زبان اختیار کر لی ہو گی" اب اہل علم اس لفظ (ہو گی) کو ملاحظہ فرمائیں، وہی نواب صاحب کے (غالباً) کا ہم معنے ہے، اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، اپنا اپنا قیاس ہے، نواب صاحب نے قسم کھا کر تو نہیں کہا ہے، بہرحال نواب صاحب نے اس شرح میں فن شعر اور علم ادب کے وہ مسائل بیان فرمائے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں، نواب صاحب ان لوگوں میں نہیں ہیں، جو کسی پر اعتراض کرنا باعث شہرت سمجھتے ہیں۔ بیسیوں ماہواری پرچوں میں ہم نے ان کے مضامین دیکھے ہیں، لیکن اس وقت تک ان کا کوئی ایسا مضمون نہیں دیکھا، جس میں کسی پر انھوں نے بہ تخصیص اعتراض کیا ہو، تعمیم کے ساتھ بحث کرنی اور بات ہے، کسی شخص خاص پر اعتراض کرنا اور بات ہے، خصوصاً مرزا غالب پر وہ کس طرح اعتراض کر سکتے ہیں، جب کہ خود بقول مضمون نگار صاحب وہ ان کی استادی کے معترف ہیں، یہ ان کی نسبت سوء ظن ہے۔ اِنَّ بعض الظن اثم۔

(۹) تمہید میں مضمون نگار صاحب پرچہ کے صفحہ (۲۵۹) میں لکھتے ہیں کہ " نواب صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان پر محاکمہ فرمایا ہے اور زبان دہلی کی خرابیاں اور زبان لکھنؤ کی وجوہ ترجیح بیان کی ہیں اور حضرت علیؑ کے وصی رسول اللہؐ ہونے کی دلیلیں تحریر کی ہیں دوبارہ چھپتے وقت نواب صاحب کو چاہئے کہ اس قسم کے مباحث خارج کر دیں۔"
میں عرض کرتا ہوں کہ نواب صاحب نے جہاں موجودہ زبان لکھنؤ کی وجوہ ترجیح بیان کی ہیں، وہاں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابتداءً زبان لکھنؤ زبان دہلی کی خوشہ چیں رہی ہے، چنانچہ ان کی شرح ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶۱ سطر ۵ میں وہ لکھتے ہیں کہ " حقیقت امر یہ ہے کہ لکھنؤ کی جو زبان ہے یہ دہلی ہی کی زبان ہے" اور شرح کے صفحہ ۱۵۹ میں نواب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میر و سودا و جرأت و انشا کے لکھنؤ آنے سے دلی اور لکھنؤ کی زبان ایک ہوگئی" وجوہ ترجیح جو بیان کئے ہیں، اس کی تائید میں آزاد دہلوی کا قول نقل کر دیا ہے، تو گویا یہ وجوہ ترجیح بھی اہل دہلی ہی کے قائم کردہ ہیں، پھر اس میں نواب صاحب پر کیا اعتراض ہے۔ حضرت علیؑ کے وصی رسول اللہ صلعم ہونے کی دلیل جو بیان کی ہے اس میں مجبوری تھی، اس لئے کہ اصل مصنف کے شعر میں مضمون ہی ایسا تھا جس میں شارح ہونے کی حیثیت سے ان دلیلوں کے بیان کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ وہ شعر یہ ہے ؎

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا وصی ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

یہاں مصنف نے یقین کے ساتھ وصی ختم مرسل ہونا بیان کیا ہے اب شارح کیا کرتا دو ہی صورتیں تھیں یا اس کا رد کرتا یا اس کی تائید کی جاتی، ہر صورت میں یہی اعتراض ہوتا کہ یہ مذہبی مناظرہ ہے پھر اس کو بے محل اور ناجائز بحث کہنا کیا معنے اس کے سوا یہ بحث ہی ایسی کونسی مذہبی ہے، وصیت کے اقسام ہیں، انھوں نے کسی خاص ایسی وصیت کا ذکر نہیں کیا ہے، جو کسی مذہب کے عقائد کے خلاف ہو، بعض وصیتوں کے متعلق تو اسلام کے تمام فرقے متفق ہیں مثلاً بعد وفات آنحضرتؐ کو غسل دینا اور حضرت کے ذمہ کا قرض ادا کرنا وغیرہ ان امور میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو وصیت کی تھی۔

ایک شخص متوفی بعض وقت چند امور کے متعلق ایک شخص غیر کو وصیت کر دیتا ہے اور اپنے عزیز فرزند کو نہیں کرتا ہے، اسی لئے آیہ ترکہ نازل ہونے کے بعد سالم مال کے متعلق وصیت ناجائز قرار پائی تاکہ ورثا ترکہ سے محروم نہ ہو جائیں، مطلب یہ کہ ورثا کے سوا غیر کے لئے بھی شخص متوفی اپنے مال وغیرہ کے متعلق وصیت کر سکتا ہے، ملاحظہ ہوں کتب فقہ باب وصیت ایک کو وصی کرنے سے دوسروں کی شان میں فرق نہیں آتا۔ البتہ کسی خاص ایسی وصیت کا ذکر ہو جو کسی مذہب کے عقائد کے خلاف ہو تو اس کو مذہبی بحث کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال

اذا لم تحز فضلاً و صفو کمالہ فعقلک لا تبدی اللسان من الفم

سید نوازش علی لمعہ

ابو العلاء المعری

ابو العلاء احمد ابن عبداللہ ابن سلیمان شام کے شہر معرۃ النعمان میں ۳۶۳ھ م ۹۷۳ء میں پیدا ہوا معرۃ النعمان حلب کے جنوب میں اس سے ایک دن کے فاصلے واقع ہے، کہتے ہیں کہ پہلے اس شہر کا نام معرہ حمص تھا۔ لیکن مسلمانوں کے شام کو فتح کر لینے کے بعد اس کا نام معرۃ النعمان پڑ گیا۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اموی خلیفہ مروان ابن الحکم کی طرف سے نعمان ابن بشیر حمص کا عامل تھا اور اسی کے نام پر اس مقام کا نام رکھ دیا گیا، اس کے علاوہ نعمان کا ایک لڑکا بھی، وہاں مرا اور دفن ہوا تھا۔ مورخ بلاذری نے اس کی وجہ تسمیہ کم از کم یہ بیان کی ہے، دوسرے مورخ و جغرافیہ داں مثلاً یاقوت حموی اس کو نہیں مانتے اور دوسری وجہ بیان کرتے ہیں، لیکن کم از کم یہ یقینی ہے کہ نعمان کا لفظ اس کے نام کے ساتھ اس لئے لگایا گیا تھا کہ اسے ایک اور معرہ سے ممیز کیا جا سکے جو اسی نواح میں واقع تھا اور معرۃ مصرین کہلاتا تھا۔ نام کے پہلے حصہ کے متعلق بھی جغرافیہ دانوں کے مختلف خیالات ہیں، وہ صوبہ جس میں یہ شہر آباد تھا، ابو العلاء کے زمانہ میں عواصم کہلاتا تھا، بعض کے نزدیک اس نام کا اطلاق ایک وسیع سرزمین پر ہوتا تھا اور بعض اس کو محض حلب اور حمص کے علاقوں میں محدود کر دیتے ہیں اور ایک خیال یہ ہے کہ موخر الذکر دونوں اضلاع خصوصیت کے ساتھ اس علاقہ میں شامل نہ تھے، ابو العلاء کے زمانے میں یہ علاقہ حلب کے گورنر کے ماتحت تھا، معلوم ہوتا ہے کہ قبل اسلام سے ہی اس تمام علاقہ میں تنوخ کا قبیلہ آباد ہو گیا تھا اور اس سلسلہ کوہ کو جسے دریائے آورنٹیز سیراب کرتا ہے، اسی قبیلہ کا نام دے دیا گیا تھا، خصوصاً معرہ کے

متعلق یہ مشہور تھا کہ اس کے باشندے اسی قبیلہ کی اولاد میں سے ہیں۔ چنانچہ ابو العلاء کا بھی دعویٰ تھا کہ وہ تنوخی ہے۔

ابو العلاء نے خود اس شہر کا جو کچھ حال لکھا ہے، وہ نہایت ناخوش گوار ہے، مگر دوسرے مصنفین سے سوا اس کے ابو العلاء کے کسی اور بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اس میں دریا یا نہر بالکل مفقود تھی، مشہور عرب جغرافیہ داں ابن حوقل جو تقریباً اس وقت مرا ہے، جب ابو العلاء پیدا ہوا ہے، معرۃ النعمان کے متعلق بیان کرتا ہے کہ یہ ایک خوش حال شہر ہے، جہاں انجیر، پستہ، انگور اور دیگر میوے مل سکتے ہیں، ابن بطوطا کا بھی جو آٹھویں صدی ہجری میں یہاں آیا تھا، تقریباً یہی بیان ہے، اگرچہ آج کل شہر کی آبادی کم ہو گئی ہے، مگر موجودہ زمانے کے سیاح بھی اس کی سرسبزی اور شادابی کے معترف ہیں ابو العلاء نے معرہ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ وہاں علمی چہل پہل مفقود ہے، مگر دوسرے ذرائع سے وہاں کے باشندوں کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے، اس سے بھی ابو العلاء کے بیان کی تردید ہوتی ہے قبیلۂ ہذیل کی طرح قبیلۂ تنوخ میں بھی قبائلی اشعار کی کثرت تھی اور تیسری صدی ہجری میں شاعر ابو تمام کی سفارش سے یہاں کے لوگوں نے مشہور شاعر بحتری کی ایک ہزار درہم تنخواہ اس لئے مقرر کی تھی کہ شاعر نے شہر کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا، اور اتفاق سے یہ پہلی رقم تھی جو بحتری کو شاعری کے وسیلے سے حاصل ہوئی تھی، علاوہ ازیں اگرچہ ابو العلاء المعری اس شہر کا سب سے زبردست اور مشہور صاحب قلم تھا لیکن مختلف تاریخوں اور کتابوں میں اس شہر کے بہت سے شعراء کے نام پائے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ابو العلاء کے باپ کے رشتہ داروں میں اس سے قبل اور اس کے بعد بہت سے بڑے پائے کے علماء و فضلاء گزرے ہیں، اس کا دادا پہلے معرہ کا اور بعد میں حمص کا قاضی تھا، اس کا باپ ایک مشہور اور خاصہ اچھا شاعر تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابو العلاء کے بچپن ہی میں انتقال کر گیا تھا، اس کے مرثیہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مرنج و مرنجان

آدمی تھا، چنانچہ ابوالعلاء کا قول ہے کہ حشر کے دن وہ بیٹے سے بچنے کی کوشش کرے گا۔
اگر ایک فرضی افسانے پر یقین کر لیا جائے تو ابوالعلاء کا بھائی صالح ابن مرداس ۴۲۰ھ
کے زمانے تک زندہ تھا، ابوالعلاء کی ماں اس کے (۳۷) سال کی عمر تک زندہ تھی اور
ابوالعلاء کی ایک نثر اور ایک نظم موجود ہے جس میں اپنی والدہ کے مرنے کا افسوس کیا ہے وہ
سبیکہ کے خاندان سے تھی، جس کے بعض افراد شام کے شہروں میں ذمہ دار عہدوں پر
ممتاز رہ چکے تھے، یہ ہم کو معلوم ہے کہ ان میں سے ایک حلب میں مقیم تھا اور دوسرا دمشق
میں، لیکن تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں آتا، اگر ایک نظم میں جس میں ان کو مخاطب کیا گیا ہے
مبالغہ سے کام لیا گیا ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ زبردست سیاح بھی تھے، ابوالعلاء کے خطوط سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور ماموں کے تعلقات نہایت گہرے اور محبت آمیز تھے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں خاندان مذہبی عقائد کے لحاظ سے ایسے ہی خیالات
رکھتے تھے، جس کے لئے آخر میں خود ابوالعلاء اس قدر بدنام ہوا، اپنی زندگی کے آخری
حصہ میں اس نے اپنی نظم میں بعض لوگوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنی
تمام عمر میں کبھی حج نہیں کیا۔ اس کا جواب وہ اس طرح سے دیتا ہے کہ اس کے باپ برادر
عمزاد اور ماموں نے بھی کبھی حج کا فریضہ ادا نہیں کیا تھا، اگر ان لوگوں کا یہ گناہ خدا معاف
کر دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا گناہ بھی معاف نہ کر دیا جائے اور اگر وہ لوگ اس وجہ سے
معتوب ہیں تو عقبیٰ میں بھی ان کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

بچپن ہی میں یعنے اس کے سوانح نویسوں کے بیان کے مطابق ۳۶۷ھ میں جب کہ
اس کی عمر ساڑھے تین برس کی تھی، اس کے چیچک نکلی، جس سے نہ وہ صرف بدرو ہو گیا
بلکہ اس کی بائیں آنکھ تو اس صدمے سے بالکل جاتی رہی اور دائیں آنکھ کو نقصان
پہنچا، اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ آخر اس کی نظر کب تک قائم رہی، مگر اس کی نظموں میں
چونکہ ستاروں، پھولوں اور حروف تہجی کی شکل و شباہت کا اکثر ذکر آتا ہے، اس لئے یہ

قرین قیاس ہے کہ اس کی نظر اس صدمے کے چند سال بعد تک قائم رہی تھی، اس کے علاوہ اس امر کے اور شواہد بھی موجود ہیں، مگر اغلب یہ ہے اس کی تعلیم کا کوئی حصہ پڑھنے لکھنے سے حاصل نہیں ہوا تھا، اس کی آنکھیں تو بالکل جاتی رہی تھیں، مگر خدا نے آنکھوں کے نعم البدل کے طور پر اس کو بلا کا حافظہ عطا فرما دیا تھا، چنانچہ اس حافظہ کے متعلق جو حکایات عام طور پر مشہور ہیں، اگر ان میں سے مبالغہ کے جز کو نکال بھی دیا جائے تو بھی وہ اعجاز معلوم ہوتا ہے، اس کے شاگرد ابو ذکریا تبریزی کا بیان ہے کہ اس میں اور اس کے ایک ہم وطن میں آذر بائیجان کی زبان میں گفتگو ہوئی اور اگرچہ ابو العلاء اس زبان سے محض ناواقف تھا، مگر اس نے یہ تمام گفتگو لفظ بہ لفظ تبریزی کے سامنے دوہرا دی، اسی قسم کی اور حیرت انگیز حکایات بھی بیان کی جاتی ہیں، لیکن اگر ہم ان حیرت انگیز اور مبالغہ انگیز حکایات کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی [illegible] نے خطوط میں جس کثرت سے دیگر مصنفین کے اقوال نقل ہیں، ان سے ہم اس کے حافظہ کی تیزی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، یہ یقینی ہے کہ عربی علم ادب سے اس کو گہری واقفیت تھی، اگرچہ یہ واقفیت اکثر صحیح نہیں ہوتی تھی، اس کے اقوال کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دیدہ و دانستہ ان کے متعلق تمام حوالے دینے سے گریز کیا ہے۔

اس نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا ہے کہ بیس برس کی عمر سے اس نے شام یا عراق کے کسی باشندے سے نہ تعلیم حاصل کی اور نہ کسی قسم کی نقد مدد چاہی، اس طرح ہم اس کی زندگی کو بآسانی تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، حصول تعلیم کا زمانہ جو ۳۸۲ھ میں ختم ہو گیا، معرۃ النعمان میں قیام کا زمانہ جو آخر بغداد کے سفر پر تمام ہوا (سنہ ۳۹۸ و ۳۹۹ھ)۔ بغداد سے واپسی کے بعد معرۃ النعمان میں گوشہ نشینی کا زمانہ جو موت تک برابر قائم رہا۔

مورخین کے قول کے مطابق اس کی تعلیم اس کے باپ کے زیر اہتمام شروع ہوئی اور اس کے علاوہ اس نے معرہ میں یحییٰ ابن مشعر کی شاگردی میں حدیث کی تعلیم پائی، تعلیم کا باقی حصہ شام کے مختلف شہروں میں اس نے پورا کیا، سیف الدولہ حمدانی امیر حلب کی شہرت اور جود و سخا کی وجہ سے تمام مشاہیر علم وفضل اس وقت اس کے دربار میں جمع تھے اور بغداد کے بعد شام کی علمی شہرت وعظمت کا غلغلہ بلند تھا۔ ابو العلاء کے ایک اور ہم عصر ثعلبی نے اپنی مشہور آفاق کتاب یتیمۃ الدہر میں شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے، شامی شاعروں کو سب سے پہلے جگہ دی ہے، بلکہ کتاب کے دیباچہ میں ان امور پر بحث کی ہے، جن کی بنا پر اس کے خیال میں شامی شاعر تمام دیگر اسلامی ممالک کے شعراء پر سبقت لے گئے تھے، ان اہل علم وفضل میں جن کو سیف الدولہ کی بخشش کی کشش حلب میں لے آئی تھی، ایک خالویہ نحوی بھی تھا، جس کے درسوں میں تمام اسلامی ممالک کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے، ابو العلاء کی عمر ابھی سات برس ہی کی تھی کہ خالویہ مرگیا اور اس طرح ابو العلاء اس کے تعلیمات سے مستفید نہ ہو سکا، مگر اس نے یقیناً اس کے جانشینوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا، ان میں سے اس کا ایک استاد ابو القاسم المبارک معلوم ہوتا ہے، اس کے دوسرے استادوں میں وہ بنو کوثر اور محمد ابن عبداللہ ابن سعد کا ذکر کرتا ہے، اس زمانہ میں شام کے اکثر شہروں میں عالیشان کتب خانے تھے، چنانچہ صرف حلب ہی کے کتب خانہ میں (۲۰۰۰) کتابیں موجود تھیں، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے بعد ابو العلاء انطاکیہ اور طرابلس شام گیا اور یہاں کی بعض کتابوں کو حفظ یاد کر لیا، انطاکیہ میں اس نے اپنے حافظے کے بڑے بڑے کرشمے دکھائے، اس کے سوانح نگار کا قول ہے کہ "لتکیہ سے گزرتے ہوئے اسے ایک عیسائی راہب ملا، جس نے سب سے پہلے مذہب کی طرف سے اس کے دل میں ایسے شکوک پیدا کر دئیے جو ابو العلاء تمام عمر اپنے دل سے نہ نکال سکا۔"

ممکن ہے کہ سوانح نگار کا یہ قول صحیح ہو، لیکن عیسائی راہب کا جا و بے جا اکثر حکایات میں اس قدر ذکر آتا ہے کہ یہ واقعہ بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو مشکوک ہو جاتا ہے وہ آزاد خیالی جس کے لئے ابوالعلاء آخر میں بدنام ہوا، عیسائی راہب کے علاوہ اور دیگر اسباب سے بھی پیدا ہو سکتی تھی، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ متنبی کے اثر سے پیدا ہوئی ہو، شروع شروع میں جب ابوالعلا نے لکھنا شروع کیا تو اس نے متنبی کو جو اس زمانے میں شعر الشعراء سمجھا جاتا تھا، اپنا رہبر بنایا، یہ شخص بھی اپنے ہونہار شاگرد کی طرح آزاد خیال تھا اور اس کے آخری عمر تک کے اشعار اس قسم کی بد دینی اور آزاد خیالی سے خالی نہیں معلوم ہوتے، اگرچہ یہ ضروری ہے کہ اپنے مربی سیف الدولہ کی رومی فتوحات کی وجہ سے وہ اکثر جوش میں آکر اپنے مذہبی تعصب تنفر کا اظہار کر جاتا ہے، لیکن اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ابوالعلاء کے زمانے میں حالات و واقعات بہت کچھ بدل چکے تھے، اس کے وقت میں دو اسلامی اور ایک عیسائی طاقت کے درمیان پنجہ آزمائی ہو رہی تھی، اس میدان کارزار کا مرکز حلب تھا، چنانچہ ابوالعلاء کی زندگی میں اکثر مرتبہ خود حلب کو عیسائیوں نے اسلامی فاتحین کے ہاتھ سے بچایا تھا۔

ابوالعلاء کی تمام تعلیم معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب پر ہوئی تھی کہ جس سے وہ آخر میں شاعری کا پیشہ اختیار کرلے اور اسے اپنی وجہ معاش بنالے، کیونکہ تمام امور پر نظر رکھتے ہوئے، یہی ایک ایسا پیشہ تھا جس میں اس کا اندھاپن مانع نہ ہو سکتا تھا، چنانچہ کتاب الاغانی میں بہت سے ایسے شعراء کا حال موجود ہے، جو اندھے تھے اور ان میں سے ایک شاعر تو ایسا ہے، جس کی آنکھیں چیچک ہی کی وجہ سے جاتی رہی تھیں، قصائد و مدائح کے صلے میں بیش قرار رقوم شعراء کو عطا کرنے کا طریقہ خلفا نے ایجاد کیا تھا اور بنو عباس کے عہد میں جو صلے خلفاء کے دربار سے شاعروں کو ملتے تھے،

ان کا اثر گورنروں، وزیروں اور عام اہل دولت و ثروت لوگوں تک پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ وہ خلفاء بیش قرار صلے نہ دے سکتے تھے، مگر پھر بھی شعراء کی قدر دانی اور علم نوازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی ضرور کوشش کرتے تھے، کتاب الاغانی میں ان زبردست رقوم اور صلوں کے مطالعہ سے تعجب ہوتا ہے، جو بعض مرتبہ معمولی درجہ کے قصائد کے عوض میں شعراء کو دیئے جاتے تھے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کتاب الاغانی کے یہ بیانات بالکل صحیح اور اعلیٰ درجہ کی تحقیقات پر مبنی ہوتے ہیں، اس کے علاوہ عمارہ یمنی کی خود نوشت سوانح عمری سے، جو چند سال ہوئے ڈاکٹر ان برگ نے شائع کی ہے، اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے، عمارہ خود چھٹی صدی ہجری میں گزرا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام قصوں کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں معاً یہ خیال گزرتا ہے کہ اسلامی سلطنتوں میں شاعری کا فن اس قدر محدود کیوں تھا، اور شعراء کی تعداد کم ہونے کی کیا وجہ ہے، کیونکہ کام اور مزد میں جو تباین اس پیشہ میں پایا جاتا ہے، وہ شاید ہی دنیا کے کسی اور پیشہ میں پایا جاتا ہوگا، لیکن اس کی دو ایک وجہیں ہوسکتی ہیں، اول تو یہ کہ بعض لوگ شاعری کو ایک معزز اور شریف پیشہ نہ سمجھتے تھے، عہد عباسیہ کے بہترین زبردست ترین شعراء اپنے مربیوں کے آگے اس بری طرح اور ذلت سے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ کسی دیکھنے والے اور پڑھنے والے کو عار اور شرم آتی ہے، ان کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے شاعر تو اس گداگری میں اور بھی زیادہ ذلیل خوار ہو جاتے ہیں، اگر اس سے قطع نظر کرلی جائے تو بھی تمام مدائح جن سے شعرا کو صلہ اور انعام کی توقع ہوسکتی تھی، بالعموم کذب و افترا پر مبنی ہوتے تھے اور صداقت کا نام بھی ان میں نہ پایا جاتا تھا، اس ذلت و خواری کے علاوہ یہ پیشہ خطرے سے بھی خالی نہ تھا، دولت و ثروت کی ناپائداری مشہور ہے اور اس زمانے کے آئے دن کے سیاسی انقلابات میں یہ ناپائداری اور زیادہ بین و ظاہر ہوگئی تھی،

۵؎ کامل مطبوعہ یورپ جلد اول صفحہ ۲۶۹ و ۲۶۲۔ کتاب الاغانی جلد ۱۲ صفحہ ۱۱۲۔

شاذ ہی ایسا ہوتا تھا کہ ایک مربی آخر عمر تک کسی شاعر کے ساتھ سلوک جاری رکھ سکے،
اگرچہ یہ ضروری ہے کہ بعض شاعر کافی نقدی جمع کرنے کے بعد بالعموم درباروں سے
کنارہ کش ہو جاتے تھے، مگر ایسے شعراء کی تعداد بہت زیادہ تھی، جو انعامات کو فضول خرچی
میں اڑا کر ہمیشہ کسی نئے مربی کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے، شعراء پر بعض مرتبہ ایک
اور مصیبت پڑتی تھی، کسی مربی کی مدح سرائی کے بعد جب وہ اس کے قاتلوں یا دشمنوں کے
دربار میں جگہ پانے کی کوشش کرتے تھے تو وہی قصائد اور مدائح جو کسی زمانے میں حصول زر
کا باعث ہوئے تھے، اب ان کے لئے وبال جان ہو جاتے تھے اور اگرچہ بعض شعراء اپنی
خداداد قابلیتوں کی وجہ سے کسی دربار کی رونق و شان کو دوبالا کر سکتے تھے، لیکن بڑی
تعداد شعراء کی ایسی تھی، جو کسی طرح بھی نئے خداوندان نعمت کو خوش نہ کر سکتے تھے،
ان کی جو حالت اس قسم کے انقلابات کی وجہ سے ہو جاتی ہوگی، اس کا اندازہ بآسانی
ہو سکتا ہے۔

اگرچہ ابوالعلاء نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ اس کے اشعار کبھی کسی صلے کی توقع
میں نہیں لکھے گئے تھے، لیکن اغلب یہ ہے کہ وہ شروع زندگی میں یقینی طور پر شاعر کے
پیشہ کو اختیار کرنا چاہتا تھا، چنانچہ متنبی کی جس قسم کی تعریف اس نے اپنے اشعار میں
کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اصناف شاعری بلکہ جہاں تک
ہو سکے، اس کی زندگی کی بھی تقلید کرنا چاہتا ہے، ڈاکٹر ریو نے ظاہر کیا ہے کہ اس کے
پہلے قصائد سعد الدولہ حمدانی کی مدح میں ہیں، جو ۳۸۱ھ میں حلب کا امیر بنایا گیا تھا اور
یہ قصائد ۳۸۳ھ اور ۳۸۴ھ میں کہے گئے تھے، اس کے بعد کے قصائد میں فاطمی خلیفہ کے
ان دو قائدوں کی تعریف ہے، جن کو خلیفہ نے اس لئے روانہ کیا تھا کہ سعد الدولہ کو حلب
کی حکومت سے برطرف کر دیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ سے ہم کو اس بات کا
پتہ چلتا ہے کہ اس جنگ کے دوران میں اہل معرہ نے اپنے آپ کو حلب سے علٰحدہ کر لیا تھا

اور کیا یہ اغلب نہیں کہ ابوالعلاء نے بھی اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا ہو؟ اس کے دیوان سقط الزند میں مدائح بہت کم ہیں، لیکن جتنے بھی ہیں وہ ایسے اشخاص کے متعلق کہے گئے ہیں، جن سے صلے کی امید ہو سکتی تھی، مگر ساتھ ہی کم از کم ایک نظم ایسی بھی ہے کہ جس سے دیدۂ و دانستہ مدح کا حصہ خارج کر دیا گیا ہے اور ایک دوسرے میں اس بادشاہ کا نام بالکل خفیہ رکھا گیا ہے، جس کی شان میں یہ مدح لکھی گئی تھی، آخری زمانے کے بعض قصائد میں جب وہ کسی بڑے آدمی کی تعریف کرتا ہے، تو صاف طور پر یہ بھی ظاہر کر جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کے صلے یا انعام کا خواہش مند نہیں، بہر حال یہ خیال کہ شروع میں اس نے شاعری کا پیشہ یقیناً اختیار کیا تھا، لیکن فوراً ہی اس کو ترک کر دیا تھا، اس وجہ سے اور قوی ہو جاتا ہے کہ بیس برس کی عمر سے وہ ایک بالکل بے تعلقانہ زندگی بسر کرتا ہے اور دنیا میں کسی سے مدد کا خواہشمند نظر نہیں آتا۔

حصول تعلیم کے بعد جب ابوالعلاء اپنے وطن کو واپس آیا تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقف سے تیس دینار سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ رقم اس قدر حقیر تھی کہ معمولی سے معمولی شاعر صرف ایک قصیدہ کے صلے میں اس سے زیادہ پیدا کر سکتا تھا، لیکن اس وقت امیر حلب اور خلیفۂ مصر میں جنگ جاری تھی اور حلب کی حالت اس قدر ردی ہو گئی تھی کہ وہ یونانیوں سے مدد مانگنے پر آمادہ ہو گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ حلب کی رعایا کی مفلسی حد کو پہنچ گئی تھی، غالباً اسی مفلسی اور اسی قسم کی اور دیگر سختیوں کی وجہ سے جو سعید الدولہ اور اس کے وزیر لؤلؤ کی طرف سے غریب رعایا پر کی جاتی تھیں، آخر ۳۸۶ھ میں معرہ ریاح السیفی کے کہنے سے باغی ہو کر مصر سے مل گیا۔

بہت سی نظمیں جو ابوالعلاء کے دیوان سقط الزند میں شامل ہیں ۳۸۶ھ و ۳۹۹ھ کے درمیانی زمانے کی کہی ہوئی ہیں، یہ بھی بالکل بین ہے کہ رسائل ابوالعلاء میں سب سے پہلا خط المغربی کے ایک سرکاری مراسلہ کے جواب میں ہے اور المغربی نے فاطمی خلیفہ کے

دربار میں رسوخ پیدا کرنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ معرہ کے لوگوں سے ان تعلقات کو تازہ کرنا شروع کردیا تھا، جو اس سے قبل ان کے آپس میں قائم تھے، ابوالعلاء کے اس سرکاری مراسلہ کے جواب دینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اس وقت اپنے اہل وطن میں خاصی وقعت اور عزت پیدا کرلی تھی اور اس وقعت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے خط کو کس عزت و توقیر سے دیکھا گیا تھا، کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مدبر ہونے کی حیثیت سے المغربی کوئی درجہ نہیں رکھتا، لیکن پھر بھی وہ عہدے جو ابوالعلاء کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک مصنف کی حیثیت سے وہ بہت کچھ وقعت حاصل کرچکا تھا۔

اس زمانے سے پہلے ہی حلب کے والی لؤلؤ نے فاطمی خلیفۂ مصر کی اطاعت قبول کرلی تھی اور ۳۹۹ھ ہجری میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا جو اس سے قبل ہی حکومت میں اس کا حصہ دار تھا، اس کا جانشین ہوا، لیکن ابونصیر کی تخت نشینی سے قبل ہی وہ واقعہ پیش آچکا تھا، جو آخر میں ابوالعلاء کے بغداد جانے کا باعث بنا۔ کہتے ہیں کہ حلب کے عامل نے اس کے وظیفہ کو بند کرنا چاہا تھا اور ابوالعلاء اس غرض سے بغداد گیا تھا، کہ خلیفہ کی بارگاہ میں اس کے متعلق مرافعہ کرے، لیکن یہ ذرا بعید از قیاس ہے کیونکہ اس زمانے میں حلب کا عامل بغداد کا نہیں، بلکہ خلافت قاہرہ کا ماتحت تھا، بہرحال یہ ہوسکتا ہے کہ وظیفہ بند ہوجانے کی وجہ سے ابوالعلاء کو مجبوراً معرہ کو چھوڑ کر بغداد جانا پڑا ہو، اس کے رسائل اور نظموں میں کہیں وظیفہ کا ذکر نہیں آتا، لیکن ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بغداد اس ارادہ سے گیا تھا کہ وہاں مستقل طور پر مقیم ہوجائے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کچھ بعید از قیاس بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شخص جو ایک دور رو افتادہ مقام پر علمی شہرت حاصل کرچکا ہو، اسی میدان میں دارالخلافہ میں بھی قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہو، خصوصاً اس حالت میں کہ ہم کو معلوم ہے کہ دوسروں نے اسی لالچ سے بغداد

کے سفر کی زحمت اٹھائی تھی، ان لوگوں میں تبریزی کا نام بطور مثال کے پیش کیا جا سکتا ہے، خود ابو العلاء کی ماں نے بھی اس کو اس کی صلاح دی تھی اور اس کے ایک ماموں نے تمام مصارف سفر برداشت کئے تھے، ابو العلاء نے قاضی ابو الطیب طاہر کے نام جو اصل میں طبرستان کا رہنے والا تھا، لیکن اس زمانے میں بغداد میں مقیم تھا، خط بھی لکھنا شروع کیا تھا کہ وہ اس کے مکان میں مقیم ہونا چاہتا ہے، لیکن یہ خط کبھی پورا نہیں ہوا، کیونکہ معلوم ہوتا ہے، کہ ابو العلاء کو طاہر کے خصائل کا اندازہ ہو گیا تھا اور اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ انتہا درجہ کا بخیل ہے، لیکن جن خیالات اور جذبات کا اظہار اس نامکمل خط میں کیا گیا تھا وہ ایسے تھے کہ کسی اور موقع پر نہایت آسانی سے کام آسکتے تھے اور یہ موقع بہت جلد پیش آگیا۔

مسٹر کاؤپر نے اپنی کتاب "تھرو ٹرکش اریبیا" میں تین راستوں کا ذکر کیا ہے، جن سے حلب سے بغداد جا سکتے ہیں، ابو العلاء نے ان میں سے پہلے راستے کو اختیار کیا یعنے دریائے فرات کی وادی کے راستے کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں کشتی میں سوار ہوا تھا لیکن اگر وہ حلب کے راستے سے گیا ہو گا تو بالیس وہ مقام ہے، جہاں کشتی میں بالعموم سوار ہوتے ہیں، بہر حال ابو العلاء کی کشتی انبار پہنچی، یہاں سے ایک نہر کے ذریعے دریائے دجلہ کو راستہ جاتا تھا، اور یہی بغداد کا بہترین راستہ تھا، مگر کسی خاص وجہ سے یہ راستہ اس وقت بند تھا اور اسی سبب سے کشتی قادسیہ گئی تاکہ کسی اور راستے سے بغداد پہنچ سکے لیکن یہاں پر سلطان[1] کے افسروں نے اس کشتی پر بہ جبر قبضہ کر لیا اور ابو العلاء کو بے دست و پا چھوڑ دیا گیا۔

بغداد پہنچنے پر اس نے قدیم شہر کے حصے سویقہ کے ابن غالب میں رہائش اختیار کی، جہاں چند اور مشاہیر بھی مقیم تھے، قاضی ابو الطیب نے چند اشعار اس کی مدح میں

---

[1] سلطان سے مراد غالباً بغداد کا امیر الامراء ہے اور اس زمانہ میں بہاؤ الدولہ اس عہدے پر ممتاز تھا۔

لکھ کر بھیجے اور ابو العلاء نے ان کا فی البدیہ جواب دیا، ابو الطیب ابو حامد الاسفرائنی کا شاگرد تھا اور الاسفرائنی اپنی شہرت و عزت کی معراج پر پہنچ چکے تھے، اس کے علاوہ سلطان کو ان کی خاطر از حد منظور تھی، شاید اسی وجہ سے ابو العلاء نے ان کی معرفت یہ کوشش کی کہ ضبط شدہ کشتی پھر اس کو واپس مل جائے، لیکن الاسفرائنی بھی اس کے متعلق کچھ نہ کر سکے اور آخر کار ابو احمد حکاری نام ایک شخص کی معرفت وہ کشتی اصل مالکوں کو واپس ہوئی

قدیم روما کی طرح اسلامی شہروں میں بھی مصنفوں کے شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ یہی تھا کہ عوام میں کھڑے ہو کر اپنی نظمیں یا تصنیفات پڑھیں اور قدیم زمانے سے ہی مساجد اس مصرف کے لئے استعمال ہوتی تھیں، ابو العلاء کے زمانے میں بغداد کی مسجد المنصور اس کام آتی تھی، لیکن اس کے علاوہ مشاہیر شہر بھی اپنے مکانوں پر بڑے بڑے لوگوں کو جمع کیا کرتے تھے اور ان کے ذریعہ سے اپنی محفلوں کی رونق بڑھاتے تھے، ابن خلکان نے فاطمی خلیفہ نصر العزیز کے وزیر یعقوب کی ان علمی محفلوں کا ذکر کیا ہے اور اس بیان سے اس زمانے کی اسی قسم کی اور محفلوں کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ "ہر جمعرات کو وہ ایک مجلس منعقد کیا کرتا تھا جس میں وہ اپنے اشعار دوسروں کو سنایا کرتا تھا، ان مجلسوں میں قاضی۔ فقیہ۔ قاری اور نحوی اور دیگر مشاہیر جمع ہوتے تھے اور اس کی نظموں کے بعد عام شاعر کھڑے ہو کر اپنی نظموں سے لوگوں کو محظوظ کرتے تھے وغیرہ وغیرہ"

جس وقت ابو العلاء بغداد گیا ہے اس وقت ابو نصر سابور ابن اردشیر کا شہر میں شہرہ تھا اور وہ متعدد مرتبہ امیر بہاؤ الدولہ کا وزیر رہ چکا تھا، سابور شعراء کے ساتھ اس قدر سخا و جود سے پیش آتا تھا کہ ثعلبی نے اپنی یتیمۃ الدہر میں ایک پورا باب اس کے شعراء کے حال میں قلم بند کیا ہے، اسی مصنف کا بیان ہے کہ سابور کے شاعر حضرت شریف الرضی کے مکان میں بچہ پیدا ہونے کی تقریب پر سابور نے ایک ہزار دینار سے بھرا ہوا ایک طشت اس کے پاس بھیجا۔ الرضی نے اس کو جوں کا توں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ کسی

قسم کے تحفے نہیں لیتے، سابور نے اس کو پھر بھیجا کہ یہ رقم محض دائی کے انعام کے لئے ہے، الرضی نے اسے پھر یہ کہہ کر واپس کیا کہ سادات میں ایسے موقعوں پر خود خاندان کی عورتیں اس کام کو انجام دیتی ہیں، سابور نے وہ طشت تیسری مرتبہ الرضی کے پاس روانہ کیا اور کہا کہ اس رقم کو ان اہل علم وفضل میں تقسیم کر دیا جائے جو ان کے مدرسہ میں شامل ہیں، اب کے مرتبہ جب یہ طشت آیا تو ان لوگوں میں سے ایک شخص نے اس میں سے ایک دینار اٹھا لیا اور اس کا ایک ٹکڑا توڑ کر باقی کو پھر طشت میں ڈال دیا۔ اور کہا کہ کل رات مدرسہ کا مہتمم موجود نہیں تھا، اس لئے تیل قرض لینا پڑا تھا اور اس کی قیمت وہ اس سے ادا کر دے گا، یہ سن کر شریف الرضی نے بہت سی کنجیاں تیار کرائیں اور ہر ایک شخص کو ایک ایک تقسیم کر دی، تاکہ مہتمم کے غیاب میں ان کو جس چیز کی ضرورت ہو وہ مدرسہ کے مخزن سے بلا تردد حاصل کر سکیں۔ (ترجمہ)۔

(باقی آئندہ)

محمد جمیل الرحمن

حیات تمدن

حصہ اوّل

عہد سلف

بہ سلسلۂ گزشتہ

پیش قدمی اصول مسالمت پر ہوتی تھی، چنانچہ ولید نے اپنی طرف سے ایک خط راجہ **قنوج** کے نام لکھ کر محمدؐ بن قاسم کے پاس بھیجا کہ یہ خط راجہ کے پاس بھیجا جائے۔ **اودے پور** تک دس ہزار سواروں کے ساتھ قاصد **حکیم شیبانی** آیا۔ یہاں سے اس کا قاصد **زید بن عمرو کلابی** راجہ قنوج کے دربار میں حاضر ہوا جو اس وقت ہندوستان کا نامور دربار تھا، راجہ نے سخت کلامی کے ساتھ ایلچی کو واپس کیا، پیش قدمی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن مشیت ایزدی یہی تھی کہ اسلامی سرحد اس وقت اسی حد تک ہو، ۹۵ھ میں حجاج مرگیا اور اس کے آٹھ مہینے کے بعد ولید بھی سلیمان کو ولی عہدی سے معزول کرکے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانے کے خیالات میں اس دنیا سے کوچ کرگیا، سلیمان نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی اپنے تمام مخالفین سے بدلا لینا ضروری سمجھا، قتیبہ اور موسیٰ بن نصیر کی طرح محمدؐ بن قاسم بھی، نہ صرف معزول کرکے واپس طلب کیا گیا بلکہ واسط میں قید کیا گیا اور اسی حالت قید میں یہ نامور فاتح دنیا سے اٹھ گیا، خود ہندوؤں نے اس کا سخت ماتم کیا، اس کی یادگار میں اس کی مورت بنائی۔

بہرنوع حجاج اور محمدؐ بن قاسم نے جو نیا ملک حاصل کیا تھا وہ بدستور اسلامی صوبہ رہا

عام طور پر جو یہ خیال تاریخ میں داخل ہو گیا تھا کہ "سندھ کچھ بہت مدت تک مسلمانوں کے تصرف میں نہیں رہا" وہ عربی تاریخوں سے بے خبری کی بنا پر تھا، جب سے سندھ اسلامی عملداری میں آیا، مغربی ڈپلومیسی کے دور دورہ تک وہ اسلام ہی کے زیر نگیں رہا، سر ہنری ایلیٹ اور عبدالحلیم شرر تاریخ ہند کے اس حصہ کو روشنی میں لا چکے ہیں[1]، بلکہ یہ واقعہ بھی نوٹ کے قابل ہے کہ دربار سندھ میں جو عرب پناہ گزیں موجود تھے اور جنھیں داہر کا پس ماندہ جے سنگھ اپنے ساتھ کشمیر لے گیا، ان میں حمیم بن سامہ بھی تھا اور جو علاقہ جے سنگھ کو دربار کشمیر سے بہ طور جاگیر ملا وہ جے سنگھ کے مرنے کے بعد حمیم ہی کو ملا کیونکہ رعایا اس سے خوش تھی اور کشمیر کے راجہ اس کی عزت کرتے تھے، چچ نامہ کے زمانہ تک اس علاقہ کی حکومت حمیم ہی کے خاندان میں چلی آرہی تھی (کشمیر میں بھی اسلامی آبادی ہی اصلی باشندوں کی آبادی ہے)۔

سنہ ۱۰۰ھ میں خطوط اور سفارتوں کے ذریعہ سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ہند کے تمام راجاؤں کو اسلام کی تبلیغ کی، چنانچہ بعض راجاؤں نے اسلام قبول بھی کرلیا، دوسری صدی کے اوائل میں ہشام کے زمانہ میں جنید والی سندھ تھا جس نے پھر پیشقدمی کا سلسلہ جاری کیا۔ ماڑواڑ اور مالوہ تک اس کی پیش قدمی ہوئی، اس زمانہ میں محمد بن قاسم کا بیٹا عمرو بھی سندھ میں آیا، اولاً وہ والئ وقت حکم کا مشیر خاص تھا۔ حکم نے دریائے اٹک کے دہانہ کے مشرق طرف شہر محفوظہ آباد کیا تھا، عمرو نے بھی اپنی فتح کی یادگار میں دریائے سندھ کے دہانہ کے مغربی کنارہ پر منصورہ آباد کیا، جو اس کے بعد ایک عرصہ تک سندھ کا دارالامارہ رہا۔

---

[1] عبدالحلیم شرر نے سندھ کی تاریخ جس حد تک روشن کردی ہے اس کے لحاظ سے ضرور تھا کہ عام طور سے اس کی وسعت کے ساتھ اشاعت اور شہرت عمل میں آئے۔ ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں افسوس ہے کہ اس سینہ کاوی کا کوئی نمایاں اثر اب تک قائم نہیں ہوا ہے، تاریخ تو روشن کی جا چکی ہے، لیکن ملک کے ذمہ دار جماعت ہائے تعلیمی کو متوجہ کرانے کی ضرورت ابھی باقی ہے ۱۲

سندھ عرب آبادی کی وجہ سے بالکل شام کا ایک نمونہ نظر آتا ہے، عربی وضع قطع جو دمشق میں نکلتی ہے وہ ملتان منصورہ میں بھی فوراً آجاتی ہے، علمی اور مذہبی حلقہ ہائے درس سندھ میں بھی اسی طرح ہیں، جس طرح اور دنیائے اسلام میں، چنانچہ دوسری صدی کے مشہور محدثین میں ابو معشر السندی کا نام بھی ممتاز طور پر نظر آتا ہے[1]، ابوعطا سندی نامور عربی شاعر ہے اور یہی اثر یہاں کے باشندوں پر پڑتا ہے، بقول بی پوٹن "سندھ کا ہندو آدھا مسلمان ہے"، سندھی زبان عربی ادب کے اثر سے بھری ہوئی ہے، بہت سے عربی ترجمے اس میں موجود ہیں۔

انقلاب حکومت۔ سنت بوبکرؓ و عمرؓ کے عوض سنت کسریٰ و قیصر کو رواج دینے کی بحث ایک ہزار مہینوں کی مدت (۸۳) سال میں حکمراں قوت کو نصرت اہل بیت رسالت کے نام سے سیاہ جھنڈے کے نیچے ہزارہا خراسانیوں وغیرہ سے کچل دیتی ہے، لیکن اس انقلاب سے بجائے احیاء حق سنت کسریٰ و قیصر کا نشہ دوبالا ہو جاتا ہے بقول امام ظاہریہ ابن حزم "بنی امیہ کی دولت باوجود اپنی خرابیوں کے ایک عربی دولت تھی، انھوں نے مسلمانوں کو مجبور نہیں کیا تھا کہ ان سے عبودیت اور شاہانہ طریقہ کے ساتھ خطاب کریں، یا زمین یا پاؤں کو بوسہ دیں، ان کا اصول نہایت دور و دراز علاقوں میں اپنی حکمرانی تھی، جیسے اندلس۔ چین۔ سندھ۔ خراسان۔ آرمینیا۔ یمن۔ شام۔ عراق۔ مصر۔ مغرب وغیرہ کل اسلامی دنیا، بنی عباس کی سلطنت گویا ایک عجمی (ایرانی) سلطنت تھی، جس میں عربی حکومت معدوم ہو گئی اور خراسان کے عجمی برسرکار ہو گئے، سلطنت ایک کسروی انداز میں آگئی، ہاں مگر یہ بات ضرور تھی کہ کسی صحابی کو علانیہ برا نہیں کہا جاتا تھا"

مسلمان ایرانی عربی سیکھنے کے بعد عربوں کو ہٹا کر اگرچہ دیوانی انتظام پر پھر مثل سابق قابض ہو گئے (جو حجاج کے زمانہ میں براہ راست عربوں کے ہاتھ میں لے لیا گیا تھا) لیکن جب تک زبردست خلفاء کا ہاتھ موجود تھا، عربی اعلیٰ اقتدار قائم رہا۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔

اندلس شیرازۂ خلافت سے اگرچہ اسی وقت الگ ہوگیا تھا، لیکن باقی اسلامی دنیا بدستور خلافت کے زیر حکم اور ان میں تمدنی بہار تازہ ہو رہی تھی، چنانچہ سندھ میں بھی منصور کے زمانہ میں تازگی پیدا ہوگئی، مہدی کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیز کی تبلیغی مشن تازہ کی گئی ہندوستان کے بھی بعض راجہ مسلمان ہوئے، ہارون الرشید کے زمانہ میں ہندوستان سے تعلقات اور بڑھ گئے، متعدد ہندی اطبا بغداد میں بلائے گئے، مامون کے زمانہ سے سندھ میں بعض ایسے حکام قائم ہو گئے، جنہوں نے بجائے والی صوبہ کے راست دربار خلافت سے سند حاصل کر لی جس کو آئندہ خود مختار حکومتوں کا دیباچہ سمجھنا چاہئے۔

تیسری صدی ہجری۔ ترک عربی جمعیت کی جگہ لیتے اور سپہ سالار دربار عرب بنتے ہیں۔

عربی خلافت اور ایرانی دیوان کے ساتھ اب ایک اور تازہ جز فوجی طاقت کا قائم ہوتا ہے، سمرقند و فرغانہ کے ترک غلام، جو نسل عرب و عجم دونوں سے الگ تیسری نسل سے تھے، شروع شروع میں صوبہ داران ترکستان کے پاس سے بطور تحفہ و ہدیہ دربار خلافت میں پیش کئے جاتے تھے اور وہ دربار کے خاص خدمتی بنائے جاتے۔

طاقتور فوج (یمنی، مصری، خراسانی) کی قوت توڑنے کے لئے جس کی خلفا تاب نہیں لا سکتے تھے، یہ غریب الوطن نو وارد، جو مقامی سرغنوں سے بے تعلق ہوتے، خلفاء کے لئے ایک کارگر آلہ ثابت ہوئے، اور اسی طرز عمل سے جس کی کامیابی ثابت ہو رہی تھی، بہت جلد ان ہی کی خاص زرق برق وردی پہنی ہوئی جمعیت، ۲۰ ہزار سے زائد کی مرتب ہوگئی اور بالآخر وہی سپہ سالار دربار عرب بن گئے، ان کے رہنے کے لئے خاص سر من رائی بسایا گیا۔

عربوں کے اقتدار چھن جانے پر اس زمانے کے شاعر دعبل خزاعی نے اس طرح قومی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

لقد ضاع امر الناس حیث یسوسہم وصیف واشناس وقد عظم الخطب

ترجمہ لوگوں کا کام بگڑ گیا جب کہ وصیف و اشناس (دو مشہور ترک افسر) ان پر حکومت کرنے لگے ہیں سخت مصیبت آگئی۔

وهمك ترکی علیه حضانته　　ما انت له ام وانت له اب

ترجمہ (اے معتصم تیرے خیال میں ذلیل ترک ہی بسا ہوا ہے، تو ہی اس کے لئے ماں ہے اور تو ہی اس کا باپ ہے۔)

معتصم نے عربوں کو دفتر فوج سے خارج کر دیا اور عربی اقتدار کے ضعف کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی حرکت مذبوحی بآسانی ٹھنڈی ہو گئی، کسی قوم کا تنزل اسی وقت ہوتا ہے، جب اس کی قابلیت سلب ہو جائے۔ بغداد کے ناز و تنعم نے بطحا و عرب کے جذبات جواں مردی سرد کر دیے تھے اور سنت الٰہی کا عمل لازمی تھا۔

ترک خلیفہ گر بنتے ہیں

معتصم سمجھتا تھا کہ یہ نئی فوج خاندان خلافت کے لئے قوت بازو ہو گی لیکن سنتہ اللہ قومی طاقت کے زوال کے ساتھ قوم کی حکمراں ہستی باقی نہیں رکھتی، معتصم کا مرنا ہی تھا کہ اس کے کمزور جانشینوں کے زمانہ میں، یہی سمرقندی غلام، خلیفہ گر بن گئے اور تمام بیش بینی اکارت گئی۔

ان هذا من اعاجیب الزمان　　بان مملوکی فاضحی مالکی

ترجمہ (یہ عجائبات زمانہ سے ہے　　میرا غلام میرا آقا بن گیا۔)

دعبل کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔

وانی لارجوان تمائی من مغیبها　　مطالع شمس قد یغص بها الشرب

ترجمہ (مجھے امید ہے کہ اپنی مغرب سے آفتاب نکلے گا اور زندگی تلخ ہو جائے گی)۔

(باقی آئندہ)

مرتضیٰ

نقد سخن

از حضرت آصف غفراں مکاں

تھوڑے بھی تو معشوق کے احسان بہت ہیں
دو چار بھی نکلیں تو وہ ارمان بہت ہیں

جھگڑے تو ہزاروں ہیں، مگر بات ہے اتنی
ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں

دل ڈھونڈ رہا ہے انھیں اے ناصح مشفق!
وہ کام محبت میں جو آسان بہت ہیں

مایوس نہ ہو کوئی زمانے میں خدا سے
ہونے کے لئے، غیب سے سامان بہت ہیں

زاہد سے قیامت میں بھی دبنے کے نہیں رند
اس کے لئے ہر حال میں، ہر آن بہت ہیں

دیوانوں کو جنت ہے، ترا سایۂ دیوار
ہاں! خاک اڑانے کو بیابان بہت ہیں

وعدہ نہیں کرتے ہو کبھی وصل کا ہم سے
کیا پوچھتے ہو؟ دل میں تو ارمان بہت ہیں

دل جتنے شکستہ ہیں، اگر کیجئے گنتی
ٹوٹے ہوئے ان سے ترے پیمان بہت ہیں

آتے ہیں خدا جانے تصور میں وہ کیونکر
دربان وہاں ان کے نگہبان بہت ہیں

ہاں دیکھنے والے کو نظر اور پرکھ ہو
انسان جنھیں کہئے وہ انسان بہت ہیں

دل لے کے کیا مجھ سے سلوک آپ نے کیا خوب
یوں مفت جتانے کو تو احسان بہت ہیں

کچھ اور ہو غم حضرت آصف کی بلا کو
ہاں! تیری محبت میں پریشان بہت ہیں

مراۃ الحال

جہانِ اہلِ جہاں کی یہ زندگانی ہے
کہ کاروانی ہیں وہ یہ سرائے فانی ہے

جواں کا ہے بھروسہ نہ بوڑھے نہ بچے کا
اگر ہے نام بھی زندہ تو صرف اچھے کا

گدا و شاہ برابر ہیں موت کے آگے
قضا سے بھاگے بھی کوئی تو پھر کہاں بھاگے

قوی ضعیف بہادر شجیع و دانشمند
اجل نصیب ہیں سب اپنے وقت کے پابند

دوام عیش و خوشی ہے نہ رنج و غم ہے مدام
جما نہ جم کا قدم بھر گیا جو عمر کا جام

غرض جہان میں سب چار دن کے ہیں مہمان
صحیح ہے حکمِ خدا کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

یہ جانتے ہیں یقیناً کہ موت آتی ہے
یہ مانتے ہیں قضا ایک دن بلاتی ہے

مگر خدا کا غضب ہے یہ ہم ہیں غفلت میں
وہی شعار ہے جو آگئی طبیعت میں

اگر حسد تو حسد کینہ ہے تو کینہ ہے
خزینہ ہائے خباثت ہمارا سینہ ہے

نہ دیکھ سکتے ہیں اچھوں کو مہر و الفت سے
نہ دیکھتے ہیں بروں کو نگاہ عبرت سے

نہ اپنے مذہب و ملت سے ہم کو الفت ہے
نہ اپنے دین کے رہبر سے کچھ محبت ہے

تباہ قوم جو ہوتی ہے اور ہونے دو
ہنسیں گے ہم تو کوئی رو رہا ہے رونے دو

نصیحت اوروں کو کرتے ہیں اور آپ خراب
عذاب خیر عمل جانتے ہیں کار ثواب

بگاڑ پر ہے نظر طرز نہ خیر خواہانہ
بنا ہے حکم خدا و رسول افسانہ

نہ پاس قوم ہے ہم میں نہ جوش ملت کا
یہی ہوا ہے سبب آج اپنی نکبت کا

پڑھیں جو چار کتابیں تو ہو گئے عالم
ملا جو کام ذرا سا تو بن گئے ظالم

صفات بھائیو کیا کیا ہیں ہم میں غور کرو
خدا کے واسطے اب فکر اپنی اور کرو

بھلا کہو تو کہ کب تک ہماری یہ غفلت
برائے حسن ترقی ہو کس قدر مہلت

خدا نے امت مرحومہ کا شرف بخشا
ہمارے واسطے بھیجی شریعت غرا

تمام دینوں پہ بیشک ہمیں فضیلت ہے
صفات اپنے جو دیکھو تو کیا فضیحت ہے

خدا کے واسطے باز آؤ اب تو غفلت سے
نہ بے خبر رہو للہ دین ملت سے

کرو برائے خدا پیروی دین متیں
کہ پھیل جائے جہاں میں تمہارا دین مبیں

بتاؤ صنعت و حرفت کے کام تم بھی کچھ
نکالو یورپ و لندن میں نام تم بھی کچھ

نفاق و بغض کو چھوڑو بڑھاؤ الفت کو
اسی سے پاتا ہے ہر ایک جہاں میں راحت کو

یہ خانہ جنگی سے برباد ہو رہے ہیں ہم
اسی سے خادم حساد ہو رہے ہیں ہم

جو اتفاق سے رہتے تو ہم بھی کرتے کام
نہ اس طرح سے بزرگوں کا ہم ڈبوتے نام

نہیں ہے کوئی بڑی بات ہم اگر چاہیں
وہی ہیں ہم وہی گردش ہے اور وہی راہیں

وہی ہے یار وہی ہم ہیں اور وہی راتیں
وہی ہے حرف و حکایت وہی ہیں سب باتیں

مگر ہے فرق تو یہ ہے کہ جذب دل کم ہے
یہی بڑی ہے مصیبت یہی بڑا غم ہے

وگرنہ شاہد اسلام کی وہی ہے آن
ہزار جان سے قدموں پہ اس کے میں قربان

اسی سے دونوں جہاں میں نجات ممکن ہے
نہیں تو موت کا دن سوچ لو برا دن ہے

لکھا ہے شمس نے جو کچھ وہ واقعی حال ہے
تو خواہی از سخنم پند گیر خواہ ملال

محمد شمس الدین شمس

غزلیات

(از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم)

میری چپ کھٹکی دل اغیار میں | بولتا ہوں کیا زبان خار میں؟
ہے دوائے درد دل بازار میں | کون جائے مجمع اغیار میں
یار دل میں، ہم خیال یار میں | اور ہیں رسوائیاں بازار میں
دونوں شامل ہیں مرے آزار میں | فرق ہے پھر یار میں، اغیار میں
مر گئے ہم اک نگاہِ یار میں | کیا ملا تھا شربت دیدار میں؟
اک ہوا تھی، شوق سیر گل نہ تھا | اب بہار آیا کرے گلزار میں
ہائے ہم نے لطف صحبت کھو دیا | حجتوں میں، بحث میں تکرار میں
خضر کی بھی زندگی مشہور ہے | ہم بھی جیتے ہیں، فراق یار میں
جس ہوا سے غنچہ ہائے دل کھلیں | وہ ہوا چلتی نہیں گلزار میں
دم نکلتا ہے، تو نکلے شوق سے | جان جاتی ہے، تو جائے پیار میں
مسکرانے کا، تو کیا کہنا مگر | یہ کوئی اقرار ہے، اقرار میں؟
کیوں نہ رسوائی مری جھنڈے چڑھے | اب سما سکتی نہیں بازار میں
ہیں وہی دل کی امیدیں برقرار | کچھ نہ کچھ نفی ہے، ترے انکار میں
اب کہاں جائیں، قفس کو چھوڑ کر؟ | رہ چکے ہیں، مدتوں گلزار میں
لخت دل سب باندھ کر رکھ لوں، مگر | دم نہیں ہے آنسوؤں کے تار میں
دل ہمارا لے لیا، اچھا کیا | شوخیاں کم تھیں، نگاہ یار میں

آج تو کیفی کی صورت دیکھ لی
نام دیکھا تھا کسی اخبار میں

(از جناب مولوی سید امین الحسن صاحب رضوی بسمل)

بھیجد یتا ہے اثر عرش بریں سے کوئی
میری سن لیتا ہے واللہ یہیں سے کوئی

مفت احسان ہی ہوجاتا ہے کرلو اقرار
جانتے ہو کہ نہ پائے گا، نہیں سے کوئی

جان جاتی ہے کسی کی کسی کافر کے لئے
کاش کہ ہو سکے تدبیر تمہیں سے کوئی

دل میں بے پردہ بنا بیٹھا ہے دل کا مالک
پھر ستم یہ ہے کہ چھپتا ہے ہمیں سے کوئی

بانکے قاتل کی اداؤں پہ کروں میں قرباں
اور سو جانیں مجھے لادے کہیں سے کوئی

ایک نگاہ غلط انداز تمھاری بس ہے
دل بچالے گا بھلا تم سے حسیں سے کوئی

لذت کافریٔ عشق الٰہی توبہ
دل لگا دیکھے تو اس دشمن دیں سے کوئی

کم نگاہی سے ترے اور بڑھیں گے ارماں
کام نکلا ہے کبھی چین جبیں سے کوئی

سر بازار ہے رسوائے محبت بسمل
کاش جا کر کہے اس پردہ نشیں سے کوئی

از جناب مولوی محمد قطب الدین علی صاحب تسلی حیدرآبادی

ادا یہ حور میں، یہ شوخیاں پری میں کہاں
جو بات آپ میں ہے، وہ بھلا کسی میں کہاں؟

خیال یار بھی، اب جوش بے خودی میں کہاں
حواس کس کے ٹھکانے ہیں؟ جی ہی، جی میں کہاں

تری ادائے تبسم سے اس کو کیا نسبت؟
یہ دل ربائیاں کھلتی ہوئی کلی میں کہاں

یہ سچ ہے، کوئی وفا بے وفا سے کرتا ہے؟
مجھے تمیز ہے، لیکن بری بھلی میں کہاں

کوئی گھڑی، کوئی پل، سکھ سے چین سے گزرے
مبارک ایسے دن، اس دل کی زندگی میں کہاں

وہ ہائے تیرا بگڑ بیٹھنا، مچل جانا
رکاوٹوں کے مزے، بے تکلفی میں کہاں

جفا اور ایسی جفا پر، وفا تسلی کی
ذرا سی بات ہے، لیکن یہ ہر کسی میں کہاں

النسآء

دکن کا واحد اور پہلا زنانہ ماہوار پرچہ زیر ادارت بیگم صاحبہ

عالیجناب سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹرایٹ لا حیدرآباد سے

ہر ماہ ہلالی کو نکلتا ہے قیمت سالانہ ے/ دفتر النساء صغرا منزل

ہمایوں نگر سے طلب کر لیا جائے

بیگم صاحبہ کی مندرجہ ذیل تصانیف دفتر النساء سے ملتی ہیں

مشیر نسواں ۸/ تحریر النساء عہ/ سفینۂ نجات ۴/

مجموعۂ نصائح ۵/ سفرنامۂ عراق عہ/ سیر بہار و بنگالہ ۸/

سفرنامۂ پونہ و مدراس وغیرہ ۸/ روزنامچہ دہلی و آگرہ وغیرہ ۸/

پروفیسر الیاس برنی

کا

مشہور و مقبول سلسلہ منتخبات نظم اردو

۱۔ **معارف ملت**۔ حمد، نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ۔ جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم۔

۲۔ **مناظر قدرت**۔ اوقات۔ مقامات۔ مخلوقات اور واقعات کی تصاویر کا دلکش مرقع۔ جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم۔

۳۔ **جذبات فطرت**۔ سب دلوں کی کہانی چند شاعروں کی زبانی بقول غالب۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم۔

نوٹ ہر حصہ کی چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔

اپنی غیر معمولی شہرت اور قبولیت کی بدولت اب یہ سلسلہ کسی مزید تعارف اور سفارش کا محتاج نہیں۔ اس کی کتابیں اردو کے شائقین میں ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں اور ہندوستان کے اکثر صوبوں کے مدارس میں داخل نصاب ہو چکی ہیں۔ جلد پاکیزہ۔ قیمت فی جلد مجلد صرف ایک روپیہ۔

اسرار حق

مرتبہ

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

آیات قرآنیہ۔ احادیث نبویہ۔ ارشادات صدیقین و اکابر دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان سب کا نہایت جامع اور مربوط انتخاب۔ اور ان کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لب لباب جس سے خود بخود اسلام کے حقائق و معارف اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں تصوف کی تحقیق و تصدیق میں بعض لحاظ سے یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ قابل دید ہے۔ حجم تقریباً چار سو صفحہ جلد پاکیزہ قیمت صرف (عہ)

مندرجہ بالا کتابیں ملنے کا پتہ

سمی احمد صدیقی۔ بر دولت خانہ محمد الیاس برنی صاحب سیف آباد حیدرآباد دکن

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۲۳

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابوالمکارم صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

باہتمام مرزا غلام جیلانی بیگ

گنگا ساگر پریس میں چھپکر

دفتر رسالہ ترقی اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتہ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائیگا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کردئیے جائیں گے۔

(۵) خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط وکتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعہ خط وکتابت یا بالمشافہ طے ہوسکتا ہے۔

(۸) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ (ص) ششماہی (ﷲ) نمونہ ۸/

منیجر

جلد ۱ ـــــ ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ ـــــ نمبر ۳

فہرست مضامین

نشآت

سالگرہ نمبر۔ سالگرہ مبارک کی تقریب مسعود پر خاکسار ایڈیٹر کے جوش عقیدت کا تقاضہ ہے کہ ماہ آیندہ میں خاص اہتمام سے سالگرہ نمبر نکالا جائے۔ رسالہ کے معمولی حجم میں بھی کچھ اضافہ ہوگا۔ ہم اپنے قلمی معاونین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ "ترقی" کے سالگرہ نمبر کو ہر طرح شاندار بنانے میں عقیدت کیش ایڈیٹر کی پوری مدد فرمائینگے۔

سحابی استرآبادی مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کسی مزید تعارف سے مستغنی ہیں۔ کیونکہ سید صاحب موصوف نے اپنے اعلیٰ مضامین کے ذریعہ جو مختلف رسایل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے، کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ مضمون بالا سید صاحب ہی کے جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں آپ نے کسی قدر اختصار کے ساتھ سحابی کے سوانحی حالات جمع کردئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کسی آیندہ نمبر میں سحابی کی شاعرانہ نکتہ سنجیوں پر قلم اٹھاکر ناظرین "ترقی" کو محظوظ فرمائینگے۔

خواب کی باتیں ظرافت نگاری کو بھی محاسن ادبی میں شمار کرنا چاہئے۔ ناظرین کرام کو اس شوخ نگاری کے لئے جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہئے۔

زمانہ۔ جس طرح "دارالترجمہ" اور "انجمن ترقی اردو" کے ذریعہ متعدد مفید کتابیں زبان اردو میں منتقل ہورہی ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ ایسے مضامین جو علوم جدیدہ و فنون محدثہ پر مشتمل ہوں رسائل میں کثرت سے شایع ہوا کریں۔ تاکہ ملک کا مذاق لطائف ادبی کی معمولی سطح سے گزر کر علوم جدیدہ کی خوشگوار فضا میں پہنچ جائے۔ ہم جناب مولوی نصیر احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ صاحب موصوف نے نہایت محنت سے یہ مضمون تیار فرمایا۔ جس سے ناظرین کرام کو طبقات الارض سے متعلق بہت سی مفید اور نئی باتیں معلوم ہونگی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مولوی صاحب موصوف اسی طرح اپنی قلمی اعانت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

خوشی کی بات ہے کہ آج کل ہمارے ملک کی خواتین میں بھی ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ حیدرآباد سے ایک ماہواری رسالہ "خادمہ" کے نام سے شایع ہوا ہے جس کے اب تک دو نمبر نکل چکے ہیں۔ ہم "خادمہ" کا خیر مقدم کرتے ہوے اپنے ناقدانہ خیالات آیندہ نمبر تک محفوظ رکھتے ہیں۔

جلد (۱) ——— ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ ——— نمبر (۴)

سحابی استرآبادی

مولانا کمال الدین سحابی کے حالات ان تمام تذکروں میں مذکور ہیں جو گیارھویں صدی ہجری کے آغاز سے اس وقت تک ضبط تحریر میں آئے ہیں۔ علاء الدولہ قزوینی کی کتاب نفایس المآثر سب سے پہلی کتاب ہے جس میں مولانا سحابی کا ذکر آیا ہے۔ یہ کتاب شہنشاہ اکبر ۹۶۳ھ سنہ ۱۰۱۴ھ کی زندگی میں سنہ ۹۹۰ھ سے پہلے تصنیف ہوئی ہے۔ اس کے تقریباً چار سال بعد سنہ ۹۹۳ھ میں میر تقی الدین کاشی نے اپنا تذکرہ خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار تصنیف کیا ہے۔ پہلی کتاب اگرچہ ہماری نظر سے نہیں گزری تاہم ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مولانا سحابی کا حال نہایت مختصر اور ناکمل درج ہے مصنف نے صرف نام اور چند رباعیاں نقل کر دیے ہیں برخلاف اسکے تقی کاشی نے کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ

"مولانا سحابی دار الفتح استرآباد کے رہنے والے تھے۔ وطن سے نکل کر عراق عرب میں"
"آئے ائمہ طاہرین کی زیارتوں سے فارغ ہو کر نجف اشرف میں مقیم ہوے بیس سال سے"
"زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ مشہد جناب امیر علیہ السلام میں سکونت پذیر ہیں۔ سنہ ۹۹ھ"

"میں جب فقیر نجف اشرف میں پہنچا تو مولانا ناطقی استرآبادی کے ساتھ انکی خدمت"
"میں حاضر ہو کر شرف ملاقات حاصل کیا اور انھیں درویش اور زہد و عبادت میں اپنی"
"زندگی بسر کرتے ہوے پایا۔"

مولانا سحابی کی اخیر عمر میں ان کی وفات سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے ۱۰۰۲ھ میں امین احمد رازی نے اپنا مشہور تذکرہ ہفت اقلیم تصنیف کیا ہے اس میں شعرائے استرآباد کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ

"مولانا سحابی سالہا سال سے آستانہ نجف اشرف میں جاروب کشی کرتے ہیں اور اس"
"مسجد میں جو ضریح مبارک کے روبرو واقع ہے سکونت رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ تیس سال سے"
"انھوں نے آستانہ مبارک سے باہر کوچہ و بازار میں قدم نہیں رکھا ایک حصیر اور ایک"
"ابریق خشتی کے سوا کوئی سامان دنیوی انکے پاس نہیں ہے بحالت درویش گوشہ عزلت"
"میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

تقی کاشی اور امین رازی نے استرآباد کو مولانا کا وطن بیان کیا ہے لیکن تقی اوحدی کی رائے اس کے خلاف ہے۔ اور اپنے تذکرۂ عرفات میں جو مولانا سحابی کی وفات کے تقریباً بارہ سال بعد ۱۰۲۴ھ کی حدود میں تصنیف ہوا ہے لکھا ہے کہ

مولانا کا اصلی وطن جرجان ہے اور ولادت شوستر میں ہوئی ہے۔ شیر خاں لودھی نے اپنے تذکرہ مراۃ الخیال میں جو ۱۱۰۲ھ کی تصنیف ہے ان دونوں بیانات سے اختلاف کیا ہے اور خاص نجف اشرف کو مولانا کا وطن بیان کرتا ہے۔ علی قلی خاں والہ داغستانی نے اپنے تذکرۂ ریاض الشعرا میں جو ۱۱۶۱ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور تقی اوحدی کے بیان کو نقل کر کے اپنی یہ تحقیق بیان کرتا ہے کہ

"مولانا استرآباد میں پیدا ہوے۔ نجف اشرف میں سکونت اختیار کی۔ جہاں چالیس"
"سال قیام رہا اور اسی جگہ فوت ہو کر مدفون ہوے۔"

کسی قریب العہد مصنف نے مولانا کا سن وفات نہیں لکھا ہے۔ زمانہ کا تعین کرنے کے لئے صرف

ہمعصر بادشاہوں کے نام لکھدئے ہیں۔ بختاور خاں عالمگیری نے اپنی تاریخ مراۃ العالم میں جو ۱۰۸۰ھ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے لکھا ہے کہ مولانا شاہ طہماسپ صفوی (سنہ ۹۳۰ سنہ ۹۸۴ھ) کے عہد میں گزرے ہیں۔ والہ داغستانی کا بیان ہے کہ شاہ عباس ماضی (۹۸۵ھ ۱۰۳۸ھ) کے معاصر تھے۔ سنہ وفات صرف سرو آزاد میں تحریر ہے۔ یہ تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف ہے اور مولانا کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ۱۱۶۶ھ کی حدود میں تصنیف ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ مولانا نے ۱۰۱۰ھ میں بمقام نجف اشرف انتقال کیا۔ اور اسی جگہ مدفون ہوئے۔ سرو آزاد کے بعد فارسی شعرا کے جس قدر تذکرے تصنیف ہوئے ہیں مثلاً صمصام الدولہ شاہنواز خاں کا بہارستان سخن حسین قلی خاں کا نشتر عشق۔ لچھمی نارائن شفیق کا گل رعنا۔ قدرت اللہ خاں گوپاموی کا نتایج الافکار وغیرہ ان سب میں مولانا سحابی کے حالات اور ان کا سن وفات سرو آزاد سے ماخوذ ہے اس لئے ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے اور ڈاکٹر اسپرنگر۔ چارلس ریو ہرمن ایتھے وغیرہ نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے لیکن صنیع الدولہ حکیم محمد حسن خاں طہرانی کی کتاب منتظم ناصری میں جو زمانہ حال کی ایک بہترین تصنیف ہے مولانا سحابی کا ۱۰۲۱ھ وفات لکھا ہے لیکن مصنف ممدوح نے اس کی کوئی سند نہیں بیان کی ہے اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر پرش نے جو جرمنی کا مشہور عالم شرقیات ہے اور جس نے برلن کے شاہی کتب خانہ کے مشرقی کتابوں کی توضیحی فہرست بنائی ہے لکھا ہے کہ مولانا سحابی شاہ عباس ثانی کے معاصر تھے لیکن اسکی یہ صریح غلطی ہے کیونکہ شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲ھ ۱۰۷۷ھ) مولانا کی وفات کے بیالیس سال بعد ۱۰۵۲ھ میں برسر حکومت ہوا ہے۔

گزشتہ اوراق میں مولانا سحابی کی نسبت جو بے ترتیب و پراگندہ اقتباسات جمع کئے گئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

"مولانا سحابی طبرستان کے شہر استرآباد میں پیدا ہوئے سن تمیز کو پہنچنے کے بعد نجف اشرف میں آکر سکونت اختیار کی جہاں چالیس سال تک گوشہ نشینی میں گزارے اور مشہد حضرت امیر علیہ السّلام کی جاروب کشی کرتے رہے اس عرصہ میں آستانۂ مبارک کے احاطہ سے قدم باہر نہیں نکالا۔ شاہ طہماسپ صفوی (سنہ ۹۳۰ سنہ ۹۸۴ھ) کے زمانہ میں ان کا ظہور ہوا اور

شاہ عباس ماضی (۹۸۵ھ تا ۱۰۳۸ھ) کے اواسط سلطنت میں ۱۰۱۰ھ ہجری کو نجف اشرف

میں وفات پائی اور مدفون ہوے۔"

اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مولانا سحابی نے اپنے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف کر دیا ہے چنانچہ

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ سرو آزاد میں تاریخ صبح صادق کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"مولانا ایک روز کہیں جا رہے تھے راستہ میں ایک نہر ملی انھوں نے پانی سے گزرنا

چاہا لیکن پاؤں تہ میں اترنے لگے انھوں نے خیال کیا کہ یہ دنیاوی تعلقات کا اثر ہے

مجھ کو کسی اور چیز سے تعلق نہیں۔ البتہ دیوان سے ہے یہ کہہ کر دیوان کو پانی میں ڈال دیا

مولانا کی تصنیف سے ستر ہزار رباعیاں تھیں جو غرق آب ہوگئیں۔ کم و بیش بیس ہزار

رباعیوں کو لوگوں نے بیاضوں میں نقل کر لیا تھا جو تباہ ہونے سے محفوظ رہ گئی ہیں۔"

صاحب مراۃ الخیال کا بیان ہے کہ میں نے ایک مجموعہ میں مولانا کی بارہ ہزار رباعیاں دیکھی ہیں والہ داغستانی

نے صرف چھ ہزار رباعیوں کی تعداد بیان کی ہے۔ بانکی پور کی اورینٹل لائبریری میں مولانا کے کلام کا

ایک مجموعہ موجود ہے جس میں چار ہزار رباعیاں تحریر ہیں۔ یہ نسخہ نہایت قدیم ہے اور مولانا کی وفات

کے تقریباً پینتالیس سال بعد ۱۰ ربیع الاول ۱۰۵۵ھ ہجری میں اس کی کتابت ہوی ہے۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم

اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں رباعیات کے متعدد مجموعے موجود ہیں جن کا ذکر چارلس ریو اور

ہرمن ایتھے نے اپنی فہرستوں میں کیا ہے اور ان میں صرف ایک نسخہ ایسا ہے کہ اس میں آٹھ ہزار سے زیادہ

رباعیات جمع ہیں۔

صاحب مراۃ الخیال نے لکھا ہے کہ مولانا سحابی کے تصنیفات سے اصناف نظم میں رباعیات کے

سوا اور کوئی تصنیف سننے میں نہیں آئی ہے لیکن والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں مولانا کی چند غزلیات

کو بھی نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں کلام سحابی کے ایسے متعدد مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔

جس میں رباعیات کے علاوہ غزلیات اور مقطعات بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ

شاہان اودھ کے کتب خانہ میں کلام سحابی کا ایک نسخہ محفوظ ہے جس میں رباعیات کے علاوہ ایک

مثنوی بھی شامل ہے یہ مثنوی شاہ عباس ماضی کے نام پر لکھی گئی ہے۔ اس میں عرفان و حقائق کے مضامین مذکور ہیں اور اس کی ابتدا حسب ذیل بیت سے ہوئی ہے:-

زکلکم اے سر برآہ برخیز نسیم کوئے بسم اللہ برخیز

بانکی پور اورنٹیل لائبریری کے مجموعہ میں رباعیات سے پہلے ایک تصوف کا رسالہ اور اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی ہے رسالہ نثر میں ہے اور اس کی ابتدا حسب ذیل بیت سے ہوئی ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم تیر شہاب ست بدیو رجیم

مثنوی میں تصوف کے مضامین اور اہل دنیا کی مذمت مرقوم ہے اور اس کا آغاز حسب ذیل بیت سے ہوا ہے:-

درجہاں نہ مشت خام طمع کید خود را نہادہ نام ورع

مولانا سحابی کے حالات مفصلہ ذیل کتابوں میں مذکور ہیں:-

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ	کیفیت
۱	نفائس المآثر	علاء الدولہ قزوینی	تصنیف سنہ ۹۹۰ھ	قلمی
۲	خلاصۃ الاشعار	میر تقی الدین کاشی	سنہ ۹۹۳ھ	قلمی
۳	ہفت اقلیم	امین احمد رازی	سنہ ۱۰۰۲ھ	قلمی
۴	عرفات العاشقین	تقی اوحدی	سنہ ۱۰۲۴ھ	قلمی
۵	مراۃ العالم	بختاور خان عالمگیری	سنہ ۱۰۷۸ھ	قلمی
۶	مراۃ الخیال	شیر خان لودھی	سنہ ۱۱۰۲ھ	طبع بمبئی سنہ ۱۳۲۴ھ ص ۸۳
۷	ریاض الشعرا	علی قلی خان داغستانی	سنہ ۱۱۶۱ھ	قلمی
۸	سرو آزاد	میر غلام علی آزاد بلگرامی	سنہ ۱۱۶۶ھ	طبع لاہور سنہ ۱۹۱۳ء ص ۴۲
۹	بہارستان سخن	صمصام الدولہ شاہنواز خان	سنہ ۱۱۷۱ھ	قلمی
۱۰	آتش کدہ	میرزا لطف علی آذر	سنہ ۱۱۸۰ھ	طبع بمبئی سنہ ۱۲۹۹ھ ص ۱۵۶
۱۱	گل رعنا	لچھمی نارائن شفیق	تصنیف سنہ ۱۱۸۳ھ	قلمی
۱۲	نشتر عشق	میرزا حسین قلی خان عظیم آبادی	سنہ ۱۲۳۳ھ	قلمی
۱۳	نتائج الافکار	قدرت اللہ خان گوپاموی	سنہ ۱۲۵۶ھ	طبع مدراس سنہ ۱۳۴۳ھ ص ۱۹۱
۱۴	مجمع الفصحا	میرزا رضا قلی خان	سنہ ۱۲۹۳ھ	طبع طہران سنہ ۱۲۹۵ھ ص ۱۱
۱۵	محبوب الالباب	مولوی خدا بخش خان	+	طبع حیدرآباد سنہ ۱۳۱۴ھ ص ۲۰۵
۱۶	فہرست کتب خانہ شاہان اودھ	ڈاکٹر اسپرنگر		طبع کلکتہ سنہ ۱۸۵۴ء ص ۴۱، ص ۵۰، ص ۵۵۲
۱۷	فہرست امپیریل لائبریری جرمنی	ڈاکٹر پرش		طبع برلن سنہ ۱۸۸۸ء ص ۹۲۵ و ص ۹۲۶
۱۸	فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم	چارلس ریو جلد دوم		طبع لندن سنہ ۱۸۸۱ء ص ۲۷۲
۱۹	فہرست بوڈلین لائبریری	ہرمن ایتھے		طبع اکسفورڈ سنہ ۱۸۹۲ء نمبر ۱۰۶۳
۲۰	فہرست انڈیا آفس لائبریری	ہرمن ایتھے		طبع لندن سنہ ۱۹۰۳ء نمبر (۱۴۰۱)

سید شمس اللہ قادری

خواب کی باتیں

ہر مضمون نگار کو پہلے اس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جس موضوع پر اسے قلم اٹھانا ہو اس کی منطقی حدود معین کرے اور یہ بات دلگی نہیں لوہے کے چنے چبانے ہیں اس لئے عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ موضوع کی تعریف کو چبا جاتے ہیں اور قارئین کرام کی منطق دانی یا غیر منطق دانی پر بھروسہ کرکے الفاظ کا پل باندھ دیا جاتا ہے رہی یہ بات کہ کوئی پڑھنے والا مضمون سمجھیگا بھی یا نہیں اس سے مضمون نگار کو کوئی بحث نہیں کیونکہ مضمون نگار کو محض مضمون لکھنا ہے قارئین کرام کی گوناگوں سمجھ اور طرح طرح کی عقل کا ٹھیکا لینا نہیں ہے ایسے قارئین جنھوں نے روزناموں اور رسالوں کے میدان مطالعہ میں تازہ تازہ قدم رکھا ہے عموماً اس مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ مضمون نگار اپنے مفہوم کو ادا نہیں کرسکا۔ عام فہم نہیں بنا سکا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مضمون نگار صرف اتنا کرسکتا ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق مضمون لکھدے سمجھنا یا نہ سمجھنا ظاہر ہے کہ یہ قارئین کرام کا کام ہے۔ کہنہ مشق قارئین اس گر کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور مضمون چپ چاپ سمجھے یا بے سمجھے پڑھ جاتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مصنف کا یہ فرض نہیں ہے کہ ہر ایک کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے کا اجارہ لے اس کا کام محض لکھدینا ہے فرض کیجئے کہ شکسپیئر اپنے مشہور و معروف ناٹک اس طرح لکھتا کہ بچہ سے لیکر بڑے تک سب سمجھ جاتے۔ اول تو شکسپیئر سے بھی یہ بات ممکن نہ تھی۔ مگر خیر فرض کرنے میں تو کوئی بڑا ہرج نہیں تو اس کا نتیجہ ملاحظہ فرمائیے شکسپیئر پڑھانے والے عینک لگانے والے بڑے دماغ والے بے گنتی پروفیسروں سے یہ دلچسپ دنیا کا ناٹک والا چبوترہ خالی ہو جاتا۔ ستم ہو جاتا اگر ایسے مصنف دنیا میں پیدا ہوتے جو اس طرح لکھتے کہ ان کا لکھا ہر ایک بے تکلف سمجھ لیتا۔ کہاں ہوتے اساتذہ کہاں ہوتے مدارس اور کالج اور کیا دنیا کے ہر ملک سے سررشتہ تعلیمات مفقود نہ ہو جاتا۔

غرض عرض کرنا صرف اتنا تھا کہ یہ مضمون خواب پر ہے اور راقم خواب کی تعریف پیش نہیں کریگا

اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ یہ ہیچمدان تعریف سے اور لوگوں کی طرح قاصر ہے بلکہ وجہ صرف اتنی ہو کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے غذا نہ کھائی ہو اور کوئی ہستی ایسی نہیں جس نے خواب نہ دیکھا ہو غذا یا خواب کی تعریف کرنا دلی یا لکھنو والوں کو اردو زبان کا سکھانا یا لندن کے ارباب تدبر کو سیاسیات کا سبق دینا ہے لہذا اب آپ بھی مان لینگے کہ خواب کی تعریف کی واقعی ضرورت نہیں اس لئے آپ خود اپنے بستر کی فضا اور نیند کے عالم تنہائی میں قابل یا نا قابل بیان خواب یقیناً دیکھتے رہتے ہیں۔ اکثر کو طاق نسیاں کے حوالہ کر دیتے ہیں بعض کی تعبیر کی الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک آدھ کسی یار غار سے کبھی بیان بھی کر دیتے ہیں۔ اور آپ خفا نہ ہوں تو بعض ایسے بھی خواب آپ دیکھ لیا کرتے ہیں کہ انکو اپنے دامن ہستی کی وابستہ چولی سے بھی بیان کرنے کا خیال آپ کو خواب میں بھی نہیں آسکتا ایسے خوابوں کو بھلا دینے کی عام طور پر عمدہ تدبیر یہی ثابت ہوئی ہے کہ چپ چاپ صبح کو ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جائے تاکہ خواب کے نقش و نگار یاد سے دھل جائیں۔

اب قارئین کرام خواب کی باتیں سننے سے قبل ایک تو اپنے دیکھے ہوے خوابوں کو جو بیش و کم صاف اور واضح طور پر یاد ہوں۔ آزمایش کے لئے حافظہ میں تیار کر لیں اور دوسری بات یہ سمجھ لیں کہ شعوری زندگی ہی انسان کی کل زندگی نہیں ہے یہ اصطلاح بازی الجھن کا باعث ہوگی۔ اچھا یوں سمجھئے کہ آپ جاگتے رہتے ہیں اور اس جاگنے میں جو باتیں آپ کرتے ہیں خواہ وہ آپ کے دلی خیالات ہوں خواہ وہ آپ کے افعال کی صورت میں ظاہر ہوں بشرطیکہ آپ یہ محسوس کرتے ہوں کہ میں یہ خیال کر رہا ہوں، میں یہ کام کر رہا ہوں اور میرے اس خیال یا اس کام کے کرنے کی وجہ یہ ہے یہ استدلالی امور جو آپ کے دائرۂ شعور میں ہیں آپ کی شعوری زندگی کہلاتے ہیں یہ آپ کی ہستی کا وہ حصہ ہے جو آپ کا جانا بوجھا ہے مگر اسی جاگنے کی حالت میں اسی شعوری زندگی کے بہاؤ میں آپ کے ذہن میں ایسی باتیں گزر جاتی ہیں یا آپ سے ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جن کی آپ وجہ نہیں بتلا سکتے۔ اگر آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے کہ "بھائی! یہ آپ نے کیا کیا؟" تو آپ معصوم سی صورت بنا کر یہی جواب عنایت فرمائینگے "کیا بتاؤں چوک ہو گئی۔" یا "خدا گواہ ہے

بالکل انجانی سے یہ حرکت ہوگئی۔" اسی طرح بعض خیال آپ کے ذہن میں دفعتہً ابھر آتا ہے آپ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔" اس خیال کا ظاہرا یہاں کوئی کام نہ تھا یہ خیال دل میں کیوں آیا۔" اور آپ کو کوئی وجہ اس خیال کے ابھر آنے کی معلوم نہ ہوگی۔

اس قسم کے اکثر لیس خیالات وجذبات اور ایسی اوٹ پٹانگ حرکات جنکو چوک سہو اور بھول یا انجانی سے تعبیر کرتے ہیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ آپ کی شعوری زندگی ایک اور چٹان پڑی ہوئی ہے اور اس چٹان کا نام انگریزی میں (unconscious) ہے اور اردو میں ۔مجھے اصطلاح سازی کا دعویٰ نہیں ۔میری خاطر اس کے لئے اس مضمون میں" انجان" کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے یا اگر آپ لفظ" شعوری" ہی کو پسند فرماتے ہیں تو ظرافت اس کی استدعا کرتی ہے کہ انجان کے بدلے" بے شوری" کی اصطلاح منظور فرمائی جائے ۔خیر اس مسئلہ کو جامعہ عثمانیہ کے لئے اٹھا رکھنا بہتر ہوگا ۔

ہماری آپ کی حیات شعوری کی جڑیں" انجان" زندگی کے طبقات میں اسی طرح پھیلی ہوئی ہیں جس طرح ایک درخت کی جڑوں کا جال زمین کے نیچے بچھا ہوتا ہے انجان کا فلسفہ ایک لطیف مطالعہ ہے مگر یہاں اس بھول بھلیاں میں قدم رکھنے کا موقع نہیں آنا یاد رکھئے کہ خواب اسی آپ کے انجان نفسی عنصر کا ایک کھیل ہے" انجان" کے فلسفہ تشریحی نفسیات یا بالفاظ دیگر نفس تجزیہ (Psychoanalysis) اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو لازمی ہے کہ خواب کو سمجھیں اور خواب کی تعبیر کے اصول سے عملی طور پر کام لے سکیں

خیر اب سب میں زبردست سوال یہ ہے" اور یہ سوال حضرت آدم کے بچے تاریخ سے بھی پرے کے زمانہ سے کرتے آئے ہیں کہ خواب کیوں دکھائی دیتا ہے ؟ اس سوال کا جواب جس زمانہ میں جو کچھ دیا گیا اس کے اثرات ماہرین نفسیات ارتقائی کا خیال ہے کہ اب تک بنی آدم کی سماجی زندگی کے ہر شعبہ مذہبی عقاید توہمات رسم ورواج اور عادات وغیرہ میں مضمر ہیں مگر ان اثرات سے بھی اس جگہ سروکار نہیں ' دینا کے ایک پروفیسر سگمنڈ فرئیڈ نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ" ہر خواب ایک آرزو کا پورا ہونا ہے" یہ جواب تو کوئی انوکھا اور اچھوتا نہ تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس سورج کے تلے کوئی شئے نئی اور اچھوتی نہیں اردو بولنے والوں میں سے کسی نامعلوم فطرت شناس دماغ نے اس راز کو پالیا

تھا کہ خواب میں وہی خواہشات پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں جو ہماری انجان زندگی میں نہایت سرگرم ہیں اور جو عموماً روزمرہ کی دنیا میں پوری ہونے نہیں پاتیں اور یہہ دماغ ظرافت میں بھی ڈوبا ہوا تھا اور ہر فطرت شناس ہستی طبعاً ظریف ہوتی ہے کہ اس اردو کی کہاوت میں اس حقیقت کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا کہ "بلّی کے خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے دکھائی دیتے ہیں"۔ لیکن فرئیڈ نے اس ظاہر ذرا سی بنیاد پر ایک نئی نفسیات کی عمارت کھڑی کر دی اور ایک کتاب "خواب کی تعبیر" لکھی جو اس ناچیز راقم کی رائے میں دنیا کی ویسی ہی یادگار کتاب ہے جیسی ڈارون کی "ابتداء الانواع" ہے۔ "خواب کی تعبیر" نے قدیم نفسیات کو جو بیشتر نفسی کیفیات کی فہرست تھی تقویم پارینہ بنا دیا اور نفسیاتی تحقیق اور انکشاف کا ایک ولولہ انگیز اور بیحد دلچسپ راستہ کھول دیا ہے۔

خواب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہر خواب ایک چھوٹا سا ڈراما ہوتا ہے جس کا ہیرو خود خواب دیکھنے والا ہوتا ہے اس نفسی کٹ پتلیوں کے کھیل کے سارے کل پرزے "انجان" کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور جو تصویریں سامنے آتی ہیں وہ طرح طرح کے بھیس میں ہوتی ہیں "انجان" ایسا بہروپیا ہے کہ اصل مدعا کو جو ہمیشہ ایک خواہش ہوتی ہے اس قسم کے بھیس میں پیش کرتا ہے کہ خواب دیکھنے والا خود حیران رہ جاتا ہے۔ کہ اس طلسم کے کیا معنے ہیں۔ یہاں اتنا اشارہ کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ دنیا کے مشہور ڈراما نگاروں اور فسانہ نویسوں نے انجان طور پر انھیں طریقوں سے اپنی ناٹکوں اور فسانوں میں کام لیا ہے جن سے نیند کی فضا میں "انجان" خواب کا کھیل دکھاتا ہے اور ہمارے خواب آلودہ شعور کی سطح پر چلتی پھرتی تصویروں کا ایک پردہ کھول دیتا ہے۔

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ خواب دیکھنا صرف سونے پر موقوف ہے۔ ہر ذی شعور انسان جاگتے میں بھی کسی نہ کسی وقت دن دہاڑے خواب دیکھنے لگتا ہے اچھے بھلے چنگے آدمی باتیں کرتے کرتے کبھی کچھ کھوئے سے جاتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے "حضرت آپ ہیں کہاں" تو چونک پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ارے بھائی ایک بات کا ذرا دھیان آگیا تھا۔" بچے اکثر اپنے آپ باتیں کرتے ہیں۔ گردوپیش کا کچھ ہوش نہیں رہتا۔ ننھے میاں بڑبڑاتے جاتے ہیں گھونسے تان رہے ہیں گویا

کسی سچ مچ کے لڑکے سے باتیں ہو رہی ہیں اور آپ اسے تکے تان تان کر ڈرا رہے ہیں اس پر موچھوں اور داڑھی والے مسکراتے ہیں مگر اپنی ہاں نہیں کہتے کہ دفتر سے تھکے ماندے آکر اور کھانا کھا کر جب آرام کرسی پر دراز ہوتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کی ہاتھ کی گلوری پر جگالی ہوتی جاتی ہے اور نفیس پیچوان کی نے ہونٹوں میں اڑا کر اپنے کارناموں کا دفتر فضائے دماغ میں کھول دیا جاتا ہے اور اپنی ترقی اور نام آوری کے حیرتناک کرشمے پیش نظر ہوتے ہیں اس قسم کے خیالی پلاؤ بیداری کے خواب نہیں تو اور کیا ہیں؟ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اتنا کہ بیداری کے خواب میں عقل اس درجہ بے دست و پا نہیں ہوتی جتنی نیند والے خواب میں ہو جاتی ہے اور ہماری انجان ہستی اس قدر نہیں کھل کھیلتی جتنی سوتے میں شتر بے مہار ہو جاتی ہے۔

اتنا اور یاد رکھنا ضروری ہے کہ خواب میں بھی انجان بالکل مطلق العنان نہیں ہونے پاتا جو سماجی اور اخلاقی رجحانات ہماری ہستی شعوری اور غیر شعوری میں اکتساباً یا وراثتاً متمکن ہو چکے ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی سوتے اور جاگتے میں محتسب کا کام دیتے ہیں اور ہماری سرشت کی ایسی خواہشات کو جو مذہبی یا سماجی یا استدلالی طور پر مذموم سمجھی جاتی ہیں بہت کم بلا کسی شاریہ بھیس کے عریاں سطح شعور پر آنے دیتے ہیں اور اسی باطنی محتسب کی نظر سے بلا اعتراض گزر جانے کے لئے انجان خواہشات کو طرح طرح کے بھیس بدل کر خواب میں پیش کرتا ہے۔ جوں جوں آپ خواب کی تعبیر کے اصول اور طریقوں پر حاوی ہوتے جائینگے آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ کے اندر آپ کی انجان ہستی کو سوانگ بھرنے میں کس قدر ید طولیٰ ہے۔

قارئین کرام اب اکتا چلے ہونگے اور دل میں سوچتے ہوں گے کہ "یہ کیا خرافات اور لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ کام کی بات ایک بھی نہیں۔" اول تو قارئین کرام پر یہ واضح رہے کہ اس مضمون کی سرخی خواب کی باتیں ہے اور ایسے مضمون میں کام کی باتوں کا اول تو تلاش کرنا راقم سے ناجائز توقع رکھنا ہے خیر اسے جانے دیجئے۔ کام کی بات ضرور ڈھونڈیئے مگر کام کی بات کا سمجھنا آسان کام نہیں بغیر اس قدر لفظوں کے ہیر پھیر کے راقم کو یقین کامل ہے کہ آپ کے لئے "خواب کی باتیں" ایک بے سرو پا خواب سے زیادہ قدر و قیمت والی نہ ہوتیں تیسرے یہ کہ اگر آپ نے آگے کا مضمون پڑھنے کے بغیر ایسا خیال کیا ہے تو یہ نہایت قبل از وقت ہے اس لئے کہ ناچیز راقم اب خواب کی دو مثالیں اور ان کی تعبیر

ملاحظۂ عالی میں پیش کرنے والا ہے۔

پہلا خواب (الف) صاحب کا ہے ان کے چچا ایک دور دراز شہر میں مقیم ہیں شہر (ح) میں اپنے کچھ کاروبار الف صاحب کے ذمہ کر دئیے ہیں اور الف صاحب کو تاکید ہے کہ جملہ حالات کے متعلق جلد جلد مراسلت کرتے رہیں ایک دو مہینہ کام کرنے کے بعد الف صاحب یہ خواب دیکھتے ہیں:۔

"چچا کا خط آیا ہے میں نے اسے کھولا اس میں سے ٹکٹ ہی ٹکٹ نکلے چلے آتے ہیں"

الف صاحب نے خواب بیان کیا ان سے سوال کیا گیا "کل آپ نے چچا کو خط لکھا تھا" "ہاں"

"اس وقت آپ کے ذہن میں جو خیالات تھے ان میں سے کوئی یاد ہے؟" "ہاں یہ خیال تھا کہ مفت میں ٹکٹ خرچ ہوتے ہیں" اس کی ایک تعبیر قارئین کرام سمجھ گئے ہونگے مگر یہ سطحی تعبیر ہے اس کے پیچھے ایک اور گہرے معنے ہیں جو آگے بیان کئے جائینگے۔

(س) صاحب فطرتاً اچھی صورت کے شیدا ہیں مگر ساتھ ہی با خدا نمازی اور پرہیزگار ایک بزرگ کی صحبت اور روابط کے زیر اثر ان کی لڑکی سے عقد ہو چکا ہے اور بیوی کی صورت شکل اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پائی ہے جی چاہتا ہے کہ ایک لڑکی (میم) سے جس کی صورت اچھی ہے شادی کر لیں اپنی بیوی کو میکے میں بھیج دیا ہے اور کسی کام کے لئے شہر (ح) میں مقیم ہیں اور ان کے خسر صاحب بھی اس کام میں مدد دینے کے لئے اسی شہر میں آئے ہوئے ہیں ایک رات یہ خواب دیکھتے ہیں۔

"گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے میری شادی ٹھہری ہے"

"مگر یہ بھی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی بدصورت ہے میں شادی سے انکار کرتا ہوں والدہ"

"وغیرہ کہتی ہیں کہ اب یہ کس طرح ہو سکتا ہے لڑکی والے کیا کہیں گے۔ مجھے اپنے خسر کا خوف"

"لگا ہوا ہے اور آخر میں یہ تدبیر بتاتا ہوں کہ خسر صاحب کو وہاں بھیجنا چاہئے وہ سمجھا دینگے"

"کہ لڑکے کی شادی ہو چکی ہے اب لڑکی دینے سے فائدہ"

(س) صاحب نے پوچھا "اس کی تعبیر کیا ہے"

راقم نے عرض کیا "اس کی تعبیر صرف یہ ہے کہ آج کل آپ کا جی چاہتا ہے کہ مہری پر تنہا نہ ہوں"

یہہ ایک نہایت لطیف خواب ہے (س) صاحب کے گھر والے یہاں نہیں ہیں اور آتنا اور قارئین کرام کو بتا دینا ہے کہ ان کے ہاں زچگی ہونے والی ہے ایسی صورت میں اگر خواب میں "انجان" گھر چیز پیش کرتا تو رکاوٹ ہوتی مگر (س) صاحب پرہیز گار ہیں باخدا ہیں غیر محرم کو پیش کیا جاتا تو اندر والا محتسب نامنظور کرتا لہذا شادی کی تیاری ضروری تھی یہاں آتنا جتلا دینا ہے کہ (س) صاحب کی صحت ٹھیک نہیں اور "انجان" کا یہ بھی منشا ہے کہ مسہری کی خواہش پوری طرح پوری بھی ہو لہذا خسر صاحب کا خوف لگا دیا کہ جوان دنوں یہیں موجود ہیں۔ اس خیال سے بھی کام لیا کہ لڑکی حسین نہیں ہے اس طرح یہ چھوٹا سا ڈراما ناتمام رہا اور صحت پر بھی اثر نہ ہونے دیا کیونکہ یہ خواہش اپنی "جان ہے تو جہان ہے" مسہری کی خواہش سے بھی زیادہ گہری ہے۔

خواب کی تعبیر کرنے میں قارئین کرام نے اب محسوس کیا ہوگا یہ نہایت ضروری ہے کہ خواب دیکھنے والے کی جو خصلت (کیرکٹر) اس کی ضروری سوانح عمری اور گرد و پیش سے واقفیت ہو اور یہ باتیں معلوم کرنے کے لئے تعبیر کرنے والے کو خواب کے ہر جز کے متعلق ایسے سوالات کرنے پڑتے ہیں جن سے خواب دیکھنے والے کے دل کو ٹٹولا جائے اور انجان ہستی کی سرگرم کار خواہشات کا پتہ لگایا جائے۔ اور اس طرح دل کے ٹٹولنے کو ہی نفس تجزیہ کہتے ہیں۔

ایک اور بات پر غور کیجئے کہ خواہشات کی بجلی اور بھاپ کے بل پر اس دنیا کے پھیئے چلتے ہیں اور دیکھنا یہہ کہ آخر میں چل کر وہ کونسی اساسی خواہشات ہیں جن کی قوت کا ظہور یہ سارا اسنساریہ سارا انسانی تمدن کا حیرتناک تماشہ ہے آپ ذرا سا غور فرمائینگے تو معلوم ہوگا کہ انسان کے ہر زمانہ کی بنیاد مسہری اور دسترخوان ہے۔ مسہری اور دسترخوان سے بھی گہری ایک خواہش ہے اپنی جان کا بچانا۔ جان ہے تو جہان ہے لیکن جان کا بچانا دو ہی صورت سے ہو سکتا ہے ایک تو پیٹ کا دھندا دوسرے مسہری کے کاروبار فرائیڈ کا خیال ہے کہ مسہری کا رجحان ہر انسان کی زندگی اور مجموعاً کل نوع انسان کی حیات اور تمدن پر غیر محدود اثر رکھتا ہے بلکہ یہی وہ قوت ہے جس کا سماج اور تمدن ظہور ہے اس قوت کو اعلیٰ راستوں پر ڈال دیجئے تو علوم و فنون کی صورت میں ظاہر ہوگی اور اس کو آوارہ

بھٹکتا چھوڑ دیجئے تو گناہ اور جرائم کے بھیس میں نظر آئیگی۔ نفس تجزیہ (جدید نفسیات) نے مسہری کے رجحان کو انسان کی ہر شعوری یا انجان کیفیت میں کھود کھود کر نکالا اور پہلے پہل ماہرین نفس تجزیہ اور خصوصاً اس جدید نفسیات کے باوا آدم فرائیڈ پر حسب قاعدہ دنیا نے خوب خوب نفرین کی مگر اب دنیا کی آنکھیں کھلی ہیں اور اس اصلی نفسیات کے اصول سے تعلیمیات میں کام لیا جارہا ہے اور اس کے نتایج لوگوں کو اچنبھے میں ڈال رہے ہیں۔ اچھا اب خواب کی پہلی مثال کی طرف رجوع کیجئے اس کی سطحی تعبیر تو ظاہر ہے لیکن اتنا معلوم کرنے کے بعد کہ الف صاحب کی گھر والی ان کے ساتھ شہر (ح) میں نہیں ہیں اور الف صاحب جب اپنے گھر جاتے ہیں تو اکثر لفافوں پر اپنا پتہ لکھکر بہت سے لفافے گھر چھوڑ آتے ہیں تاکہ اس طرف سے خط بھیجنے میں تساہل نہ ہو۔ اب قارئین کرام اس خواب کو پڑھیں اور کیا اب صاف طور پر اس خواب میں بھی مسہری کے رجحان کی جھلک نہیں ہے؟ البتہ الف صاحب کی شرافت طبع کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا اندر والا محتسب ایسا زبردست ہے کہ اس رجحان کو بہت مشکل سے اور ایسے بھیس میں ابھرنے دیتا ہے جس پر اس خواہش اساسی کا مشکل سے بھی گمان ہو بلکہ خود خواب دیکھنے والے صاحب اس کی دوسری تعبیر پر ہی اکتفا کر جائیں۔

اب صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں خواب اصلی ہیں اور خواب دیکھنے والے اصحاب نے اس ہیچمدان راقم سے خود بیان کئے ہیں قارئین کرام میں سے جن حضرات کو نفس تجزیہ کا میدان دلفریب معلوم ہونے لگے وہ اس میں قدم رکھ سکتے ہیں اور خوابوں کو جمع کرنا شروع کردیں نفس تجزیہ کے اصول اور قوانین سمجھنے کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے خوابوں کی تعبیر کی جائے مگر یہ یاد رہے کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ابھی نفس تجزیہ کی ارتقاء ابتدائی ہے اور بہت سے خواب "انجان" اس کمال کے ساتھ تصنیف کرتا ہے کہ ان کی تعبیر مشاق ماہرین نفس تجزیہ بھی نہیں کرسکتے۔ علاوہ اس کے یہ بھی خاطر نشین رہے کہ فطرت انسان میں کروڑوں شعوری اور انجان کمزوریاں ہیں اس شغل تعبیر میں فطرت انسان کی بہت سی تاریک گہرائیوں پر روشنی پڑتی ہے لہذا اس میدان میں قدم رکھنے والے کو دلی صفت وسیع نظر اور چشم پوش ہونا نہایت ضروری ہے مضمون طول ہوگیا اب قارئین کرام کو خواب دیکھنے اور اس کی تعبیر کے لئے فرصت دینی ضروری ہے فقط

محمد عظمت اللہ خاں

حیاتِ نسلی

حیوانات

(۱)

چونکہ ہم نوع انسان پر عالم کائنات سے ایک جداگانہ ہستی کی حیثیت سے نظر ڈالنے کے عادی ہو رہے ہیں اور انسان کو کرۂ ارض کا ایک لزوم نہیں سمجھتے اس لئے اس حیوان ناطق کے امتیازات کا تطابق حیوان مطلق سے کرنا ایک اشرف و محترم ہستی کی سراسر تحقیر سمجھی جاتی ہے "علم الانسان" انھیں افکار باطل کا نتیجہ ہے مگر "علم الحیات" کے کامل مطالعہ نے اس طفلانہ گھمنڈ کی نسبت ہمارے تصورات کو بالکل بدل دیا اور ہم اس امر کی تحقیق پر آمادہ ہوئے کہ روئے زمین پر بنی نوع انسان کا حقیقی درجہ کیا ہے؟

باوجودیکہ یہ حیوان باقی جنس حیوانات میں سب سے زیادہ فہیم و فطین مانا گیا ہے مگر اس کے عضلات کی ترکیب و ترتیب اور اعضاء و جوارح کے اعمال و افعال میں حیوانی خصوصیات بہ اکمل وجوہ جلوہ گر ہیں اور انسان کہلانے کے باوجود نوع حیوانات میں اس کا بے تکلف شمار کیا جاسکتا ہے جانوروں کی طرح وہ بھی دو پنجہ رکھتا ہے، دو پستان اس کے بھی ہوتے ہیں علیٰ ہذا اعصاب و مفاصل میں اس کو حیوانات سے مماثلت تام حاصل ہے انسان اپنی نوع کے دانشمندوں (یعنی عقلاء) کو پیش کرنے کے باوجود اپنے عصبات یعنے ذات الثدیا[ع] کے طبقہ سے بالاتر نہیں تصور کیا جاسکتا بلکہ اپنے نوع کی ناقص ہستیوں (یعنی حمقاء) کی بدولت حیوان مطلق کی بعض اسفل جنسوں سے بھی کمتر درجہ میں آجاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ "حمقاء" مستثنیات عامہ میں شمار کرنے کے لائق ہیں تو یہی کلیہ "عقلا" پر بھی منطبق ہوسکے گا۔ مختصر یہ ہے کہ نوع بشری کی ادنیٰ اور ابتدائی صنف جس کی معاشرت اور نفسیات و جسمانیات کی مختصات کا علم تحقیقات جدیدہ کی بدولت ہو چکا ہے ہم کو خجل کرنے کے لئے کافی ہے۔ انھیں معلومات سے "علم انساب البشر" کے مطالعہ کی تحریک ہوئی اور یہی علم ہمارے تمدنی تصورات

ع جس طرح انسان نوع حیوان ناطق کا اکمل نمونہ خیال کیا جاتا ہے اسی طرح پستاندار جانور (ذات الثدیا Mammals) طبقہ حیوانات میں اشرف و اکمل سمجھے جاتے ہیں ۱۲

میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

جبکہ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بھی ذات الثدی کی ایک صنف ہے اور اپنی نوع کے حیوانات پر صرف دماغی اکتسابات کی وجہ سے تفوق رکھتا ہے تو اصولاً یہ لازم آتا ہے کہ معاشرت انسانی کے تعلقات پر غور کرنے سے پہلے معاشرت حیوانی کے مختلف پہلوؤں کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا جائے اور چونکہ مدنیت کی حد علم الحیات پر منتہی ہوتی ہے اس لئے خود علم الموجودات میں ہم کو عظیم حقایق اور تمدنی انکشافات کا سراغ لگانا چاہیئے۔ دنیا میں سوسائٹی اور قبیلہ کی ضرورت اس وجہ سے تسلیم کی گئی ہے کہ اس سے افراد کی قوت اجتماعیہ کو پائندگی اور دوام حاصل ہوتا ہے اور اس خصوصیت کا پیدا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ شرایط اساسی کا پوری طرح ایفا ہوتا ہو اس لئے کہ بقائے نوع کا مسئلہ خود ان شرائط کی تکمیل پر منحصر ہے اور تمدنی تاسیسات کا ضبط و انتظام انھیں کی بدولت ظہور میں آتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ انسان بالطبع مدنی ہے تو یہ تفوق کچھ اسی کے لئے مخصوص نہیں دنیا میں اور بہت سی انواع میں جمعیت و مدنیت کی صفت پائی جاتی ہے مثلاً زنبور عسل مورچہ اور دیمک حقیقی جمہوریت کی زندہ نظیریں ہیں اور ہم ان کے طرز ماند و بود سے اکثر مفید اور پند آموز نتایج اخذ کر سکتے ہیں قانون ازدواج کا مقصد اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہے کہ تاہل کے وسیلہ سے جو دو ہم جنسوں کا اجتماع ہوتا ہے اس میں تنظیم اور باقاعدگی پیدا ہو جائے اور غایت ازدواج ایک ایسے وظیفہ کی بجا آوری ہے جو لازمۂ حیات کہا جا سکتا ہے اور جس کی کیفیات زیادہ تر وجدانی ہوتی ہیں یا بقول "مانٹین" وہ ایسا "دام" ہے جس میں آنے کے بعد انسان اور حیوان دونوں کو اپنی بقائے نوع یا "موروثی دین" کی ادائی کا نہایت شدت کے ساتھ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

قبل اس کے ہم ازدواجی تعلقات اور جمعیت بشریہ کے متعلقات پر بحث کریں بے محل نہ ہوگا اگر تناسل اور اس کے متعلقہ وظائف کے تذکرے سے ہم اپنے مضمون کی ابتدا کریں اس لئے کہ حس حیوانی جس کی علت وظیفہ طبعی کی بجا آوری ہے سرکش انسان کو کس قدر لاچار کر دینے والی شئے ہے؟ اس کا ادنی کرشمہ یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ وحشی سے وحشی اور خونخوار سے خونخوار جانور بھی اس کے آگے رام اور منقاد ہو جاتے ہیں۔

تناسل | توالد و تناسل غذائیت کا نتیجہ ہے۔ حیوانات کے ادنیٰ طبقوں میں بھی عمل تولید غذا کے مادۂ فاضل سے

ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنے غذا کے اجزائے لطیف اعضائے متعلقہ کو حسب ضرورت ملنے کے بعد مادہ فاضل سے دوسرے اجزاءِ حیات کی ترکیب شروع ہو جاتی ہے۔ درخت اپنے نوع کی بقاء کے لئے بذریعہ جذور زمین سے غذا کھینچتے ہیں اور پتوں کی راہ سے ہوا پاتے ہیں۔ پھولوں کا بھی یہی حال ہے کہ غبار طلع جو پھولوں میں بجائے منی کے ہوتا ہے عضو تانیث میں داخل ہو کر تخم کے حصوں اور اس کے نشوونما کو کامل کرتا ہے۔ اسی عنوان سے چھوٹے چھوٹے جانوروں میں اعضائے تذکیر اعضائے تانیث سے باہم تماس کرتے ہیں جس کے بعد مادہ بیج میں سے شق ہو کر اپنی ہی شکل کی ایک نئی مخلوق پیدا کر کے ختم ہو جاتا ہے۔

بدن میں بعض اعضا نہایت چھوٹے چھوٹے گول یا پہلو دار اجزا سے مرکب ہوتے ہیں ان خوردبینی اجزا کو "حجرہ" یا "خلیہ" (cells) کہتے ہیں مادہ نر کے خلیات سے متصل ہو کر مادہ کو جذب کرتی ہے۔ اسی طرح مرد کے حوینات منویہ (Spermatic cells) عورت کے بیض (ovulary cells) میں داخل ہوتے ہیں مادہ کا خلیہ یا عورت کا بیض اپنی ہیئت اصلی کو قائم رکھ کر نر کے خلیہ کو جذب کر لیتا ہے یا مرد کے حوینات منویہ سے تلقیح ہو جاتا ہے اور جو جوہر نر یا مرد سے اس طرح حاصل کیا جاتا ہے وہ مادہ یا عورت کے اعضاء تانیث میں منجذب ہو کر ایک نئی زندگی کا دور شروع کر دیتا ہے صرف عمل تولید دنیا میں اکثر ذی روح مخلوق کے وجود کی علت غائی ہے بہت سے جاندار نباتات اور حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) اس اہم فرض کی بجا آوری کے بعد زندہ نہیں رہتے اور ان کی زندگی کا زمانہ بذات خود نہایت مختصر ہوتا ہے بسا اوقات نر مادہ سے جدا ہونے کے قبل ہی مر جاتا ہے اس کے بعد مادہ بھی صرف انڈے دینے کے لئے زندہ رہتی ہے۔ کرم دانہ (Cochineal) میں حد سے زیادہ انڈوں کے بھر جانے سے مادہ بھی مر جاتی ہے۔ اس کے جسم کا غلاف (tegument) قدرتی طور پر انڈوں کی حفاظت کے کام آتا ہے ادنی طبقہ کے حیوانات میں عمل تولید بلا ارادہ و خیال کے ہوتا ہے چنانچہ (Paramaecium) بالدار حشرات آبی کی نظیر جو اس موقع پر پیش کی جاتی ہے وہ گرانباری اولاد میں عدیم النظیر ہیں بیالیس دن میں ایک مادہ (۱۲۰۴۱۱۶) بچے دیتی ہے اور اس کو مطلق اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ اس قدر کثیر تعداد کیونکر پیدا ہو گئی۔ ملک بویریا میں عام ٹروٹ اور قوس قزح کے رنگ کی ٹروٹ مچھلی کے انڈوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لئے تجربات کئے گئے تو پرانی اور بھاری مچھلیوں میں

بالاوسطاً تین ہزار فی مچھلی انڈے نکلے اور چھوٹی عمر کی مچھلیوں میں بہ مقابلہ اپنے وزن کے انڈوں کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ پائی گئی لیکن اعلیٰ طبقہ کے حیوانات میں توالد وتناسل کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں قابلیت تولید رکھنے والی دو خلیات کے اجتماع اور نتیجہ کے ظہور پذیر ہونے کے لئے مختلف مدارج طے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جن میں ارادہ اور قوت یا روحانی وجسمانی موثرات کو پورا دخل ہے۔ انسانی زندگی میں عشق ومحبت کے اثرات عجیب وغریب طریقوں سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن ان تمام موثرات میں سب سے زیادہ قوی اثر بیض اور حیوانیات منویہ کی مواصلت یا دو روحوں کے ایک دوسرے کے رگ وپے میں سرایت کرجانے کا ہے انسان کے دل میں جس قدر جذبات ودیعت ہیں شرکت تاثیر میں کوئی جذبہ وہ زور واثر نہیں رکھتا جو عشق ومحبت کو حاصل ہے جن سے جذبات وحیات وجدانی میں تموج اور عقل وشعور میں شگفتگی کے دوگونہ اثرات رونما ہوتے ہیں محبت کرنے اور چاہے جانے کے بعد فنون لطیفہ وظریفہ کے اکتسابات خصوصاً شاعری وموسیقی کے ملکات حسن وحسن ولطافت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں ان کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے الفت ومحبت، مدنیت اور حب وطن کا ایک زبردست وسیلہ ہے وہ اتحاد اقوام اور جمعیت وانتظام کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا نہایت قوی ذریعہ ثابت ہوتی ہے مگر یہ جذبہ ایک دوسری کیفیت بھی رکھتا ہے۔ اکثر یہ ایک شعلہ جانسوز ثابت ہوا ہے اس کی بدولت بہت سی زندگیاں تباہ وبرباد ہوچکی ہیں۔ اس کی کرشمہ سازی نے معصیت فسق وفجور اور جرایم کا اکثر ہستیوں کو شکار بھی بنا دیا ہے۔

مستی اور محبت موروثی خصائص اور طبعی رجحانات عادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے افعال متواتر واقع ہوتے رہنے سے خلیات عصبی میں ان کے اثرات جاگیر ہوجاتے ہیں چنانچہ خواہش تولید اور شوق وصل اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ حیوانات اپنے نمو کی مختلف حالتوں میں بحالت خود فراموشی ان افعال کے عادی رہتے ہیں جن سے ان کے نوع کی وفرت اور حفاظت متصور ہے عصبی تقاضا پر ان حرکات وافعال کے اثر کرنے کے بعد موثرات وخواہشات طبعی میں بیداری کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں اور جو حس نسبتاً زیادہ قوی ہوگی اس پر تاثیر بھی زیادہ ہوتی ہے وظائف حیات میں تزاید

نسل اور دفرتِ نوع سے قوی تر کوئی فعل نہیں ہے اس لئے کہ حفاظت ذات اور بقائے نوع اسی پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جانور جب مست ہوتے ہیں تو ان کی یہ حالت دیوانگی کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ جب یہ خواہش حد سے متجاوز ہو جاتی ہے تو جنگلوں کے وحشی اور خونخوار جانور بھی تنہائی اور تجرد کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ نر اور مادہ ایک دوسرے کی تلاش میں اپنے زاویۂ خلوت سے باہر آتے ہیں۔ بعض وقت دونوں اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر نکلتے ہیں اور مستی کا زمانہ گزر جانے کے بعد پھر نیستانوں میں متفرق ہو جاتے ہیں۔ ایام مستی میں ہر مرتبہ جوش شباب ان میں از سر نو عود کر آتا ہے اس زمانہ میں ان کے بال، کلغی اور پروں پر جو خوشنمائی اور رونق پیدا ہو جاتی ہے وہ اس موسم کے گزر جانے کے بعد باقی نہیں رہتی۔ مادہ کو اپنی طرف مائل کرنے یا حریف سے مقابلہ کے واسطے نر کے لئے بعض چیزیں مادر فطرت خود مہیا کرتی ہے۔ بعض انواع اس درجہ جوش اور بدمستی کے ساتھ ملتے ہیں کہ مادہ نر کی بدفعلیوں کی تاب نہ لا کر اکثر جان سے گزر جاتی ہے[۵]۔ مینڈک اور غوک زہر دار کی ٹانگ ایک مرتبہ حالت جفتی میں قلم کر دی گئی لیکن وہ اپنے فعل میں بدستور منہمک رہا۔

صنف ذات الثدی کو بھی اگرچہ دوسرے جانوروں کی طرح مستی آتی ہے لیکن ان میں جبر و تشدد کی وہ حالت نہیں پائی جاتی اس لئے یہ کیفیت ہم انسانوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ ان میں محبت باہمی ازدیاد نسل کا وسیلہ ہوتی ہے اور نسل کی زیادتی کا تعلق نر اور مادہ کے اعضاء تولید سے ہے جو تبلی ہو کر مادہ میں انڈے دینے کی قابلیت کا باعث ہوتی ہیں۔ ذات الثدیا کے خصایص سے مشابہ ہونے کی وجہ سے انسان بھی اسی قانون کا تابع ہے چنانچہ عورتوں کو طمث کا آنا ذات الثدی کی مادہ کی مستی سے قطعی طور پر ملتا جلتا ہے۔ علیٰ ہٰذا عورت کا انڈے دینا اور اعضاء تناسلیہ نسا میں انڈے کا نشو و نما پانا اور بیضۂ بشر کا حویصل ovule سے نکل کر نفیر کی راہ سے رحم میں داخل ہونا ان اعمال کا بالکل عکس ہے جو ذات الثدی کی مادہ پر گزرتے ہیں۔ ہم علل و اسباب کے کوچہ کی راہ اختیار کریں تو واضح ہوگا کہ انس و محبت انسانی حیوانات کی مستی کی ایک سنجیدہ صورت ہے جس سے انسانوں میں وظائف تناسل کے ایفا کی ترغیب و تشویق اور حیوانات کی

---

[۵] ڈاروِن۔ ڈیسینٹ آف مین ص ۴۸۴

حس شہوانی میں ہیجان و اضطرار پیدا ہو جاتا ہے۔ باہمی فرق اگر کچھ ہے تو انسانیت و سبعیت کا ہے البتہ جن روحانی و وجدانی لذات و محسوسات سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے ان سے حیوانات قاطبۃً محروم ہیں۔ اس ضمن میں یہ مشاہدہ بغایت دلچسپ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے حیوانات اس خواہش کے غلبہ کے وقت کن وسائل و اطوار کو اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ان میں اور نوع انسانی میں جو عادتیں بطور قدر مشترک کے پائی جاتی ہیں ان سے آیندہ ہم کو بعض اہم نتایج اخذ کرنا ہیں۔ ہم آگے چل کر یہ بھی ثابت کرنے والے ہیں کہ جوڑوں کے باہمی ملاپ اور نر و مادہ کے نسلی تعلقات کی پابندی میں انسان اور حیوان کے درمیان مماثلت و یگانگت پائی جاتی ہے حیوانات کی روش زندگی پر غور کرنے سے انسانی طرز معاشرت پر حیرت انگیز روشنی پڑتی ہے اور معاشرت انسانی کے مبادیات کا سراغ ہم کو عالم حیوانات کے مطالعہ سے بطریق احسن مل سکتا ہے۔

حیوانات کا جذبہ محبت کہا جاتا ہے کہ محبت موت کی طرح قوی ہے بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت موت سے زیادہ تر قوی ہے۔ اس لئے کہ محبت کے عالم میں موت کی کوئی وقعت ہماری نظروں میں باقی نہیں رہتی اور ہم اسے حقیر سمجھنے لگتے ہیں لیکن یہ کلیہ انسان کے بجائے حیوانات پر زیادہ صحت کے ساتھ منطبق ہوتا ہے اس لئے کہ ادراک و شعور کی کمزوری جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر یہ جذبہ قوی پایا جائے گا۔ کیڑے پتنگوں کے بارے میں یہ کہنا بالعموم درست ہے کہ ان کی محبت اور موت میں ایک قدم کا فاصلہ ہے باوجود اس کے وہ اپنے جوش محبت کو روکنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے ان کے میل ملاپ کا زمانہ خواہ کتنا ہی کم ہو لیکن جو بات اکثریت کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے اور اپنی تعمیم کی وجہ سے اس جنس میں قانون کا حکم رکھتی ہے وہ ان کا باہمی عشوہ و ناز ہے ان جانداروں کی مادہ جو معمولی طور پر ذی شعور ہیں نر کی چاپلوسی پر پہلے پہل بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے اس مفید عادت کی ابتدا غالباً طبعی انتخاب سے ہوئی ہے۔ اس کم التفاتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نر کی خواہشات کو تحریک ہو کر اس کے خوابیدہ جذبات میں ایک قسم کا اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ تتلیوں کی عمر اگرچہ بہت قلیل ہوتی ہے لیکن ان کے جوڑوں کا ملاپ "مراتب ابتدائی" کے بغیر نہیں ہوتا۔ نر مادہ کے

پیچھے گھنٹوں خوشامد و چاپلوسی کیا کرتا ہے حالانکہ اس ننھی سی جان کے لئے گھنٹے سالوں کے برابر ہیں

یہی کیفیت مچھلیوں میں بھی مشاہدہ میں آئی ہے۔ جب ان کی بہار کا موسم آتا ہے اور مشاطۂ قدرت نر مچھلیوں کو نہایت خوشنما رنگوں سے آراستہ کرتی ہے تو وہ جوش مسرت میں اپنے حسن مستعار کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے مادہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی تو وہ اپنے پروں کو پھلا دیتے ہیں اور کبھی مادہ کے گرد اچکتے پھاندتے اور خوش فعلیاں کرتے ہیں مچھلیوں میں قانون عشوہ و ناز کی طرح ایک اور قانون بھی رائج ہے جس کو ڈارون نے قانون مجادلہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں مادہ کے لئے نروں میں جنگ وجدال ہوتی ہے اور مادہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو زیر کر دے۔ اس صنف میں مادہ خاموش اور صلح پسند ہونے کے باوجود نر حد درجہ کا جنگجو پایا جاتا ہے مقابلہ کے وقت اپنی عزت کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ جوش وغضب کے ساتھ جنگ آزمائی کرتے ہیں۔ نر سامن salman جس کے نیچے کلپھڑے تناسل کے زمانہ میں لانبے اور خمدار ہو جاتے ہیں آپس میں ہمیشہ لڑتے رہنے کا عادی ہوتا ہے۔[1]

حیوانات کے اعلیٰ اقسام میں بالعموم دو خواہشیں نہایت شدت کے ساتھ پائی گئی ہیں (۱) طرحدار نظر آنے کی خواہش (۲) حریف کو زیر کرنے یا بھگا دینے کی خواہش۔ جنوبی امریکہ میں چھپکلی کے نر تناسل کے ایام میں خوب لڑتے جھگڑتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغلوب بے دم رہ جاتا ہے اس لئے کہ غالب اس کی دم کاٹ ڈالتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں خوب پھول جاتا ہے اور سر و دم کو اٹھا کر سطح آب پر چکر لگاتا رہتا ہے اور اس کی حرکات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ امریکہ کے وحشیوں کا ایک سردار اپنی نبرد آزمائیوں کے قصے فخریہ بیان کر رہا ہے۔

پرندوں کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے ان کے شوق و محبت کا جذبہ حقیقی زور و اثر رکھتا ہے اور اس میں موسیقی کی شان پائی جاتی ہے۔ انتخاب طبعی کے متعلق ڈارون کی مشہور تھیوری بھی ٹھیک طور سے پرندوں ہی پر صادق آتی ہے۔ قمری کے عشق کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نر خاص شان کے ساتھ دم ہلاتا ہوا خراماں خراماں بڑھتا ہے کبھی اس کو چونچ کرتا ہے اور کبھی بالکل سمٹ لیتا ہے

[1] ڈارون۔ ڈیسنٹ آف مین ص ۳۶۵

اس کی خوش نوائیاں کانوں کو نہایت بھلی معلوم ہوتی ہیں خصوصاً درخت کی کسی اونچی ٹہنی یا جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے اس کی حقیقی خود فراموشی کی صدائیں دل و دماغ پر اثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس عالم بیخودی میں کوئی حریف مخل ہو یا کوئی نر نظر آجائے تو اس پر فی الفور حملہ کر کے حدود معینہ سے اس کا یکسر اخراج کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کئی پرندے اس قسم کے مقابلوں میں مصروف پائے جاتے ہیں لیکن اس کا دوران دو یا تین منٹ سے زاید نہیں رہتا۔ اس اثنا میں احیاناً کوئی مادہ نظر آجائے تو بس ان معرکہ آرائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور سب کے سب اس کے پیچھے اڑ جاتے ہیں ایسے مواقع پر مادہ اپنی فطری متانت کو قایم رکھتی ہے (جو حقیقتاً نر کے قابو میں لانے کا عمدہ نسخہ ہے) جس وقت نر دلکش نغمے الاپتا ہوا مادہ کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اپنے عاشق زار کی وارفتگیوں پر اس انداز سے پیچھے سرک جاتی ہے کہ وہ دل باختہ اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ جواب صاف دیا گیا ہے یا امتحان وفا منظور ہے۔

پالو اور سیاہ رنگ کے مرغ منچلے، جری اور لڑاکو ہوتے ہیں۔ ان کی مادہ پہلے تو خاموشی کے ساتھ اس سنجیدہ لڑائی کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور بالآخر فتحمند مرغ کو کامیابی کے انعام سے خوش کرتی ہے متمدن اور وحشی انسانوں میں بھی تقریباً یہی کیفیت مشاہدہ میں آتی ہے ایک مرغی ایسی بھی ہوتی ہے جو بڑے مرغ کو حریف سے مقابلہ میں منہمک پا کر چھوٹوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہے[۵]۔

یہ باہمی مجادلے کسی دیرینہ مخالفت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ مادہ کو اپنی خوبصورتی اور بہادری کی شان دکھا کر مسخر کیا جائے۔

حیوانوں اور انسانوں کی طرح پرندوں میں بھی محبت پر معنی ہوا کرتی ہے۔ مادہ کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے وہ بھی عجیب وغریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ بعض سر کی کلغی اور جسم کے پروں کو خوشنما بنا کر رقص کرتے ہیں اور بعض اس پر تسلط حاصل کرنے کے لئے اپنی وہبی خوش گلوئی کو وسیلہ تسخیر قرار دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں ان کی جسمانی قوت اور بہادری بالکل معطل ہو جاتی ہے بلکہ مادہ کی صرف آنکھ اور کان پر جادو چلایا جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ کبوتر اور فاختہ کس طرح اپنی مادہ کی سلامی اتارتے ہیں بگلے گدھ اور سرقاب مادہ کے سامنے اکڑتے اور اتراتے ہوئے اپنی دم کو زمین پر گھسیٹتے اور رقص کرتے ہیں

---

[۵] ڈارون۔ ڈیسنٹ آف مین ص ۳۹۹

تاجدار ہنس سر اٹھا کر اپنے ریشمی طرہ کو سیدھا یا خمدار بنا لیتا ہے۔ اور اپنی مادہ کے سامنے حلق کو خوب پھلا کر اس میں سے خاص قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔

چیافنش نامی گانے والی چڑیا اپنی مادہ کے سامنے اس لئے آکر کھڑی ہوتی ہے کہ وہ اس کے سرخ گلو اور نیلے سر کو قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ بعض پرندے خوبصورتی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح یہ بھی اپنی قدرتی زیبائش پر قانع نہیں ہوتے بلکہ اس کو ناکافی سمجھ کر اپنے گھونسلوں کو رنگارنگ پروں، خوشنما پھول پتیوں، سیپیوں اور ہڈیوں سے نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ آراستہ کرتے ہیں۔ اکثر پرندے اپنے راز و نیاز کی باتوں کو دوسروں سے مخفی رکھنے کے لئے کنج اور سائبان بناتے ہیں شہر نیوگنی کا ایک پرندہ مخروطی وضع کی ایک کٹی یا جھونپڑی بناتا ہے جس کے آگے سبزہ اور کائی جمع کی جاتی ہے اور اس پر خوشنما پھول اور بلور کے ٹکڑے اور سیپیاں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کملائے ہوئے پھولوں کے بجائے تازہ پھول بدلے جاتے ہیں تاکہ ان ایام میں فرحت بخش سامان ہر وقت پیش نظر رہے لطف و محبت کے یہ عجیب و غریب کاشانے اس قدر مستحکم ہوتے ہیں کہ کئی برس تک قایم رہتے ہیں اور کئی جوڑوں کے کام آتے ہیں۔ اس وقت تک نوع حیوانات کے قانون ازدواج کے متعلق جو کچھ ہمارے معلومات ہوئے ہیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسلی زندگی کی حد تک پرندوں کا طرز معیشت کس قدر بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ سب سے زیادہ لایق غور یہ امر ہے کہ اس بارے میں ان کے مساعی جبر و تشدد کے بجائے صنف نازک کو باسالیب مختلفہ اپنی جانب مایل کرنے پر محدود ہوتے ہیں اور وہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے اپنی سمجھ اور بساط کے موافق ہر ممکنہ طریقہ سے کوشش کرتے ہیں۔ مینا چونکہ بلبل کی طرح خوش الحان نہیں ہوتی اس لئے کسی خشک مگر پُرصدا ٹہنی کی آڑ میں ہو کر وہ اپنی مادہ کو آواز دیتی ہے کینڈا کے ہنس کے بارے میں مسٹر اڈوین کا مشاہدہ نوع انسانی پر بالکلیہ منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہنس جس قدر زیادہ عمر والے ہوں گے۔ اسی مناسبت سے "مراتب تمہیدی" میں بھی کمی پائی جائے گی۔ چونکہ بہ تقاضائے سن ان میں اگلا سا شوق و ولولہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تملق و خوشامد کے بغیر یہ اپنی مادہ کا رُخ کرتے ہیں۔

پرندوں اور رینگنے والے جانوروں کے نر مادہ کے مقابلہ میں زیادہ پر جوش ہوتے ہیں اس لئے

اس خواہش کے غلبہ کے وقت ان کو کسی مادہ کے قبول کرلینے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا لیکن پرندے اپنے جوڑوں کے انتخاب کے معاملہ میں قانون مجادلہ کے بڑی حد تک پابند ہوتے ہیں اور یہ قانون آبی وارضی دونوں قسم کے جانوروں میں بالاشتراک پایا جاتا ہے مگر صنف ذات الثدی کی یہ حالت نہیں ہے۔ ان میں جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہی سب پر غالب رہتا ہے۔ مستی کے زمانہ میں بارہ سنگھوں کے مجادلے مشہور ہیں، بعض وقت ان کی شاخیں آپس میں اس قدر الجھ جاتی ہیں کہ وہ اسی حالت میں موت یا کسی شکاری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ سیل (دریائی بچھڑا) اور گرین لینڈ کے وہیل بھی خشمناکی سے آپس میں مجادلے کرتے ہیں۔

انسان ذات الثدایا اور پرندوں میں شوق وصل تمامی قوتوں پر محیط ہوتا ہے۔ اور اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی معمولی حیثیت سے ترقی کرکے ایک ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہوگئے ہیں۔ جانور مستی کے عالم میں زیادہ جری اور خونخوار نظر آتے ہیں۔ ہاتھی جو اپنی خاموشی اور صلاحیت کے لئے مشہور ہے۔ مست ہوکر آپے سے باہر ہوجاتا ہے صنف حیوانات کے متعلق یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ وہ شعور و ادراک کی قوتوں سے معرا ہیں اور ان کے اغراض و ضروریات زندگی ایک خود رواں مشین کی طرح بلاحس و ادراک کے پوری ہوتی ہیں۔ اور ساری عقل و ادراک حضرت انسان ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ نیز امتیاز تخیل اور انتخاب کی قوتیں انسان ہی کے لئے مخصوص ہیں لیکن بقاے نوع جو لوازمات زندگی کا ایک اہم لزم ہے اسی میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جانوروں میں حد درجہ کا انضباط اور باقاعدگی پائی جاتی ہے اور اسی ضابطہ کے تحت ان کے مقاصد زندگی نشو ونما پاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اور حیوان روش و خصوصیات میں ایک دوسرے سے مطابقت و مناسبت رکھتے ہیں اس لئے کہ عادات و اطوار میں یہ ایک دوسرے کے نقال ہوتے ہیں۔ مہذب انسانوں کی طرح حیوان بھی قوت امتیاز و انتخاب رکھتے ہیں چنانچہ وہ اپنے ہم جنس کی محبت میں اندھے نہیں ہوجاتے۔ جن لوگوں نے فطرت مخلوقات کے مسئلہ پر غائر نظر ڈالی ہے ان کی رائے میں مادہ نر کے مقابلہ میں طبعاً کمزور ہوا کرتی ہے اور وہ اپنے ہم جنس کے انتخاب

میں زیادہ غیر محتاط اور جلد باز پائی گئی ہے لیکن کبوتر کی مادہ بعض کبوتروں سے سخت تنفر دیکھی گئی ہے اور باوجود چاپلوسی کے رام نہیں ہوتی۔ یہی مادہ بعض اوقات اپنے پرانے نر کو چھوڑ کر دفعتاً دوسرے کبوتر سے مل جاتی ہے۔ اسی طرح مادہ طاوس کسی دوسرے مور کی جانب مائل ہوجاتی ہے۔ اچھی نسل کی کتیاں حس شہوانی سے مغلوب ہوکر اپنی نسل کی خوبیوں کو معمولی اور کم ذات کتوں سے ملوث ہوکر برباد کرلیتی ہیں۔ بعض کتیاں ہفتوں اسی شغل میں مصروف پائی گئی ہیں اور اس زمانہ میں وہ اپنی ذات کے عمدہ کتوں سے بھی نفرت کرنے لگتی ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور بیمار کبوتر کو اس کی مادہ نے چھوڑ دیا ہے۔

المختصر جانوروں کا اتحاد محبت واتحاد انسانی سے کچھ زیادہ مغائر نہیں ہے نہ ان کے نسلی تعلقات قیام و استحکام کی صفت سے خالی ہوتے ہیں۔ البتہ انس ومحبت کی پائندگی اور شرافت ونجابت کی خوبیوں میں انسان کو حیوانات پر افضلیت حاصل ہے۔

سید علی اصغر بلگرامی

زمانہ

کائنات میں مکان کی وسعت کا اندازہ کرنے میں انسان کو علم ہیئت سے بڑی مدد ملی ہے رصد گاہوں میں بیٹھ کر ہم نے معلوم کیا کہ اس گنبد نیلی رواق میں ایک ثابت ایسا بھی ہے جس کی روشنی ہم تک تین برس میں پہنچتی ہے روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تین برس میں روشنی کتنا فاصلہ طے کریگی۔ اس ثابت کا فاصلہ ہم سے ۲ پدم میل کے قریب ہے جس کا مفہوم ہر کس و ناکس اپنے ذہن میں مشکل ہی سے قایم کر سکتا ہے۔

اسی طرح علم طبقات الارض نے زمان یا وقت پر احسان کیا ہے یعنے آج اور کل کی چھوٹی چھوٹی مدتوں کے مفہوم کو ترقی دیکر ایک سلسلہ لاتناہی تک پہنچا دیا۔ چنانچہ زمین کی عمر ہی دیکھئے۔ ارضئین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں لیکن اس کی مدت کو لاکھوں تک سب ہی پہنچاتے ہیں ایسی صورت میں اگر ہم ان شواہد اور نتایج پر جن سے یہ مسایل اخذ کئے گئے ایک نظر ڈالیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب ہم زمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں یا زیادہ صحیح معنوں میں اس ارض مسکونہ کا ملاحظہ علی صحت و احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترکیب یکساں نہیں ہے بلکہ مختلف اور ممتاز طبقے یا تہیں ہیں۔ یہ بڑے خطوں ہی پر نہیں صادق آتا ہے بلکہ ہر ایک ایسی تہ اسی طرح باقاعدہ بنی ہے جیسے اہرام مصری اور بعض تہیں تو ورق کتاب سے زیادہ دبیز نہیں ہیں۔ اب ذرا غور کرو کہ اس طبقہ سازی کا کیا مطلب ہے سب سے پہلے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ طبقہ پانی ہی نے بنائے کیونکہ کوئی دوسری طاقت ایسی نہیں ہے جو اس طرح چیزوں کو علیحدہ کر کے ان کی تہ پر تہ جمادے تمام اکناف عالم میں پانی کی یہ قوت برابر اپنا کام کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر دریاے رہون ہی جو سوئٹزرلینڈ میں جھیل جنیوا میں گرتا ہے۔ داخل ہوتے

وقت تو اس میں بہت کچھ گدلا پن ہوتا ہے لیکن جب اس جھیل سے نکل کر آگے بڑھتا ہے تو نہایت شفاف ہوجاتا ہے جو کچھ مادہ یہ اپنے ساتھ بہا کر لاتا ہے وہ سب جھیل میں جمع ہوتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ مدت کے بعد وہ جھیل تمام تر اس سے بھر جائیگی ہر مد و جزر کے ساتھ جمع شدہ مواد کی مقدار و نوعیت بدلتی رہتی ہے چنانچہ بعض اوقات پتھر کے تودے بعض اوقات سنگریزے، ریت یا باریک بالو جمع ہوجاتا ہے کبھی تو یہ سب دور تک بہے چلے جاتے ہیں اور کبھی تھوڑی دور تک جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ سب پانی کی رفتار پر منحصر ہے صدیوں بعد جب جھیل بھر کر خشک ہوجائیگی تو اس وقت بھی اگر کوئی کنواں یا گڑھا کھودا جائیگا تو صاف معلوم ہوجائیگا کہ یہاں پہلے جھیل تھی، جیسا کہ آج کل بھی ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے۔

جو کچھ رہون یا جنیوا کے ساتھ وہ ہر ایک دریا یا جھیل کے ساتھ گزر رہا ہے خواہ وہ دریائے گنگ ہو یا مسی سپی اور جن جن سمندروں میں یہ دریا گرتے ہیں ان پر بھی یہ کیفیت گزر رہی ہے۔

سمندروں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے سواحل کو برابر کاٹتے جاتے ہیں اور جہاں کہیں زمین نرم موجیں زبردست، اور روانی تیز ہے یہ انہدام نہایت سرعت کے ساتھ جاری ہے یہ تمام مادہ سنگریزوں کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے، پس کر ریت ہوجاتا۔ یا باریک بالو بنکر تیر تا رہتا ہے اور بالآخر یہ سب سمندر کی تہ میں جاکر جم جاتا ہے لیکن یوں ہی تودے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک ترتیب منضبط کے ساتھ۔ ان ہی میں بعض طبقوں پر مرجان اور دیگر حشرات البحر کی نسلیں کی نسلیں رہی اور مرگئی ہیں ان کے آثار دوسرے طبقوں سے دب گئے اور آیندہ ارضیین کے لئے باقی رہ گئے یہ تمام عمل اب بھی ہو رہا ہے اور جب ہم چٹانوں کو بغور ملاحظہ کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ سوائے ان چند آتشین چٹانوں کے جو زمین کے اندر سے پگھلے ہوئے مادہ کے ابھرنے سے اور پھر اس مادہ کے دباؤ کی مقدار اور وقت تبرید کی وجہ سے لاوا کی چادروں کی صورت میں یا سنگ سماخ یا سنگ لاخ میں تبدیل ہونے سے بن گئے ہیں باقی جتنی چٹانیں ہیں وہ سب ترتیب یافتہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی کی بدولت اس ترتیب کو پہنچے۔ بعض قدیم ترین چٹانیں مثل (Gneiss[1]) نیس کے ایسی بھی ہیں جن کی نسبت قطعی رائے نہیں قائم کیجا سکتی۔ کیونکہ بظاہر ان پر حرارت اور دباؤ کا تشدد بہت ہوا ہے حتی کہ ان میں اس قدر لوچ آگیا کہ وہ بوقت

---

[1] ایک قسم کی چٹان جس میں ابرک لبرو وغیرہ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

تہ بہ تہ سلوں میں منجمد ہوگئیں اور اس طرح تمام وہ حیوانی اور دیگر آثار مفقود ہو گئے جن سے ان کی طبقہ سازی کا پتہ لگتا۔ لیکن ماہرین فن کا خیال ہے کہ وہ چٹانیں اصل میں طبقہ در طبقہ تھیں لیکن متحول ہو کر آتشین چٹانوں کی سی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اگر ان کو بھی نہ شامل کیا جائے تو ہم اس کہنے کے مجاز ہیں کہ قشر زمین کی ساخت میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے بیشتر حصہ اس طبقہ در طبقہ مواد کا ہے جس کو پانی نے ترتیب دیا ہے

اس سے ایک اور امر اہم کا پتہ چلتا ہے یعنے مادہ کے اس تہ بر تہ جمع ہونے سے یہ مراد ہے کہ اسی قدر حصہ زمین سے الگ ہوا ہے پانی خود ان اشیا کو پیدا تو کر سکتا نہیں پس ہر مربع میل کا طبقہ جس کی موٹائی اوسطاً ۱۰ فیٹ ہو یہ معنی رکھتا ہے کہ خشکی کے ہر مربع میل سے ۱۰ فیٹ کی تہ بذریعہ بارش یا دریاؤں نے علیحدہ کردی ہے یا یہ کہ زمین سے اس حجم کا مادہ ساحل کے گھسنے یا اور کسی صورت سے علیحدہ ہو گیا ہے اس امر کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم موجودہ طبقوں کے بننے کی مدت پر غور کرتے ہیں۔ ابتدا میں جب زمین ایک رقیق حالت سے منجمد ہوی ہوگی اور سطح سخت ہوگئی ہوگی تو ضرور ایک صخرہ یا چٹان بھی ہوگا اور جب تدبیراس حد کو پہنچی ہوگی کہ بخارات آبی کثیف ہو کر پانی ہوگئے ہوں تو ان صخروں کو اس وقت کے سمندروں اور دریاؤں نے خوب کاٹا ہوگا اور یہ مادہ جو اس طرح کٹ کر علیحدہ ہوا ہوگا وہ سمندر کی تہ میں موٹے موٹے طبقوں میں جم گیا ہوگا اور اس طرح صخرۂ ابتدائی کو ڈھک لیا ہوگا اور پھر یہ سب کسی قدر حرارت اور دباب کی وجہ سے سلوں میں بدل گئے ہوں گے، بار بار ان میں ایک تلاطم پیدا ہوا ہوگا، اور پھر یہ تہ نشین ہوگئے ہوں گے اور خود بھی کسی قدر گھسے ہوں گے جن سے نئی تہیں بن گئی ہوں گی اور یہی عمل پھر ان پر جاری ہوا ہوگا۔

ایک تیسرا اہم نتیجہ اس طبقہ سازی سے یہ نکلتا ہے کہ شروع میں یہ تمام تہیں متوازی الافق یا اس کے قریب قریب جمی ہوں گی اس طرح پر کہ سب سے قدیم تہ سب سے نیچے ہوگی۔

فرض کیجئے کہ ہم ایک گلاس میں پانی بھریں اور اس میں سفید ریت ڈال دیں اور جب وہ تہ نشین ہوجائے اور پانی صاف ہوجائے تو پھر زرد ریت ڈال دیں۔ اور پھر تھوڑی سی سرخ ریت تو ظاہر ہے کہ ظرف کے پیندے میں تین متوازی الافق تہیں ہوں گی ایک سفید ایک زرد، ایک سرخ۔ اور یہ کسی طرح

ترین تھا یہ نہیں ہے کہ ان کی ترتیب میں کسی طرح کا فرق آئے۔ پس گویا یہ ایک قانون ہے اس لئے جہاں کہیں ہم کو ان طبقوں کا سلسلہ ملتا ہے جو ایک دوسرے پر مترتب ہوں تو بہ لحاظ وقت قدیم ترین طبقہ وہی ہے جو سب سے نیچے ہے اور جو سب سے اوپر وہ تازہ ترین ہے۔

پس اگر عہد عتیق سے لیکر جدید ترین عہد ثالث تک یہ تمام تہیں ساری دنیا میں یکسانیت کے ساتھ متوازی الافق ہو کر جمتیں اور دستبرد زمانہ سے محفوظ رہتیں تو ہم ایک صخرہ اعظم پاتے جس کی بلندی ۵۰ میل ہوتی کیونکہ ان طبقوں کی مجموعی موٹائی ہے اور پھر کسی مزید وقت کے بغیر نہایت آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تہوں کی ترتیب اور جسامت کیا ہے۔

لیکن ایسا ہونا ظاہر ہے کہ ناممکن ہے کیونکہ ایک وقت میں جو اجزا بیٹھتے جاتے ہیں وہ دوسرے وقت کے اجزاء سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے زمانہ میں بحر اطلانتک یا اوقیانوس کے عمق کو بھرنے کے لئے گلو بی جیرینیا پر برابر مٹی جمتی چلی جاتی ہے جو شل کھریا مٹی کے ہے۔ خلیج ہائے بنگال و مکسیکو اپنے میں گرنے والے دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے پر ہوتے جاتے ہیں۔ بحر الکاہل و بحر الہند و بحر قلزم کے بڑے بڑے حصہ مونگے اور مونگے کی چٹانوں سے گھسے ہوئے مادہ سے بھرتے جاتے ہیں اب اگر آیندہ کسی زمانہ میں یہ طبقات زمین کی شکل میں نمودار ہوں اور اس زمانہ کے اوضیئین ان کو دیکھیں تو ان کو کیونکر پتہ چلیگا کہ سب ایک ہی زمانے میں تیار ہوئے ہیں فرض کیجئے کہ ملکہ وکٹوریہ کے سکے ان طبقوں میں ڈال دئے جائیں تو جو اراضی ان کو دیکھیگا وہ یہ فوراً نتیجہ نکالیگا کہ یہ طبقہ انیسویں صدی میں بنے ہیں زمین کے طبقات میں جو مچھ کوڑیاں یا دیگر آثار ملتے ہیں وہ گویا اسی قسم کے سکے ہیں۔ ہر طبقہ کے آثار حیوانی و نباتی امتیازی ہوتے ہیں یہ اختلاف ایک عہد سے لیکر دوسرے عہد تک تدریجی ہوتا ہے لیکن ماضی اور آیندہ سے تعلق دکھانے کے لئے کچھ صورتیں و شکلیں باقی رہ جاتی ہیں تاہم ان میں اپنے طبقہ کی خصوصیات اس درجہ غالب ہوتے ہیں کہ ہم کو تاریخ ارضی میں ان طبقوں کی مناسب جگہ دینے میں کچھ بھی دقت نہیں ہوتی۔ بے شمار شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہم زمین کے مختلف طبقوں کی

قدامت معلوم کرنے کے لئے ان آثار حیوانیہ و نباتیہ پر کامل اعتماد کر سکتے ہیں جو ان طبقوں میں ملتے ہیں اگرچہ وہ طبقے باعتبار اپنے معدنی اجزا کے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان طبقوں کی دبازت اور ترتیب کیونکر معلوم کی جائے اتنا ہم کو معلوم ہے کہ تمام طبقہ در طبقہ صخور پانی کے عمل کا نتیجہ ہیں اور نیز یہ کہ جمنے کے وقت متوازی جمے ہوں گے اگر وہ اسی حالت میں رہتے تو یہ طبقہ سازی کب تک کی ختم ہو گئی ہوتی کیونکہ تمام خشکی کی سطح سمندر کی سطح کے برابر ہو جاتی اور پھر پانی کاٹنے کے لئے زمین نہ ملتی۔ پس تاریخ ارضی کے شروع ہی میں یہ جمنا بند ہو گیا ہوگا۔ ورنہ ہم کو سطح کے علاوہ یا ان گڑھوں کے علاوہ جو ہم کھود سکے زمین کے طبقات زیرین کا بالکل علم نہ ہوتا۔ لیکن زلزلے اور کوہ ہائے آتش فشاں اور ان کے علاوہ اندرونی حرارت اور مقامی تبرید اور انقباض کی وجہ سے جو دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ سب امور بالا کے خلاف کام کر رہے ہیں جس کی وجہ سے زمین کی بلندیاں و پستیاں برابر قایم رہتی ہیں۔ خشکی و تری کے درمیان توازن قایم رہتا ہے اور وہ طبقات جو ابتداءً سمندر کی تہ میں متوازی تھے دفعتاً اوپر آ جاتے ہیں یہاں تک پہاڑوں کی چوٹیوں پر مرجان ملتے ہیں اور ہم ان کی منقلبہ سطحوں پر میلوں چل سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ علماے ارضیات نے قشر زمین کی دبازت کو کیونکر ناپا تو اس کو چاہئے کہ ایک کتاب اپنے ہاتھ میں لے اور اس کے پہلے صفحہ کو کھولے اس کو سوائے اس ایک صفحہ کے دوسرا نظر نہ آئیگا۔ لیکن اگر وہ کتاب کے ورقوں کو دہنی طرف موڑے حتی کہ ان کے کنارے متوازی ہو جائیں تو اس کو معلوم ہوگا کہ ۲ انچہ کی بساط میں وہ تقریباً ... صفحہ گن سکتا ہے۔

ارضیین نے بھی بس یہی طریقہ وہاں استعمال جہاں ان کو قشر زمین کے مختلف مقامات پر اس کی تاریخ کے صفحے اس طرح الٹے ہوئے دکھائی دئے اور یہ ورق یکے بعد دیگرے اسی ترتیب کے ساتھ الٹتے جاتے ہیں جس طرح کہ قلم فطرت نے ان کو تحریر کیا تھا مثلاً اگر ہم انگلستان میں مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف سفر کریں تو ہم متواتر جدید طبقوں سے قدیم طبقوں تک گزرتے چلے جائیں گے یعنے پہلے کھریا ملے گی پھر اس کے نیچے چونہ کا پتھر اور لائس[1] یعنے چونے کے تہ کے نیچے نکلتا ہے۔ ......

[1] اس کو انگریزی میں (Lias) کہتے ہیں یہ (Limestone)

پھر کیمبرین[1] یعنے نیا سنگ سرخ - پھر کاربنی مادہ جس میں کوئلہ بھی شامل ہے - ڈیونین[2] یعنی قدیم سنگ سرخ پھر میلورین[3] - کیمبرین اور اسکاٹ لینڈ اور ہیبرائڈس کے گوشہ شمال مغرب والا اور قدیم ترین لارنٹین -

ترتیب بالا میں کچھ حذف اور اضافہ ہے تاہم بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت برطانیہ میں صحیفہ فطرت کی صفحہ اول سے صفحہ ۵۰۰ تک ورق گردانی کرنے سے وہی تصویر نظر آئیگی جیسی کہ مذکورۂ بالا مثال میں پیش کی گئی ہے - اگر ہر ایک طبقہ کو ایک باب یا فصل قرار دیا جائے تو اس میں متعدد صفحے نظر آئیں گے جن کے حروف و مرقع جدا جدا ہوں گے اگرچہ یہ صفحے اپنے ماقبل اور مابعد سے مشارکت باب کی وجہ سے متعلق ہوتے ہیں اور یہ ابواب خود ایک دوسرے سے اصل صحیفہ کے ذریعہ مربوط ہوتے ہیں - تاہم یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ کسی طرح بھی مکمل ہے - ہم کو اس کا ورق ورق چن کر جمع کرنا پڑتا ہے اور یہ ورق ہم کو ان محدود ملکوں میں ملے ہیں جن کی آج تک علمی طریقہ پر چھان بین ہوئی ہے اور یہ ملک سب مل کر سطح زمین کا بہت ہی قلیل حصہ ہیں - ہم کو نہیں معلوم کہ ان سمندروں کے نیچے کیا ہے جو زمین کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ گھیرے ہوئے ہیں جس وقت کہ سطح زمین خشک تھی - اس وقت کی تاریخ کے سلسلہ کی بہت سی کڑیاں مفقود ہیں اس وقت تہوں کا جمنا یا اثرات کا قایم رہنا ممکن نہ تھا تاہم بہت کچھ مصالحہ جمع کیا گیا ہے اور ارضیین کا جس پر اجماع ہے وہ ذیل میں درج ہے :-

طبقات معلومہ کی مجموعی دبازت تقریبًا ۱۳۰۰۰۰ (۱۳ لاکھ) فٹ یا ۲۵ میل ہے - یعنے سطح سے مرکز تک کے فاصلہ کا $\frac{1}{1\cdot\cdot}$ حصہ - اس میں سے ۳۰۰۰۰ (تیس ہزار) فٹ تو قدیم ترین زمانہ لارنٹین میں بنے جس سے زیادہ قدیم دوسرا طبقہ معلوم نہیں - ۱۸۰۰۰ (اٹھارہ ہزار فٹ) کیمبرین میں

---

[1] کیمبرین اس طبقہ کا نام ہے جس میں شل والے جانوروں کے آثار پائے جاتے ہیں شل سے مراد وہ جانور ہیں جنکے جسم پر خار دار اور سنگین جلد ہوتی ہے اس طبقہ ارض کو سجوک نامی ایک عالم نے سنہ ۱۸۳۶ء میں دریافت کیا - ویلز کی زمین اس قسم کے جانوروں کے نشانات ملے چونکہ ویلز کو کیمبریا بھی کہتے ہیں اس لیئے اس طبقہ کا نام اس زمین میں سر رکھا -
[2] اس طبقہ میں سیپ وغیرہ پائے جاتے ہیں اس کے آثار برطانیہ کے ڈیون شائر میں پائے جاتے ہیں اس لئے یہ نام رکھا گیا - [3] اس طبقہ میں مچھلیوں کے آثار ملتے ہیں -

اور ۲۲۰۰۰ فٹ سلورین میں بنے۔ یہ قدیم طبقے جن کو دور اولین کے تحت میں شمار کیا جاتا ہے حرارت اور داب کی شدت کی وجہ سے کچھ اس طرح متغیر ہو گئے کہ تمام آثار اور علامات قریب قریب محو ہو گئیں۔

کیمبرین اور سلورین زیریں کے زمانوں میں حیات کے نشانات کثرت سے ملتے ہیں خصوص دریائی گھاس کے ادنیٰ ترین شکلوں کے اور سلورین بالا میں تو ہم کو ایسے آثار بہت نظر آتے ہیں جن میں مونگا مچھلی اور کچھ اصلی مچھلیاں بھی ملتی ہیں بعض مونگے شل لنگولا کے اب تک بلا کسی ٹیڈ تغیر کے موجود ہیں۔ اور بہ حیثیت مجموعی اگر قبل کا نہیں تو دور سلورین کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے اس دور میں وہی قوتیں عمل کر رہی ہیں اور وہی اثرات منتج ہوتے تھے جو کہ اب جاری ہیں چنانچہ پانی برستا تھا ہوائیں چلتی تھیں، دریا بہتے تھے، موجیں چٹانوں کو کاٹتی تھیں، مونگے رہتے اور مرتے تھے، کیکڑے اور دیگر حشرات الارض ان ساحلوں پر رینگا کرتے تھے جو لہر کے اتر جانے سے خشک ہو جایا کرتے تھے اور اب بھی بہت کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔

اس کے بعد کا سب سے بڑا طبقہ جس پر اول (یعنے طبقہ اول) کا اطلاق کیا گیا پیشتر اس کے کہ حیوانی اجسام کے پس ماندہ اجزا کا وجود عہد اول یا حیات قدیم (Palaeozoic)[1] میں معلوم ہوا ہو ڈیونین یا قدیم سرخ پتھر۔ پتھر کا کوئلہ اور پرمین یا جدید سرخ پتھر پر مشتمل ہے ان ہر سہ طبقات کی اوسط دبازت یا موٹائی بہ حیثیت مجموعی ۴۲۰۰۰ فٹ ہے ہم اس کو عہد پرسیاوشان ہنسراج (Ferns)[2] دماہی کہہ سکتے ہیں ان میں سے اول الذکر ہمارے پتھر کے کوئلہ کا مخزن ہے اور ثانی الذکر ڈیودین اور پرمین طبقوں میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔

تیسرا سب سے بڑا طبقہ ہر سہ نظام ثانوی جس میں (Triassic)[3] بھی شامل ہے۔ جیورا (Jura)[4]

---

[1] (Palaeozoic) یہ لفظ یونانی زبان کے دو الفاظ (Palaos) اور (zoe) سے مرکب ہے پیلو (Palaios) یعنی قدیم اور زوئے بمعنی زندگی اس زمین کو (Palaeozoic) اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں سب سے پہلے جاندار چیزوں کے آثار پائے جاتے ہیں اس زمین کو (Primary Rocks) بھی کہتے ہیں یعنی ابتدائی زمین ہم اپنی اصطلاح میں حیات قدیم یا عہد اول کہیں تو بہتر ہے [2] ایک قسم کا پودا ہے [3] اس طبقہ میں ذات الثدی جانوروں کے نشانات ملتے ہیں یہ طبقہ پہلے الگ الگ تین طبقوں میں منقسم تھا۔ مگر جدید تحقیق کی ابناء پر جرمنی کے علماء ارض نے اس کا نام ٹرائی ایک یعنے اتفاق ثلاثہ رکھا۔

[4] اس طبقہ میں رینگنے والے جانوروں کے نشانات ملتے ہیں جو پرند کے مشابہ ہوتے تھے چونکہ اس طبقہ کی زمین کوہ جیورا میں پائی گئی اس لئے یہ نام رکھا گیا۔

اور کری ٹےسیس یعنے خاک سفید یا کہربا پر مشتمل ہے جس کی اوسط دبازت ۰۰ ۱۵ فٹ ہے یہ زمانہ خاص طور سے زحاف یعنے رینگنے والے حیوانات کا تھا جیسا کہ پیشتر کا عہد ماہیان کے لئے مخصوص تھا اور اس عہد میں عالم نباتات کائیون اور پرسیاوشان ہی پر مشتمل نہ رہا بلکہ بے پردہ تخم والے درخت بھی اس میں شامل ہیں جن کی سب سے اہم قسم وہ ہے جس کو کونیفری یا پائن یعنے صنوبر کہتے ہیں اس عہد میں پلیسیوساری - اکیتھیوساری اور اسی طرح کے دیگر بحری اژدہوں کی کثرت تھی اور بری اژدہوں میں عظیم الجثہ دینوساری کا نام قابل ذکر ہے ہوا میں ایک قسم کی اڑنے والی گوشت خور چھپکلی کا دورہ تھا اسی طرح کے دیگر حشرات البر والبحر جو موجودہ چھپکلیوں، ہنگوں اور کچھووں سے بہت کچھ مشابہ تھے خشکی اور تری کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے چند علامات جو ذوات الثدی اور طیور کی ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا وجود بھی اس زمانہ میں اسی طرح شروع ہو گیا تھا جس طرح کہ زحاف کے وجود کا پتہ طبقہ اول میں اور مچھلیوں کا پتہ حیات قدیم کے طبقوں میں ملتا ہے لیکن جو ذوات الثدی یعنے دودھ پلانے والے جانوروں کے تھوڑے بہت جو نشانات ملے ہیں وہ چھوٹے جانوروں کے ہیں جو ادنیٰ قسم کے تھے اور اسی طرح پر کبھی نہ تو صحیح طور پر زحاف تھے اور نہ صحیح طور پر طیور اس عہد کا اختتام کہربا کے طبقہ پر ہوتا ہے جو کہ نسبتاً گہرے پانی میں بنا تھا اور جس میں حیات ارضی کے علامات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد عہد ثالث آتا ہے جبکہ موجودہ ترتیب حیات نباتی وحیوانی کی بہت کچھ شروع ہو گئی تھی۔ ذوی الفقرات[1] میں ذوات الثدی[2] کی کثرت ہو چلی تھی۔ موجودہ اقسام وانواع کا ظہور اور تکثر تیزی سے شروع ہو گیا تھا اور نباتات میں بالخصوص غلاف دار تخم والے پودے نمایاں تھے جیسا کہ اب بھی ہمارے جنگلات میں ہیں ان طبقوں کی مجموعی دبازت زیرین یعنے ای اوسین سے لیکر بالاترین یعنے پلوسین تک ۰۰ ۳۰ فٹ ہے اس سے اوپر طبقہ رابعہ آتا ہے جس کو عہد جدید بھی کہتے ہیں اس میں دور جدید کے سطحی طبقے شامل ہیں جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسان کا وجود پایا جاتا ہے اور ان حیوانات کا بھی جو یا تو اب بھی موجود ہوتے یا ان کو معدوم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

---

[1] یعنے ریڑھ کی ہڈی والے جانور [2] دودھ پلانے والے جانور

قدامت انسانی کے تحت میں اس کی اور عہد ثالث کی تفصیل انشاء اللہ آیندہ موقع پر ملے گی کیونکہ ان کا تعلق بہت کچھ انسانی قدامت سے ہے ہمارا مقصد اس مضمون میں اس کی تفصیل نہیں ہے بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ ہم زمان کا ایک ایسا معیار مقرر کریں جس سے ہم ان طویل اور مسلسل مدتوں کا اندازہ کرسکیں جو ازروے طبقات الارض زمین کو اپنی موجودہ صورت اختیار کرنے موجودہ قوانین و نوامیس فطرت کے تحت میں آنے اور حیات کا مسکن ہونے میں درکار ہوے ہیں۔ اس لئے ہم اس مضمون میں قدیم ترین طبقات ہی کا ذکر کریں گے۔

ارضی تغیرات کے لئے جس طویل اور مدید مدت کی ضرورت ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے معدنی کوئلے کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کوئلہ کی کانوں میں صرف ایک جز اس طبقہ کا ہے جس کا ذکر اوپر کاربونی فرس یعنی "کوئلہ کا دور" کے نام سے گزر چکا۔ ان کا بقیہ حصہ مجتمع نباتی مادے کی چادروں یا ورقوں سے مرکب ہے جن کی دبازت مختلف ہے کہیں تو نصف انچ سے بھی کم اور کہیں ۳۰ فٹ تک یہ ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ واقع ہیں اور ہر دو تہ کے درمیان پتھر کی ایک تہ ہے اور تقریباً ہر ایسی تہ کے اجزار ترکیبی مختلف ہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کوئلہ کی ایک تہ کے نیچے پنڈول کی ایک تہ ہوتی ہے جس کو "گل زیرین" کہتے ہیں اور ان دونوں کے اوپر ایک غلاف سنگ سرخ کا ہوتا ہی پنڈول، کوئلہ، اور پتھر کی یہ ترتیب بار بار نظر آتی ہے چنانچہ ساوتھ ویلز اور نووا اسکاٹیا میں تقریباً ۸۰ یا ۱۰۰ انہیں کوئلہ کی ملی ہیں۔ ہر تہ کے ساتھ "گل زیریں" اور "سنگ بالا" علحدہ ہے ان میں سے بعض تہیں ۲۰ فٹ تک دبیز ہیں اور مجموعی دبازت بعض اوقات ۱۴۰۰۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ (باقی آیندہ)

نصیر احمد

ابو العلاء المعری

(گزشتہ سے پیوستہ)

متذکرہ بالا حکایت سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں۔ ایک تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی علمی مجالس کے مہتمم کے کیا فرائض تھے۔ اور دوسری یہ کہ ان مجالس کی کیفیت ایک خاص چیز تھی جو صرف معدودے چند لوگوں کے حصہ میں آئی تھی۔ بہرحال یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریف الرضی کی یہ مجلس اسی قسم کی تھی جیسی کہ سابور نے قائم کی تھی اور یہی وہ مجلس ہے جس کا ذکر ابو العلاء نثر و نظم میں اکثر جگہ کرتا ہے یہ مجلس ۳۸۱ھ میں بغداد کے حصہ کرخ کے محلہ بین السوائن میں قائم کی گئی تھی اس میں ایک بے نظیر کتب خانہ جمع کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا تھا چنانچہ وہاں قرآن کریم کے سو نسخے ایسے موجود تھے جن کو ابن مقلہ نے لکھا تھا اور اس کے علاوہ دیگر مضامین کی (۱۰۴۰۰) کتابیں تھیں ان میں سے اکثر یا تو خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں اور یا ایک زمانہ میں نہایت مشہور و معروف اشخاص کے قبضہ میں رہ چکی تھیں۔ خود سابور ہی نے اس مجلس کے قیام و انصرام کے لئے روپیہ فراہم کیا تھا اور تمام کام کو بنو علی کے دو افراد کے سپرد کر دیا تھا جن میں سے ایک ابو عبد اللہ البطحاوی ابو العلاء المعری کے بغداد آنے کے وقت زندہ تھا اگرچہ سابور کی قسمت اکثر پلٹے کھاتی رہی۔ مگر بہرحال اس کی یہ علمی مجلس ۴۱۶ھ میں اس کی موت تک برابر قائم رہی اور حقیقت یہ ہے کہ ۴۵۱ھ میں جب بغداد کے اس حصہ میں آگ لگی تو اس وقت تک یہ مجلس بدستور باقی تھی مگر اس پریشانی کے وقت وہاں کا کتب خانہ اور دوسرے بیش بہا عجائبات یا تو عوام الناس نے لوٹ کھسوٹ لئے اور یا سرکاری طور پر ضبطی میں آ گئے۔ ابو العلاء کے زمانہ میں یہ مجلس تمام علما کا مرکز بنی ہوئی تھی جہاں علمی اور موسیقی چہل پہل کا نظارہ ہر وقت پیش نظر رہتا تھا۔ ابو العلاء کے دوستوں میں دو ایسے ہیں جن کو اس مجلس کا مہتمم کہا گیا ہے ان میں سے ایک عبد السلام بصری دربار بغداد میں یقیناً

کسی ممتاز عہدے پر فائز تھا اور اپنے نحوی اور جغرافیائی تصانیف کی وجہ سے اس سے قبل ہی شہرت پا چکا تھا۔ اس کے متعلق ہم کو معلوم ہے کہ وہ ابو العلا کا نہایت گہرا دوست تھا اس کے علاوہ ابو العلا نے چند منثور اور منظوم رسائل بھی اس کے نام لکھے ہیں۔ عبد السلام اس سے پہلے سیرافی کے درسوں میں بھی شامل رہا تھا ادھر ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ ابو العلاء کے ماموں نے یہ کام بھی اس کے سپرد کیا تھا کہ وہ اس سیرافی کے باپ کی کتابوں کو بغداد میں تلاش کرکے حاصل کرے۔ لیکن آگے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا اسی تعلق سے ابو العلاء اور عبد السلام کی ملاقات ہوئی تھی یا ابو العلا کے ایک دوسرے ہم قبیلہ اور شاگرد ابو القاسم ابن المحاسن التنوخی نے دونوں کا تعارف کرایا تھا اور یا کسی اور طرح ان دونوں میں تعلقات شروع ہوئے تھے۔ دوسرا اہتمم مجلس جس کا ذکر غالباً ابو العلاء المعری کی تصانیف کے سوا اور کہیں نہیں آتا۔ ابو منصور تھا یہ یقینی ہے کہ ابو العلاء جیسے متلاشی علم و ہنر شخص کے لئے بغداد میں ان دونوں حضرات کی دوستی بہت کچھ سودمند ہوسکتی تھی۔

غالباً یہ سابور ہی کی علمی مجلس تھی جہاں وقتاً فوقتاً دوسرے علما سے ابو العلا کی ملاقات ہوئی اور یہی ملاقات آخر میں بڑھتے بڑھتے دوستی تک پہنچ گئی۔ اس کو بعض مرتبہ بدسلوکی سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے نحومی ابو الحسن الربعی کے درس میں شامل ہونے کے لئے گیا تو کسی نے کہا کہ اس آسیل کو بھی اندر آجانے دو۔ آسیل شامی روزمرہ میں اندھے کو کہتے تھے ابو العلاء کو یہ بات اس قدر ناگوار گزری کہ وہ نہایت غیظ و غضب کی حالت میں درس چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک موقع پر جب اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا تو اس نے اپنی حاضر جوابی اور علمی فوقیت کا ایسا ثبوت دیا کہ لوگ ششدر رہ گئے لیکن بہرحال تمام کوائف و صورت حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابو العلاء کا دیوان سقط الزند بغداد میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور دار الخلافہ کے علما و فضلا نے خود ابو العلاء کی اتنی قدر کی کہ اس کو اپنے زمرے میں ہی شامل سمجھ لیا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابو العلا کی شہرت بغداد میں اتنی ہو چکی ہو کہ اُسے علما کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں دقت نہ ہوئی ہو۔ دوسرے مغربی اور ابو القاسم ابن جلیات کے سے ممتاز علماء اور اہل قلم

کی وساطت سے اہل علم و فضل تک رسائی بالکل آسان تھی۔ متذکرہ بالا اشخاص کے علاوہ
ابن فورجہ بھی جو متنبی کے شارح ہونے کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ابوالعلاء کا دوست تھا اور بغداد سے
چلتے وقت ابوالعلاء نے اسے ایک منظوم رسالہ بھی لکھا تھا ایک اور دوست ابوبکر احمد الصابونی تھا
مگر ان سب سے قطع نظر کرکے ابوالعلاء کے دوستوں میں بنو علی کا ایک خاندان بھی تھا جس سے کہ شاید
اس کی ملاقات سابور کی متذکرہ بالا علمی مجلس میں ہوئی ہو گی۔ اس کے بغداد میں آنے کے وقت اس
خاندان کے بزرگ ابو احمد حسین تھے ان کا نام اس زمانہ کی تاریخ میں اکثر سننے میں آتا ہے وہ ایک
لائق و فرزانہ روزگار آدمی تھے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے المرتضیٰ اگرچہ شاعر کی حیثیت سے مشہور
نہ ہو سکے لیکن پھر بھی علم و فضل میں ان کی شہرت کچھ کم نہ تھی مگر باپ کی عزت و شہرت ان کو حاصل
نہیں ہوئی بلکہ یہ ان کے چھوٹے بھائی محمد ابن ابو احمد حسین شریف الرضی کو ملی جو ہم عصر نقادوں
کے فیصلے کے مطابق بنو علی کے خاندان کے سب سے بڑے شاعر تھے ان کے ضخیم دیوان میں ۳۶۹ھ سے
سے لیکر جب کہ ان کی عمر دس برس کی تھی ۴۰۶ھ یعنی ان کی موت تک کے اشعار پائے جاتے ہیں اور
یہ اشعار شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ بہت سا قیمتی تاریخی مواد بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں
ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ بھی سابور کی طرح ایک علمی مجلس منعقد کیا کرتے تھے اور ان کے ہاں علما کا عموماً
جمگھٹا رہتا تھا۔

جمادی الاول کے نصف آخر سنہ ۴۰۰ھ میں ابھی ابوالعلاء کو بغداد آئے ہوئے چند ہی مہینے
ہوئے تھے کہ ابو احمد حسین نے وفات پائی۔ اور ابوالعلاء نے ان کا مرثیہ لکھا یہ مرثیہ شاعر کی دوسری
نظموں کے مقابلہ میں بہت بلند پایہ سمجھا جاتا ہے اس میں اگرچہ ابو احمد کے بیٹوں کی تعریف موجود
ہے مگر ساتھ صاف صاف یہ کہہ دیا گیا ہے کہ شاعر کو صلے یا انعام کی ضرورت نہیں۔ اس طرح
شاعری کو بطور پیشے کے اختیار کرنے سے انکار کرنا ہمارے نزدیک خواہ کتنا ہی قابل تعریف
کیوں نہ ہو لیکن اس سے ابوالعلاء بتدریج ان تمام مواقع اور ذرائع سے ہاتھ دھو رہا تھا جو
اس کو حصول شہرت و دولت میں مدد دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اس پیشے کے علاوہ دوسرے

ذرایع معاش بھی ایسے تھے جن سے ابو العلاء بغداد میں رہ کر گزارا کر سکتا تھا مگر ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شاعری ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعہ سے حصول دولت قطعاً یقینی ہو جاتی تھی۔ مثلاً وہ اگر چاہتا تو معلمی کے ذریعہ سے روپیہ پیدا کر سکتا تھا۔ مگر اغلب یہ ہے کہ دار الخلافہ میں معلموں کی تعداد ضرورت سے زیادہ تھی۔ بہر حال اگرچہ وہ ایک نظم میں جو بغداد میں لکھی گئی تھی دوستوں اور معاش کی قلت کا رونا روتا ہے مگر پھر بھی اس کے دوسرے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ کوشش کرتا تو ملازمت کا مل جانا دشوار نہ تھا اور اس کے ایسے دوست بھی موجود تھے جو اسے ہر ممکن مدد دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ابو احمد کی موت کے چار مہینے بعد ہی اسے مجبوراً بغداد کو خیر باد کہنا پڑا۔

دار الخلافہ کی واپسی کے بعد وہ ایک نظم میں بغداد چھوڑنے کے دو وجوہ بیان کرتا ہے یعنے اس کی ماں کی بیماری کی خبر اور مفلسی ان دونوں اسباب سے قطع نظر کرکے شاید اصل سبب وہ ہے جس کا ذکر ابو المحاسن مورخ نے کیا ہے۔ یہ مورخ متنبی کا ذکر کرتے ہوئے ایک قصیدے کا ذکر کرتا ہے جس کی بنا پر شریف الرضی اور ابو العلاء کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا مگر اس قضیہ کی وجہ اور زیادہ تفصیل نہیں کرتا اتفاقاً الصدفی کی قلمی تاریخ میں اس جھگڑے کا ذکر ہے مگر وہاں بجائے شریف الرضی کے ان کے بھائی المرتضیٰ کا نام بیان کیا گیا ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ابو العلاء کی شریف الرضی کی علمی مجلس میں بھی بڑی آو بھگت ہوتی تھی بدقسمتی سے ابو العلاء متنبی کا بڑا مداح تھا اور المرتضیٰ کو متنبی سے سخت نفرت تھی اگر ابو العلاء ذرا بھی سمجھ بوجھ سے کام لیتا تو اپنا یہ ذاتی خیال اسے المرتضیٰ سے چھپائے رکھنا چاہئے تھا بجائے اس کے یہ ہوا کہ ایک دن جب المرتضیٰ متنبی کو برا بھلا کہہ رہے تھے ابو العلاء سے نہ رہا گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر متنبی صرف ایک خاص نظم لکھ کر مر بھی جاتا تو بھی وہ شاعری میں شہرت حاصل کر سکتا تھا المرتضیٰ کو یہ اس قدر ناگوار گزرا کہ انھوں نے حکم دیا کہ ابو العلاء کی ٹانگ پکڑ کے اسے کمرے سے باہر گھسیٹ کر ڈال دیا جائے اس سختی کی وجہ المرتضیٰ نے بہر حال یہ بیان کی کہ متنبی کے اس خاص نظم کا حوالہ دینے سے ابو العلاء کا اصلی مطلب یہ تھا کہ ایک شعر کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے جس میں متنبی کہتا ہے کہ کم درجے کے مصنفین کے اعتراضات ہی اس کی خوبیاں ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور اس طرح

المرتضیٰ کا خیال تھا کہ ابو العلاء نے اسے کم درجہ کا مصنف سمجھ لیا تھا ہمارے نزدیک غالباً یہی قصہ تھا جس کی وجہ سے ابو العلاء نے بغداد سے واپس جانے کا ارادہ کر لیا کیونکہ یہ بے عزتی ایسی تھی کہ اس کے بعد اس قسم کی اور بے حرمتیوں کا اندیشہ لگا ہوا تھا اور اس لئے اب بغداد میں قیام ناممکن تھا۔ یہ یقینی ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ ضرور چار مہینے کے اندر ہی اندر واقع ہوا ہوگا کیونکہ ابو العلاء جیسے آدمی سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ اس قسم کی بے عزتی کے باوجود بھی وہ المرتضیٰ کے باپ کا مرثیہ کہہ دیتا اس وقت یہ معلوم کرنے کی کوشش بالکل بیکار ہے کہ المرتضیٰ نے شعر کا جو مطلب نکالا وہ کہاں تک درست تھا اور یا اس کے سوا ان کا اس بے حرمتی سے اور کیا خاص مطلب تھا۔

واپسی میں وہ موصل تک تو کشتی کے ذریعہ سے آیا اور وہاں سے براہ حسینہ۔ میافارقین۔ آمد۔ حلب اور رقہ ہوتا ہوا معرۃ النعمان واپس پہنچا حلب میں اس کے رشتہ دار اور مربی مقیم تھے لیکن شاید بذات خود اپنی ناکامی کا تذکرہ ان سے نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اس مقام کو چھوڑتا ہوا وہ رقہ پہنچا۔ اور وہاں سے اس نے ابو طاہر کے نام وہ خط لکھا جس سے کہ اس کے خصایل پر اس قدر روشنی پڑتی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بغداد سے روانہ ہونے کے بعد ہی وہ اپنے کئے پر پچھتایا کیونکہ بہت سے رسایل اور نظموں میں وہ بغداد کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے دار الخلافہ چھوڑنے کا افسوس ہے ان تمام ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی بغداد کی اجڑی ہوی حالت کے باوجود عوام الناس پر وہاں کی رونق اور چہل پہل کا کس قدر گہرا اثر ہوتا تھا۔ ابو العلاء اگرچہ نابینا تھا لیکن وہ بھی اس سے متاثر ہوے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا قول تھا کہ جو ایک مرتبہ بغداد میں رہ چکا ہو ناممکن ہے کہ اسے پھر کوئی دوسرا مقام پسند آسکے۔ ابو العلاء کے ایک اور ہمعصر نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا قاضی عبد الوہاب بغداد کے رہنے والے تھے انھوں نے بھی مفلسی کی وجہ سے دار الخلافہ کو خیرباد کہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے اپنے بغدادی دوستوں سے کہا تھا کہ اگر دار الخلافہ میں انھیں دو وقت کا کھانا میسر آسکتا تو وہ کبھی بغداد سے قدم باہر نہ نکالتے۔ ابو العلاء کے دار الخلافہ کو چھوڑنے کے بیس برس بعد جب وہ مصر جاتے ہوے معرۃ النعمان ہو کر گزرے تو ابو العلاء سے

ان کی ملاقات ہوئی اور دونوں نے مل کر یقیناً اپنی بدقسمتی پر ایک دوسرے سے ہمدردی ظاہر کی ہوگی۔

بغداد چھوڑنے کے بعد ابوالعلاء کو بغداد کے علما وشعرا کی فیض صحبت سے ہمیشہ کے لئے ناامید ہونا پڑا مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ صرف معرہ کے ہی کم درجے کے علما کے ساتھ اس کا گزارہ ہونا ناممکن ہے چنانچہ اپنے ماموں کے نام ایک خط میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور معرہ میں پہنچنے سے پہلے اپنے ہم وطنوں کو اپنی آمد کی خبر کے ساتھ ہی ساتھ اس نے صاف طور پر یہ جتلا دیا تھا کہ وہ اب ترک دنیا کرکے خانہ نشین ہو جائیگا اس لئے اس نے ہم وطنوں سے درخواست کی تھی کہ اس کا کسی قسم کا استقبال نہ کیا جائے۔

سوانح نویسوں کے قول کے مطابق یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اس نے ترک دنیا کے ساتھ ایک قسم کی سنیاسی زندگی بھی اختیار کر لی تھی اور گوشت نفیس کپڑوں اور شراب کا استعمال قطعاً ترک کر دیا تھا اسی زمانے میں اس کو اپنی والدہ کے انتقال کی خبر ملی۔ اور اس خبر نے اس کے نئے اصول زندگی کو اور زیادہ استوار اور پختہ کر دیا۔

بغداد میں مختصر سی رہایش کا ایک نتیجہ ضرور پیدا ہوا۔ عوام الناس کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دارالخلافہ میں ابوالعلاء کو علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس کی قدر ومنزلت کے پورے معترف ہو چکے ہیں۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے اور عربی۔ شاعری۔ نحو اور دیگر علوم عرب حاصل کرنے کے متمنی ہوے اب معرہ کا چھوٹا سا قصبہ علم وفضل کا مرکز اور اس میں ابوالعلاء کا مکان سب سے زیادہ مشہور ومعروف مقام بن گیا۔ اس شہرت کے سبب ترک دنیا کا وہ خیال جو اس نے پہلے ظاہر کیا تھا پورا نہ ہو سکا۔ گزشتہ ناکامی کے بعد اس موجودہ کامیابی نے اس کے دل ودماغ پر اثر کیا اور اس کے ایک سوانح نویس کا بیان ہے کہ باوجود نابینائی کے ابوالعلاء شطرنج اور نرد کھیلنے میں طاق تھا ہر قسم کے ادبی اور علمی معاملات میں حصہ لیتا تھا یہاں تک کہ جس طرح اور لوگ بینائی کے لئے خدا کا شکر کرتے اسی طرح وہ اپنی نابینائی کے لئے کیا کرتا تھا خود اس کے رسائل سے بھی جن میں سے اکثر بغداد سے واپسی کے بعد لکھے گئے تھے وہ تارک دنیا نہیں معلوم ہوتا بلکہ ان سے یہ تشریح ہوتا ہے کہ وہ ہر طرف دوستوں سے گھرا ہوا ہے اور دنیا میں بدستور سابق منہمک ہے۔

حلب کے تمام والیوں سے اس نے اس طرح برابر رسوم قائم رکھے کہ ان کے نام اپنی کتابیں معنون کیں عزیز الدو

منجوتکین کا ایک ارمنی غلام تھا اور ۳۹۸ھ میں الحاکم بامر اللہ نے اسے حلب کا والی بنا دیا تھا۔ ابو العلا نے اپنی دو کتابیں اس کے نام پر معنون کیں۔ ۴۱۶ھ میں عزیز الدولہ حلب کا گورنر مقرر ہوکر آیا اور ابو العلا نے اس کے نام ایک کتاب "عزیزیہ" لکھی۔ ابو العلاء کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزیز الدولہ نے بھی کوشش کی تھی کہ اسے حلب کے دربار میں مدعو کرے۔ یہ غالباً اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ الحاکم مرچکا تھا کیونکہ اپنے تقرر کے دو سال بعد ہی جب عزیز الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ الحاکم اس کا مخالف ہوگیا ہے تو اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور اپنا سکہ مضروب کرایا۔ کیونکہ جب تک الحکم زندہ رہا عزیز الدولہ کو اتنی فرصت نہ ملی تھی کہ وہ اس قسم کی دعوتیں لوگوں کو دیتا پھرتا یہ دعوت صدقہ ابن یوسف الفلاحی کی معرفت بھیجی گئی تھی اس وقت صدقہ کی حیثیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن آخر ۴۲۵ھ میں جب منتخب الدولہ کو مصر سے شام میں امن قایم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے تو یہی صدقہ ابن یوسف اس کا وزیر مالیات مقرر ہوا تھا ابو العلاء نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور عزیز الدولہ نے ناچار مفضل ابن سعید کو اپنے دربار میں جگہ دے دی۔

ان شاگردوں میں جو ابو العلاء کے گرد جمع ہوگئے تھے سب سے زیادہ مشہور ابو زکریا تبریزی ہے، اس نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی تھی اور وہاں تکمیل کرنے کے بعد اس کے استادوں نے اسے ہدایت کی تھی کہ ابو العلاء کے سامنے زانوے ادب تہ کرے اور اپنی تحصیل علم کی تکمیل کرے یہ ابو العلاء کے بغداد سے واپس آنے کے چالیس برس بعد کا واقعہ ہے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ابو العلاء کی شہرت کس قدر عام ہوگئی تھی۔ یہی تبریزی ہے جس نے ابو تمام کے حماسہ کی شرح لکھی تھی جس میں کہ استاد کی علمیت کا ایک بڑا جز شامل ہے۔

(باقی آیندہ)

محمد جمیل الرحمن

حیاتِ تمدن

حصہ اول

عہد سلف

بسلسلۂ گزشتہ

اسلام کا ہمہ گیر جذبہ اور اصول مساوات ترکستان و تاتار کے صحراؤں میں کچھ ایسی نسلی افراط ہے کہ بار ہا جب تمدن دنیا ترفہ اور عیاشی کے دلدل میں پھنسی ہے تو ان صحراؤں سے ایسی آندھی اٹھتی ہے جو اس دلدل کو صاف کر دیتی ہے۔ مشرق و مغرب ہند و چین ہر جگہ اس کے کشتے نظر آئینگے۔ عربوں پر ترکی اثر کا یہ پہلا ورق تھا جس کو اس کے بعد آنے والے شدید اثرات کا دیباچہ سمجھنا چاہئے بے شبہ ان دل بادل ایرانی و ترکی قوموں کے عربوں پر اس شدت سے چھا جانے کے بعد عربی مذہب کی ہر وقت تازہ رہنے والی جلا اس دعوی کی قطعی دلیل ہے کہ اگر عرب صرف ایک قومی جذبہ کی بدولت کام کرنے والے ہوتے تو۔ ومس کی طرح وہ کب کے نیست و نابود ہو چکے ہوتے یہ صرف اسلام کے ہمہ گیر جذب کی تاثیر ہے کہ باوجودیکہ وہ شایستہ ایرانیوں سے لیکر نیم مہذب ترکوں اور وحشی مغلوں اور زنگیوں تک کو اپنے میں لے لیتا ہے لیکن وہ روح مساوات اور توحید، فنا نہیں ہونے پاتی، جس کی تعلیم کے لئے اسلام دنیا میں آیا۔ تاریخ اسلام ایک قوم عرب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایرانی ترک و مغل بھی اس کے دوامی اجزا بن گئے ہیں

صوبوں کی خود مختاری ظاہر یہ دربار خلافت کی کمزوری کے ساتھ شیرازۂ خلافت کا بکھرنا لازمی تھا اندلس تو شروع دور بنی عباس سے ہی آزاد ہو گیا تھا۔ اب ایران وغیرہ کی بھی باری آگئی۔ صوبہ دار اس حالت میں آگئے کہ دربار ان کو معزول نہیں کر سکتا تھا اور پھر ان میں بھی وراثتی جانشینی مسلمہ دستور تھی خراسان کا صوبہ دار **طاہر ذوالیمینین** جس نے امین کو شکست دی تھی (ظاہر ہے کہ امین کے دربار کو شکست دینے

کے لئے بغیر خراسانی فوجوں کے مامون کچھ نہیں کرسکتا تھا) گویا بجائے خود مستقل بن گیا جس کو آیندہ چل کر دربار بھی معزول نہ کرسکتا تھا۔ اس کے حدود حکومت خراسان سے غزنی اور سیستان تک تھے اس کے بعد اس کا لایق بیٹا اس کا سچا جانشین تھا جو قوانین سنت الہی معتصم کے بعد بغداد میں ترک غلاموں کو خلیفہ گرنبا رہے تھے اس چھوٹے سے خاندان میں بھی ان کا عمل اسی تیزی سے ضرور تھا۔ بہت جلد آل طاہر بار امانت کے اہل نہ رہے وہ عیش و عشرت کے خوگر ہو گئے اور عظمت آلہی نے ایک صفار (ٹھٹیرے) کو کسروی قلمرو کی تاجداری اس بنا پر نصیب کی کہ وہ نہایت جفاکش محنت کا خوگر اور حکومت کی اہلیت رکھتا تھا چنانچہ خود رائے عامہ نے حکومت کا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھا۔

صفاریہ | خود مختاری کی یہ دوسری منزل تھی پہلے دور میں تو خود دربار سے حکومت عطا ہوئی تھی اس دور میں خود بزور قابلیت حکومت تسلیم کرائی گئی۔ خاندان صفار کی حکومت آل طاہر کے حدود حکومت سے زائد ہوگئی جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار خلافت کا اثر او رکمزور ہو گیا تھا چنانچہ صوبہ **سندھ** جو اس وقت تک راست دربار خلافت سے متعلق تھا وہ بھی خود دربار سے بر دست سند صفاریہ کے حدود حکومت میں شامل کیا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں سندھ کے صوبہ دار وقت عمر بن عبد العزیز ہباری نے بھی صفاریہ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا۔ دائرہ اقتدار جس قدر سکڑتا جاتا ہے اسی قدر خود مختاری کی لہریں ابھرتی جاتی ہیں اموی دور میں یا تو ایک ہی وائسرائے بصرہ سے لیکر سندھ تک کافی تھا یا یہ حالت ہے کہ حکومت در حکومت بنتی ہی چلی جاتی ہے شلاً دربار بغداد میں جو حیثیت حاکم خراسان کی ہے وہی حالت سامانی [illegible] کی نظر میں روسائے خراسان کے پاس ہے

سامانی خاندان | ایک ہی ہمہ گیر اصول کا اثر نمایاں ہے۔ بہت جلد صفاری نسل حکومت کی اہل نہ رہی آل سامان جو تاجدار ایران **بہرام چوبین** کی نسل سے ہیں **سمرقند** میں اپنا مشہور زمانہ معارف گستر دربار جماتے ہیں اور چونکہ یہ مرکز **سندھ** سے بہت دور ہے لہذا یہاں بھی اس خود مختاری کا عمل زور سے ہونے لگتا ہے۔

سندھ کی خود مختار عربی حکومتیں | ایک صوبہ سندھ میں متعدد عربی النسل حکومتیں قائم ہو جاتی ہیں جن میں **منصورہ** اور **ملتان** کی ریاستیں زیادہ مشہور ہیں جو دور عرب کی یاد باقی رکھتی تھیں۔

بنی بویہ | بالکل یکساں نمونہ پر آل سامان بھی کمزور جانشینوں کی وجہ سے فنا ہونے لگتے ہیں **بنی بویہ** (یہ بھی ایرانی نسل سے اور دیلم کے باشندہ تھے) کی عظمت کا ڈنکہ بجتا ہے۔ سندھ میں بھی ان کی اعلیٰ حکومت تسلیم کی جاتی ہے۔ مشہور بویہی فرماں روا **عضد الدولہ** نے **قفص** اور **بلوص** کی جو راہزن قومیں تھیں پوری سرکوبی کی۔ اسی کے زمانہ میں یہ مسلمان بھی ہوے۔ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کی رائے میں **بلوص بلوچ** اور **قفص** افغان ہیں (صفحہ ۴ ج ۱۔ اور صفحہ ۱۲ جلد دوم تاریخ سندھ) بلوص کا بلوچ ہونا تو بالکل قرین قیاس ہے لیکن قفص کا افغان یا اقل درجہ افغ ہونا محل نظر ہے۔ افغانی قوم جو بمرور زمان ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے آج بظاہر ایک نسل معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت مختلف النسل والجنستہ قوموں کا مرکب مجموعہ ہے۔ مشہور زمانہ علامہ جمال الدین افغانی نے اس بارہ میں محققانہ طور سے اپنی کتاب تاریخ افغانستان میں بحث کی ہے۔

اسلامی جوش دنیا تشیع سے بھری ہوی ہے | اب یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اسلامی دنیا تشیع کے جوش سے بھری ہوئی ہے ابو مسلم خراسانی کا ماٹو نصرت اہل بیت ہی تھا اور اس وقت تک بنی علی و بنی عباس ایک ہی تھے جب خلافت بنی عباس کے ہاتھ میں چلی گئی تو دونوں کی جدائی ناگزیر تھی جب تک بنی عباس میں زبردست فرماں روا برسر حکومت رہے بنی علی کی کوششیں سرسبز نہ ہوسکیں۔ خلفاء کا ضعف۔ عربی اقتدار کی کمی۔ ترکوں کی چیرہ دستی قومی معاشرت میں ترفہ کا مبالغہ جس سے عوام الناس اور امراء میں تفرقہ پیدا ہونے لگتا ہے ان سب باتوں نے ابو مسلم خراسانی کی مشن کو پہلے سے زیادہ شدید مذہبی رنگ میں نئے نئے انداز کے ساتھ رنگنا شروع کر دیا چنانچہ **قرمطی** تحریک کے ذریعہ سے ۲۷۸ھ میں امام غائب کی طرف دعوت آغاز ہوئی۔ چند ہی سالوں میں اس دعوت نے **بحرین** میں زبردست سیاسی طاقت حاصل کر لی ان سیاسی یا معاشرتی انقلاب پسندوں کی پیدائش چونکہ خود سوسائٹی کے فاسد مادے تھے لہذا ایک طرف سے ان کے اکھڑ جانے کے بعد پھر دوسری جانب وہ منھ بنانے لگتے اور اس طرح چوتھی صدی کے ابتدائی حصہ میں ان نذر من چلے انقلاب پسندوں نے نہ صرف بصرہ اور کوفہ لوٹ لیا بلکہ دربار خلافت کو تھرا دیا بغداد کے خود ترکوں کی نازپروردگی کا اندازہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ستائیس سو قرمطی ۳۰ ہزار کی شاہی ترکی فوج پر بھاری ہوتے

---

[1] محلات شاہی کی نوبت نوازی انھی کی یادگار ہے ۱۲

تھے۔ اسی زمانہ میں عبید اللہ مہدی نیجو مین سے آفریقہ چلے گئے تھے[1] مغرب میں مستور و مخفی امامت کو جس کا اس بے تابی کے ساتھ انتظار تھا عالم آشکارا کر دیا۔ اس طرح یہ قرمطی مشن اس دعوت اسمعیلیہ کی طرف جھک پڑا اور اپنے حلقہ ارادت میں اس کا قدم تیز کرنے لگا۔ باطنیت کے پردہ میں بیت اللہ کی حرمت ضروری نہ سمجھی گئی۔ قرمطی مشن اور بویہی حکومت جو بغداد پر قابض تھی تشیع کے عالم گیر اثر میں برزور[2] حصہ لے رہی تھی جس زمانہ میں عضد الدولہ نے بلوچستان کا نام پیدا کر دیا ہے تو اسی زمانہ میں المعز الدین اللہ تمام مصر۔ شام۔ حرمین تک اپنا اقتدار قایم کر کے قاہرہ کو دار السلطنت بناتا ہے۔ زبردست مذہبی اور دینوی اقتدار کے ساتھ بزم حکمت میں مسکویہ اور بوعلی یہی راگ الاپتے ہیں۔

(سنہ ۳۶۰ھ) لیکن چند ہی قدم آگے بڑھنے کے بعد اس بوقلمون دنیا میں یہ طرفہ ماجرا نظر آتا ہے کہ قرامطہ و داعیان امام متغلب عباسی کے جھنڈے کے نیچے بنی بویہ جیسے حامیان تشیع کی پرزور مدد سے خود امام پر یورش کرنے لگتے ہیں لیکن مغرب کے تازہ دم (بربر) افریقی سپاہی بغداد کے نازپروردہ ترک نہ تھے۔ الٹ کر سے قرمطی مشن اسمعیلی امام کو زبردست مدد پہنچا کر خود اسی طرح فنا ہو گیا جس طرح کہ اگلے زمانہ میں ابومسلم خراسانی بنی عباس کو قایم کر کے خود ان کے ہاتھ سے مقتول ہو چکا تھا۔

اسمعیلیت سواحل ہند میں | اسمعیلیت کی حیرت انگیز ترقی کا نظارہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ قاہرہ کے مرکز اسمعیلیت ہونے کے پندرہ سال کے بعد مشہور سیاح مقدسی (سنہ ۳۷۵ھ) میں ملتان کو بالکل اسمعیلی اثر میں پاتا ہے۔ انہی کا خطبہ اور سکہ جاری تھا۔ ملتان کے تعلقات قاہرہ کے ساتھ حیرت انگیز طور پر قایم تھے۔ (باقی آیندہ)

مرتضیٰ

---

[1] عبید اللہ مہدی کی تحریک کا نشو و نما اولاً یمن میں ہوا تھا سنہ ۲۸۰ھ ۱۲

[2] دیلم نومسلم تھے حسن بن علی علوی اطروش کے ہاتھ پر یہ مسلمان ہوئے تھے سنہ ۳۰۱ھ ۱۲

خطاب بہ اقبال

تو اے اقبال عندلیب گلشن اسلام ہے
نغمہ سنجی تیری ملت کے لئے پیغام ہے

تیرے نالوں نے بپا اک شور طوفاں کر دیا
خفتہ پا ملت کی بیداری کا ساماں کر دیا

ساز ہستی مسلماں تھا توں ہی تھا خموش
بربط دل نے ترے کی اس کو تلقین خروش

ہستی اسلام حرف نالہ و فریاد تھی
شکوہ سنج جور تھی، فریادی بیداد تھی

جز شکیبائی نہ تھی کچھ دوسری راہ نجات
قوم تھی بیگانہ اسرار پیکار حیات

سینے یاد محفل دوشینہ سے معمور تھے
اور دل اندیشہ فردا سے کوسوں دور تھے

کر دیا تھا خود فراموشی نے ناکام عمل
تیرے نغموں نے دیا ملت کو پیغام عمل

کس قدر ہنگامہ زا تھا تیرے نالوں کا خروش
قصہ خواب آور ماضی کو کر ڈالا خموش

تیرے دل کی ہر صدا اک سوزش قم بن گئی
اشک کی ہر بوند پیغام تلاطم بن گئی

”از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرک بے مایہ را سوز گلیم آموختی“؟

اقبال

سید وہاج الدین احمد شمیم

آفتاب کی پہلی کرن اور میں

میں جو تڑکے شہر کے باہر گیا
صبح کا منظر عجب پر کیف تھا
تھی فضا یوں نور میں نکھری ہوئی
جیسے ہو دھوئی نہائی اک پری
ننھی چڑیاں گا رہی تھیں جابجا
صبح کا تھا بر بط زریں چھڑا
جب ترنم طائروں کا ہو چکا
اک تبسم نور کا رقصاں ہوا
رقص کرتے آ رہی تھی اک کرن
رقص میں زر پاشیوں کی تھی پھبن
آگئی جب سامنے میں نے کہا
اے سراپا زر مجھے یہ تو بتا!!
نور یہ تجھ میں کہاں سے آگیا؟
کس سمندر نے تجھے نہلا دیا؟
روشنی کیا یہ تجھے فطرت نے دی؟
کہہ دے سچ سچ کیا ہے اصلیت تری

نور آگیں وہ شعاع دلنشیں
بولی یہ ہرگز مری خوبی نہیں
تم اگر ذرّوں سے مجھ کو چھین لو
مجھ کو ذرّوں سے اگر ملنے نہ دو
تو کہو پھر مجھ میں رہ جاتا ہے کیا؟
کچھ نہیں ہوں اک حرارت کے سوا
راز میں نے تم پہ ظاہر کر دیا!
یعنی چھوٹوں سے بڑا رتبہ ملا!
وہ جب اتنا کہہ کے آگے بڑھ گئی
فکر میری آسماں پر چڑھ گئی

تھا نظر میں اک بت نور آفریں
شاہِ خاور اک نگار آتشیں

وحید ـ نلگنڈوی (دکن)

معارضہ بر غزل غالب

غالب	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
لمعہ	یہ مزا کہاں سے ملتا جو وصال یار ہوتا	نہ یہ اشتیاق رہتا نہ یہ انتظار ہوتا
غالب	ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
لمعہ	ترے وعدے کو ستمگر یہ ستم ہے جھوٹ جانا	کبھی غم سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
غالب	تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا	کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
لمعہ	مرا دل ہے خوش اسی سے کہ ہے عہد تیرا بودا	تھی عدو کی کامیابی اگر استوار ہوتا
غالب	کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو	یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
لمعہ	ترا تیر نیم کش تھا مجھے کر سکا نہ بسمل	خلش اس سے بڑھ کے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غالب	یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح	کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
لمعہ	یہی عین دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح	غم عشق میں کوئی کیا مرا غمگسار ہوتا
غالب	رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا	جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
لمعہ	رگ سنگ سے ٹپکتا جو لہو تو تھم بھی جاتا	جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غالب	غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے	غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
لمعہ	میں جہاں میں گر نہ ہوتا تو نہ ہوتی کوئی آفت	غم عشق ہی نہ مجھ کو غم روزگار ہوتا
غالب	کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے	مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
لمعہ	شب غم کا ہے کرشمہ کہ ہے روز مرگ تازہ	کہ مزا ہی کیا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
غالب	ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا	نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
لمعہ	ہوئے ہم جو غرق دریا ہوئے بس اسی سے رسوا	کوئی فاتحہ تو پڑھتا جو کہیں مزار ہوتا
غالب	اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا	جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
لمعہ	وہ حجاب ہی میں رہتا تو یگانہ کون کہتا	کبھی کشش محبت نہ ہوتی نہ اگر دوچار ہوتا
غالب	یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب	تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
لمعہ	تری بیخودی نے لمعہ تجھے باخدا کیا ہے	نہ تجھے ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
لمعہ	نہ ولی ہوں میں نہ زاہد نہ ہوں متقی نہ عابد	پھر اب اور کیا میں ہوتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرا کوئی شعر ہوتا جو نظیر شعر غالب
تو میں لمعہ فخر کرتا مجھے افتخار ہوتا

سید نوازش علی لمعہ

رباعیات

لاغر غمِ حضرت میں کچھ ایسا ہوں میں
تارِ نگہ شوق کا دھوکہ ہوں میں
ڈھونڈے گی کن آنکھوں سے اجل اے زیرک
کانٹا سا لگا ہوں میں کھٹکتا ہوں میں

عالم نے جو کچھ دین کی دولت پائی
سردار دو عالم کی بدولت پائی
قسّامِ ازل سے امتِ احمد نے
قسمت پائی تو اچھی قسمت پائی

طفلی ہی سے دلدادۂ حضرت ہوں میں
جانبا ختۂ درد محبت ہوں میں
بیٹھا ہوں سرِ راہ مدینہ تھک کر
مجھ کو نہ اٹھا نا کہ قیامت ہوں میں

وحشت جو غم شہ میں فزوں ہوتی ہے
حالت مری کچھ اور زبوں ہوتی ہے
جاتی ہے نہ جان ہی نہ آتا ہے قرار
یوں ہوتی ہے تسکین نہ یوں ہوتی ہے

زیرک

دکن کا واحد اور پہلا زنانہ ماہوار پرچہ زیر ادارت بیگم صاحبہ

عالیجناب سید ہمایون میرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا حیدرآباد سے

ہر ماہ ہلالی کو نکلتا ہے۔ قیمت سالانہ ہے دفتر النساء

صغرا منزل ہمایون نگر سے طلب کر لیا جائے

بیگم صاحبہ کی مندرجہ ذیل تصانیف دفتر النسا سے ملتی ہیں

مشیر نسواں عہ — تحریر النساء عہ — سفینہ نجات ۴ر

مجموعہ نصائح ۵ر — سفر نامہ عراق عہ — سیر بہار و بنگالہ ۸ر

سفرنامہ پونا و مدراس وغیرہ ۸ر — روزنامچہ دہلی و آگرہ وغیرہ عہ

پروفیسر الیاس برنی

کا

مشہور و مقبول سلسلہ منتخبات نظم اردو

۱۔ **معارف ملت** ۔ حمد، نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ۔ جلد اول جلد دوم جلد سوم

۲۔ **مناظر قدرت** اوقات۔ مقامات۔ مخلوقات اور واقعات کی تصاویر کا دلکش مرقع

جلد اول جلد دوم۔ جلد سوم۔

۳۔ **جذبات فطرت** ۔ سب دلوں کی کہانی چند شاعروں کی زبانی بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جلد اول۔ جلد دوم۔ جلد سوم

نوٹ ۔ ہر حصہ کی چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔

اپنی غیر معمولی شہرت اور قبولیت کی بدولت اب یہ سلسلہ کسی مزید تعارف اور سفارش کا محتاج نہیں رہا اس کی کتابیں اردو کے شائقین میں ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں۔ اور ہندوستان کے اکثر صوبوں کے مدارس میں داخل نصاب ہو چکی ہیں۔ جلد پاکیزہ۔ قیمت فی جلد مجلد صرف ایک روپیہ

اسرار حق

مرتبہ

پروفیسر الیاس برنی ایم۔ اے

آیات قرآنیہ۔ احادیث نبویہ۔ ارشادات صدیقین و اکابر دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان سب کا نہایت جامع اور مربوط انتخاب۔ اور ان کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لب لباب جس سے خود بخود اسلام کے حقایق و معارف اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں۔ تصوف کی تحقیق و تصدیق یعنی لحاظ سے یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے قابل دید ہے۔ حجم تقریباً چار سو صفحہ جلد پاکیزہ قیمت صرف (عہ)

مندرجہ بالا کتابیں ملنے کا پتہ

سمی احمد صدیقی۔ بر دولت خانہ محمد الیاس برنی صاحب ترپ بازار حیدرآباد دکن

سالگرہ نمبر

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابو المکارم محمد انوار اللہ صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر

دفتر رسالہ ترقی، اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جاے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط وکتابت بنام مینجر رسالہ کی جائے۔

(۷) اجرت طبع اشتہارات کا تصفیہ بذریعۂ خط وکتابت یا بالمشافہ طے ہوسکتا ہے۔

(۸) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ (صہ) ششماہی (سے) نمونہ ۸ر

مینجر

ترقی

جلد (۱) — بابتہ ماہ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ — نمبر (۵)

فہرست مضامین

منشآت

خادمہ - ترقی کے گزشتہ نمبر میں وعدہ کیا گیا تھا، کہ ہم آئندہ اشاعت میں رسالہ خادمہ پر اپنے خیالات ظاہر کرینگے چنانچہ چند سطور اسی بنا پر حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔
ایڈیٹرس صاحبہ نے اپنے التماس میں اس رسالہ کا یہ مقصد بیان کیا ہے، کہ "وہ ہر راہ علمی، اخلاقی، تمدنی، مذہبی مضامین اپنی بہنوں میں پیش کریں گے"
اس وقت ہمارے سامنے اس رسالہ کے چار نمبر ہیں جن کے دیکھنے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ من حیث المجموع یہ رسالہ اپنے مقصد سے کچھ دور نہیں۔

قوم کی ترقی میں عورتوں کو جو ممتاز درجہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، انہیں کی آغوش میں نشو و نما پاتے ہیں۔ اب اگر عورت لائق، تعلیم یافتہ، دیندار ہوئی تو ان نونہالوں کی تعلیم و تربیت پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر یہی عورت جاہل، بدسلیقہ، فضول رسوم کی پابند، اور جادو ٹونے کی خوگر، ہوئی تو بس پھر اولاد کی تعلیم کا خاتمہ سمجھنا چاہیئے۔ کسی عقلمند کا قول ہے کہ بچے کے لئے ماں کی آغوش سب سے پہلا مدرسہ ہے۔ ملک میں ایک ایسے پرچہ کی سخت ضرورت تھی، جو خواتین کی تعلیم و تربیت پر اپنا مصلحانہ اثر ڈالتا رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ خادمہ کی ایڈیٹرس صاحبہ نے انہیں حالات و مقاصد کو مدنظر رکھ کر یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ آپ ایک لائق اور مشاق مضمون نگار معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ رسالہ مذکور میں زیادہ تر آپ ہی کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور پھر یہ دیکھکر بھی ہمیں خوشی ہوئی کہ خادمہ نے عصمت وغیرہ کی تقلید کرکے خشک علمی مباحث یا عشق و محبت کے افسانوں سے اپنے صفحات رنگین نہیں کئے اور ہم نہایت اطمینانی مسرت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسالہ مذکور میں اکثر و بیشتر ایسے مذہبیہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن کا تعلق عورتوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح سے ہوتا ہے۔

ان چاروں نمبروں میں جو اہم اور مفید مضامین شائع ہوتے رہے، ہم اس جگہ صرف ان کے عنوان لکھے دیتے ہیں، جن سے ناظرین کرام پر ان مضامین کی نوعیت، اور ان کی حیثیت افادی اچھی طرح مکشوف ہو جائیگی۔

(۱) چھوکریاں خریدنا یعنی لونڈیاں پالنا، (۲) رسم ستوانسا،
(۳) نماز، (۴) ہماری اہم اخلاقی کمزوریاں،
(۵) تکلفات ناجائز، (۶) خیرات،
(۷) مقروض شوہر، (۸) زچگی،
(۹) حقوق زوجین، (۱۰) پریشان شوہر،
(۱۱) اسلامی فرائض وغیرہ،

افسوس کہ گنجائش اور وقت کی قلت سے ہم نے صرف عنوانوں پر قناعت کی، ورنہ مذکورۂ بالا مضمون ضرور تنقید و تبصرہ کے قابل تھے۔
خادمہ کا ایک نقص البتہ لائق اظہار و قابل اصلاح نظر آتا ہے یعنی رسالہ کا حجم، افسوس کہ خادمہ کی ضخامت ۱۶ صفحے سے آگے نہیں بڑھی اور ظاہر ہے کہ یہ ضخامت ایک مستقل رسالہ کے لئے "کان لم یکن" کا حکم رکھتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ رسالہ مذکور کی ضخامت میں اضافہ کیا جائیگا اس کے ساتھ ساتھ ہم ملک کی محترم خواتین اور تعلیم نسواں کے حامی طبقہ کو اس کی اعانت و امداد کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس کے مفید اور اخلاقی مضامین سے وہ ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔ قیمت سالانہ (ے) پتہ مہتمم رسالہ خادمہ قطبی گوڑہ حیدرآباد دکن۔

امریکہ کی علمی دنیا کے نمایندے پروفیسر پی یم بک اوائل فروری میں حیدرآباد آئے تھے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے زیر اہتمام ان کے تین لکچر ۸، ۱۰، ۱۲ فروری کو دارالبلدہ باغ عامہ میں حسب ذیل عنوانات پر ہوے۔

(۱) امریکن ادبیات، (۲) امریکہ کی یونیورسٹیاں، (۳) امریکہ کی فنی اور عمومی تعلیم۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم آئندہ کسی نمبر میں ان لکچروں کا ترجمہ شائع کریں گے۔

تصحیح مع تتمہ { صفحۂ ۴ پر حضرت کیفی مرحوم کی پہلی رباعی کے آخری مصرع میں اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کے نام نامی کے ساتھ لفظ میرؔ لکھدیا گیا ہے جو وزن رباعی کے لحاظ سے غلط ہے براہ کرم صحت فرمالی جائے۔

نوید سالگرہ مبارک اعلیحضرت شہریاری

حق شہ کو بعمر خضر دل شاد کرے تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزایش اعداد کرے

بندگان اقدس و اشرف کی یہ عظیم و جلیل سالگرہ حقیقت میں دولت علم و ہنر و معارف و مکارم کی وہ بدیع المثال سالگرہ ہے جو اسی شاہنشاہ مکرمت پناہ کے لئے مخصوص ہے۔ اس تقریب ہمایوں پر وفادار و جاں نثار رعایائے دکن کے طبقۂ اہل علم کی جانب سے "ترقی" کی نذر اخلاص و عقیدت پیشکش ہے، اور دعا ہے کہ:-

ازاں بیشتر کاوری در ضمیر ولایت ستاں باش و آفاق گیر

زماں تا زماں از سپہر بلند بفتح و ظفر باش فیروز مند

ازاں مے کہ جاں دارد و ہوش باد

مرا شربت و شاہ را نوش باد

فدوی
ابو المکارم صدیقی
اڈیٹر رسالہ ترقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد (۱) —— ماہِ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ —— نمبر (۵)

تہنیت سالگرہ مبارک

(از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ)

مژدۂ سالگرہ بادِ صبا دیتی ہے — گُلِ عشرت چمنِ دل میں کھلا دیتی ہے

یہ سعادت ہے اسی سالگرہ کا حصّہ — ہر گرہ سلسلۂ عمر بڑھا دیتی ہے

یہ کرامت بھی اسی سالگرہ میں دیکھی — نقشِ غم صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے

شانِ دربار بھی رکھتی ہے کمالِ بہزاد — دیکھنے والوں کو تصویر بنا دیتی ہے

رقص کرتا ہوا کہتا ہے یہ جامِ صہبا — کیا مزہ قُلقُلِ مینا کی صدا دیتی ہے

اب کے موسم میں کچھ ایسا ہے اثر مستی کا — بُوئے گُل ہوش عنادل کے اڑا دیتی ہے

چشمِ ساقی سے کسی جام کو نسبت کیا ہے — ایک ہی دور میں محفل کو لٹا دیتی ہے

بزم شاہی میں جلاتی ہے جو پروانوں کو
شمع کو بادِ سحر آکے بجھا دیتی ہے

ہے عجب رنگ حکومت کہ دمِ سیرِ چمن
شاخِ گل بھی سرِ تسلیم جھکا دیتی ہے

نام آصف ہے مگر سطوتِ آصفجاہی
شوکت و شانِ سلیماں کا پتا دیتی ہے

شاہ کی تیغِ رواں میں ہیں صبا کے انداز
جاگتا ہے کوئی فتنہ تو سلا دیتی ہے

کسی گلشن کی ہے کیا اصل دکن کے آگے
کوچے کوچے کی ہوا بوئے وفا دیتی ہے

صاف دل کیوں نہ رہیں سب کہ سیاست شہ کی
خاک میں گرد کدورت کو ملا دیتی ہے

اپنی دلسوز رعایا پہ شہ والا کو
ہے وہ شفقت کہ محبت کا مزا دیتی ہے

بخشش عام نے وہ کام کیا ہے کہ جلیل
ساری دنیا شہ عثماں کو دعا دیتی ہے

رُباعیات

از حضرت کیفی حیدرآبادی (رحمۃ اللہ تعالیٰ)

ہے مدنظر جس کو رعایا کی رفاہ
وہ کون ہے؟ ہم رتبۂ جم، آصف جاہ
سلطان گدا پرور و عادل، باذل
ماہر عثمان علی، شاہِ دکن ظل اللہ

اہل اسلام کا، ہے ملجا، مامن
چپہ چپہ ہے اس کا، گلشن گلشن
قائم دائم رہے، الٰہی! یہ شہر
رشک فردوس، حیدرآباد دکن

گلبانگ سالگرۂ سلطانیہ
و
ترانۂ برکاتِ عہدِ عثمانیہ

(از جناب علی حسین صاحب حسن حیدرآبادی)

سالگرہ مبارک کی مسرت آگیں تقریب پر ہمارے کرم فرما جناب مولوی علی حسین صاحب حسنؔ نے مندرجہ ذیل مضمون عنایت فرماکر ہمیں بے حد ممنون کیا ہے۔

مضمون کے متعلق ہمیں صرف اس قدر لکھنا ہے کہ، ناظرینِ کرام کو اس میں مبالغہ آمیز انشا پردازی، یا فوق الحد مداحی کے بجائے حقائق و واقعات کی سادگی و دلاویزی نظر آئیگی اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے کہ اعلیحضرت حضور پُر نور خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے زندہ جاوید اور درخشاں کارناموں سے تاریخ کے صفحات ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ اور "عثمانیہ یونیورسٹی" و "دارالترجمہ" کے غیر فانی علمی سرچشمے، قیامت تک، رہروان وادی علم کی تشنگی دفع کرتے رہیں گے۔ (مدیر)

جس طرح حیاتِ منفردہ کے قیام و ارتقاء کے لیے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے، جو اخلاط مختلفہ و قواے متضادہ میں باہمی ارتباط و توافق قائم رکھے، بالکل اسی طرح حیات اجتماعیہ کے نشوونما کے لئے بھی، ضرورت ہے ایک ایسی قوتِ عاملہ کی، جو قواے اجتماعیہ پر اپنی فرمانروایانہ نگرانی قائم رکھے، اور انھیں ایسے رستہ پر ڈال دے کہ ان قواے اجتماعیہ سے بڑے بڑے محیر العقول کارنامے ظہور پذیر ہوں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دکن کی حیاتِ اجتماعی جس عظیم الشان قوتِ عاملہ کے زیرِ تربیت نشوونما حاصل کر رہی ہے، اس کی ولادت باکرامت اسی ماہ مقدس میں شرف اندوزِ سعادت ہوئی ہے

یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آسمانی سفر طے فرمایا جو معراج کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وہ محترم مہینہ ہے، جس میں سرچشمۂ ولایت، شمع شبستان طریقت، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولادت مبارک واقع ہوئی، کچھ تعجب نہیں کہ حضرت **میر عثمان علی خاں بہادر** کی ذات ہمایوں پر اسی ماہ کی روحانی برکتوں نے نزول اجلال کیا ہے۔

حضرت اقدس و اعلیٰ کے دور حکومت میں، ملک نے جس سرعت سے ترقیاں کی ہیں ان کا استقصاء اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے، لیکن بمصداق اس ضرب المثل کے "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" ہم نہایت اختصار کے ساتھ برکات عہد عثمانیہ پر قلم اٹھاتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی "ایں سر رشتۂ تعلیم با در دست ما باشد" ہندوستانی تعلیم کا یہ خوشگوار تخیل کبھی شرمندۂ عمل نہیں ہوا، اور صرف عقلاء کے فضاء دماغ ہی میں گھٹ گھٹ کے رہ گیا، ہندوستان کے ماہرین فن تعلیم نے "اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بیشمار فوائد" پر دھواں دھار تقریریں کیں، اخباروں نے نہایت بلند آہنگی سے اس کے مناقب و فضائل کی زمزمہ سنجیوں سے فضاء ہند کو معمور کر دیا، مگر با ایں ہمہ شور اشوری و ہنگامہ آرائی کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس عظیم الشان کام کے عملی حصہ پر متوجہ ہوتا، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام ان لوگوں کے بس کا بھی نہیں تھا، اردو یونیورسٹی کے افتتاح کے لیے جس طرح غیر معمولی حکمت و دانش کی ضرورت تھی، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ بے پایاں دولت کی ضرورت بھی ناگزیر تھی۔ خدائے مسبب الاسباب نے اس عظیم الشان کام کے لئے **اعلیحضرت میر عثمان علیخان بہادر** شہریار دکن کا انتخاب کر لیا تھا اور واقعی سوائے **حضرت اقدس و اعلیٰ** کے یہ اہم کام کس کے بس کا تھا؟ چنانچہ **حضرت اقدس و اعلیٰ** نے موانع اور مشکلات کے باوجود اس عظیم الشان کام کو کائنات تخیل سے کھینچ کر میدان عمل میں قائم فرما دیا ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فی الحقیقت یہ ایسا عظیم الشان اور غیر فانی کارنامہ ہے کہ اس کی اہمیت کا احساس

صرف عقلا رہی کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے اسباب تباہی میں سب سے زیادہ اہم سبب موجودہ تعلیم کے نقائص کو سمجھنا چاہیئے۔ ان تعلیمی نقائص میں، سب سے زیادہ اہم نقص یہ ہے کہ مادری زبان کے بجائے، کسی دوسری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے، صرف یہی نہیں کہ طالب علم کے ذہنی اور دماغی قوا، جراحت پذیر ہو جاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک اور ناقابل تلافی نقصان سے دو چار ہونا پڑتا ہے، وہ یہ کہ طالب علم اپنی عمر کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ اجنبی زبان کے سیکھنے میں کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد پھر علوم و فنون پر توجہ کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کس قدر اوقات کش و عمر سوز ہے۔

اور پھر یہ کھلی ہوئی حقیقت بھی محتاج دلیل نہیں کہ اپنی زبان میں مطالب جس قدر دل نشیں ہو سکتے ہیں دوسری زبان میں کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ انہی نقائص نے اپنے مضر اثرات سے مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات کو حد درجہ مجروح کر دیا۔ اخلاق، معاشرت، مذہب کوئی شے بھی ان کے خطرناک وار سے محفوظ نہ رہ سکی۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مذہب سے بیزاری، معاشرت میں یورپ کی کورانہ تقلید، اپنی قومی خصوصیات کے مٹانے اور غیر قوم میں جذب ہو جانے کی انتہائی خواہش، غرض اسی قسم کے بے شمار بدبختیوں کو انہی تعلیمی نقائص کے تلخ ترین نتائج سمجھنا چاہیئے۔ علامہ شبلی مرحوم نے اپنی ایک مشہور نظم میں اسی فرقہ کی خانہ برانداز یوں پر، اس طرح ماتم کیا ہے۔

ایکہ برمائدہ یوروپ، مہماں باشی	حیف باشد، اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف، اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں	منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
مسمر از شعبدۂ جلوہ دہ اسرہ نہی	منکرِ معجزۂ موسیٰ عمراں باشی
از ہنیبال، صد افسانہ و دستاں گوئی	غافل از معرکۂ فاتحِ ایراں باشی
از خداوندِ جہاں یاد نیاری گاہے	روز و شب خود ہو پرستارئ سلطاں باشی

ان نقائص کا علاج ایک، اور صرف ایک ہی تھا وہ یہ ع

"این سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد"۔ اب یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے ان تعلیمی نقائص کا کس حد تک قلع قمع کر دیا ہے۔ اس سے نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی مذہبی، علمی، اخلاقی، معاشرتی سطح کس قدر بلند ہو جائے گی؟ اس کا ہر وہ شخص فیصلہ کر سکتا ہے جس کو تعلیمی مسائل سے کچھ بھی واقفیت ہے۔ اس سچائی میں ذرہ برابر بھی شک وارتیاب کی گنجائش نہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کو چودھویں صدی کا ایک اعجازی انقلاب سمجھنا چاہیئے جس سے کل ہندوستان کے مسلمانوں کی گوناگوں ترقیاں وابستہ ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے فوائد عظیمہ خود ایک وسیع موضوع ہے، اس موقع پر اس کا استقصاء منظور نہیں، بلکہ استطرادی طور پر، نہایت اختصار کے ساتھ چند عام اور بیش پا افتادہ امور کا ذکر کر دیا گیا۔ بہر کیف دکن اور ہندوستان پر اعلیٰحضرت خسروِ دکن کا یہ ایک احسان ہے جس کو کسی طرح بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بعد دار الترجمہ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اعلیٰحضرت کی حقائق رس ومعارف آشنا نگاہ نے بادنیٰ تامل یہ محسوس فرما لیا کہ بغیر "دار الترجمہ کے قیام کے عثمانیہ یونیورسٹی کا وجود ایک جسدِ بے روح سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ساتھ ہی ساتھ دار الترجمہ بھی معرضِ وجود میں آ گیا۔ دار الترجمہ کا قیام کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھو تو اسکو عثمانیہ یونیورسٹی کی تشکیل وتاسیس کا سب سے زیادہ اہم جزو سمجھنا چاہیئے۔ ضرورت تھی ایک ایسی تعلیم یافتہ جماعت کی، جو انگریزی زبان کے ماہرانہ عبور کے ساتھ، السنہ مشرقیہ کے بحرِ ذخار کی بھی شناور ہو، فلسفۂ السنہ وتکوینِ لسان کے غامض اسرار کی محرمِ راز ہو، اور وضعِ اصطلاحات کی دشوار گذار گھاٹی میں بھی اس کے قدم رہنمایانِ ادائم سے بڑھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تدبرِ عثمانی کی موانع شکن قوت نے اس سنگِ گراں کو بھی راہِ عمل سے ہٹا دیا اور سب نے دیکھ لیا کہ دار الترجمہ کا افقِ آسمانِ علم کے سب سے زیادہ ضیا بار ستارہ سے جگمگا رہا ہے۔

اس موقع پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ارکانِ دار الترجمہ کے اسمارِ گرامی اور ان کے متعلقہ فرائض

کسی قدر تفصیل سے لکھ دیں، جس سے ناظرینِ کرام کو ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ کس کتاب کا کس صاحب نے ترجمہ کیا اور کونسی کونسی کتابیں زیر اشاعت ہیں، اور کتنی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اشاعت پذیر ہو چکی ہیں و ہو ہذا۔

نمبر سلسلہ	نام مترجم	نام کتاب	تاریخ طبع	زیر اشاعت	کیفیت
۱	مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی	تاریخ ہند برائے میٹرک	شائع شدہ		
۲	"	تاریخ ہند حصّہ اوّل	"		
۳	"	" " دوم	"		
۴	"	" " سوم		زیر اشاعت	
۵	"	" " چہارم		"	
۶	"	جغرافیۂ عالم		"	
۷	"	حواشی تاریخ فرشتہ		"	
۸	"	تاریخ یونان	"		
۹	مولوی ظفر علی خاں صاحب	تاریخ انگلستان	"		کچھ حصّہ کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے۔
۱۰	مولوی علی رضا صاحب	تاریخ دستور انگلستان	"		
۱۱	"	اُصول قانون		"	
۱۲	"	اُصول شرع محمدی		"	
۱۳	مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب	تاریخ اہل انگلستان حصّہ اوّل	"		
۱۴	"	" " " دوم	"		
۱۵	"	" " " سوم	"		
۱۶	"	" " " چہارم		"	

نمبر سلسلہ	نام مترجم	نام کتاب	تاریخ طبع	زیر اشاعت	کیفیت
۱۷	مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب	تاریخ اہل انگلستان حصہ پنجم		زیر اشاعت	
۱۸	″	تاریخ یورپ حصہ اول		″	
۱۹	″	″ ″ ″ دوم		″	
۲۰	″	نظریہ سلطنت		″	
۲۱	″	علم السیاست		″	
۲۲	″	انجام سلطنت انگلیشیہ		″	
۲۳	مولوی محمد الیاس برنی صاحب	برطانوی حکومت ہند	شائع شدہ		
۲۴	″	مقدمہ معاشیات	″		
۲۵	″	معیشت الہند		″	
۲۶	″	معاشیات ہند	″		
۲۷	″	اصول معاشیات		″	
۲۸	مرزا محمد ہادی صاحب رسوا	مبادی علم النفس		″	
۲۹	″	حکمت الاشراق		″	
۳۰	″	مفتاح المنطق حصہ اول		″	
۳۱	″	″ ″ دوم		″	
۳۲	مولوی عبد الماجد صاحب	منطق	″		
۳۳	مولوی عبد اللہ العمادی صاحب	طبقات ابن سعد جلد اول		″	
۳۴	″	″ دوم		″	
۳۵	″	″ سوم		″	
۳۶	″	″ چہارم		″	

نمبر شمار	نام مترجم	نام کتاب	شائع شدہ	زیر اشاعت	کیفیت
۳۷	مولوی محمد ابراہیم صاحب	تاریخ طبری جلد دوم		زیر اشاعت	
۳۸	”	” سوم		”	
۳۹	مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی	” اول		”	
۴۰	قاضی محمد حسین صاحب	ترسیمات	شائع شدہ		
۴۱	”	ہندسہ مجسمات	”		
۴۲	”	ہندسہ مخروطات	”		
۴۳	”	علم المثلث حصۂ اول	”		
۴۴	”	” دوم		”	
۴۵	”	جبر و مقابلہ	”		
۴۶	”	سکون سیالات	”		
۴۷	”	ہندسہ تحلیلی		”	
۴۸	مولوی چودھری برکت علی صاحب	کیمیا	”		
۴۹	”	کیمیا حصۂ اول	”		
۵۰	”	” دوم		”	
۵۱	”	” سوم		”	
۵۲	”	عملی کیمیا		”	
۵۳	”	طبعیات حصۂ اول	”		برائے میٹرک
۵۴	”	” ” دوم	”		
۵۵	”	” ” اول	”		برائے انٹرمیڈیٹ
۵۶	”	” حصۂ دوم حرارت	”		

نمبر سلسلہ	نام مترجم	نام کتاب	شائع شدہ	زیر اشاعت	کیفیت
۵۷	مولوی چودھری برکت علی صاحب	طبعیات حصۂ سوم نور	شائع شدہ		
۵۸	"	" " چہارم آواز	"		
۵۹	"	" " پنجم مقناطیس	"		
۶۰	"	طبعیات حصۂ ششم برق	"		
۶۱	مولوی عنایت اللہ صاحب	قسطنطین		زیر اشاعت	
۶۲	"	یونانی شاہنشاہی		"	
۶۳	"	پیرک لیز	"		
۶۴	مولوی جمیل الرحمن صاحب	قدیم تاریخ ہند		"	
۶۵	"	تاریخ ابن اثیر کامل		"	
۶۶	مولوی عبدالرحمن خان صاحب	رسالۂ طبعیات عملی جلد اول	"		
۶۷	"	" جلد دوم حرارت و مناظر	"		
۶۸	"	رسالۂ طبعیات عملی جلد سوم آواز و مقناطیس	"		
۶۹	"	رسالۂ طبعیات عملی جلد چہارم نور		"	
۷۰	"	" " " پنجم آواز	"		
۷۱	"	طبعیات عملی مقناطیس و برق		"	
۷۲	مولوی شیخ برکت علی صاحب	علم المثلث تحلیلی حصۂ دوم		"	

نمبر سلسلہ	نام مترجم	نام کتاب	تاریخ طبع	زیر اشاعت	کیفیت
۷۳	مولوی محمود شوکت صاحب	مارکوئس ولیزلی		زیر اشاعت	
۷۴	مولوی سید محمد احمد صاحب	ڈلہاوزی		〃	
۷۵	مولوی حمید احمد صاحب	ویدک ہند		〃	
۷۶	〃	تاریخ جمہوری روما		〃	
۷۷	مولوی ہارون خاں صاحب	تاریخ یونان جلد دوم		〃	
۷۸	مولوی سید محمد عبد السلام صاحب	ہندی ملکت ہند		〃	
۷۹	مولوی نظیر حسین صاحب	رنجیت سنگھ		〃	
۸۰	مولوی سید فخر الحسن صاحب	عروج فرانس		〃	
۸۱	مولوی رشید احمد صاحب	تاریخ یورپ جدید		〃	
۸۲	مولوی عبد الباری صاحب	علم اخلاق		〃	
۸۳	مولوی سید سجاد صاحب	بدھستی ہند		〃	
۸۴	مولوی عبد الحلیم صاحب شرر	تاریخ اسلام		〃	
۸۵	مولوی سید غلام ربانی صاحب	امپیریل گزیٹر آف انڈیا		〃	
۸۶	مولوی محمد عبد السلام صاحب	تاریخ ہند عہد برطانوی		〃	
۸۷	مولوی فدا علی صاحب	تاریخ فرشتہ		〃	
۸۸	مولوی حمید حسینی صاحب قادری	مرقات	شائع شدہ		
۸۹	مولوی خان فضل محمد خاں صاحب	علم حرکت	〃		
۹۰	〃	سکونیات		〃	

مذکورۂ بالا فہرست میں جن حضرات کے نام نظر آرہے ہیں ان میں سے اکثر اپنی علمی سرگرمیوں کی وجہ سے شہرت و مقبولیت کے سرمایہ دار ہیں، اور اس لئے ہمارے تعارف و معرفی سے بھی بے نیاز

یہ انتخاب عثمانی ہی کی برکت ہے کہ دارالترجمہ نے، اپنی شش سالہ زندگی میں مختلف علوم وفنون کی درسی کتب کا ترجمہ کرکے، اردو کا دامن مراد علمی جواہر ریزوں سے بھر دیا ہے، اور منزل مقصود کی طرف نہایت تیزی سے بڑھا جارہا ہے۔

وہ دن قریب ہیں کہ یورپ کا بہترین علمی ذخیرہ، اردو کی آغوش میں دکھائی دیگا۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی نہ صرف دکن نہ صرف ہندوستان بلکہ کل ایشیا کی واحد تعلیم گاہ ثابت ہوگی۔ "خدا ہمارے معارف نواز بادشاہ کو سلامت رکھے" آمین۔

مذہبی توغل وجوشِ تشرع حضرت اقدس واعلیٰ کا سب سے اہم واقدم اور اختصاصی وصف، الفت اسلام و پابندی احکام شرع مبین ہے، اپنے مذہب سے آپ کی اُلفت ومحبت عشق و تعشق کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، یہ مذہبی تعلق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ترقی وحفاظت اسلام کی تدبیریں ہر وقت آپ کے زیر غور رہتی ہیں۔

ہم چند واقعات نہایت اختصار کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں جس سے ناظرین کرام کو اپنے عاشق اسلام بادشاہ کی مذہبی اُلفت کا بخوبی اندازہ ہوجائیگا۔

(۱) دارالترجمہ میں کتابوں کا ترجمہ ہورہا ہے جس میں ہر علم وفن مثلاً فلسفۂ جدیدہ، منطق، سائنس وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ اب آپ کی مذہبی شیفتگی ملاحظہ ہو کہ فوراً آپ نے علماء میں سے ایک مشہور مولوی جناب محمد صفی الدین صاحب کا انتخاب فرماکر، حکم صادر فرمایا کہ "دارالترجمہ سے جس قدر کتابیں ترجمہ ہوکر نکلیں وہ شائع ہونے سے قبل مولوی صاحب ممدوح کو دکھائی جائیں، اور مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں میں، کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں آگیا جو مذہب اسلام سے متصادم یا معارض ہو" والہانہ شیدائیتِ اسلام کی اس سے روشن تر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۲) بلدۂ حیدرآباد و مضافات میں محرم کے دنوں میں، عجب طوفان بے تمیزی بپا ہوجاتا تھا اور اس مہینے کی پہلی ہی تاریخ سے طرح طرح کے شرمناک وحیاسوز افعال، منظر عام پر

مشاہدہ میں آتے تھے حضرت اقدس و اعلیٰ نے فوراً ان مفاسد پر بھی توجہ فرمائی۔ سوانگ بنانے والوں اور ناشائستہ آدمیوں کے لئے سخت تعزیری احکام نافذ فرمائے، اور دکن کی روشن پیشانی سے یہ بدنما داغ ہمیشہ کے لئے دور کر دیا گیا۔

(۳) عرس کے دنوں میں بزرگانِ دین کے مزاروں پر، سالانہ شاہران بازاری کا شرمناک اجتماع ہوا کرتا تھا، کئی کئی دن تک رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتی تھیں، جس سے عوام کے جذبات و اخلاق پر نہایت برا اثر پڑنے کے علاوہ، ان بزرگوں کے متبرک مزاروں کی بھی حد درجہ توہین ہوتی تھی آپ نے اپنے زمانۂ حکومت میں یہ پاک مقامات (بزرگوں کے مزارات) ان نجس ہستیوں سے ہمیشہ کے لئے پاک فرما دئے۔

(۴) آپ ہی کے عہد مبارک میں احکام نافذ ہوئے کہ بعض متبرک مہینوں میں چند روز تک شراب و سیندھی اور جملہ مسکرات کی دوکانیں اور خرید و فروخت بالکل بند رہے۔ اور واقعی ان مقدس مہینوں کی تقدیس و احترام کا بھی یہی تقاضا تھا، ان مبارک مہینوں میں محرم الحرام، ربیع الاول کا محترم مہینہ، شب معراج، رمضان شریف وغیرہ شامل ہیں۔

(۵) آپ ہی کے زمانۂ حکومت میں، بلدۂ حیدرآباد اور اضلاع میں واعظوں کا تقرر عمل میں آیا، جو اپنے مواعظ حسنہ کے ذریعہ سے عوام میں، اظہار محاسن اسلام، تعلیم و تلقین احکام شریعت میں، شب و روز منہمک و مصروف ہیں۔

(۶) آپ ہی کے زریں عہد میں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ایام وفات میں، ختم قرآن شریف و فاتحہ خوانی کے بابرکت اعمال، سرکاری طور پر انجام دئے جاتے ہیں، اور اسی روز جملہ دفاتر میں ایک ایک دن کی عام تعطیل بھی ہوتی ہے۔

یہ چند واقعات جو اس وقت دماغ میں مستحضر تھے، سرسری طور پر لکھ دئے گئے، اگر استقصاءِ وجزرسی سے کام لیا جائے، تو اس موضوع پر، ایک مستقل رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

ممکن نہ تھا کہ عوام پر اپنے بادشاہ کی مذہبی شیفتگی کا اثر نہ ہوتا، چنانچہ آج کل عوام، پابندی احکام

اسلام میں جس سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں، اس کو بھی اسی شیفتگی کا ایک خوشگوار نتیجہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ "الناس علیٰ دین ملوکھم"۔

اصلاح عدالت جس طرح ابتداے تمدن میں ضروریات کی کثرت، احتیاجات کی فراوانی، کاروبار کا پھیلاؤ، اس قدر نہیں تھا جیسا کہ اس زمانہ میں پایا جاتا ہے بالکل اسی طرح تقسیم عمل کا اصول بھی مفقود تھا۔ بڑی بڑی سلطنتوں میں، جملہ امور چند آدمیوں کے سپرد کردئے جاتے تھے۔ ایک ہی شخص خدمات مختلفہ و فرائض متنوعہ کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور یہ فرائض و کاروبار کا حلقہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا تھا اسی قدر ہر ایک کام میں بے ترتیبی اور ابتری پیدا ہوجاتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی حیرت انگیز کار آگاہی و سیاست دانی سے اپنے زمانۂ خلافت میں، متعدد شعبے جداگانہ قائم فرمائے جنھیں صاحب الفاروق نے حضرت عمرؓ کے اوّلیات میں شمار کیا ہے، افسوس کہ یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ اسلام کے یہی وہ اولین و اساسی کارنامے ہیں، جن پر آج یورپ نے ایسی فلک بوس عمارتیں اُٹھائی ہیں کہ ذرا غور کرنے کے بعد ہی ان کی قدیم بنیادیں دکھائی دیتی ہیں۔

چنانچہ یورپ نے اس شعبہ بندی میں بھی بے حد ترقی کی اور سلطنتوں کے امور خفیہ کے لئے بھی علٰحدہ علٰحدہ شعبہ قائم ہوگئے۔

ہندوستان میں ایک عرصۂ دراز سے سنا جا رہا ہے کہ سر رشتۂ عدالت کو مالیات سے علٰحدہ کرنے کی تدابیر زیر غور ہیں۔ خیر! ہندوستان کو تو خیالی تدابیر پر غور کرنے دیجئے اور ذرا عمل کدۂ دکن پر نظر ڈالئے۔ حضرت اقدس و اعلیٰ کی ہمہ رس نگاہ نے اس طرف بھی اصلاح پاشیاں کیں۔ عدالت کو سر رشتۂ مال سے یک لخت الگ کر دیا گیا۔ جا بجا منصفیاں قائم ہوگئیں۔ اور اس کی وجہ سے سرکاری خزانہ پر جو بار پڑا، اسے ملک و رعایا کی فلاح و بہبودگی کے لئے بہ طیب خاطر منظور کیا گیا۔

اس عظیم الشان اصلاح سے قبل، عدالت و مال کے مخلوط رہنے سے جو نقائص پیدا ہوگئے تھے

ہم اس کی دردناک تفصیل درج ذیل کرتے ہیں، جس کے ملاحظہ کے بعد، اس عظیم الشان اصلاح کی پوری اہمیت واضح ہوگی، کیونکہ "تعرف الاشیاء باضدادھا"۔

عہدہ داران مال کو بوجہ کثرت کار مثلاً وصول مالگزاری حالیہ و بقایا، وراثت، انعام، توکلفنڈ، تقاوی، لاونی، زمین بنجر افتادہ، ہراجات، سوے ابواب، بندوبست، چوبینہ، آب پاشی، تصفیہ مقدمات مالی، جمع بندی، پولیس، سرحدات، و دیگر پیچیدہ معاملات مال و متفرق سے اس قدر فرصت نہیں ہوتی تھی کہ مقدمات عدالتی کا از روے قانون و ضابطہ اصول ایکوئی تحقیقات و تصفیہ کریں۔

اگر فرائض مال کی انجام دہی کے اوقات میں سے کوئی وقت، عدالتی مقدمات کے لئے نکالا بھی جاتا تھا تو وہ بالکل ناکافی ہوتا تھا۔ اور عدالتی تحقیقات کے لئے جو سہولتیں ہونی چاہئیں، وہ نہ حکام کو میسر تھیں نہ فریقین اس سے مستفید ہوسکتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ عہدہ دار مالی فرائض کی انجام دہی کے لئے دورہ کرتے تھے، اور مقدمات عدالتی کی پیشیاں دورہ کے مقامات ہی میں رکھ لیا کرتے تھے۔ ان حالات میں پچاس پچاس میل کی مسافت طے کرکے، فریقین، پنچ، گواہ، اور پولیس کو ہر پیشی پر جانا پڑتا تھا، اور اس طرح آمد و رفت میں سو سو میل کا چکر پڑ جاتا تھا۔

تکالیف و شدائد کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ عہدہ داران مال کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے پیشیاں تبدیل ہو جایا کرتی تھیں اور برسوں اشخاص متعلقۂ مقدمات ان مصائب میں گرفتار رہا کرتے تھے اور پنچ و گواہ بھی اپنے پیشہ اور کاروبار چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے خراب و خستہ ہوتے تھے۔ مقدمات عدالتی میں پنچوں اور گواہوں کا ملنا دشوار ہوتا تھا اور باوجود عینی مشاہدات کے پنچ اور گواہ محض اس مصیبت سے بچنے کے لئے شہادت سے انکار کر دیا کرتے تھے اور قتل، ڈاکہ و دیگر سنگین جرائم کے مرتکب بھی عمدہ شہادت نہ ملنے کی وجہ سے بری ہو جاتے تھے

اس کا خطرناک اثر سیاسی خرابیوں کے علاوہ رعایا کے حقوق پر جیسا کچھ پڑتا تھا ظاہر ہے۔
مزید براں پولیس کے فرائض پر بھی اس کا ناگوار اثر پڑتا تھا۔ کیونکہ پولیس، جرائم واقعہ شدہ کی سزائیں دلانے اور جرائم کے انسداد و سراغ رسانی میں اعراض و تساہح سے کام لیا کرتی تھی اور جب عہدہ داران مال اپنے ان اوقات میں سے جو مالی فرائض سے متعلق ہوتا تھا، عدالتی کاروبار کے لئے وقت نکالتے تھے تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ان کے اپنے فرائض (فرائض مال) ناتمام رہتے تھے۔ مثلاً تعین شخص مالگزاری و سبیل وصول و دیگر انتظام مال کے کاروبار کو اچھی طرح انجام نہیں دیسکتے تھے۔
مذکورۂ بالا نقائص نہایت اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے، ناظرین کرام اب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس عظیم الشان اصلاح سے کتنے مفاسد کا دروازہ بند ہو گیا۔

ٹائم اسکیل جنگ یورپ کے تباہ کن عواقب کا بے پایاں سلسلہ نہیں معلوم کب تک ہلاکت ریز رہے گا، اس دائمی قحط کو جو ساری دنیا پر مسلط ہے، اسی مہالک خیز زنجیر کی اک گلوگیر کڑی سمجھنا چاہیئے، دنیا بھر کے عقلا محو تفکر و واقف تدبر ہیں مگر اس قحط نے اپنے "بطش شدید" میں کچھ کمی نہیں کی، مگر راحت کدہ دکن میں حضرت اقدس اعلیٰ کی قحط شکن تدابیر نے اس بلا سے بھی نجات دلا دی، اور لطف عثمانی "ٹائم اسکیل" کی شکل میں اُفق دکن پر چمکنے لگا، ملازمین کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافے ہوئے جسکی وجہ سے رعایا نہایت آسایش کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے اور اپنے آقا ے ولی نعمت کے لئے پر خلوص دعاؤں کی فلک پیما آوازیں بلند کر رہی ہے

آرائش و تعمیرات "لطف معنی" کے ساتھ "حسن صورت" بھی ضروری ہے، وہ اگر "سرمایۂ باطن" ہے تو اس کو "متاع ظاہری" سمجھنا چاہیئے یہ کس طرح ممکن تھا کہ شاہ دکن کی معنی آرائیاں وقف "بطون" ہی رہتیں اور "ظہور" محروم رہتا، ملک دکن کی مذکورہ بالا اصلاحات (جو مشتے نمونہ از خروارے سے زیادہ نہیں) کے ساتھ ہی ساتھ بلدہ حیدرآباد

فرخندہ بنیاد کی ظاہری حالت میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں ہونے لگیں، پست و تنگ سڑکیں، وسیع اور دل کشا ہوگئیں، مختلف عالیشان و دلفریب عمارتیں تعمیر ہو چکیں جن میں ہائیکورٹ، سٹی ہائی اسکول، اسٹیشن کاچی گوڑہ، دواخانۂ افضل گنج، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہائی کورٹ کی عمارت اپنی شان و شوکت اور عظمت و وقعت کے لحاظ سے فقید المثال ہے اور اس کے پہلو ہی میں سٹی ہائی اسکول کی دلفریب عمارت شہنشاہِ دکن کی علمی دلچسپیوں کا راگ اونچے سُروں میں الاپ رہی ہے۔

رود موسیٰ کا کنارہ بہت دور تک متعدد گلزاروں اور چمن آرائیوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے، سبزہ زاروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مختلف الاشکال و متنوع الہیت حوض، آب شفاف سے چھلک رہے ہیں، حوضوں کی یہ دلکش قطار بہت دور تک چلی گئی ہے، جس سے ان گلزاروں کا منظر عمومی عجب کیف پرور و نشاط انگیز ہوگیا ہے، تفریحی مناظر سے دلچسپی رکھنے والے ارباب ذوق کو اعتراف ہے کہ یہ تفرج گاہ اپنی دلفریبی اور محل وقوع کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے۔

غرض ہمارے شہنشاہ کی زندگی، جو سراسر اک طلسم حیرت ہے، اپنے ملک و رعایا کی فلاح و بہبودگی کے لئے بالکل وقف ہے، جب سے آپ نے زمام حکومت اپنے اصلاح نواز ہاتھوں میں لی ہے، شاید ہی کوئی ایسا آفتاب طلوع ہوا ہو جس کی روشنی میں آپ نے ملک و قوم کے لئے کوئی نہ کوئی اصلاحی کام انجام نہ دیا ہو، اور پھر یہ ابر لطف و کرم سرزمین دکن ہی کے لئے، مخصوص نہیں ہے بلکہ اس موسلا دھار مینہ کی بوچھاڑ سے ہندوستان بھی سیراب ہو رہا ہے، وہاں کے مدارس، درگاہیں، علمی انجمنیں، اور جملہ مفید تحریکات کی آبیاری یہیں سے ہوتی ہے، جس طرح رعایائے دکن اپنے ہر دلعزیز بادشاہ کی جاں نثار ہے، اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی، اس واحد اسلامی سلطنت اور

اس صاحب جود و کرم شہنشاہ کے حلقہ بگوشی کو سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

اب ہم اس مختصر مضمون کو ختم کرتے ہوے دل کے عمیق ترین گوشہ سے اپنے آقاے ولی نعمت کے لئے بارگاہ لم یزلی میں اپنی پرخلوص دعاؤں کا یہ ہدیہ پیش کرتے ہیں کہ

اے رب حی و قیوم! ہمارے بادشاہ کی عمر و حیات میں ترقی دے جس سے تیرے بے شمار بندوں کی گوناگوں ترقیاں اور امیدیں وابستہ ہیں۔

اے معبود قادر و توانا! ہمارے بادشاہ کی جسمانی صحت و قوت برقرار رکھ، کیونکہ یہ صحت و قوت تیرے ان گنت بندوں کی فلاح و بہبودگی میں ہمہ وقت مصروف ہے۔

اے حافظ و ناصر مطلق! ہمارے بادشاہ کو ہمہ وقت و ہمہ دم اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھ، کیونکہ یہی اک ایسا مغتنم وجود ہے کہ جس کا آستانۂ کرم، آج تمام دنیا کے کمزوروں اور حاجتمندوں کا جاے پناہ بنا ہوا ہے، اور جس کی عالمگیر حفاظت میں، تیرے کروڑوں بندے نہایت آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اے مسبب الاسباب! تو اپنی بے پایاں قدرت سے ایسے اسباب، ایسا ماحول اور ایسی فضا تیار کر دے جس میں ہمارے بادشاہ کی اولوالعزمیاں بلند ترین مقاصد اور ارفع و اعلیٰ خواہشات انجام پذیر ہوں۔

آمین ثم آمین

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی صاحب رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ سرکار عالی)

حضرت مولانا عبداللہ العمادی ہمارے تعارف و تعریف دونوں سے مستغنی ہیں، آپ کی متعدد تصانیف علمی دنیا میں متداول ہیں اور ہندوستان کے بیسیوں رسالوں میں بلا مبالغہ آپ کے سینکڑوں مضامین نکل چکے ہیں، آپ کا انداز تحریر بالکل خاص اور حد درجہ دل نشیں ہوتا ہے، اسلاف کے محاسن اور کارنامے قدامت کی گرد سے پاک کرکے نہایت آب و تاب کے ساتھ موجودہ زمانہ میں نمایاں کرنا، آپ ہی کا حصہ ہے۔

مندرجۂ ذیل مضمون جو رنگ و سنگ میں درِ شہوار کی طرح چمک رہا ہے، حضرت مولانا ہی کے جواہر افکار کا نتیجہ ہے، ناظرین کرام دیکھیں گے کہ اس مختصر مضمون میں کس طرح شاہان اسلام اور ان کے درخشاں کارنامے جگمگا رہے ہیں، اور پھر اسی سلسلہ میں کس حیرت انگیز لطافت کے ساتھ اعلیٰ حضرت فیض گنجور نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا ذکر مبارک آگیا ہے۔

فیروز شاہ کی رعایا نوازی، اکبر کی شجاعت و دلیری، سلطان سلیمان خاں کی حشمت و رفعت، اورنگ زیب کی عالمگیری و سیاست دانی، مامون الرشید کی علم دوستی و معارف آگاہی، الحاکم بامر اللہ کی علما پرستی و حقائق آشنائی، حضرت مولانا نے ان سب کا ذکر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے بادشاہ دکن اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی

کا یہ کارنامہ جو عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، کسی طرح ان بادشاہوں کے کارناموں سے کم نہیں ہے۔

مضمون کا آغاز مولانا نے حافظ شیرازی کے ساقی نامہ کے چند اشعار سے کیا ہے اور ان اشعار میں عجیب و غریب تصرفات فرمائے ہیں، جس سے مولانا کی شاعرانہ نکتہ طرازیوں کا پتہ لگ سکتا ہے، بہرکیف مضمون ہی خود ایسا ہے جو اپنے محاسن و لطائف کی آپ شرح کریگا۔

"ترقی" کو اپنی اس خوش قسمتی پر فخر و ناز ہے کہ مولانا جیسے فاضل مضمون نگار ہاتھ لگ گئے لہذا امید کرتا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا یہ فخر و ناز اسی طرح قائم رہے گا۔ (مدیر)

آج سورج کی کرن پھوٹی ہے پیمانے سے

بیا ساقی آں مے کہ شاہی دہد — بہ پاکی او دل گواہی دہد
بدہ کاز دکن خیمہ بیروں زنم — سراپردہ بالائے گردوں زنم
و دو دیو را برکشیدہ صفے — ز ملک سلیماں بیار آصفے
سبک باش و رطل گرانے بیار — مے ناب گیتی ستانے بیار
مے حیدرآباد عثماں قوام
کہ ہندوستاں زو پذیرد نظام

(۱) "بادہ درجوش است و یاراں منتظر" جس صبوحی میں سفیدۂ سحر کی شعاعیں خم خانۂ بغداد میں جلوہ ریز ہوئی تھیں، عثمان ساگر میں بھی آج اُسی رحیق انوار کا دور ساغر ہے، فرق یہ ہے کہ اُس خرابات کا پیر مغاں نقلی تھا اور اس حوض کوثر کا ساقی عثمان علی ہے "ساقیا خذ ما صفا دع ما کدر"۔

"ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم" دیکھنا اس قدح میں آفتاب کا پرتو دیکھنا، یہی کوزہ دریا بند تو ہے جس میں بحر ہند و بحر مغرب کا اتصال ہوا ہے، یہ محیط موّاج، معرفت کا سمندر، اور تشنہ کامی "اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما"

"جلال قدح ذوالجلال آورد" شراب خواروں سے تو دنیا بھری ہے، مگر وہ کیف کہاں جو علم کا پیغامبر، عرفان کا پروردگار، سطوت وجلال کا خداوند، اور عظمت و جبروت کا خلاق ہو "کرامت فزاید کمال آورد"۔

(۲) عبدالملک نے ایک عظیم وجلیل دولت اُمویہ قائم کی، ولید نے سندھ سے ہسپانیہ تک کے ممالک فتح کر لئے، یزید کے سب سے پہلے مرکز نصرانیت پر لشکرکشی کی، دیوار قسطنطنیہ پر اپنی حیرت انگیز شجاعت کے آثار ثبت کر دئے جن کی یادگار ابوالفرج اصبہانی کے عہد تک موجود تھی، پھر سلیمان نے تو اپنی تمام زندگی ہی اس سب سے بڑی فرنگی سلطنت کو حلقہ بگوش اسلام بنانے میں صرف کر دی، مسلمہ نے خاص قسطنطنیہ کے بالمقابل ایک عربی شہر آباد کیا جس کو ڈیڑھ سال کے متواتر حملوں سے بھی متحدہ فرنگی طاقتیں سر نہ کر سکیں، اور ہمیشہ ان کے دلوں میں اس جگردوز تیر کی کھٹک رہی کہ جب ان کے گرجوں سے صدائے ناقوس بلند ہوتی ہے تو نعرۂ اللہ اکبر روزمرہ ان پر غالب آتا ہے اور ایک ایک دن میں پانچ پانچ مرتبہ اس غلبۂ توحید کی صلیب شگافی سے بنائے کنشت لرز لرز اٹھتی ہے۔

بایں ہمہ تاریخ نے عبدالملک کو "المنتھک لحرمات اللہ" (عظمت خداوندی کی بے عزتی کرنے والا) ولید کو جبار، یزید کو سکیر (متوالا) سلیمان کو اکال (بسیار خوار) اور مسلمہ کو جرادۂ صفراء (زرد ٹڈی) کا خطاب دیا ہے۔

معلوم ہوا، دستار عظمت فقط وابستۂ دامان سلطنت ہی نہیں، بقائے دوام کے اس درۃ التاج بختیاری کے لئے اورنگ خلافت کے اکلیل سعادت بھی لازم ہے۔

(۳) فیروز شاہ کو رفاہ عامہ میں نہایت انہماک تھا، اکبر کی جلالت وکبریائی شہرۂ آفاق ہے، سلطان سلیمان خاں کی جاہ وجبروت کے زندۂ جاوید کتابے اب بھی مجارستان (ہنگری) کی ہر در و دیوار پر نقش ہیں، اورنگ زیب عالمگیر

کی کشائی و مملکت آرائی کی یاد آج تک تازہ ہے مگر کیوں ؟ اور بھی تو بادشاہ گذرے ہیں جو ان سے بھی بڑے تھے ، طرۂ افتخار کے حامل انہیں کے تاج کیوں ہیں ؟

واقعہ یہ ہے کہ دین و دنیا و معاش و معاد کی سب سے بڑی نعمت علم ہے ، تاریخ انھیں تاجداروں کو نیکنام ازل بنایا جو نشر علم میں سرگرم رہے ، فیروز و اکبر و سلیمان و اورنگ زیب کو سلطان اعظم کا لقب اُس وقت ملا ہے۔ جب اوّل و ثانی فارسی میں علوم و فنون کے ترجمے کرائے ، ثالث نے تدوین قوانین کے محکمے بنائے ، اور رابع کے ترتیب فقہ اسلامی کا ایک سررشتہ قائم کیا جس کے ارکان کی تعداد چالیس تھی ، جس کے ناظم قاضی نظام جون پوری تھے ، اور جس کی یادگار "الفتاوی الهندیہ" اس وقت بھی اپنے موضوع میں اسلامی دنیا کا ماخذ و مستند ہے (۴) ، عبداللہ المامون بن الرشید نے نصرانیوں سے غزوے کئے ، جزیرۂ صقلیہ (سسلی) کو فتح کیا ، فرنگستان میں اسلام کی بنیادیں استوار کیں ، رومیوں کی ترکتاز مسدود کر دی ، یہ سب کچھ کیا مگر مامون اعظم کا خطاب اُس کے لئے تاریخ نے اسی وقت تجویز کیا جب بغداد میں اُس دارالترجمہ کا افتتاح ہوا ہے جس کا نام بیت الحکمۃ تھا اور جس نے تمام علمی زبانوں کے فنون و معارف عربی میں منتقل کئے تھے ، اس زمانے میں نہ کوئی کالج تھا ، نہ یونیورسٹی تھی ، نہ کسی مخصوص درسگاہ کے لئے کتابیں درکار تھیں ، با ایں ہمہ بغداد کے دارالترجمہ (بیت الحکمۃ) سے جاتی دنیا تک بقائے دوام کا شرف اولیت کوئی نہیں چھین سکتا۔

دولت فاطمیۂ مصر کے تیسرے فرماں روا الحاکم بامر اللہ سے مورخین کو بڑے گلے شکوے تھے ، مگر جب اس نے قاہرہ میں وہ دارالترجمہ قائم کیا جس کا نام دارالعلم تھا

اور جس کے حالات علامہ مقریزی کی کتاب الخطط والآثار میں مبسوط ہیں، تو رائے عامہ کی بارگاہ سے پھر اسی کو حاکم اعظم کا خطاب ملا ہے۔

(۵) ہندوستان کے بھلے دن آنے کو تھے کہ معارف حاضرہ کا آفتاب بھی جب مشرق میں طلوع نہ ہوا تھا، جب خاندان خدیویہ مصر میں "مدارس علیہ" کے آثار بھی نہیں پختہ ہوئے تھے، جب روم میں سلطان عبدالمجید خاں غازی کو "تاسیس مکاتب عالیہ" کا موقع بھی نہیں ملا تھا، جب ایران اپنے "دارالفنون" کے نام تک سے آشنا نہ تھا، جب علی گڑھ کی "تحریک" پیدا ہی نہ ہوئی تھی، اس زمانہ میں، اس ابتدائی زمانہ میں دولت علیہ آصفیہ کے نامور تاجدار حضرت نواب ناصرالدولہ نظام الملک آصف جاہ ثالث نے اسی حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں اس قدیم دارالترجمہ کی طرح ڈالی جس کا اہتمام و انتظام شمس الامرا امیر کبیر کا رہین منت تھا، پھر اسی سررشتہ کا نام حضرت غفراں مکان کے عہد میں گویا "محکمۂ علوم و فنون" پڑا جس کا احیا اب اعلیٰحضرت ظل اللہ و خلیفہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معارف گستری نے اب سچ مچ کا دارالترجمہ بنا کر فرمایا ہے، پہلے سررشتوں سے اگرچند کتابیں مرتب ہوئی تھیں تو اس دارالترجمہ نے اعلیٰحضرت پادشاہ اسلام کے اقبال سے کئی سو علمی کتابیں ترجمہ و تالیف و طبع و نشر کی ہیں جن کی تعداد آئندہ چند ہی سالوں میں ایک ہزار سے متجاوز ہو جائیگی، ان شاء اللہ وبیدہ التوفیق۔

یہ عظیم و جلیل منقبت ہے جس نے اعلیٰحضرت کے اسم سامی کو تمام دنیائے اسلام میں عثمان اعظم مشہور کر رکھا ہے۔

دکن امروز بہشت است کہ رضواں ایں جاست — وقت بسپردن جان است کہ جاناں ایں جاست
برسر کوہ عجب بارگہے می بینم — کوہ طور است مگر موسی عمراں ایں جاست
چہ غم از فتنۂ ایام جہاں را کامروز — شاہ جم مرتبہ عثمان علی خاں ایں جاست

ایّد اللہ دیمہ بدولتہ و بقاء عظمتہ و شوکتہ، امین، اللّٰھم امین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،

نطاشیؔ کا فلسفۂ ارتقاء

(از جناب مولوی سید تاج الدین احمد صاحب بی۔اے، بی۔ٹی)

دُنیا میں "عمل" ہی کی چہل پہل ہے اور "عمل" ہی حیرت انگیز نتائج کا سرمایہ دار ہے، تمدن، معاشرت، سیاست، صنعت و حرفت، کوئی شئے بھی ہے جو "عمل" کی نفع بخشی کا منت پذیرانہ اعتراف نہ کرے۔

نطاشی کا فلسفہ سراسر دعوت "عمل" ہے اور بآواز دہل پکار رہا ہے کہ "یاراں کنید کارے"

وہ نہیں چاہتا کہ لوگ بیرونی قوتوں، تقدیر کے نوشتوں اور ماحول کی موافقت پر بھروسہ کرکے بیٹھے رہیں، بلکہ وہ کڑک کر اور نہایت تندی کے ساتھ، کہتا ہے کہ اٹھو اور بیرونی قوتوں، تقدیر کے نوشتوں اور اپنے ماحول کو اپنا مطیع بنالو۔

ؔ چونکہ لفظ نٹشے ہماری زبان میں آسانی سے ادا نہیں ہوسکتا، نیز اس کے مشتقات مثلاً Nietzscheanism, Nietzscheism کا صحیح ترجمہ بھی بہت دشوار ہے، اس لئے اس لفظ کو دیگر حکماے یوروپ کے ناموں کی طرح اپنی زبان کی خراد پر چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حسب تجویز استادی و مخدومی مولانا وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعۂ عثمانیہ، اردو میں لفظ نطاشی، بہت موزوں ہے، اس لئے کہ اولاً تو یہ لفظ اصل لفظ Nietzsche کے قریب ہے، اور دوسری بات یہ Nietzscheanism کا ترجمہ "نطاشیت"، اور Nietzschean کا (نطاشوی)، بہت آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے، اور اردو میں بہت جلد رائج ہوسکتا ہے۔

نطاشی نے اپنے اس سنگین اصول کی کاری ضرب سے" زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز"
کے گھروندے کو بھی منہدم کر دیا کہ اگر زمانہ تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو اس کو منانے کی ضرورت
نہیں، بلکہ اپنی عملی قوت کو اور زیادہ مشتعل کر دو، یہاں تک کہ وہ مجبور ہوکر تمہارا
ساتھ دینے لگے، کیا عرفی بھی نطاشیت سے واقف تھا؟

نوررا تلخ ترمی زن، چو ذوق نغمہ کم یابی
حودی را تیز ترمی خواں، چو محمل راگران بینی"

ہم جناب سید وہاج الدین احمد صاحب، بی۔اے، بی ٹی وائس پرنسپل
نارمل اسکول حیدرآباد دکن کے واقعی ممنون ہیں کہ انہوں نے نطاشی کے فلسفہ کا
یہ حصہ "ترقی" کو عنایت فرمایا۔

جناب سید صاحب موصوف نے فلسفہ کے خشک ریگستان میں، جو گل ریزیاں
کی ہیں غالباً ناظرین کرام کے دماغ بھی اس کی شمیم انگیزیوں سے معطر ہو جائینگے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ جناب سید صاحب اسی طرح اپنی عنایت جاری رکھینگے (مدیر)

نطاشی کے نام سے ہندوستان کی اردو داں پبلک ناآشنا نہیں ہے، اگرچہ اس کے
فلسفیانہ مسائل سے معدودے چند لوگ واقف ہیں، تاہم اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے
انوکھے خیالات کی وجہ سے اس فلسفی نے یوروپ کی علمی دنیا میں ایک تہلکہ ڈال دیا تھا۔
"عیسویت"، "پیکار حیات"، "نظام تمدن"، "فلسفہ اخلاق" اور اسی قسم کے دوسرے اہم مباحث
پر اس نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ کچھ تو اپنی جدت کی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ
سے کہ اس کے پیشیرو فلاسفہ کے قائم کردہ اصولوں کے منافی تھے اور مذہب عیسوی
کی بیخ کنی کرتے تھے، یوروپ میں پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھے گئے۔ کسی نے تو
اسے مجنون قرار دیا، اور کسی نے اس کو شورش پسند بتلایا۔ بعضوں نے سیرے سے
اس کے فلسفی ہونے سے بھی انکار کیا، اور بعضوں نے اس کے فلسفہ کی تعریف ان

الفاظ میں کی "کہ اس میں ہر مسلمہ حقیقت کی نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے" غرضکہ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار ہونے لگی۔ حتیٰ کہ خود جرمنی میں لوگ اس کو نہ سمجھ سکے، اور اس قصور فہم کی پردہ پوشی کے لئے "تضحیک و تفضیح" کی ایک عمارت کھڑی کردی گئی۔

آج روکن Roecken کے اس عزلت نشین فلاسفر کو مرے ہوئے تیئیس[1] سال ہونے کو آئے ہیں، یہ سچ ہے کہ اعتراضات کی وہ گرم بازاری آج نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس کے فلسفہ کو سمجھنے لگے ہیں، اور اس "دیوانہ" کی باتوں میں بھی ان کو ایک آدھ "ٹھکانے کی بات" نظر آنے لگی ہے، لیکن معتوبین یوروپ کی فہرست میں آج بھی اس کا نام جلی قلم سے لکھا ہوا نظر آتا ہے، گذشتہ جنگ یوروپ کی ذمہ داری اسی کی فلسفیانہ تلقین پر عائد کی جاتی ہے، اور عام طور پر اس بیچارے کو "خطرناک" سمجھا جاتا ہے۔

نطاشی کو یوروپ میں ہر دلعزیزی کیوں نہ حاصل ہوسکی؟ نطاشیت پر شورش پسند اور مغوی ہونے کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب مختصر الفاظ میں تو یہ ہے کہ اس کے خیالات ہمیشہ تعصب اور قدامت پسندی کی نظروں سے دیکھے گئے، یہ کبھی نہیں ہوا کہ ذاتیات سے قطع نظر کرکے، جذبات کو پس پشت ڈال کر اس کے بنا کردہ مسائل، اور ان کی علت پر غور کیا جاتا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ اس کا شدید ترین وار انہیں مسائل پر ہے جو فی زماننا اپنے اندر قبولیت عام اور مرجعیت کے فرائض مخفی رکھتے ہیں مثلاً "جمہوریت" "اشتراکیت" "تمدن" وغیرہ تو انہوں نے بجائے منصفانہ استدلال کے، تقاضائے عادت سے مجبور ہوکر، اُن کو غلط قرار دیا، اور آسانی کے ساتھ نطاشی کو عوام الناس کی طرف سے بدنامی کا خطاب دلوادیا، حالانکہ حقیقت

---

[1] روکن Roecken پروشیا Prussia کے صوبہ سیکسنی Saxony میں ایک مقام ہے، اور نطاشی کی جائے پیدائش یہی ہے۔

یہ ہے کہ جب تک نطاشی کے خیالات ہر مسئلہ پر فرداً فرداً نہ پیش کئے جائیں، اور ان کا مقابلہ مروجہ خیالات سے نہ کیا جاے، اُس وقت تک اُن کو صحیح یا غلط کہنا ہی نادرست ہے۔ مضمون ہذا میں اسی کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس کے فلسفہ کے ایک رُخ "ارتقاے انسانی" کو لے کر اُس کی کامل تشریح کر دی جاے تاکہ دیگر فلاسفہ کے مسلمات اور معتقدات سے اُن کا مقابلہ ہو سکے اور کسی ایک کے صحیح یا غلط ہونے سے متعلق کوئی آزادانہ راے قائم کی جاسکے۔

نطاشی نے جب اپنا پیغام عمل دنیا کو سنایا، اس وقت یوروپ پر ایک عالم جمود طاری تھا۔ جس چیز کو حقیقی معنوں میں پیکار حیات کہنا چاہیئے، اُس کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ آرام، سکون، عیش کوشی، خطرات سے گریز، بس یہی ہر شخص کے نصب العین بنے ہوے تھے۔ یوروپ بدترین امراض روحانی، یعنی قوت ارادہ کی ناتوانی میں مبتلا تھا، نیکی کا مفہوم بس یہی رہ گیا تھا کہ پُر امن اور مجہول طریقہ پر زندگی بسر کی جاے اور زندگی سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ انسان دوسرے بے ضرر پالتو جانوروں کی طرح گھر کی زینت بنے رہیں۔ اور اپنی چہلوں سے فرقہ اناث کے لئے سامان دلبستگی فراہم کیا کریں۔

نطاشی کی دور رس نگاہوں نے تاڑ لیا کہ اس ظاہری اطمینان اور سکون کے پردہ میں، قومی ہستی کو برباد کرنے والی قوتیں اپنے پورے زور کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، اور اس نے مروجہ طریقۂ زندگی کے خلاف اپنی صداے احتجاج بلند کی:—

"تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ بہادری بہترین نیکی ہے"
"تمہارا خیال ہے اگر کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جنگ و جدل"
"بھی کی جاے تو یہ بھی جائز ہو جاتی ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ"
"جنگ و جدل" بشرطیکہ اچھی کی جاے، ہر مقصد کو اعلیٰ و ارفع بنا دیتی"
"ہے جنگ و جدل اور ہمت کے کارنامے، عشق و محبت کے خواب آور"

"افسانوں سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔"

"میں ان لوگوں کے درمیان (اس سے مراد جرمن قوم ہے۔ راقم) آتا
"جاتا رہتا ہوں، اور اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں، وہ حقیر اور کمزور"
"ہوگئے ہیں اور دن بدن زیادہ حقیر و کمزور ہوتے جاتے ہیں، اس کی
"وجہ خوشی اور نیکی کے متعلق اُن کے مسائل و معتقدات ہیں۔"

"مردانگی کا اُن میں کم پتہ ملتا ہے، اس لئے ان کی عورتیں مردانہ بن گئی
ہیں، عورت کی نسائیت کی حفاظت وہی شخص کرسکتا ہے جو خود"
کافی طور پر مردانگی رکھتا ہو۔

"اُن کے قلوب اپنے اندر صرف ایک آرزو لئے ہوئے ہیں، اور وہ"
"یہ کہ کوئی انہیں گزند نہ پہنچائے۔ یہ بزدلی ہے، حالانکہ اس کو"
نیکی کہا جاتا ہے۔"

یہ تھی وہ کیفیت جس نے نطاشی کو مجبور کیا کہ وہ گوشۂ عزلت چھوڑ کر باہر نکلے، اور اپنی قوم کے قالب مردہ میں ایک تازہ روح پھونکے۔ یاد رہے کہ نطاشی پہلا ہی شخص نہیں ہے جس نے یہ پیغام عمل سنایا ہو۔ اُس سے بہت قبل اسٹنڈ ہال Stendhal دنیا کو یہی پیغام سُنا چکا تھا، اور عیسویت کی اس تلقین کے خلاف کہ "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی پیش کردو" صدائے احتجاج بلند کر چکا تھا۔ خود نطاشی کے معاصرین میں ایک گروہ ایسے فلاسفہ کا موجود تھا جو اُس وقت کی حالت کو بہت پر خطر سمجھتا تھا۔ اسباب و علل کی تلاش سے معذور ہو کر اُس کی اصلاح سے مایوس ہو چکا تھا اور اسی لئے قنوطی[1]

[1] فلاسفہ کا وہ گروہ جو حیات، کائنات وغیرہ کی اصلاح و درستی سے قطعاً ناامید ہو کر صبر و سکون کی تلقین کرتا ہے "قنوطین" Pessimists کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مخالف گروہ جو موجودات عالم کے اصلاح پذیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ کوشش سے کائنات کی بہتری ہو سکتی ہے، رجائیوں Optimist کے نام سے موسوم ہے، یہ دونو مذاہب قنوطیت Pessimism و رجائیت Optimism کے نام سے موسوم ہیں۔

فلسفۂ زندگی کی تلقین کرنے لگا تھا۔ نطاشی کے زمانہ میں ان کا سرگروہ مشہور فلسفی شوپنہاؔر Schopen hauer تھا، پہلے پہل نطاشی بھی شوپنائر کا ہمخیال ہو کر تخیلات و افکار قومی کی اصلاح سے قطعاً مایوس ہو چکا تھا، لیکن اُس کے دلی اضطراب نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس طرح نامردانہ طور پر عاجزی کا اقرار کر لیا جائے۔ رفتہ رفتہ اُس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس حالت کا باعث نظام عالم کی بے ترتیبی نہیں بلکہ خود انسان کی کم نظری، اور اُس کے قائم کئے ہوئے معیارِ عمل کی پستی ہے۔ اس خیال کو لے کر وہ اُٹھا اور دنیا کو "انسان اعلیٰ" Superman یعنی مدارج ارتقائی کی آخری منزل پر پہنچنے کی تلقین کرنے لگا۔

"زندگی" کیا ہے؟ حیات، زیست، بقا، ان کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب نطاشی کا ہمعصر اور انگلستان کا مایۂ ناز فلسفی ہربٹ اسپنسر یہ دیتا ہے کہ "زندگی جد و جہد کا نام ہے"، یا "داخلی حالات کی خارجی عوارض سے مسلسل مطابقت کرتے رہنا زندگی کہلاتا ہے"۔ ان دونوں تعریفات پر غور کرو۔ حقیقی معنوں میں "پیکار حیات" کا مفہوم کسی ایک سے بھی نکلتا ہے؟ کیا "جد و جہد" انسانی زندگی کے تمام ناخوشگوار رخوں پر حاوی ہے؟ بالکل نہیں۔ آتش جذبات، نفرت، حسد، حرص و آز، ان سب باتوں کا اظہار یہ معصوم الفاظ ہرگز نہیں کرتے۔ اب دوسری تعریف پر غور کرو۔ اگر پہلی تعریف اپنی غیر جامعیت کے لحاظ سے ناقابل قبول ہے، تو دوسری اپنی وسعت کے اعتبار سے "زندگی" کا حقیقی مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسپنسر نے جبر و احتیاط کے ساتھ "زندگی" کے ناخوشگوار پہلوؤں کو ان تعریفات سے خارج کر دیا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی تمرد و نا ہموار کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لے!!

نطاشی کی ہمت اس بات کو گوارا نہ کر سکتی تھی کہ اپنے دل کو اس طرح سمجھا لیا جائے، اُس کا خیال تھا کہ اگر ہم کو کسی وادی پر خطر میں چلنا ہے تو خطرات کی مناسبت

سے زادِ سفر بھی مہیا کرنا چاہیئے۔ خطرات کو معدوم سمجھنے، اور وادی پر خطر کو وادی ایمن فرض کر لینے سے سفر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی اصول زندگی اُس وقت تک کامیاب اور قابل عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اصول بنانے والا زندگی کے تاریک مناظر کی جھجک اپنے دل سے دور نہ کر دے، اور ہر دلعزیزی کو سچائی پر قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائے

نطاشی نے بسیط ترین اشکال حیات یعنی یک خانوی Unicellular ایمبا[1] Amoeba سے لے کر، تیز ناخن والے، خونخوار شیر تک ہر چیز کو بغور دیکھا تھا، اور اس مشاہدہ سے جس نتیجہ پر اُسے پہنچایا، اُس کا بلا کم و کاست اظہار اُس نے اپنی تعریف حیات میں کر دیا۔ چنانچہ کہتا ہے: "حیات، تغلب و تصرف، ضرر رسانی، کمزوروں اور اجنبیوں پر غلبہ پانا، تہدید، سختی اور اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کے قربان کرنے کا نام ہے،"

اس تعریف کو شروع سے آخر تک دوبارہ پڑھ جاو، ہر لفظ اپنے اندر ایک روح فرسا حقیقت لئے ہوئے ہے روح فرسا ضرور ہے لیکن حقیقت ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی میں یہ سب نہیں ہوتا۔ اب اسپنسر کی مذکورۂ بالا تعریف پر بھی غور کرو۔ اسپنسر کا پیرو، اپنے پر سکون گھر میں آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر اس خیال میں خوش رہتا ہے کہ "زندگی جد و جہد کا نام ہے" لیکن نطاشی کا مقلد خارزار حیات کو گلستان فرض نہیں کر سکتا، وہ اس آرام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اس کو ہر وقت اپنی شمشیر عمل کو عریاں رکھنا پڑتا ہے وہ جانتا ہے کہ میدان جنگ میں چلنے کے لئے سامان جنگ ضروری ہے

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

---

[1] ایمبا amoeba ایک یک خانوی عضویہ ہے، یہ پانی میں اکثر موجود رہتا ہے اور نہایت دقت کے بعد خوردبین کی مدد سے نظر آتا ہے۔ اس کی کیفیت ایک خانہ کی سی ہوتی ہے جس میں مادہ اولی (پروٹوپلازم) بھرا ہوا ہوتا ہے عام طور پر ماہران حیاتیات کا خیال ہے کہ تمام اشکال حیات، عمل ارتقا کی بدولت اسی عضویہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ الفاظ "جد وجہد" اتنے غیر جامع نہیں ہیں جتنے کہ بتائے جاتے ہیں اور یہ کہ اُن میں جہد للبقا یا حفاظت ذات کا مفہوم داخل ہے، آیا حیات جہد للبقاء ہے یا نہیں اور حفاظت ذات خاص الخاص جبلت انسانی ہے یا نہیں؟ ان سوالات کا جواب تو تم آگے چل کر خود نطاشی کی زبان سے سن لو گے۔ سردست اسی قدر کہنے پر اکتفا کی جاتی ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے تمام اعمال حیات کا محض حفاظت ذات کی غرض سے ہونا فرض کر بھی لیا جائے، تو ایک اور اخلاقی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی شر کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ جب تم ہر فعل کو تقاضائے حفاظت ذات خیال کرنے لگو، تو کوئی فعل بھی بُرا نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اس وجہ سے نطاشی اس تعریف کو صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ حالانکہ موجودہ معیار خیر و شر کا وہ سخت مخالف ہے، لیکن پھر بھی شر کو خارج از بحث قرار دینے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہے۔ وہ مانتا ہے کہ جہد للبقاء ضرور ہوتی ہے، لیکن اُس کے عام اور ہمہ گیر ہونے کو وہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے:۔

"حیات، وسیع ترین معنوں میں احتیاجات اور ضروریات کی کثرت کا نام نہیں ہے کہ جس کے لئے ہر ذی حیات کو ایک مسلسل جہد للبقاء کرنا پڑے۔ بلکہ زندگی کی کیفیت آسودگی سیرابی، اور افراط کی ہے۔ اگر تم کو کہیں جد وجہد نظر آتی ہے، تو یہ 'بقا' کے لئے نہیں بلکہ اقتدار کے لئے ہوتی ہے۔ حیات کی قوت محرکہ خواہش حیات نہیں بلکہ خواہش اقتدار ہے۔"

جہاں کہیں مجھے ذی حیات مادہ نظر آتا ہے میں وہاں لازمی طور پر خواہش اقتدار پاتا ہوں۔ نوکروں میں بھی میں نے آقا بننے کی خواہش موجود پائی ہے۔

خواہش کا وجود وہیں ہوگا جہاں حیات ہو۔ کونسی خواہش ؟ خواہش
حیات نہیں، بلکہ میں تم کو بتلاتا ہوں کہ خواہش اقتدار"

جو لوگ جہد للبقار کو لازمی طور پر محرک حیات سمجھتے ہیں، اور اس کو ہمہ گیر خیال کرتے ہیں، اُن سے کوئی پوچھے کہ کیا انسان کا ہر جارحانہ فعل، ہر ظلم و زیادتی، جنگ وجدل، یہ سب جہد للبقار کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں ؟ کیا اکثر یہ نہیں ہوتا کہ حفاظت ذات کے جملہ وسائل تو موجود ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ سب افعال کئے جاتے ہیں ؟ طاقتور قومیں جو اپنی بقا کے جملہ وسائل رکھتی ہیں، اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہیں، کیوں دوسرے ملکوں پر دندان آز تیز کیا کرتی ہیں ؟ زید جس کی آمدنی عام، اور عام حیثیت اتنی کافی ہے کہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کے جملہ لوازم فراہم کرسکتا ہے، جو ایک طرح سے "جہد للبقا" کی طرف سے فارغ البال ہے، کیوں بکر کی زیادہ آمدنی، اور اس کی زیادہ حیثیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اُس کو نیچا دکھانے کے درپے ہو جاتا ہے ؟ پس معلوم ہوا کہ مقصد حیات صرف جہد للبقار ہی نہیں ہے، واقعات پتہ دیتے ہیں کہ حیات انسانی میں بالعموم، اور خاص افراد مثلاً بڑے بڑے سورما، مصلحان قوم، اور ماہرین فنون میں بالخصوص، خواہش بقا پر ایک دوسری زبردست خواہش حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ زبردست خواہش آخر کیا ہے ؟ نطاشی کہتا ہے کہ یہ "خواہش اقتدار" ہے اور فی الواقع یہی حقیقت نطاشیت کی جان ہے۔ خود اسی کے الفاظ سنو۔

نفسیات دانوں کو چاہیئے کہ غور و خوض سے کام لیں اور بے سوچے سمجھے "حفاظت ذات" کو کسی عضویہ کی خاص الخاص جبلت نہ ٹھیرائیں۔ ہر ذی حیات کی لازمی کوشش کسی نہ کسی طرح سے اپنی قوت کو ظاہر کرنا ہے، حیات خود خواہش اقتدار کا دوسرا نام ہے، اور حفاظت ذات یا جہد للبقار

اُس خواہش کا ایک بالواسطہ اور کثیر الوقوع ، نتیجہ ہے۔"

سطحی نظر میں تم کو شاید نطاشی اور دیگر فلاسفہ مثلاً ہربرٹ اسپنسر کے نقطۂ خیال میں کوئی خاص فرق نہ معلوم ہو، اور یہ ساری بحث بعض لفظی گورکھ دھندا نظر آئے لیکن مذکورہ بالا اقتباس کے پڑھنے کے بعد ان دونوں کے نقطۂ خیال کا فرق بخوبی واضح ہوجاتا ہے، کسی ذی حیات کو محض ایک ایسی ہستی فرض کرنا جو اپنی بھوک کو فرو کرنے کے لئے گشت لگاتی رہتی ہے، اور اس خواہش کے فرو ہوجانے کے بعد معطل ہوجاتی ہے۔ ایک بات ہے، اور یہ اسپنسریت ہے، لیکن اسی جانور کو ایسی قوتوں کا ذخیرہ جاننا جن کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہونا لازمی ہے، اور حفاظت ذات، کی غرض سے جو اعمال سرزد ہوں، اُن کو ثانوی اور عارضی حیثیت دینا، یا ایک بالکل دوسری بات ہے اور یہ نطاشیت ہے۔

نطاشی نے اس خیال کو کہ حیات خواہش اقتدار کا نام ہے، بنیاد قرار دیکر اس کے اوپر اپنے فلسفۂ ارتقار کی عمارت کھڑی کی ہے، اور اس میں اور دیگر فلاسفہ میں اصلی فرق یہی ہے وہ انواع کے ارتقار کا قائل ہے۔ لیکن ڈارون Darwin اور دیگر انتخاب طبیعی natural selection کے قائلین کے برخلاف نطاشی کی رائے عمل ارتقار کے متعلق بھی کچھ اور ہے۔

انگریزی اور المانی حیات دانوں کے فرقے، ارتقار کا باعث "موافقت ماحول" کو قرار دیتے ہیں۔ نطاشی اس کا قائل نہیں۔ اُس کو تعجب ہوتا ہے کہ ارتقاء انواع میں ماحول کے میکانی اور مجہول اثرات کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے اور ذہن اور روح کو عوامل کی فہرست سے کیوں خارج کر دیا جاتا ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ ہر عضویہ کے اندر ایک تخلیقی قوت باطنی طور پر عامل ہے (خواہ تم اُس کا کچھ ہی نام کیوں نہ رکھو) جو آگے چل کر ماحول اور حالات طبعی کو اپنا ماتحت بنا لیتی ہے۔ یا یوں

کہوکہ انسان، اور ہر ذی حیات اپنی دنیا آپ پیدا کرسکتا ہے۔ خود ڈارون نے بھی اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "ابتدائے انواع" میں اسی حقیقت کا دبی زبان سے اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

"عوامل اختلاف انواع، دو اقسام پر منقسم کئے جاسکتے ہیں، ایک تو کسی عضویہ کے داخلی حالات اور دوسرے اس کے گرد وپیش کے حالات، پہلے بہ نسبت دوسرے کے زیادہ اہم ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ مختلف ماحول کے ماتحت بعض اوقات یکساں تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں، علیٰ ہذا یکساں ماحول میں مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔"

ان اختلافات سے قطع نظر، عام طور پر نطاشی ارتقاء کے مسئلہ میں قدیم مذاہب حیاتیات کا ہمخیال ہے اور اُن کو صحیح مانتا ہے لیکن اُس کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی بحث وتحقیق اس قدر قبل از وقت کیوں ختم کردی اگر عمل ارتقاء ایک مسلمہ حقیقت ہے اور موجودہ اشکال حیات فی الواقع ارتقاء ہی کا نتیجہ ہیں تو نطاشی پوچھتا ہے کہ محققین نے اپنا کام اس قدر جلد کیسے ختم کردیا اگر تم مسئلہ ارتقاء کے قائل ہوکر یہ ماننے کے لئے تیار ہوکہ انسان بربریت سے، یا زیادہ دور جاؤ تو یک خانوی عضویہ سے ترقی کرتے کرتے اپنی موجودہ حالت عروج پر پہونچا ہے تو نطاشی سوال کرتا ہے کہ کیا یہ ناممکن ہے کہ اسی طرح درجہ بدرجہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا، اپنے ذہن اور ارادہ کی وساطت سے انسان موجودہ حالت سے بڑھ جائے اور انسان اعلیٰ بن جائے:۔

آج کل کے بہترین دماغ سوال کرتے ہیں کہ بقائے ذات کیونکر ہوتی ہے:

زراتھسترا[1] Zarathustra. پہلا شخص ہے جو پوچھتا ہے کہ انسان

---

[1] زراتھسترا Zarathustra ایک فرضی نام ہے، اس شخص کی زبان سے نطاشی اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے چنانچہ اسکی ایک تصنیف کا نام Thus Spake Zarathustra ندا زراتھسترا کا پیغام ہے یہ کتاب نظم میں لکھی گئی تھی، اور نطاشی کی بہترین تصنیف ہے۔

"اپنی موجودہ حالت سے ترقی کیونکر کرسکتا ہے؟"
"تمہارے مدارج ارتقاء میں ہر عضویہ نے اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ
اشکال حیات پیدا کی ہیں، تو کیا اس بڑھتی ہوئی موج کا خاتمہ تم پر
ہو جائے گا؟ دیکھو میں تمہیں 'انسان اعلیٰ' کی تعلیم دیتا ہوں۔"
قدیم محققین نے اپنی بحث کو ادھورا کیوں چھوڑ دیا؟ اس کی وجہ اُن کا یہ خیال تھا کہ ماحول کی قوتوں کی کورانہ، اور غیر منتظم کشمکش، آگے چلکر کوئی نہ کوئی اچھا نتیجہ ضرور پیدا کر دے گی۔ اور جس طرح اب تک ارتقا ہوتا رہا ہے اسی طرح آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اس قسم کی دل خوش کن امیدوں سے متاثر ہونا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھکر آنیوالے عہد زریں کا تصور کرنا، ہرچند شعرا اور عوام میں قابل معافی ہو، لیکن حکما کی یہ شان نہیں ہے پھر کس قدر مقام تعجب ہے کہ اسپنسر جیسا فلسفی اس کا قائل ہو کر کہ گیا کہ
"آخر چل کر عمل ارتقا، انہی اسباب کے ظہور کا موید ہوگا جن سے
حیات، اور حیات کی مسرتوں میں اضافہ ہو۔"
اسپنسر کے اس خیال کی وجہ ڈارونیوں کا یہ فرضیہ ہے کہ "جو لوگ جہد للبقا میں 'اصلح' ہوں گے وہی بہترین انسان ہوں گے" نطاشی اس خیال کا سخت مخالف ہے۔ وہ یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے کہ محض اتفاقیہ طور پر، بغیر ہماری سعی و کوشش کے بیرونی عوامل کوئی مفید نتیجہ مترتب کرسکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تم نے 'فاعلیت' سے دست بردار ہوکر، سب کچھ 'ماحول'، پر چھوڑ دیا تو تم میں اور نباتات میں فرق ہی کیا رہ گیا؟ دوسری بات یہ کہ اگر ماحول 'پست کن'، اور 'ذلیل کن' ہو تو اس ماحول کے 'اصلح' بھی پست و ذلیل افراد ہی ہوں گے۔ یعنی وہ جو پستی و ذلت کے 'ماحول' سے بہترین 'مطابقت' کرسکتے ہوں، نطاشی چونکہ اپنے زمانہ کے حالات کو 'پست کن' خیال کرتا تھا، اور

جانتا تھا کہ اگر انسان دخل نہ دے تو یہ حالات پست افراد ہی کے بقا کے موید ہونگے، اس لئے وہ دوسرے فلاسفہ کی طرح سب کچھ 'قدرت' کی مرضی پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا اُس کا خیال تھا کہ مزید ارتقاء بغیر انسانی کوشش کے ناممکن ہے، یعنی یہ کہ موجودہ حالات کو یکلخت بدل دیا جاے' انسان ایک جدید اور مفید تر 'ماحول' پیدا کرے، اور برسوں کے قائم کردہ معیار عمل کو ترک کرکے اُس کی جگہ ایک جدید معیار مقرر کیا جاے، یہ 'معیار عمل' کیا ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ یہ بحث نطاشی کے فلسفہ اخلاق و تمدن سے متعلق ہے اور موجودہ حد نظر سے باہر............ وہ فطرت انسانی کی بے شمار ممکنات سے واقف تھا اور یہ گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ 'ماحول' کے ترحم پر چھوڑ کر اس کے بہا استعداد کو ضائع کر دیا جاے۔ اس غرض سے اُس نے اپنا پیغام لوگوں کو سنایا، اور آخر وقت تک اُن کو اصلاح حال' جد و جہد' اور بہادری کی تلقین کرتا رہا۔

نطاشی کا پیغام صرف ان گنتی کے چند لوگوں کے نام تھا جو عام طور پر عوام الناس کو راستہ دکھاتے یا راستہ سے بہکاتے ہیں۔ خود عوام الناس سے اُسے کوئی بحث نہ تھی اور یہ بھی اُس کے ہردل عزیز نہ ہونے کا ایک بڑا سبب ہے۔

بنتھم (Benthem) نے 'اکثر مفاد بہ اکثر افراد' (Maximum good of the maximum no) کا نعرہ لگایا، اور عوام اس کی اصابت راے کے قائل ہوگئے اسپنسر نے 'کثیر ترین خوشی' (Maximum pleasure) کو حیات انسانی کا مطمح نظر قرار دیا' اور عوام سے سند قبولیت حاصل

کرلی لیکن نطاشی نے اپنا پیغام صرف ان لوگوں سے کہا جو "قیادت" کی صلاحیت رکھتے ہیں، اوراسی وجہ سے عوام نے اُسے "مجنون" اور "شورش پسند" بتلایا، ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے، اور خود نطاشی ہی کے الفاظ میں اس کے پیام کو پیش کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

"اے تنہا رہنے والے انسانو! جاگو، اور میری بات سنو۔ "مستقبل" سے ہوائیں اُڑی ہوی چلی آرہی ہیں۔ اُن کے پروں کی دھیمی دھیمی آواز کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے، گوش حقیقت نیوش کے لئے اس آواز میں مژدہ ہے۔"

اے آج کے دن تنہا رہنے والے افراد انسانی! تم جو آج علٰحدہ علٰحدہ کھڑے ہوے ہو، ایک دن تم ہی بڑھتے بڑھتے ایک پوری آبادی بن جاؤگے۔ تم سے جنھوں نے کہ اپنے آپ کو منتخب کرلیا ہے، منتخب افراد کی ایک اور آبادی ظاہر ہوگی، اور اس آبادی سے "انسان اعلیٰ"۔

معارضہ بر غزل غالب

(از جناب مولوی محمد فخر الدین مدرس سٹی ہائی اسکول)

ہمیں افسوس ہے کہ جناب لمعہ صاحب کا وہ مضمون جو ترقی کے نمبر ۲ و ۳ میں علی الترتیب شائع ہوا تھا، علمی طبقہ میں سخت برہمی کا باعث ہوا۔ نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان کے مشہور اہل قلم نے متعدد خطوط لکھے، جن میں تعجب آمیز استفسار کیا گیا تھا، کہ اڈیٹر' ترقی' نے ایسے عامیانہ اور ناشائستہ مضامین کی اشاعت کس طرح گوارا کی ؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون ایک مشہور و معروف علامہ نے خاص طور پر عنایت فرمایا تھا اور مجبور کن اصرار کے ساتھ خواہش فرمائی تھی کہ اسے فوراً شائع کر دیا جائے۔

افسوس ہے کہ ہم نے ان بزرگوار کی تعمیل ارشاد کی عزت حاصل کرنے کی آرزو میں ترقی کو نہایت ذلیل کیا۔ ترقی کے چوتھے نمبر میں جناب لمعہ صاحب نے پھر توجہ کی اور غالب جیسے مایۂ ناز شاعر سے معارضہ کر بیٹھے، ہمارا خود ارادہ تھا کہ لمعہ صاحب کے مضامین و معارضہ پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ اس عرصہ میں استادی مولوی محمد فخر الدین صاحب نے ہماری ترجمانی کر دی ہم اس بے غرضانہ ادب آموزی کا منت پذیرانہ اعتراف کرتے ہوے حضرت مدظلہم کے ناقدانہ خیالات کی داد دیتے ہیں۔ (مدیر)

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے فلسفیانہ نکات، جنہیں ان کی زندگی کے تجارب و مشاہدات کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے، اب تک اہل بصیرت کے لئے سرمایۂ نصیحت و

متاعِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

عظیم الشان آفتاب کی بیشمار شعاعیں، دنیا پر اپنی ضیا باریوں میں مصروف ہیں، عالم و ما فی العالم منور ہو گیا ہے، اور ہر شئے حسبِ استعداد و قابلیت اکتسابِ نور سے انتفاع پذیر ہو رہی ہے۔

مگر آہ! اسی دُنیا میں ایک ذی روح نوع ایسی بھی ہے، کہ جس کی بینائی کے حق میں، آفتاب مع اپنے بے پایاں روشنی کے بیکار ہی نہیں بلکہ موجب تیرگی و ظلمت ہے۔

غالب کی شاعری کا آفتاب، آسمانِ شعر و سخن پر تابان و درخشاں ہے اور اُس کے الہامی مضامین کی نورانی شعاعوں نے سخن سنجوں کی دماغی فضا کو معمور نور کر دیا ہے۔

مگر آہ اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی بستے ہیں کہ غالب کی شاعری کے اس آفتاب جہانتاب سے ان کی آنکھیں بے نور ہو رہی ہیں اور کلام غالب کے حیرت انگیز شاعرانہ لطائف میں ان عقل کے اندھوں کے نزدیک کچھ بھی لطف نہیں اور قصہ مختصر یہ کہ غالب کی کل سحر طرازیاں ان کے حق میں چشمۂ آفتاب نہیں بلکہ ظلمت کدۂ کثافت ہیں۔

رسالہ "ترقی" کے چوتھے نمبر میں "معارضہ بر غزل غالب" کے عنوان سے کچھ اشعار دکھائی دئے۔ پہلے تو "معارضہ" کے خونخوار لفظ ہی نے چونکا دیا، اور اس کے بعد بہ ہزار ان اشعار کا بغور مطالعہ کیا۔

یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "صاحب معارضہ" کا ناظرین کرام سے تعارف

کرا دیا جاے، مگر افسوس کہ ہم آپ کی عظیم الشان اور مشہور و معروف شخصیت سے اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں کہ آپ کا اسم گرامی نوازش علی صاحب ہے اور چونکہ آپ شاعر بھی ہیں (اور ایسے شاعر کہ غالب اور اُس کے کلام کو ہیچ اور قابلِ اصلاح سمجھکر آپ نے "معارضہ" کی تکلیف گوارا فرمائی ہے) اس لئے لمعہ تخلص فرماتے ہیں۔

اس تعارف کے بعد اب ہم "معارضہ" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل پر جس کا مطلع یہ ہے ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور زندہ رہتے یہی انتظار ہوتا

یہ "معارضہ" نازل ہوا ہے۔

"معارضہ" کی ترتیب اس طرح واقع ہوئی ہے کہ پہلے غالب کا شعر لکھا گیا ہے اور پھر اس کے جواب میں نہیں بلکہ ضد میں حضرت لمعہ نے اپنا شعر پیش کیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ غالب نے جس شعر میں جو مضمون باندھا ہے اس کی ہر طرح اور ہر رنگ میں مخالفت کی جاے۔ ہم اس موقع پر مثال کے طور پر صرف دو شعر نقل کرتے ہیں جس سے یہ مخالفت اور ضد بخوبی منکشف ہو جاے گی۔

غالب کا شعر ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

صاحب معارضہ یعنی حضرت لمعہ اس شعر کی اس طرح مخالفت فرماتے ہیں ؎

یہی عین دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
غم عشق میں کوئی کیا میرا غمگسار ہوتا

غالب کہتے ہیں ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

حضرت لمعہ اس مضمون کی ضد میں یوں گہر فشانی کرتے ہیں ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا جو لہو تو تھم بھی جاتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غرض حضرت غالب کی پوری غزل پر اسی طرح کی مخالفت صرف کی گئی ہے، ہماری سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ آخر اس "معارضہ" کی غرض و غایت کیا تھی۔ کیا اس سے یہ مطلب تھا کہ کلامِ غالب کی تنقیص و تذلیل کی جائے اور اس کے ذریعہ سے اپنی شاعری کو مشہور کیا جائے۔ یا یہ کہ غالب اور ان کے کلام سے حضرت لمعہ کو بغض للّٰہی ہے۔

یہ واضح رہے کہ ہم غالب کو معصوم نہیں خیال کرتے، اور نہ اُن کے کلام کو عیوب واسقام سے بالکل پاک سمجھتے ہیں۔ ہم اس عقیدہ کے بھی مخالف ہیں کہ اب یا آئندہ کوئی شخص غالب کا سا گرانمایہ نہیں پیدا ہو سکتا۔

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس لئے ہم اس "معارضہ" کی یقیناً قدر کرتے اگر غالب کی شاعری سے بہتر کوئی نمونہ پیش کیا جاتا یہ بھی نہ سہی، کم از کم اتنا تو ہوتا کہ حضرت لمعہ کا کوئی شعر، غالب کے کسی شعر کے لگ بھگ ہوتا۔ مگر افسوس کہ "معارضہ" بامعان نظر دیکھنے کے بعد بھی ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔

کیونکہ غالب کے اشعار کی مخالفت میں جس قدر اشعار بہم پہنچائے گئے ہیں ان میں نہ تو کوئی لفظی خوبی ہے اور نہ معنوی لطافت۔

حیاتِ نسلی

(از جناب مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی)

مضمون عنوان بالا کا پہلا حصہ رسالہ "الناظر" جلد ۱۸ نمبر ۲۰۵ مورخہ یکم مارچ ۱۹۱۸ء میں شائع ہو چکا تھا، دوسرا حصہ اڈیٹر صاحب "الناظر" کے شدید مطالبہ کے باوجود قابل مضمون نگار صاحب نے نہیں بھیجا، اور بھیجتے کس طرح وہ تو "ترقی" کے اُفق پر چمکنے والا تھا۔

ہم نے ناظرین کرام کی سہولت کے لئے اس مضمون کے پہلے حصہ کو "الناظر" سے نقل کر کے "ترقی" کے گزشتہ نمبر میں شائع کر دیا تھا، اب دوسرا حصہ نذر کیا جاتا ہے۔

یہ مضمون جس قدر اچھوتا ہے اسی قدر دلچسپ بھی ہے، جانوروں کے مختلف جذبات، ان کے عجیب و غریب اعمال، طریق ماند و بود اور ازدواجی تعلقات جو سراسر مشاہدات پر مبنی ہیں، اس طرح لکھے گئے ہیں کہ دل پر حیرت چھا جاتی ہے۔ بعض نر و مادہ جانوروں کا محبت میں ثابت قدم رہنا، یہاں تک کہ فراق یار میں اپنا کام تمام کر لینا! ہم انسانوں کے لئے بھی بے حد عبرت انگیز اور قابل تقلید ہے۔ بہرکیف جانوروں کے خصائص طبعی اور اسرار نفسی پر نہایت محققانہ بحث کی گئی ہے، پھر شگفتہ بیانی اس پر مستزاد۔

اب جناب سید صاحب کی خدمت میں ہماری یہ عرض ہے کہ وہ "ترقی" کے نئے پودے کو اپنے آبدار مضامین سے اسی طرح سیراب فرماتے رہیں۔ (مدیر)

حیوانات

(۲)

تحفظ نوع جنس حیوانات میں حفاظت نوع کے دو طریقے مشاہدے ہوئے ہیں:-

(۱) نر و مادہ اپنی نسل کی حفاظت سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔

(۲) وہ اپنے بچوں کی پرورش و حفاظت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

صورت اوّل میں مادہ کثرت سے بچے دینے والی ہوتی ہے اور صورت ثانیہ میں بچوں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ ایک موقع پر فطرت کی فیاضی حد اسراف تک پہنچ جاتی ہے اور دوسرے موقعہ پر اس کی احتیاط بخل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

کاڈ مچھلی سال میں دس لاکھ انڈے دیتی ہے لیکن اسے ان کی حفاظت کا مطلق احساس نہیں ہوتا اس وجہ سے ان کا دس ہزار واں حصّہ زندہ بچتا ہے برخلاف اس کے فاختہ، یا قمری صرف دو انڈے دیتی ہے اور اس کے دونوں بچے زندہ رہتے ہیں۔

بہرحال تحفظ نوع دو طریقوں سے ہوتا ہے، کثیرالاولادی یا بچوں کی غیر معمولی خبرگیری، نوع انسان کی حفاظت بھی اسی کلیہ کے تابع ہے، وحشی اور متمدن اقوام میں بھی یہی دونوں کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

انسانوں میں جس طرح زن و شو کے تعلقات ترقی کر کے بالآخر ازدواج اور خاندان کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جس کے بعد بچوں کی پرورش و حفاظت کے مشاغل میں دونوں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں بالکل یہی حالت حیوانوں کی ہے۔ نر و مادہ کے باہمی فرائض یکساں نہیں ہوتے، عام طور پر مادہ کے مقابل میں نر اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت میں کم حصّہ لیتا ہے، حیوانات کے صرف اعلیٰ طبقہ میں نر حقیقی طور پر خاندان کے رکن رکین کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس صورت میں بھی چند پرندوں کی قسموں کو چھوڑ کر اس کا اصلی فریضۂ پرورش اولاد کے بجائے یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ بچوں کو اپنے داب میں رکھے بالعموم اسکی حیثیت ایک ایسے مطلق العنان سردار کی ہوتی ہے جس کی متعدد حرم ہوں اور جسے عند الحاجت اپنی کم سن اولاد پر بھی تصرف کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

انسانوں کی طرح حیوانات میں بھی خاندان کی بنیاد اُمیّت (۱) یا ابویت (۲) پر قائم

---

(۱) Matriarchal　　(۲) patriarchal

ہوتی ہے، علیٰ ہذا وحشی اقوام کی اس رسم سے لے کر جس میں کل عورتیں کل مردوں کی ملک ہوتی ہیں، ایک جوڑے پر اکتفا کرنے کے تمام مدارج حیوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

تحفظ نسل ہم اس موقعہ پر اُن پست درجہ کے جانداروں سے قطع نظر کرتے ہیں جو اپنی ہست و بود سے بے خبر یا اپنی نسل کے بقا و فنا کے احساس سے عاری معلوم ہوتے ہیں اور جن کے انڈے درختوں کے تخم کی طرح پراگندہ اور غیر محفوظ حالت میں پائے جاتے ہیں، ان سے ایک درجہ اوپر کی مخلوق اپنے انڈوں کی حفاظت کے فرض کو کما بیش ادا کرتی ہے بعض جانور انڈوں کے حلقے بنا کر اُن کو اپنے جسم سے لپٹائے رکھتے ہیں۔ گھونگے اپنے انڈوں کو اکثر خنک مقامات یا درختوں کی کھوہیں جمع کرتے ہیں، ایک قسم کا دریائی جانور (۱) اپنے انڈوں کی ایک جگہ تذخیر کر کے صرف کھُلنے تک اُن کی نگہداشت کرتے ہیں اس کے بعد وہ ان کی طرف سے بالکل غافل ہوجاتے ہیں۔ مکڑیاں اپنے انڈوں کی حفاظت میں بہت مبالغہ کرتی ہیں، دوسرے حشرات کے نر کی طرح مکڑی کا نر بھی اپنے بچوں کی طرف مطلق التفات نہیں کرتا، اور ان کی پرورش و نگہداشت مادہ ہی کے ذمہ ہوتی ہے، مکڑی انڈے دینے کے بعد اُن کی حفاظت کے واسطے ایک جالدار گیند تیار کرتی ہے جس میں وہ ملفوف ہوتے ہیں، یہ گیند ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے، جب ان کی پیدائش کا وقت قریب آتا ہے تو مکڑی اس جالدار غلاف میں سے یکے بعد دیگرے ایک ایک بچہ کو باہر چھوڑتی جاتی ہے۔

کیڑے پتنگوں کے مادہ میں پیش بینی کی صفت عجیب وغریب طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے، وہ اپنے ان بچوں کے لئے جن کے دیدار سے وہ اُسی طرح محروم رہتی ہے جس طرح کہ اُس کی ماں نے اُسے نہیں دیکھا تھا، ایک خاص قسم کی غذا جو خود اس کی خوراک سے مختلف ہوتی ہے، انڈوں کے ساتھ سوراخوں میں ذخیرہ کرجاتی ہے تاکہ پیدائش کے بعد

---

(۱) Cephalopods

یہ اُس وقت تک ان بچوں کے کام آئے جب تک کہ وہ خود اپنی غذا بہم پہنچانے کے قابل نہ ہوں۔
شہد کی مکھی اور چیونٹیوں میں پرورش اولاد کا جذبہ بہت قوی ہوتا ہے، یہ حالت صرف انہی کی نسل تک محدود نہیں ہوتی بلکہ عام طور پر اپنی صنف کے تمام بچوں کی پرورش اُن کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے اُسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم اُن میں ایثار ذاتی اور باہمی اعانت کی کیفیت مشاہدہ کرتے ہیں۔

مچھلیوں میں بھی اپنی نسل کے تحفظ کا خیال ہوتا ہے، دریائی بچھڑا (۱) اپنی مادہ کے انڈوں کو ایک تھیلی میں محفوظ رکھتا ہے اور بیسیوں مچھلیوں کو اپنے منہ کے گوشہ میں دبا کر اُن کے لئے غذا فراہم کرتا ہے۔ سامن اور ٹروٹ ریت میں سوراخ کرکے اپنے انڈوں کو محفوظ کر دیتی ہے۔ حشرات الارض میں بھی انڈوں کی حفاظت اور ان کے حمل و نقل میں نر مادہ کی اعانت کرتا ہے۔ ناگ سانپ اپنے انڈوں کی حفاظت میں بڑا دلیر ثابت ہوا ہے۔ مگر کی مادہ سایہ کی طرح اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

ارتباط مرد و زن کے طریقوں یا گھرانا و جماعت بنانے کی حیثیتوں کے لحاظ سے ذات الثدیا (۲) اور پرندوں کے حالات انسانوں سے خاص طور پر ملتے جلتے ہیں۔ ان میں عادات و ضروریات زندگی کو جملہ امور پر ترجیح دی جاتی ہے اور اُن کے حصول کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

انسانوں کی طرح پرندوں میں بھی، ایک ٹولی کی تمام مادہ کل نروں کی ملک (۳) منتشر (۴) یا مستفرد (۵) ہوتی ہیں، جماعت یا گھرانا بنا کر رہنے کے خیالات میں بھی اُن کی حالت غیر مساوی طور پر پائی جاتی ہے، اور تزویج کے طریقے بھی اُن کی طرز زندگی کے لحاظ سے

---

۱ Seahorse
۲ Mammals
۳ Promiscuous
۴ Polygamous
۵ monogamous

بدلتے رہتے ہیں۔ جنگلی بط، وحشیانہ حالت میں سختی کے ساتھ مستفرد (ایک مادہ کی پابند) ہوتی ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہی حد درجہ عیاش ہو جاتی ہے۔ چینی مرغی کا بھی یہی حال مشاہدہ میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مدنیت بعض انسانوں کی طرح حیوانات میں بھی تخریب اخلاق کا باعث ہوتی ہے۔ جو جانور ٹولیاں بنا کر رہنے لگتے ہیں وہ بالعموم پابند اور منضبط زندگی سے متجاوز ہو کر بتدریج تعدد ازدواج کے خوگر ہو جاتے ہیں یہ بھی مشاہدہ میں آیا ہے کہ ایسے جانور تناسل کے زمانہ میں جوڑوں کے انتخاب کے بعد اپنی اپنی مادہ کو لیکر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی سے اُنہیں نفرت سی ہو گئی ہے۔

پرندوں کی اجتماعی زندگی میں گوناگوں کیفیتوں کا مشاہدہ بغایت دلچسپ ہوتا ہے، اس بارہ میں ان کے پرجوش طرز آشنائی اور دلکش طریقہائے اختلاط، سے ہم بہت کچھ سبق آموز نتائج استنباط کر سکتے ہیں۔ بعض پرندے اس قدر متلوّن اور عشرت دوست ہوتے ہیں کہ ہر روز ایک نئی مادہ سے رشتہ جوڑنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں، چنانچہ امریکہ کے تلیروں (۱) کا یہی حال ہے کہ اُن کی ٹولی کی جتنی مادہ ہوتی ہیں وہ جملہ نروں کے لئے وقف ہوتی ہیں۔ اس کی نظیر ہم کو غیر متمدن انسانی جماعتوں مثلاً امریکہ کی بعض وحشی اقوام میں ملتی ہے، جن میں کنبہ کی تمام عورتیں بلا لحاظ محارم مردوں کے لئے جائز سمجھی جاتی ہیں۔

بہت سے جانور جو ظاہر ا مستفرد معلوم ہوتے ہیں اُن کے تعلقات ایک سے زائد مادہ سے پائے جاتے ہیں۔ یہی حال بعض اعلیٰ درجہ کی متمدن انسانی جماعتوں کا ہے جو مستفرد ہونے کے مدعی تو ہوتے ہیں لیکن، چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔

پرندوں میں اس قسم کے تعدد ازدواج کی مثال ہم کو مرغ اہلی / میں ملتی ہے جو خود نما اور

---

(۱) Starling

عیاش ہونے کے ساتھ، منچلا اور پُررشک بھی ہوتا ہے۔ مرغ وحشی، میں مستکثر ہونے کے باوجود حد درجہ کی گرمجوشی پائی جاتی ہے، اس جذبہ کے غلبہ کے وقت بندوق کی آواز بھی اُس کو حوض میں لانے میں کارگر نہیں ہوتی، بلکہ وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہوکر اعمال تسخیر مطلوب میں منہمک رہتا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس وابستگی کے باوجود وہ تلون مزاجی سے بھی باز نہیں آتا، بلکہ ہر مرتبہ کسی نئی مادہ کا متلاشی اور معشوق نو کا طالب رہتا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پرندوں میں اس قسم کے تلون اور آشفتہ سری کی مثالیں زیادہ نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ علی العموم ایک ہی مادہ کے پابند ہوتے ہیں اور حقیقتاً اس معاملۂ خاص میں پرندوں کی استقامت طبع حضرت انسان کے لئے ایک ایسا نمونہ ہے جس کی تقلید ہونی چاہیئے۔

گدھ ایک ہی مادہ کا سختی کے ساتھ پابند ہوتا ہے، عقاب مدۃ العمر اپنی مادہ کا حلقہ بگوش رہتا ہے، اس کے باہمی تعلقات جانبین میں کسی ایک کی وفات تک فرق نہیں آنے پاتا۔ سنہری پروں والے عقاب کا جوڑہ آپس میں اس قدر مانوس ہوتا ہے کہ مدتہائے دراز تک وہ اپنی جائے رہائش کو بھی تبدیل نہیں کرتا۔ شہر الی نائی (۱) کے طوطے کی مادہ کے حق میں بیوگی، پیغام موت ہے۔ جب چند سال کی یکجائی کے بعد طوطا مرجاتا ہے تو اس کی رفیقۂ حیات اُس کے سوگ میں ایک ہی مہینہ کے اندر راندر رجان سے گذر جاتی ہے۔ عشق صحیح کی ایسی پاکیزہ نظیر، فی زماننا دنیا کی اشرف و محترم ہستی بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

فاختہ اور کٹھ پھوڑے کا سنہری جوڑہ (۲) کامل اتحاد کے ساتھ بسر کرتا ہے، احیاناً ان میں سے کوئی مرجائے تو مدتوں ایک دوسرے کا سوگ رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ کٹھ پھوڑے نے اپنی مادہ کو مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اس کے بعد مدتوں وہ اپنی چونچ اُس

۱؎ Illinois
۲؎ Golden woodpecker

اُس میں درختوں سے ٹکراتا رہا کہ شاید ان صداؤں کو سن کر اُس کی مادہ واپس آجائے گی، جب وہ اُس کی طرف سے بالکل مایوس ہوا تو دفعتاً خاموش ہوگیا، مگر اس کی پژمردگی عمر بھر نہ گئی۔

ان مثالوں سے اگرچہ پرندوں کی باعفت زندگی کا قطعی ثبوت ہوتا ہے لیکن جس طرح انسان بے قاعدہ اور اطاعت نفس کی زندگی بسر کرتا ہے پرندے بھی اس قسم کے نظائر سے خالی نہیں ہیں، اور نر یا مادہ کے مر جانے کے بعد نئے جوڑے کی تلاش میں انسانوں کی طرح پرندے بھی بہت مضطرب الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ مینا، شکرا، نیل کنٹھ اور تلیر میں جو ایک ہی جوڑے کے پابند ہوتے ہیں، یہ خواہش انسانوں کے بہت مشابہ ہوتی ہے۔

بعض پرندے اپنی فطرت کے خلاف غیر جنس کی طرف بھی مائل پائے گئے ہیں، چنانچہ راج ہنس، ہنس سے اور سیاہ مرغ، تدرو سے سرگرم اختلاط دیکھے گئے ہیں۔ ایک جنگلی بط کا حال بیان کیا جاتا ہے جو اپنے نر کو چھوڑ کر ایک غیر جنس کے آبی پرندہ سے اس قدر مانوس ہوگئی تھی کہ اُس سے سات آٹھ بچے ہوگئے، مگر جذبات حیوانی کے تسلط کی یہ ایسی مثالیں ہیں جن سے حضرت انسان، باایںہمہ علو شان خالی نہیں ہیں، اور ان واقعات سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حیوانات کی فطرت، انسانی حالات سے زیادہ متفاوت و متغائر نہیں ہے اور ان کے باہمی تقابل سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے، اُن میں ہماری عبرت و بصیرت کے اکثر راز پنہاں ہیں۔ جو لوگ فطرت انسانی کے نبض شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی مثالیں شاذ نہیں ہیں جن سے مزاجوں کا تلون اور طبیعتوں کی تغیر پسندی عیاں ہوتی ہو، مردوں کی وضعداری کمزور عورتوں کے حصن خودداری کی بارہا قلعہ کشا ثابت ہوتی ہے یا چشم و زباں کا جادو سادہ لوح عورتوں کے سر پر چڑھ کر نہیں بولتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

جانوروں میں کنبہ کا خیال حیوانات میں کنبہ بنا کر رہنے کے طریقے، نر و مادہ کے باہمی ارتباط

سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور کرنے سے ہم کو اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں انسان کو کنبہ یا خاندان بناکر زندگی بسر کرنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔

جانوروں میں خاندان کا مدار ماں پر ہوتا ہے، انڈے دینے کے بعد اُس پر مدہوشی کی سی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ایک جگہ جم کر بیٹھے رہنے کی عادت سے اُس میں شفقت و رعایت کی بہت سی خوبیاں ودیعت ہو جاتی ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں جبکہ جرمنی، پیرس پر گولہ باری کر رہا تھا، ایک شیل ایسے مقام کے قریب آکر پھٹا جہاں ایک کبوتری انڈے سے رہی تھی، لیکن اس دھماکے سے کم و بیش متاثر ہونے کے بجائے وہ برابر جمی بیٹھی رہی اور اُس کی وضع سے یہ عیاں ہوتا تھا کہ وہ ایک نہایت دلپسند شغل میں منہمک ہے۔ جانوروں میں مل جل کر رہنے کا خیال پرندوں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں بھی نر اپنے بچوں کی نگہداشت میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ فیل مرغ تو یہ ستم کرتا ہے کہ اپنی مادہ کے انڈے نگل جاتا ہے اس لئے وہ بیچاری انڈوں کو کسی محفوظ مقام میں چھپا رکھنے پر مجبور ہوتی ہے، اس کے علاوہ کہن سال فیل مرغ اپنے چھوٹے بچوں کو سروں پر چونچیں مار مار کر ہلاک کر دیتا ہے، اس لئے بچوں کی حفاظت ان میں اس طرح کی جاتی ہے کہ چالیس پچاس مرغیاں ملکر اپنی ایک ٹولی بناتی ہیں اور ہر وقت بچوں کو اپنے جتھے میں اُس وقت تک لئے پھرتی ہیں کہ وہ اپنی آپ حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں۔ اہلی مرغ یا تدرو انڈے سینے یا بچوں کی پرورش سے بالکل بے تعلق رہتے ہیں، جس وقت اُن کی مادہ ان صبر آزما فرائض میں مصروف ہوتی ہے وہ باہر کی مرغیوں سے اپنے آتش شوق کو بجھانے میں مشغول رہتے ہیں، لیکن بچوں کے بڑھ جانے کے بعد وہ پھر ان پر حق پدری جتانے کے لئے واپس آجاتے ہیں۔

بعض پرندوں میں نر، مستکثر ہونے کی وجہ سے محبت پدری کی صفت سے عاری ہوتے ہیں، مگر ایک بات ضرور ہے کہ ظالم باپ پرندوں میں شاذ ہیں، بلکہ ایسے نظایر کی

کمی نہیں ہے جن میں نر اپنے بچوں کے ساتھ الفت و شفقت کے اظہار میں اپنی مادہ سے بازی لے جاتے ہیں۔ جب مادہ انڈے سیتی ہے تو نر اُس کی پاسبانی کرتا اور غذا بہم پہنچاتا ہے۔ بعض وقت نر اپنے انڈوں کو خود بھی سینے لگتا ہے، چنانچہ کبوتر ان ایام میں مادہ کی غذا کا ہر طرح کفیل ہوتا ہے۔ کینڈا کے قاز اور کوتے بھی یہی کرتے ہیں، بلکہ کوّا مادہ کے ستا لینے کی خاطر خود انڈوں پر کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ سیاہ بگلہ اور گدھ کے نر و مادہ متفقہ طور پر باری باری سے انڈے سیتے ہیں اور جو خالی ہوتا ہے وہ دوسرے کی غذا بہم کرتا ہے۔

بعض پرندوں میں اولاد کی محبت کا جذبہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا، جب بچے اپنی آپ خبرگیری کے قابل ہو جاتے ہیں تو اُن میں یہ منظر تعجب انگیز ہوتا ہے کہ وہی ماں باپ جو کل تک ان کی پرورش و پرداخت میں مبالغہ کیا کرتے تھے اب چونچیں مار مار کر اُنھیں اپنے پاس سے ہنکا دیتے ہیں۔ بعض پرندے بچوں کو اپنے سے جدا کرنے کے قبل فن پرواز کی تعلیم دیدیتے ہیں، قاز اور بط اپنے بچوں کو پیرنا بھی سکھلاتے ہیں۔

پرند و چرند میں جمعیت کے ساتھ بسر کرنے کا زمانہ عموماً محدود ہوتا ہے، صرف اہلی مرغ کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی اولاد منجملہ چند مرغیوں کے اپنے زیر تصرف رکھ لیتا ہے۔ پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد مادری یا پدری تعلقات اُن میں مفقود ہو جاتے ہیں جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ماں باپ اپنے اور غیر کے بچوں میں کوئی امتیاز بھی باقی نہیں رکھتے یہی بات اُن جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے جو مستفرد ہوتے ہیں۔ بس ایک مادہ کی پابندی کی حد تک تو وہ مستقیم الارادہ ثابت ہوتے ہیں لیکن خاندان عارضی، اور ہر جھول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت بعض غیر متمدن انسانوں کی بھی ہے اگر معاشرت انسانی کی مختلف کیفیات کا استقصا کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنس حیوانات کے متعلقات کو تمام کرلیں۔۔۔

تعلقات زوجیت کے استحکام کی حد تک ہم صنف ذات الثدی کو جو نوع انسان سے قریب تر ہے، پرندوں پر فوقیت نہیں دے سکتے اس لئے کہ ان میں تمام مادہ انڈوں کے لئے وقف ہونے کی وجہ سے، سرسری ملاقاتوں میں بھی نر و مادہ اختلاط کے عادی ہوجاتے ہیں، لیکن یہ اتفاقیہ ملاقاتیں آئندہ تعلقات کے قیام یا خواہش اولاد سے بالکل عاری ہوتی ہیں، چونکہ ان کی مادہ نر کے مقابلہ میں فطری طور پر کمزور رہوتی ہے اس لئے کثرت البعول (۱) یا ایتیت کی صورتوں کے واقع ہونے کا ان میں بالکل امکان نہیں ہوتا، یعنی ان کی مادہ با وصف کوشش و خواہش کے نروں کو اپنے لئے جمع نہیں کرسکتیں البتہ ان کے نر عام طور پر مستکثر ہوتے ہیں اس لئے کہ بقائے نوع کے لئے انہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

مل جل کر رہنے کی احتیاج کمزوری کا نتیجہ ہے، جو جانور مقابلہ کے لئے کافی طور پر مسلح نہیں ہوتے، یا جنھیں غذا صعوبات کے بغیر میسر نہیں آسکتی ہے وہ جریدہ رہنے کے بجائے مل جل کر رہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں، بعض گوشت خوار جانور جن کے دانت اور پنجے مضبوط نہیں ہوتے مثلاً لومڑی اور کتے، اسی وجہ سے ٹولیاں بنا کر رہنے کے عادی ہوتے ہیں کہ معقول تعداد کے ساتھ حریف کے مقابل ہوسکیں۔ لاریب یہ طرز زندگی اکثر عمرانی و تمدنی خوبیوں کے پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے، اس سے شقاوت طبع میں بسا اوقات تخفیف ہوجاتی ہے، لیکن عام طور پر نر و مادہ کے باہمی میل جول میں آزادی کے باعث اس طرز معیشت سے مادہ کے صالحہ یا نر کے مستغفر رہنے یعنی فسق و فجور سے باز رہنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ذات الثدی بالعموم مستکثر ہوتے ہیں۔

جگالی کرنے والے جانور بھی ٹولیاں بنا کر رہتے ہیں اور ان میں ایک نر کے تحت متعدد مادہ ہوتی ہیں۔ یہ نر ان سب کا محافظ اور سردار سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جنگلوں کا مست ہاتھی تجرد کی زندگی (جو نر آور جانور اکثر اختیار کرتے ہیں) کو خیرباد کہنے کے بعد اپنے لئے

---

(۱) Polyandry یعنی ایک مادہ کا متعدد نروں سے متعلق رہنا۔

مخصوص طور پر ہتھنیوں کی ایک مختصر سی جماعت بنا لیتا ہے جس میں کمزور ہاتھی داخل نہیں ہونے پاتے۔ ایشیا کا بارہ سنگھا بھی عادتاً مستکثر ہوتا ہے وہ اپنی مادہ کی جماعت میں، جو اکثر ایک سو پر منتہی ہوتی ہے، کسی دوسرے نر کے آنے کا روادار نہیں ہوتا۔

جانور مستکثر ہونے کے باوجود ان کی مادہ اپنے نر کے ساتھ الفت اور وفاداری کے جذبات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتیں۔ جنوبی امریکہ کے اونٹوں میں یہ صفت خاص طور پر نمایاں ہے، اگر نر زخمی ہو جاتا ہے تو اونٹنیوں کی جماعت راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے نر کی تیمارداری میں مصروف ہونے کے علاوہ خود شکاری کے سامنے ہو جاتی ہیں تاکہ نر کی جان بچ جائے۔ لیکن جب مادہ زخمی ہو جاتی ہے تو اُسے زخمی چھوڑ کر اونٹ اپنی جماعت کو لے کر وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ گوشت خوار جانوروں میں جنوبی افریقہ کا ببر، تین چار مادہ پر متصرف رہتا ہے لیکن ریچھ اور بجو ایک مادہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ بندر، گوریلا اور لنگوروں میں بھی مختلف عادتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض مستفرد اور بیشتر مستکثر ہوتے ہیں۔ ان میں نر بچے بڑھنے کے بعد ہی ٹولی سے نکال دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس جماعت کا نر جب زیادہ ضعیف ہو جاتا ہے تو دوسرے جوان نر اور مادہ ملکر اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

جنس حیوانات کے ازدواجی تعلقات اور کنبہ بنا کر بسر کرنے کے طریقوں کے سراغ سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس مادہ میں انسانی طرزِ زندگی کو حیوانات کے طرزِ ماند و بود پر غور کرنے سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ازدواجی زندگی کو مختلف طریقوں سے بسر کرنے سے اُن کا مطمحِ نظر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ بقائے نوع کا سلسلہ برقرار رہے۔ کنبہ کی بنیاد ان میں اکثر ابوتیت (۱) اور بیشتر اُمیت (۲) کے اصول پر مبنی ہے۔ آخر الذکر صورت میں مادہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور بچوں کے ساتھ جو محبت اُس کو ہوتی ہے اُس کا درجہ

---

(1) Patriarchal
(۲) Matriarchal

نر کی محبت سے بمدارج بڑھا ہوا ہوتا ہے اور یہ نیتجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جانوروں میں ازدواجی تعلقات کا خیال کنبہ بناکر رہنے کے مقصد پر قائم ہے اسواسطے کہ اس سے بقاے نوع کی غرض بوجہ احسن پوری ہو جاتی ہے۔ جانوروں میں موقت تعلقات کے ساتھ دوامی تعلق کا وجود بھی پایا گیا ہے آخری صورت پرندوں میں زیادہ استحکام کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ کثرت البعول کی رسم جانوروں میں عادتاً نہیں پائی جاتی ہے بلکہ جانور مستکثر ہوتے ہیں اور یہ بات بھی ذات الثدایا میں زیادہ عام ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس صنف میں مادہ کی تعداد نر کے مقابلہ میں ازروے پیدائش زیادہ ہوتی ہے اور نروں میں اموات بہت واقع ہوتی ہیں۔

بے ہشیاری باشد، بکار خویش دیوانہ

(از حضرت کیفی حیدرآبادی (رحمہ اللہ تعالیٰ))

صراحی، در بغل۔ ساغر، بکف۔ در دست، پیمانہ
سوالِ مے بلب۔ گردیم میخانہ، بمیخانہ

وصال یار، گر خواہی؟ بشوہاز خویش بیگانہ
بنال اے چشم! چوں بلبل۔ بسوز اے دل! چو پروانہ

سرم باسنگ، در چشم بخاک راہ تو، سازد
ہمایوں، چشم را سرمہ۔ مبارک، زلف را شانہ

دل از اغیار، خالی کن! چو خواہی یار در آغوش
گرفتہ صورت کعبہ، چو شد بشکستہ بتخانہ

رسیدن، تا برد در دمنداں، لذتے دارد
سخنہاے نصیحت را، پندارید افسانہ

نہ ترسیدم، ز خار راہ و آفت ہاے گوناگوں
رسیدم، تا در جاناں۔ باستقلال مردانہ

بدیں خوبی و رعنائی، ستگرا از کجا آئی؟
قدم، لغزیدہ لغزیدہ۔ نگہ، مستانہ مستانہ

بصحرا می کند مجنوں، تلاشِ ناقۂ لیلی
بے ہشیاری باشد، بکار خویش دیوانہ

نہ ترسیم قاضی و مفتی، نہ بیم محتسب کیفی!
مزاج لاابالی، نیز دارم طبع رندانہ

حیات تمدن

حصہ اول

عہد سلف

(گذشتہ سے پیوستہ)

بحری راستہ | جس چیز نے ملتان کو قاہرہ سے وابستہ کر دیا، وہ بحری راستہ ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ عربوں کا تجارتی اثر، جہازوں کے ذریعہ سے سواحل ہند پر بڑھتا جا رہا تھا، حجاج کے زمانہ میں منجنیق جہازوں کے ذریعہ سے ہی دیبل لائے گئے تھے۔ اسی راستہ سے ہر مذہبی یا سیاسی تحریک کا اثر بھی سواحل ہند پر بآسانی پہنچ جاتا۔ بلکہ بسا اوقات خلافت یا حکومت کے پنجہ سے نجات پانے کے لئے سواحل ہند کے دامن کھلے ہوئے تھے (جیسے پناہ گیران راجہ داہر)۔

چنانچہ منصور کے وقت بنی علیؑ کی جو تحریک ہوئی اس میں عبداللہ اشتر بن محمدؒ اسی راستہ سے سندھ میں آئے، اور ایک ہندو راجہ کے پاس مہمان رہے۔ اگرچہ خلافت کی اس وقت کی زبردست طاقت سے آخر اشتر نے بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح جواں مردانہ جان دی، لیکن اس طور سے زیدیت جو بقول مولوی عبدالحلیم صاحب شرر دنیا میں شیعیت کا پہلا فارم تھا، سندھ میں قائم ہو گئی۔

اصل یہ ہے کہ عربوں کی بحری و تجارتی تاریخ بالکل تاریکی میں ہے، حالانکہ وہ ان کی سیاسی تاریخ سے نتائج میں بڑھی ہوئی ہے۔ اگر توفیق ربانی مساعد ہوئی تو ان شاء اللہ المستعان بہت جلد وہ روشنی میں لائی جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ سمندر مصر و عرب سے چین تک عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ان تمام ممالک کی باہمی اور ان کے ذریعہ سے یورپ و افریقہ کی تجارت کے مالک ہیں۔ اگرچہ اس وقت اسلامی دنیا میں تمام برانداز میدان سیاست و کارزار ہے

الگ خدمت مذہب وعلم میں وقف ہیں اور اس اثر کے سامنے وہ ترک خوں آشام تلوار بھی جو خلفاء کو اجل کے گھاٹ اُتارتیں اور سر تسلیم خم کرتی ہیں تو انہی طرح سیکڑوں شیوخ تبلیغی دھن میں پرخطر سمندر کے راستہ اور پرامن تجارتی طریقہ سے حواریان حضرت مسیح اور منادیان بودھ کی طرح ان سے بدرجہا زیادہ زبردست کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اسی راستہ سے چین میں مسلمانوں کی کثیر آبادی اصلی باشندوں کا جزو بن جاتی ہے۔ جزائر بحر ہند اور ہندوستان کے تمام ساحل پر عرب ہی تجارت کے مالک ہیں۔ ہندو راجاؤں کے زیر حمایت وہ مسجدیں بناتے اور تبلیغی کام انجام دیتے ہیں جس میں ذات کی تفریق ان کی بڑی معاون تھی۔ سواحل پر اسلامی آبادی کی حالت سندھ سے بھی بڑھی ہوی ہے۔ اور بقول پروفیسر آرنلڈ" اس میں ہرگز شبہ نہیں کہ ہندوستان میں اسلام کو اپنی اشاعت میں بڑی اور مستقل کامیابی ایسے اوقات اور مقامات پر ہوی ہے جہاں مسلمانوں کی سیاسی طاقت بہت ہی ضعیف تھی" یہ اثر ایسا زبردست ہے کہ مابعد ترک ومغل فرماں روایان ہند کی صدیوں کی حکومت اس کی نظیر سے خالی ہے۔ غرض اسمٰعیلیہ نے بحری راستہ سے سواحل ہند میں اپنا مستقل اثر پیدا کرلیا۔ مصر کی حکمرانی نے بلحاظ اپنے موقع کے تمام دنیا کی تجارت پر اسمٰعیلیہ کو اقتدار دیدیا تھا جیسا کہ لی بان نے تصریح کی ہے۔ اور یہی ان کی حیرت انگیز ثروت کا بڑا ذریعہ تھا لیکن اسمٰعیلیہ کا یہ اثر ساحل گجرات تک محدود رہا اس سے آگے سواحل ملیبار وکارومنڈل اسمٰعیلیت سے پاک اور قدیم پرانے اسلامی عام جماعتی اصول پر برقرار رہے جیسا کہ اس وقت تک بھی وہی حالت برقرار ہے۔

خاندان سبکتگین | ولولا دفع الناس بعضھم ببعض کے اصول کے مطابق جب بنی بویہ کا ستارہ اوج اقبال پر تھا تو ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ آل سامان میں جب معمولی اسباب ضعف پیدا ہونے لگے تو اسی دربار کے ایک ترک غلام الپتگین نے غزنی میں اپنا دربار الگ جمایا اسی الپتگین کا غلام سبکتگین تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ

وہ[۱] یزدگرد آخری تاجدار ایران کی نسل سے تھا اور حوادث زمانہ کے ہاتھوں ترک غلام بنکر الپتگین کے ہاتھ بکا۔ اسلام کے اصول مساوات اور سوسائٹی کے عام معاشرت کی بدولت وہ اپنے آقا کا داماد بنگیا۔ اور جب آقا کا بیٹا دو سال کی حکومت کے بعد مرگیا تو سبکتگین فرماں روائے غزنی تھا (۳۶۷ھ) یہی نامور سبکتگیں اور اس نامور باپ کا نامور بیٹا محمود ہندوستان کی تاریخ میں انقلاب حکومت اسلامی کے بانی بنتے ہیں۔ سبکتگیں باہمی نزاعوں کی خار دار جھاڑی میں اُلجھنے کے عوض مہلب کے نقش قدم پر پنجاب کا رخ کرتا ہے۔ ۳۶۷ھ جس کی چھیڑ خود جے پال نے کی تھی اور اپنی تازہ ہمت ترک وافغان فوجوں سے ہندوستان کی فوجوں پر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

ھند پر پیشقدمی | بنی اُمیہ کے بعد ہندوستان میں پیشقدمی کا جو سلسلہ باہمی نزاعوں کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ایک زبردست طاقت ہندوستان کی سرحد پر قائم ہو جانے سے اب اس کی تکرہ جاری کرنے کا موقع آگیا لیکن دونوں کی حالت میں ڈھائی سو برس کا ممتد زمانہ گذر جانے کے بعد جو فرق پیدا ہو گیا ہے اس کا خلاصہ اس طور پر کیا جاسکتا ہے۔

پہلی پیشقدمی کے وقت سپہ سالار اور حملہ آور فوج کا بڑا حصہ عربی النسل ہے جو نبی عربی علیہ السلام کی زبان بولنے والی ہے۔ خیر القرون کا زمانہ قریب ہی تھا جس کی وجہ سے دینی اصول و ہدایات تازہ تھے اجتہاد آسان ہے۔ عیاشی نے زیادہ گہرا رنگ نہیں جمایا تھا۔ دربار خلافت بھی عربی تھا دمشق سے ہند تک ایک ہی قلمرو ہے۔ سپہ سالار احکام ویسرائے کا اور ویسرائے احکام خلافت کا پابند ہے۔ ڈھائی سو برس کے بعد اب یہ فرق ہے کہ دربار خلافت عقیدت مذہبی کی بنا پر قائم ہے۔ نسل بنی عباس اور عرب اقتدار حکومت سے عاری ہیں۔ دیوانی اقتدار ایرانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ علمی و مذہبی حلقوں میں بھی ایرانی اور ترکی غالب ہیں۔ (باقی آئندہ)۔ **مرتضیٰ**

---

[۱] فرشتہ بحوالہ تاریخ منہاج السراج جرجانی۔

تضمین بر مثنوی حضرت جامیؒ

(از جناب مولوی سید احمد حسین صاحب امجد)

رگوں میں خون کی جا بھر گیا غم بنا ہے قد سراپا نخل ماتم
غم دوری سے لب پر آگیا دم بس اب بچتے نظر آتے نہیں ہم

ز مہجوری برآمد جان عالم

ترحم یا نبی اللہ ترحم

کبھی غم ہے کبھی درد جگر ہے عجب حالت مری شام و سحر ہے
مری زحمت سے تو کیوں بے خبر ہے مری آہ سحر کیوں بے اثر ہے

نہ آخر رحمۃ اللعالمینی

ز محروماں چرا فارغ نشینی

دو عالم سے دوئی بالکل مٹا دے مرے ساقی مئے وحدت پلا دے
اٹھا دے میم کا پردہ اٹھا دے احد کی شکل احمد میں دکھا دے

بروں آور سر از برد یمانی

کہ روئے تست صبح زندگانی

دکھا دے آج شان حسن مستور نہ خالی جائے سحر چشم مخمور
ذرا بن ٹھن کے لے نورٌ علیٰ نور خدا ہے آج ناظر، اور تو منظور

بہ تن در پوش عنبر بوئے جامہ

بہ سر بر بند کافوری عمامہ

صدا ہر ذرہ کی صلّ علیٰ ہے شب معراج ہنگامہ بپا ہے
برآمد ہوں حضور، اب دیر کیا ہے خدائے پاک مشتاق لقا ہے

ادیم طائفی نعلین پا کن
شراک از رشتۂ جاں ہائے ما کن

تری جویا ہے میری چشم تر، آ
ادھر ہی سے ہے تیری رہگزر، آ

ادھر آ، میں ترے قرباں ادھر آ
مری آنکھوں سے تو دل میں اُتر آ

ز حجرہ پائے در صحن حرم نہ
بفرق خاک رہ بوساں قدم نہ

مری بگڑی ہوی قسمت بنادے
دکھا دے شان رحمت کی دکھادے

مجھے قعر ذلت سے اُٹھادے
اذل خلق کو امجد بنادے

بدہ دستے ز پا افتادگاں را
بکن دلداری دلدادگاں را

رُباعی

قرباں ہے تجھ پہ میری جاں بھی آجا
ہے چشم برہ، یہ ناتواں بھی آجا
میں بھی ترا منتظر ہوں اک مدت سے
اللہ کے پاس ہو کے، یاں بھی آجا

نذر سالگرہ مبارک

(از جناب مولوی سید عمر ابوطالب صاحب شمس)

چمن چمن ہے عروس چمن پہ آج نکھار
ہر ایک پھول شگفتہ ہے زور پر ہے بہار

نسیم صبح کے مستانہ وار جھونکوں سے
پرندگانِ چمن خواب سے ہوئے بیدار

دھلا کے دایۂ ابر بہار نے رخ گل
گلے میں ڈالا ہے شبنم کے موتیوں کا ہار

کیا ہے موج صبا نے چمن کے صحن کو صاف
صفا سے جس کی خجل عارض پری رخسار

نگاہ شاہد گل میں نہ تا کہ کھٹکے کہیں
بسان سبزۂ نوخیز نرم ہے ہر خار

دماغ بلبل خوش زمزمہ نہیں ملتا
ہوا ہے جب سے کسی گل کے یہ گلے کا ہار

شب الم ہوی آخر ہوا ظہور نشاط
زہے نشاط کہ غافل بھی ہو گئے ہشیار

ہے صبح آج کی جوش بہار جوش نشاط
کہ جس کی شام پہ صبح بہار باغ نثار

یہ صبح وہ ہے کہ ہنستے ہیں پھول بھی پھل بھی
یہ صبح وہ ہے کہ کھلتے ہیں غنچۂ سوفار

یہ صبح وہ ہے کہ غمگیں بھی آج شاداں ہیں
خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں خشک اشجار

یہ صبح وہ ہے کہ ہے ہر طرف نشاط و سرور
وفور جشن کی گھر گھر ہے گرمئ بازار

ہے آج سالگرہ شہریار عالی کی
مچی ہوی ہے دکن میں خوشی کی دھوم پکار

یہ جشن خاص ہے دیکھیں تو دیکھنے والے
کہ انتظام ہے کیا کیا ہے شوکت دربار

بڑے بڑے شعرا زیب بزم عشرت ہیں
خوشی کے جوش میں پڑھتے ہیں مدح کے اشعار

مجھے بھی فخر ہے میں اس کا مدح خواں ہوں آج
کہ جس کی ذات ہے ملجاے کل صغار و کبار

وہ دن ہے آج کہ ہے جوش میں وہ بحر کرم
نظر میں جس کی ہے اک قطرہ قلزم ذخار

وہ یادگار شہان دکن شہ ذی جاہ
کہ جس کے بحر و بر و کوہ ہیں خراج گزار

نظام ملک دکن شہریار آصف جاہ
شجیع ، رونق لشکر ، خدیو عدل شعار

غریب پرور و مسکیں نواز و محسن خلق
ہنر پسند و سلیم المزاج و حلم شعار

یہ شاہ وہ ہے جو حامی ہے دین و ملت کا — یہ شاہ وہ ہے جو ہے دستگیر ہر ناچار

ہے ذات شاہ بلاشبہ ظلِ سبحانی — یہ بات مانتے ہیں آج سب اولی الابصار

ہے کیا ہی عقدہ کشا شہ کا ایک دستِ کرم — ہے لاکھوں درد کا درماں نگاہِ فیض آثار

اس عہد سعد میں ہیں علم و فن ترقی پر — ہر ایک فرد بشر کر رہا ہے یہ اقرار

ہے دیکھو عقل کی رو سے تو پیر صد سالہ — جو پوچھو عمر تو اڑتیس سال کا ہے شمار

ہے وہ بلندی ایوان تاجدار دکن — کہ مرغ وہم و خرد کا بھی ہے گزر دشوار

جو دیکھے رفعت قصر شہی اٹھا کر سر — تو گر پڑے سر گردوں سے مہر کی دستار

جھکا جو اس در دولت پہ سرفراز ہوا — ہزاروں بندۂ ناچیز ہو گئے زردار

ہے کسر شان کہوں عدل میں اگر کسریٰ — کہ وہ نہال خزاں دیدہ ہے یہ سرو بہار

کلام شہ کا ملوک الکلام سنتے تھے — مگر یقیں ہوا دیکھے جو شاہ کے اشعار

خلاصہ عرض یہ ہے اے شہ فریدوں فر — ترے محاسن عالی کا کیا کروں اظہار

ہے سچ تو یہ کہ تو تعریف سے ہے مستغنی — تری ثنا کے لئے عمر خضر ہے درکار

پھرا نہ خالی کوئی بارگاہ عالی سے — بڑا ہے فیض ترا اور بڑی تری سرکار

نہ صرف ہند ہی منت کش سخاوت ہے — ہے شہرہ داد و دہش کا تری سمندر پار

دعا کو ہاتھ اٹھا شمس باحضوری قلب — تری دعا ہو قبول خدائے لیل و نہار

بسیط ارض و بساط جہاں رہے جب تک — محیط دہر ہے جب تک کہ گنبد دوار

ترقیوں پہ رہیں عمر و دولت و اقبال — شہ دکن کے نگہباں ہوں احمد مختار

ہمیشہ پنجتن پاک کا رہے سایا — مدام فضل رکھیں شہ پہ اپنا چاروں یار

بسان نقش قدم پائمال ہوں اعدا — زمانہ میں وہ رہیں روسیاہ و سینہ فگار

قبول خاطر اقدس مرا قصیدہ ہو
ہے شمس تیرا نمک خوار اے مرے سرکار

مطبوعات انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

فلسفۂ تعلیم۔ والدین اور معلم کے لیے چراغ ہدایت تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے۔
قیمت فی جلد مجلد سے، کلدار یا سے، ۸ر حالی۔

فلسفہ جذبات۔ اس کتاب میں جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت نہایت قابلیت کے ساتھ دکھائی گئی ہے مجلد عاںر کلدار یا عاںر حالی

تاریخ تمدن۔ تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے، اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے
جلد اول عہ کلدار یا عہ حالی جلد دوم عاں کلدار یا عاں حالی

علم المعیشت۔ معیشت کے مشکل اور مبہم مسائل کو پانی کر دیا ہے۔ اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔ مصنفہ محمد الیاس برنی صاحب ایم اے پروفیسر عثمانیہ کالج مجلد عہ کلدار یا ہے حالی۔

تاریخ اخلاق یورپ۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن، اصول اخلاق، مذاہب و خیالات کا مرقع ہے
جلد اوّل سے، کلدار یا ہے حالی جلد دوم عاںر کلدار یا عاںر حالی

مشاہیر یونان و رومہ۔ مشہور و معروف کتاب پلوٹارکس لایوز کا ترجمہ۔ اصل کتاب سیرت نگاری اور انشا پردازی میں دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلی آتی ہے، وطن پرستی اور بےنفسی عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر صفحہ لبریز ہے۔
جلد اول سے، کلدار یا سے، ۸ر حالی۔
جلد دوم عاں ۸ر کلدار یا عاں ۱۲ر حالی۔

تاریخ یونان قدیم۔ مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ قیمت مجلد عاں کلدار یا عاں ۵ر حالی۔

ملل قدیمہ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ جس میں قدیم اقوام سلطنت کلدانی۔ آشوری۔ بابل بنی اسرائیل اور فنیقیہ کی معاشرت۔ عقائد اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔
قیمت فی جلد عاں ۸ر کلدار یا عاں ۱۲ر حالی

البیرونی۔ کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے۔ دسویں صدی کا فاضل مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔
مجلد عاں کلدار یا عاں ۵ر حالی۔

نفح الطیب۔ اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ۔ ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ یہ اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔
قیمت مجلد ہے کلدار یا مہ ۹ر حالی۔

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب ہیروز آف انڈیا کا ترجمہ۔ ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان۔ فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں سری کرشن جی مہاراج گوتم بدھ وغیرہ کے حالات عہ ۸ر کلدار یا عہ ۱۲ر حالی۔

قاعدہ و کلید قاعدہ۔ یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے اور تشریح کے لئے ایک کلید بھی
قاعدہ ۲ر کلدار ۲۰ر حالی کلید ۴ر کلدار ۵ر حالی۔

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۳۳)

اُردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی، ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبۂ

ابوالمکارم محمد ثناء اللہ صدیقی

قیمت پانچ روپے سالانہ

عادل پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت روانہ کیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ (صہ) ششماہی (سے) نمونہ ۸ر

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ | بابت ماہ شعبان ۱۳۱۸ھ | نمبر ۶

فہرست مضامین

جمال یار ، یہ مختصر رسالہ تین دلچسپ مکاتیب کا پُر لطف مجموعہ ہے جس میں دو خط مولانا جمال الدین صاحب نوری کے اور ایک خط مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کا ہے اس کو ابو محمد عمر بن صلاح صاحب یافعی نے طبع کرایا ہے ۔ ملا محمد عبدالباسط صاحب مولوی فاضل کا اس پر بہت مختصر دیباچہ ہے جو اپنی حیثیت میں اچھا ہے ۔ مولانا جمال الدین صاحب نوری پروفیسر عربی نظام کالج ، ملک دکن کے مایۂ ناز علما میں ۔ آپ کا تبحر ، دقیقہ یابی اور فلسفیانہ نکتہ سنجی ، علمی طبقہ میں مسلم ہے ۔ مولانائے محترم نے اپنے ایک عزیز سید شاہ ظہور عالم حسینی کی سفارش کے طور پر یہ خط عالیجناب ہز ایکسلنسی سرکشن پرشاد ، یمین السلطنت ، جی ، سی ، آئی ، ای شاد کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ خط کا موضوع گو بالکل محدود تھا ، مگر مولانائے ممدوح کا علم تبحر یہ چاہتا تھا کہ :۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

چنانچہ اس خط کے پڑھنے والوں کو عجیب عجیب نیرنگیاں نظر آئیں گی ، وہ دیکھیں گے کہیں تو تصوف کے تصورات عالیہ ، روحانیت کے دریائے لطیف میں غوطے لگا رہے ہیں اور کہیں فلسفیانہ عبوسیت مولانا کی شگفتہ بیانی سے ہم آغوش ہو رہی ہے اگر ایک طرف وحدۃ الوجود کی یک رنگیاں اپنی شان دکھا رہی ہیں تو دوسری طرف کثرت کی نیرنگیاں جلوہ ریز ہیں ۔ کہیں منطق کے پیچیدہ تصورات ، مولانا کے کرم کمالات علمی کی تصدیق کر رہے ہیں تو کہیں کلام کی متانت و سنگینی ، اس فاضل یگانہ کے حیرت انگیز تفلسف کی توثیق میں مصروف ہے ۔ قصہ مختصر یہ کہ حضرت نوری کے یہ دونوں خط طرح طرح کے علمی نکات سے مملو ہیں ۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد جمیع القابہ نے حضرت نوری کے پہلے خط کا جو جواب دیا ہے وہ بھی کچھ کم کیفیت نہیں رکھتا ۔ آپ کے ایک ایک لفظ سے کمال انشا پردازی مترشح ہے مگر ہم ناظرین کرام کو اس وقت آپ کی عبارت آرائی سے آگاہ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ مہاراجہ بہادر کی متعدد تصانیف نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان میں بھی متداول ہو چکی ہیں اور ان سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کی مصنفانہ قابلیت کیا درجہ رکھتی ہے ۔ بلکہ ہم اس موقع پر مہاراجہ بہادر کی ایک ایسی صفت کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں جو صرف آپ ہی سے مختص ہے اور جس میں آپ بالکل منفرد ہیں ، وہ صفت ہے خاکساری !

حضرت نوری نے مہاراجہ بہادر کی اسی صفت پر اپنی مخصوص انشا پردازی سے اس طرح روشنی ڈالی ہے :۔

"ایک نہیں کئی امیروں کو میں نے دیکھا ہے دولت کی نشہ میں چور ہوتے ہیں اور حکومت پر مغرور ، دل پھوڑ کی قبر ہوتا ہے اور دماغ فرعون کا دار الخلافہ ، لیکن قصر وزارت کا رنگ دیکھتا ہوں تو کچھ اور عالم نظر آتا ہے ۔ امیروں کے تجمل میں فقیروں کی شان ہے اور فقیروں کے رنگ امیروں کا ٹھاٹھ ۔ نہ دولت کا نشہ نہ حکومت کا گھمنڈ ، امارت کی بلندی میں تواضع پستی ہے ، سخاوت کی دریا میں خجالت کا جوش ہے ۔ اور بخشش کے نشہ میں معافی کا ہوش ، اس لئے قلم گو ہر نگار کی نگارندی پر جب نگاہ پڑتی ہے تو کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت گزرتی ہے ، دل تڑپ کر سینہ میں لوٹتا ہے اور بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے

شعر من از مروت طبع کریم فہمیدم کہ آستین بجز اینقدر ز شرم سخاست"

حضرت نوری کے اس حقیقت نگاری کو بعض ناواقف لوگ شاید انشا پردازی کی ایک مبالغہ آمیز ترنگ پر محمول کریں گے ۔ اچھا ، جانے دیجئے اور ذرا ادھر دیکھئے ! کہ مہاراجہ بہادر کا حقائق نگار قلم ، امارت کے قصر شکوہ کو اپنی منکسرانہ جنبشوں سے کس طرح پاش پاش کر رہا ہے ۔

" آپ کے ۔ ۔ ذی حجہ کے محبت نامہ کو جواب دا محرم کو دے رہا ہوں ۔ آپ ضرور سمجھے ہوں گے کہ جس قدر امارت کی کسوت میں صورتیں نظر آتی ہیں بڑی متکبر ، خود غرض ، دروغ گو ، ہوتی ہیں ۔ مگر شاد امیر تو نہیں ہے ۔ مگر ہاں ایک امیر کے خاندان میں پیدا ہوا ہے ، اس لئے امیر پکارا جاتا ہوں ورنہ ایک غریب مسکین ہوں ، کسی کے نام پر بک چکا ہوں ۔ خریدار کو سب خلق خدا جانتی ہے "۔

الا ان اولیاء اللہ ... دیکھئے غریب

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سطریں پڑھے اور سراپا حیرت نہ بن جائے ۔ غریب مسکین کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے اور مہاراجہ بہادر کی خاندانی وزارت ، پشتینی جاہ و ثروت کی طرف قیاس کیجئے رنگستان میں بہار مرا ، ان مختصر اقتباسات ہی سے اندازہ لگائیے کہ یہ لطیف مراسلت اپنی آغوش میں کیا کیا معنی رکھتی ہے ۔ ہمارا ناقص خیال ہے کہ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا آدمی اس کو ایک بار ضرور لطف اندوز ہو ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی عمدہ ، کتاب پر قیمت درج نہیں ، غالباً ان حضرات سے دستیاب ہو سکے گی

پتہ :۔ ابو محمد عمر بن صلاح یافعی و سید شاہ ظہور عالم حسینی سجادہ نشین چشتی چمن محلہ راز و ارنعال ... حیدرآباد دکن ۔

معارف نمبر ۔ جلد ۔ ۔ ۔ کے متعلق گزشتہ ... میں مولوی ... الدین صاحب کا ایک مضمون شایع ہوا تھا جس کا جواب جناب لمعہ صاحب نے ہمارے پاس بھیجا ہے ...

سلمان ساوجی

از جناب مولوی سید خورشید علی صاحب

جرمنی کے دار السلطنت برلن سے ایک فارسی ماہوار رسالہ "ایرانشہر" نامی شایع ہوتا ہے جس کے مدیر حسین کاظم زادہ ہیں - یہ ایک علمی اور ادبی مصور رسالہ ہے - اس کی ایک پچھلی اشاعت میں مرزا عبداللہ بن عبدالغفار تبریزی سابق معلم زبان فارسی مدرسہ السنۂ مشرقی ماسکو (روس) کا ایک نہایت مختصر مگر دلچسپ مضمون کلیات سلمان ساوجی کے متعلق شایع ہوا ہے - اس کا ترجمہ ناظرین "ترقی" کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا - لیکن قبل ازیں کہ اس کو پیش کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوا کہ پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات فارسی" کے اس باب کے ترجمہ سے جو اس باکمال نامور شاعر کے تذکرہ سے متعلق ہے ناظرین کی ضیافت طبع کی جائے۔

سلمان ساوجی وہ قادر الکلام شاعر ہیں جن کے فضل و کمال کا خود خواجہ حافظ نے ذیل کے اشعار میں اعتراف فرمایا ہے :-

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست؟ ز راہ صدق و یقیں، نے زراہ کذب و گماں

شہنشہ فضلا، پادشاہ، ملک سخن جمال ملت و دیں خواجۂ جہاں سلماں

سلمان دراصل ایک درباری شاعر تھے اور قصیدہ گوئی میں کمال رکھتے تھے ان کی طویل زندگی کا ایک بڑا حصہ سلاطین ایلخانی کے تعلق میں بسر ہوا - یہ سلاطین خاندان جلایر کے نام سے بھی مشہور رہیں سلطنت جلایریان کے بانی شیخ حسین بزرگ ان کی بیگم دلشاد خاتون اور ان دونوں کے فرزند شیخ اویس اس باکمال شاعر کے خاص مربی اور قدردان تھے - جملہ تذکرہ نویسوں کے ان تمام بیانات کے علاوہ جن کا اس مضمون میں جابجا حوالہ دیا گیا ہے، سلمان ساوجی کی وہ بہت عمدہ سوانح عمریاں جو ہندوستان کے فاضل بزرگوں نے مرتب کی ہیں

خاص طور پر قابلِ دید ہیں ۔ اِن میں سے ایک تو انگریزی ہے اور دوسری اُردو ۔ اول الذکر حالات
مولوی عبدالمقتدر کے مرتب کئے ہوئے ہیں جو فہرست ..... کتب خانۂ شرقی بانکی پور از فردوسی
تا حافظ صفحات ۲۱۹ ، ۲۲۵ میں درج ہیں ۔ اس بارے میں فارسی تذکرہ نویسوں نے جو کچھ
مواد فراہم اور پیش کیا ہے اس کا یہ سوانح عمری ایک محققانہ اور جامع خلاصہ ہے ۔ ثانی الذکر
تذکرہ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب شعر العجم میں شامل ہے ۔ یہ ایک نہایت قابلِ قدر تالیف ہے
اور تقریباً بیس مشہور ، سربرآوردہ ، فارسی شعرا کے مفصل تذکرے اور ان کی شاعری کے متعلق
تقریظ و تنقید پر مشتمل ہے ۔

مولوی عبدالمقتدر کے بیان کے بموجب سلمان کے سال ولادت کا سنہ ۷۰۹ھ مطابق سنہ ۱۳۰۹ء
یا اس کے قریب ہونا خود سلمان کے ایک شعر سے جو اس کی مثنوی "فراق نامہ" میں موجود ہے
ثابت ہے ۔ فراق نامہ سلمان کی سنہ ۷۶۱ھ م سنہ ۱۳۶۰ء کی تصنیف ہے شاعر اس میں کہتا ہے کہ اس وقت
اس کی عمر اکسٹھ سال سے متجاوز ہو رہی ہے ۔ اسی طرح اس فاضل سوانح نویس نے یہ باور کرنے
کے لئے نہایت معقول وجوہ بیان کئے ہیں کہ سلمان نے بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۲ صفر سنہ ۷۷۸ھ مطابق
یکم جولائی سنہ ۱۳۷۶ء وفات پائی ۔ سلمان کی تصنیفات میں دو مثنویاں جن میں سے ایک "فراق نامہ"
جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اور دوسری "جمشید و خورشید" ہے جو متعدد غزلیات ، مقطعات ،
رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہیں لیکن قصیدہ گوئی میں وہ خاص طور پہ ممتاز ہیں ۔ یہاں تک
کہ بقول مولانا جامی ، اس میدان میں سلمان ساوجی نے کاملُ الفن قدما مثلاً کمال اسمٰعیل ،
ظہیر فاریابی ، اثیر اومانی ، سنائی وغیرہ سے بھی جن کے کلام سے اس باکمال شاعر نے فیض
حاصل کیا تھا اور جن کی پیروی کی تھی ، اکثر و بیشتر گوئے سبقت لے جانے میں کامیابی حاصل کی ۔
سلمان کی غزلیات کے بارے میں مولانا جامی کا قول ہے کہ "اگرچہ وہ بھی بہت پسندیدہ
اور نہایت پختہ ، استادانہ کلام ہے ، لیکن چونکہ ان میں عشقیہ جذبات کی حقیقی چاشنی نہیں ہے
جو در اصل غزل کی جان ہے ۔ لہٰذا صاحبانِ ذوق کے پاس چنداں مقبول نہ ہو سکیں ۔"

سلمان کا کلیات، جو بمبئی میں چھپا ہے اس نامور شاعر کے حسب ذیل کلام پر مشتمل ہے۔

قصائد اور دو ترجیع بند - ابتدائی ۱۳۵ صفحہ

غزلیات - ۱۳۶ - تا ۲۳۰ صفحہ

رباعیات آخری ۶ صفحہ

سلمان کا سب سے ابتدائی کلام مولوی عبدالمقتدر کے بیان کے بموجب بظاہر وہ مرثیے ہیں جو سلطان، ابو سعید کی وفات (نومبر یا دسمبر ۱۳۳۵ء) اور اس سلطان کے نامور وزیر خواجہ غیاث الدین محمد کے قتل ہونے پر لکھے گئے ہیں۔ خواجہ غیاث الدین تباریخ ۲۱ رمضان ۷۳۶ھ م ۳ مئی ۱۳۳۶ء قتل ہوا۔ اسی سال شیخ حسن بزرگ نے اپنی وہ حکومت قائم کی جو ایلخانی کے نام سے موسوم ہے اور اپنا دارالحکومت بغداد قرار دیا۔ غالباً اپنے سابقہ مربی و قدر دان غیاث الدین محمد کے ظلم و بیدردی سے قتل ہو جانے کے بعد ہی سلمان نے ارباب کمال کے ساتھ اس بادشاہ کی عام فیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا۔ دولت شاہ اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر جب شیخ حسن تیر اندازی کا کمال تبلا رہا تھا سلمان نے ذیل کے اشعار برجستہ کہہ کر پیش کئے اور اس طرح وہ اولاً سلطان کے مورد عنایات ہوئے۔

چو در بار چاچی کماں رفت شاہ	توگفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کمال با عقاب سہ پر	بدیدم بہ یک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سر گوش شاہ	ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ
چو از شست بکشاد خسرو گرہ	بہ آمد ز ہر گوشہ آوازہ زہ
شہا! تیر در بند تدبیر تست	سعادت دواں در پئے تیر تست
بہ عہدت زکس نالۂ برنخواست	بغیر از کماں کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطانِ صاحبقران	نہ کرد است کس زور جز بر کماں

تذکرہ نویس بیان کرتے ہیں کہ سلمان کے ایلخانی دربار میں نہایت درجہ تقرب حاصل کرنے کی

خاص وجہ قابل، باکمال اور حسین ملکہ دل شاد خاتون اور صاحب جمال، ہر دل عزیز، شاہزادہ اویس کی قدردانی اور توجہ تھی۔ چنانچہ خود سلمان کہتے ہیں۔

من از یُمنِ اقبال ایں خاندان گرفتم جہاں را بہ تیغِ زباں

من از خاوراں، تا در باختر ز خورشیدم امروز مشہور تر

شیخ اویس ۷۵۷ھ م ۱۳۵۶ء میں اورنگ نشین حکومت ہوا اور تقریباً بیس سال حکومت کی۔ سلمان کے قصائد کا بہت بڑا حصہ اسی سلطان کی مدح میں ہے۔ دولت شاہ نے جو واقعات بیان کئے ہیں اور جن کی اوسلی نے اپنی کتاب "بیوگرافیکل نوٹس آف دی پرشین پوئٹس" یعنی فارسی شعرا کے حالات اور تذکرے میں نقل کی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلمان کو سلطان اویس کی بارگاہ میں انتہائی تقرب حاصل تھا۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ یہ بادشاہ اس قدر غیر معمولی حسن و جمال رکھتا تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو اہل بغداد کا ایک ایسے چہرہ کو دیکھنے کی غرض سے جو حضرت یوسف کے تاریخی حسن کو زندہ کر دیتا تھا راستوں میں ایک ہجوم ہو جاتا تھا۔ جب اس سلطان کے پاس بالکل بے وقت پیام اجل آگیا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ذیل کے پاکیزہ اشعار کہے

ز دار الملک جان روزے بہ شہرستانِ تن رفتم
غریبے بودم اینجا، چند روزے با وطن رفتم
غلام خواجہ بودم، گریزاں گشتہ از خواجہ
در آخر پیش او شرمندہ با تیغ و کفن، رفتم
الا اے ہمنشینانِ من محروم ازیں دنیا
شما را عیش خوش بادا دریں خانہ، کہ من رفتم

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے سلمان کے بیشتر قصائد بعض خاص تاریخی واقعات سے متعلق ہیں اور اس لئے ان کی تصنیف کے زمانہ کو بہ آسانی تمام معین کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالمقتدر نے حبیب السیر سے اس قسم کے دس قصائد کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس سے ان کی تصنیف

کی تاریخ اور وجہ و تقریب ظاہر ہوتی ہے۔ اِن میں سب سے پہلا قصیدہ وہ ہے جو ۷۳۹ھ م ۱۳۳۸ء میں شیخ حسین بزرگ کے بغداد کو فرار ہونے کے موقع پر کہا گیا ہے۔ یہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

وقت صبحست و لب دجلہ و انفاس بہار　　اے بسر کشتی مے تا شط بغداد بیار

سب سے آخری دو قصیدے ۷۵۶ھ م ۱۳۵۵ء میں کہے گئے ہیں اور آذربائی جان میں شاہ شجاع کی فتوحات کی تہنیت میں ہیں۔ اس میں سے ایک قصیدہ جس کو شاہ موصوف نے بجد پسند کیا اِس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

سخن بوصف رخش چوں ز خاطرم سر زد　　ز مطلع سخنم آفتاب سر بر زد

اس قصیدہ کو سننے کے بعد شاہ شجاع نے کہا تھا کہ "ہم نے اس ملک کے تین مشہور و معروف اشخاص کی شہرت سنی تھی لیکن ان کے حالات کو ان کی عام شہرت سے مختلف پایا۔ سلمان کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہیں۔ یوسف شاہ کا کمال موسیقی اور اس کی شہرت دونوں مساوی ہیں اور شیخ جہانی کے کمال کے مقابل اس کی شہرت بہت بڑھی ہوئی ہے۔

سلمان کے سب سے زیادہ مشہور اشعار وہ ہیں جو شیخ اویس کی وفات پر کہے گئے ہیں۔ شیخ اویس نے جمادی الثانی ۷۷۶ھ م نومبر ۱۳۷۴ء میں وفات پائی۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

اے فلک آہستہ رو کارے نہ آساں کردہ
ملک ایراں را بمرگ شاہ ویراں کردہ
آسمانے را فرود آوردۂ از اوج خویش
بر زمیں افگندۂ با خاک یکساں کردۂ
نیست کارے مختصر گر باحقیقت میروی
قصد خون و مال و عرض ہر مسلماں کردۂ

یہ نظم مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے سلمان نے ۷۷۸ھ م ۱۳۷۶ء میں وفات پائی۔ یعنی شاہ شجاع کی مدح میں متذکرہ صدر دو قصائد کہنے کے ایک سال بعد۔ اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ اپنی طویل حیات کے آخر زمانہ تک بھی برابر شعر کہتے رہے۔ پس دولت شاہ کی یہ روایت کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ سلمان نے اس کی خواہش ضرور کی تھی۔ چنانچہ ان کی ایک دلچسپ نظم سے جس کو مولانا شبلی نے اپنی کتاب شعر العجم جلد دوم میں نقل کیا ہے عزلت گزینی کی اس آرزو اور ارادہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ دلچسپ نظم جو در اصل چار قطعات ہیں یہ ہے۔

قطعۂ اول

بادشاہا بندہ در حضرت برسم عرضہ داشت
انبساطے می نماید بر امید رحمتت

قرب چل سال ست تا سکان شرق و غرب را
طبع سلماں می کند در گوش دُر مدحتت

در ثنائے حضرتت عہد جوانی گشت صرف
نوبت پیری رسید اکنوں بہ امر حضرتت

گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود
چند روزے بگزرانم در دعائے دولتت

علت پیری و درد پا و ضعف جسم و چشم
می برد، درد سر من بندہ را از خدمتت

گفتہ ام درباب خود فصلی دو سہ آں را جواب
چشم دارد بندہ از درگاہ گردوں حشمتت

قطعۂ دوم

اول آں ست کہ چوں نیت عزلت دارد
بندہ زیں دائرۂ جمع جدا خواہد بود

مدتے مالک ملک شعرا بود بہ حق
زیں زماں خادم جمع فقرا خواہد بود

پیش ازیں در پئے مخلوق بسی گردید
بعد ازیں بر در معبود بپا خواہد بود

بندہ تا زندہ بود، وجہ معاش بندہ
ہیچ شک نیست کز احسان شما خواہد بود

لیک دارم طمع آنکه معین باشد که مرا وجه معیشت زکجا خواهد بود

قطعہ سوم

دیگر آن ست که محبوب جہاں سقری شاہ آمد از بندگی شاہ که می فرماید
رو بگو بندۂ دیرینۂ ما سلماں را که بخواه از کرمم هرچه ترا می باید
بنده برحسب اشارت طلبی کردم و شاه داشت مبذول جہاں کز کرم شاه آید
وعده دین ست ز دین من اگر زانچه کند ذمۂ همت خود شاه بری می آید

قطعہ چہارم

دیگر از خرج تر، و دخل کمش قرضے چند هست و قرض است که قرض غربا باز دهد
بنده را غیر در شاه در دیگر نیست قرض باید که ز انعام شہا باز دهد
وجه ایں قرض که از من غربا می خواهند گرنه خواهد ز تو سلماں زکجا باز دهد

(باقی)
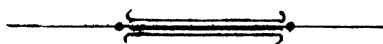
زمانہ

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو ترقی نمبر ۴ ماہ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ

از جناب مولوی محمد نصیر احمد صاحب ایم اے بی ایس سی

اب ذرا غور تو کرو کہ یہ واقعات اپنے اندر کیا راز نہاں رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر گل زیرین کسی زمانہ میں سطح زمین ہوگی جس پر خود رو نباتات اگی ہوگی اور جن کے کوڑے کرکٹ کے جمع ہونے سے معدنی کوئلے کی بالائی تہہ بنی، ان گلہائے زیرین میں جڑوں کے ریشے بکثرت ملتے ہیں۔ اور پودوں کے تنے جڑوں سے ملے ہوئے بعینہٖ اسی طرح ملتے ہیں جس طرح کہ درخت یا پودے کے گرنے کے وقت ان کی حالت تھی اور اس طرح نباتی مادہ کا اجتماع ہوتا گیا۔ موجودہ زمانہ میں اس ترکیب سے پیٹ[1] (peat) بن جاتی ہے اور قدیم زمانہ میں حرارت اور دباؤ کے مختلف حالات کے ماتحت معدنی کوئلہ بن جاتا تھا۔

جب ان نباتی آثار کا مطالعہ ایک خوردبین سے کیا جاتا ہے تو یہ پتہ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں جنگلات میں بڑے بڑے گرپا[2]، اسپ دم[3]، ہنسراج[4]، کی کثرت تھی اور کہیں کہیں

---

[1] ایک قسم کی جڑ جو جلانے کے کام آتی ہے۔

[2] ایک قسم کی گھاس جو کائی (گرپا = گرگ و پایہ)

[3] ایک قسم کا پودا ہے جو دلدلوں کے کنارے ہوتا ہے تنہ گرہ دار ہوتا ہے اور چوٹی پر پتیاں دانتوں کمر جڑے کی طرح ہوتی ہیں۔

[4] درخت بے ثمر، گرم ملکوں میں یہ پودا درختوں کے برابر بھی پہنچ جاتا ہے یہ سب قسمیں نباتات کی ہیں۔

صنوبر کی بھی لیکن بہت سی صورتوں میں کوئلہ کا بیشتر حصہ انہی ہنسراجوں اور گرگ پاؤں کے
جُزوں تخموں سے مرکب ہے، جو ہر سال پک کر گرا کرتے تھے۔ اور اس طرح گرتے گرتے ایک نباتی تودہ
بن گئے۔ جس طرح موجودہ جنگلات میں کوڑا کرکٹ اور پتیاں وغیرہ مل کر ایک تودہ بنا دیتی ہیں۔
اس عمل کے لئے ایک بہت ہی طویل مدت درکار ہوئی ہوگی تاآنکہ نباتی مادہ جس میں بڑا
حصہ جُزوں کے بُرادے کا ہے اتنا جمع ہو گیا ہو کہ دباؤ پڑنے پر وہ کوئلہ کی ایک فٹ کی
تہہ بن گیا۔ سر جے ڈبلیو ڈاسن جنھوں نے امریکہ کے کوئلہ کی کانوں میں خوب تحقیقات کی تھی
ان کا قول ہے کہ "ہم بلا خوف تردید دعوے کرسکتے ہیں کہ خالص معدنی کوئلہ کا ایک فٹ
دبیز ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ مرسانوں[۱] کی کم از کم پچاس نسلیں پھلی پھولی اور مرجھائی ہونگی
یعنی بلا کسی اختلال کے صدیوں تک نباتات کا نشوونما ہوتا رہا ہوگا"۔
لیکن کوئلہ کے طبقوں کے بننے کے لئے جسقدر مدت درکار ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے
یہ پہلا قدم ہے۔ کوئلہ کی ہر تہہ پر جیسا کہ اوپر مذکور ہوا پانی کے جمع کئے ہوئے مادے یعنی
بالو اور کوڑیاں وغیرہ کا ایک غلاف ہے۔ اس کا کیا سبب؟ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی جواب ہے
یعنی وہ سطح زمین جس پر جنگل کے جنگل نباتات کے اُگتے تھے بتدریج نرم ہوتی گئی یہاں تک کہ
وہ ایک دلدل کی صورت ہو گئی اور پھر ایک جھیل کی صورت بن گئی یا سمندر کا ایک چھوٹا سا
اونھلا حصہ بن گئی۔ جس میں بالو یا ریت وغیرہ جمتے گئے یہاں تک کہ وہ ایک تودے کی
شکل میں اُبھر آئی جس پر ایک دوسرا جنگل کھڑا ہو گیا اور اس کے کوڑے کرکٹ نے کوئلہ کی
ایک دوسری تہہ جما دی۔ یہ عمل اسی طرح ہوتا رہا تاآنکہ کوئلہ کی تمام تہیں سلسلہ بہ سلسلہ
جم گئیں بالآخر بلندی و پستی کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور زمین کی ایک معین مقامی حرکت نے
حالات میں تبدیلی پیدا کر دی دور موجودہ میں اس عمل کا چھوٹے پیمانہ پر ایک نمونہ ہم کو

---

[۱] Sigillaria قدیم زمانہ کے ان نباتات کا نام ہے جن کے تنے پر ایسے نشانات ہوتے تھے جیسے کسی نے مہر لگائی ہو۔

اب بھی دریائے مسی سپی[1] کے ڈیلٹا میں نظر آتا ہے جہاں کی حالت یہ ہے کہ نیو آرلینس میں جو کنواں کھودا جاتا ہے وہ سرو اور خودرو نباتات کی تہوں سے گذرتا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ آج کل سطح زمین پر ہو رہا ہے۔ یہ تہیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی ہیں اِن کے درمیان میں دریائی ریت کی تہیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدتِ مدید ہوئی کہ ایک دور نباتات کے نمو کا تھا اس کے بعد ایک دور فنا کا گذرا جب کہ وہ غرقاب ہو گئیں اور اِن کے آثار بحری ریت میں مِل گئے۔

مذکورۂ بالا مفروضہ کو مان کر، یعنی ایک فٹ کوئلہ کے معنی کوئلہ کے درختوں یعنی نباتات کی پچاس نسلیں اور نیز یہ، کہ نباتات کی ہر نسل دس برس میں پختہ ہوئی (اور یہ مفروضہ قرین قیاس ہے) اور نیز چونکہ بعض مقامات پر معدنی کوئلہ کی دبازت . . . ۱۲ فٹ معلوم کی گئی ہے لہٰذا ان قضایا کی بنا پر پروفیسر ہکسلے نے اندازہ کیا ہے کہ معدنی کوئلہ کی تکوین کے لئے بھی ۶ ملین یعنی ۶۰ لاکھ برس درکار ہیں۔ اور یہ اندازہ بہت کچھ تخمینی ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ارضی وقت کے اندازہ کے لئے جس مدت کو ہم معیار قرار دیں گے وہ دس لاکھ برس کی ہو گی۔

اس معیار کی تصدیق دیگر ذرائع سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر کھریا یا خاک سفید کی تکوین کو لینا چاہئے۔

کھریا کا جزو اعظم باریک حشرات کے خوردبینی خول ہیں۔ جیسا کہ آج کل بھی یہ خول ہمارے سمندروں کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہی خول باریک برادہ کی شکل میں تہہ نشین ہو جاتا ہے اس مادہ کو کرویلی گاد کہتے ہیں۔ اور جو بحر اطلانتک یا اوقیانوس اور بحر پاسفک یا بحر الکاہل میں بڑی گہرائی سے نکلتا ہے۔ بنا بریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ سمندروں کی تہہ میں کھریا برابر بنتی چلی گئی ہے اور بالعکس یہ کہ جو موجودہ کھریا کی پہاڑیاں

---

[1] شمالی امریکہ میں ایک دریا۔

یا گھاٹیاں ہیں وہ بلا شبہ کسی زمانہ میں تہہ آب بنی تھیں۔ کھریا کی تہہ نشین ہونے کی رفتار بہت ہی سست ہو گی اور اس رفتار سے تو یقیناً کم ہو گی کہ جس رفتار سے دریائے نیل اپنی طغیانی میں یا اس سے زیادہ موٹی گاد کو جمع کر دیتی ہے جس کی نسبت یہ صحیح طور پر اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۰۰ برس میں تین انچہ کی تہہ جمتی ہے۔ اب اگر کھریا کے تہہ نشین ہونے کی رفتار کو ایک انچ فیصدی قرار دیا جائے جو آہستہ آہستہ دو یا تین میل کی گہرائی پر یورپ سے بڑے رقبوں پر جمتی ہے تو کھریا کی ایک فٹ تہہ بننے کے لئے ۱۲۰۰ برس کی ضرورت ہو گی اور ۱۰۰۰ فٹ کے لئے ۱۲۰۰۰۰۰ (۱۲ لاکھ) برس درکار ہوں گے۔ ایسے مقامات بھی ہیں کہ جہاں خاک سفید کے طبقوں کی دبازت جیسا کہ اِس کے طبق منقلبہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۵۰۰ فٹ سے بھی زیادہ ہے تو اس سے بھی اتنا ہی وقت ثابت ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کوئلہ کے بیان میں اخذ کیا جا چکا ہے۔ پس اس طرح تخمیناً ۶۰۰۰۰۰۰ (۶۰ لاکھ) برس کا اقل زمانہ ہر اس تہہ کے لئے درکار ہے جس میں کہ پیمایش شدہ ۱۳۰۰۰۰ فٹ دبیز طبقہ تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن اس اندازہ میں وہ مدہائے طویل شامل نہیں ہیں جب کہ مقاماتِ زیر بحث میں کوئی چیز نہ جمی تھی۔ اور نہ وہ مدید وقفے شامل ہیں جو ہر مد و جزر کے درمیان واقع ہوئے ہوں گے خصوصاً کسی قدیم دور کے اختتام اور جدید کی ابتدا میں جس میں نباتی اور حیوانی زندگی کی شکلیں بھی مختلف ہوں گی۔ ہم کو اس کا بھی یقین کر لینا چاہیئے کہ ہمیں طبقوں کی مجموعی دبازت کی اطلاع نہیں ہے اور یہ اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جبکہ تمام سطح زمین کو چھان ڈالا جائے۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس صحیفۂ ارضی کے چند اوراقِ پریشاں ہماری نظر کے سامنے ہیں جن میں تقریباً (۱۰ کروڑ) برس کا ذکر ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ گم شدہ اوراق اسی قدر کثیر التعداد ہوں جیسا ان کی نسبت ہمارا علم ناکمل ہے۔

سر چارلس لائل جو اس فن کے مستند استاد ہیں ان کا اندازہ یہ ہے کہ اقلاً طبقاتی زمانہ (۲۰ کروڑ) ۲۰۰۰۰۰۰۰۰ برس کا ہے اور ارضئین میں سے بمشکل کوئی ایسا ہو گا جو

اُن کی رائے سے اختلاف کرے۔

اس ارضی زمانہ کی مدت مدید کا دوسرا ثبوت زمین کے اہتزازات یا لرزش سے ملتا ہے۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین ٹھیری ہوئی ہے اور سمندر متزلزل ہے۔ لیکن واقعہ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ زمین ہمیشہ سے گھٹتی بڑھتی رہی ہے لیکن پانی کی نپسال[1] ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ اس کا ایک آسان سا ثبوت یہ ہے کہ بحری گھونگے اور دیگر آبی آثار ان طبقوں میں پائے جاتے ہیں جو اب اونچے پہاڑوں پر ہیں۔ مثلاً کھریا ہی کو لو۔ انگلستان میں اس وقت سے لیکر جب کہ کھریا سطح سمندر پر جمی تھی اور جب کہ وہ بالآخر شمالی اور جنوبی پہاڑیوں کا حصہ بن گئی خشکی اور تری کی سطحوں میں عموداً دو میل سے زائد کا مدوجزر ہوا ہوگا اور دوسری حالتوں میں یہ اُتار چڑھاؤ زیادہ نمایاں ہے۔ نومی لائم، چونے کا پتھر، جو کھریا کی طرح اوائل عہد ثالث کے سمندروں میں بہتے ہوئے سفلی حشرات کے چھوٹے چھوٹے خولوں کے اجتماع سے بنا تھا وہ پہاڑوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اور الپس اور ہمالیہ میں تو دس ہزار فٹ سے زیادہ کی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔

اس سے چھوٹے پیمانہ پر موجودہ زمانہ میں ہی اونچے اونچے ٹیلے جن پر گھونگے وغیرہ پائے جاتے ہیں، برطانیہ، اسکینڈینویا، اٹلی، جنوبی امریکہ، اور دیگر ممالک کے ساحل پر سمندر کی موجودہ نپسال سے مختلف بلندیوں تک پائے جاتے ہیں۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ تبدیلیاں زمین کے اُبھرنے سے پیدا ہوئیں یا سمندر کے گھٹ جانے سے؟ جواب یہ ہے کہ زمین کے اُبھرنے سے اگر یہ سمندر کے ایک اونچی نپسال پر ہونے سے پیدا ہوئیں تو لازم آتا کہ ہر جگہ یہ سطح ایک ہی بلندی پر ہوتی یا کم از کم اسی نصف کرہ میں اور اسی عرض البلد میں تو ایک ہوتی لیکن خشکی کے بڑے بڑے قطعے اب بھی ایسے ہیں جو قدیم الایام سے کبھی پانی کے نیچے نہیں رہے اور موجودہ زمانہ میں یہ شہادت ملی ہے کہ خشکی اور تری کی سطحوں میں تبدیلی جزئی ہے کلی نہیں۔ خلیج نیپلس[2] کے مقام پوزولی

---

[1] نپسال یعنی (Level) [2] اٹلی کے مغرب میں ایک خلیج۔

میں سرا پس کے مندر کے جو کھنڈر اب تک موجود ہیں ۔ اور جنکی تصویر لائل نے اپنی کتاب "اُصولِ طبقات الارض" کے سرورق پر دی ہے ۔ اُن کے ستونوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ جب سے یہ مندر بنا ہے اُس وقت سے یا تو سمندر میں پہلے مدبھر جزر واقع ہوا ہوگا یا زمین پہلے دب گئی ہو گی اور پھر اس دو ہزار برس کی مدت میں جو مندر پر گزر گئے کم از کم ۲۰ فٹ اُبھری ہو گی ۔ کیونکہ اُس اونچائی تک سنگ مرمر کے ستونوں پر بحری گھونگھوں کے اثرات موجود ہیں چنانچہ ان کے خول ان سوراخوں میں جو انھوں نے کھودے اب تک موجود ہیں لیکن اگر بحیرۂ روم کی سطح ۲۰ فٹ بلند ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مصر کا بڑا حصہ اور ساحل کے دوسرے نشیبی ممالک بالکل غرقاب ہو جاتے ۔ حالانکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے زمانۂ تاریخی یا متاخر زمانۂ ارضی میں ایسا کوئی طوفان نہیں آیا ۔

پس اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اس مقام پر زمین ۲۰ فٹ دب گئی ہوگی اور پھر اتنی ہی اُبھری ہوگی جس سے مندر کا فرش اپنے موجودہ مقام پر آگیا جو ڈیڑھ سو برس ہوئے سطح سمندر کے اوپر تھا یہ تبدیلی کچھ اس طرح تدریجاً ہوئی ہوگی کہ موجودہ تین ستون قائم رہ سکے اِس کے بعد پھر زمین آہستہ آہستہ دبنا شروع ہوئی ہے جس سے فرش سطح سمندر سے دو یا تین فٹ نیچے ہو گیا ہے۔ اس طرح کے متعدد ثبوت دئے جا سکتے ہیں جزائر برطانیہ کے سواحل کے بعض مقامات پر جنگلات تھوڑا تھوڑا دھنستے معلوم ہوتے ہیں ۔ دوسرے مقامات پر ٹیلے اُبھرتے نظر آتے ہیں اگرچہ دونوں کی رفتار یکساں نہیں ہے ۔ اس کاٹلینڈ کے مشرقی ساحل پر ایک ٹیلہ موجودہ ساحل سے ۴۴ فٹ بلند ہے ۔ جس میں کئی مقامات پر پانی کے کٹے ہوئے غار، تال وغیرہ مثل حاضر کے موجود ہیں اگرچہ ان میں بجائے بحیرۂ شمالی کے پانی کے سبزہ یا ریتہ ہے لیکن جتنا ہم شمال کی طرف جاتے ہیں یہ ٹیلا گھٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور جب ہم بالکل شمال میں جزائر آرکنی اور شٹلینڈ میں پہنچ جاتے ہیں تو ایسے ٹیلے مطلق نہیں دکھائی دیتے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی زماننا زمین دب رہی ہے ۔

کچھ اوپر سو برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ بحر بالٹک میں سویڈن کے ساحل پر بعض چٹانوں کے چند محفوظ مقامات پر کچھ نشانات بنا دئے گئے تھے تاکہ زمین کے دبنے یا ابھرنے کا پتہ لگ سکے چنانچہ مشاہدہ سے اس امر کا پتہ لگا کہ یہ نشانات سویڈن کے انتہائی شمال میں تقریباً سات فٹ اونچے ہو گئے۔ ملک کے وسطی حصہ میں یہ نشانات نہ چڑھے نہ اترے اور جنوبی حصہ میں تو یہ نشانات نیچے ہو گئے تھے۔

اگر بجائے سمندر کے زمین ساکن ہوتی تو یہ صورتیں ممکن نہ ہوتیں۔ غرض کہ جس قدر ہم طبقات الارض کا مطالعہ کرتے ہیں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ زمین کی حالت میں ہمیشہ سے تغیر و تبدل ہوتا چلا آیا ہے ایک پانی ہی کو لیجئے۔ سمندر سے بھاپ بن کر اڑتا ہے پھر بارش یا اولے کی شکل میں زمین پر برستا ہے، زمین کو کاٹ دیتا ہے، اس کو بہا کر فراز سے نشیب کی طرف لے جاتا ہے۔ اور بالآخر تہہ سمندر میں لیجا کر جما دیتا ہے۔ یہ دور یوں ہی جاری رہتا ہے۔ چونکہ تری کا رقبہ خشکی سے زیادہ ہے اس لئے اگر اس عمل کی تلافی نہ ہوتی رہتی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام خشکی غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ ایک عالمگیر سمندر نمودار ہو جاتا۔ لیکن اندرونی حرارت اس کمی کو پورا کرتی رہتی ہے۔ نئی زمینیں ابھر آتی ہیں نئے پہاڑی سلسلے پیدا ہو جاتے ہیں اور ڈوبی ہوئی زمین کی جگہ لے لیتے ہیں۔

زمین کی یہ اندرونی حرارت کوئی فرضی افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک واقعہ ہے چنانچہ جب ہم کان کھودتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ تپش فی الواقع بڑھتی جاتی ہے اس طرح پر کہ ۶۰ فٹ کی گہرائی پر ۱° فارن ہٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے اگرچہ مختلف مقامات پر یہ شرح مختلف ہوتی ہے، اگر اسی شرح سے تپش میں اضافہ ہونا جائے تو ..... ۱ فٹ کی گہرائی پر پانی ابلنے لگے گا اور ..... ۱ فٹ تک پہنچنے سے پہلے لوہا اور جملہ دھاتیں گھل جائیں گی۔ ایسی بڑی گہرائیوں پر واقعات کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں کیونکہ ہم یقین کے ساتھ نہیں جانتے کہ بے انتہا حرارت اور بے انتہا دباؤ کی حالت میں مادہ کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ لیکن

آتش فشانوں اور زلزلوں سے ہم کو اس کا پتہ ضرور لگتا ہے کہ زیر زمین بعض مقامات پر پگھلی ہوئی چٹانیں اور مفید گیسیں موجود ہیں۔ اِن مقامات کی گہرائی اگرچہ ہمارے گہری سے گہری کان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے لیکن سطح زمین سے مرکز زمین کے فاصلے یعنی ...۴ میل کے مقابلے میں بہت ہی قلیل بلکہ اقل ہے۔

اِس قدر یقینی ہے کہ مشاہدات کی تاویل کے لئے ہم کو سب سے بیرونی سطح یا قشر زمین ہی کا لحاظ کرنا پڑے گا یعنی وہ سطح جس سے ہم واقف ہیں۔ ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قشر ایسی چیز پر قائم ہے جس میں حرارت کے تغیرات کے ساتھ تھوڑا تھوڑا انبساط یا انقباض ہوتا رہتا ہے اور بسا اوقات جب کہ یہ کھچاؤ زیادہ ہو جاتا ہے تو بیرونی سطح میں ایک ہیجانِ عظیم پیدا ہو جاتا ہے جس کو ہم زلزلہ کہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے اس تغیر پذیر حصہ سے، پگھلا ہوا مادہ اور گیسیں آتش فشانوں کی راہ سے یا اُن مقامات کی راہ سے جہاں قشر زمین کی دبازت کم ہوتی ہے پھوٹ نکلتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی حرکات یکساں نہیں ہو سکتیں، بلکہ اگر زمین کا ایک حصہ اُٹھتا ہے تو دوسرا بیٹھ جاتا ہے اور بعضے حصے تو انقلاب کی حالت میں ہیں کہ اگر ایک کنارا اُبھرے تو دوسرا بیٹھ جائے۔

اس قسم کی حرکتیں عموماً بہت ہی سست ہوا کرتی ہیں۔ آتش فشانی مقامات میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی دھکے میں بڑے بڑے خطے چند فٹ اُبھر آتے ہیں اور ایک ہی دھماکے میں کچھ ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ لاوا وغیرہ نکلنے لگتا ہے یا پہاڑ کے پہاڑ غاروں میں آ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ اطالیہ کے شہر نیپلس کے قریب ...۸ فٹ اونچا مانٹی نو نامی ایک پہاڑ اسی طرح پیدا ہو گیا۔ اور جنوبی امریکہ کے ملک میکسیکو کا جرو کو نامی پہاڑ بھی ایک ہی التہاب میں نمودار ہوا۔ برخلاف اس کے آبنائے سندا میں ...۲ فٹ کا پہاڑ زلزلہ کی وجہ سے غائب ہو گیا۔ سب سے زیادہ اونچائی جو اس طرح سے پیدا ہوئی اس کی مثال جنوبی امریکہ میں ملتی ہے ۱۸۳۵ء میں وہاں ایک زلزلہ آیا تھا جس کی وجہ سے ایک وسیع خطہ اُبھر گیا

یعنی مقامات کاپی پو اور حیلو کے درمیان ۰۰ ۵ میل لمبا ساحل ایک ہی دھکے میں ہمیشہ کے لئے ۵ یا ۶ فٹ
اُٹھ گیا اور بعض مقامات پر تو ۱۰ فٹ کی نوبت بھی پہنچی۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جنوبی امریکہ کے
مغربی ساحل پر انڈیز نامی ایک سلسلۂ پہاڑ ہے جس کی سب سے بلند چوٹی ۰۰۰،۲ فٹ سے
وہ بھی زیادہ تر ایسے ہی متواتر دھکوں کے اثر سے اس اونچائی تک پہنچا ہے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ اوتار چڑھاؤ چونکہ بہت ہی سُست ہوتا ہے اس لئے مشاہدہ میں
مشکل سے آتا ہے ملک "اسکینڈنیویا" ظاہراً اُٹھ رہا ہے اور "گرین لینڈ" بیٹھ رہا ہے لیکن بقیہ ممالک
میں انسان کی یاد میں بہت ہی کم تغیر ہوا ہے۔ انگلستان کے مغرب میں صوبۂ کارنوال کی
پہاڑی سینٹ میکائیل نامی کا تعلق بقیہ ملک سے اب تک ایک گردن کے ذریعہ سے ہے ،
جو لہر کے اُترنے پر خشک اور لہر کے چڑھنے پر ڈھک جاتی ہے بعینہٖ یہی حال ۰۰۰،۲ برس
پہلے بھی جب کہ برطانوی قوم فنیقی قوم کے ہاتھوں ٹن یا رانگہ فروخت کیا کرتی تھی: مصر میں
۰۰۰،۷ برس سے ایک ہی سطح پر چلی آتی ہے اور اگر کہیں کچھ فرق پیدا ہوا بھی ہے تو ایسی ہی
سُست رفتاری سے جیسے دریائے نیل سے مٹی وغیرہ جمتی رہتی ہے۔ انگلستان کے بعض مقامات
نواب ایسے ہیں جہاں موجودہ زمانہ میں سڑکیں ہیں لیکن عہد قبل التاریخ میں وہاں پانی تھا
اور کشتیاں آکے ٹکرایا کرتی تھیں۔ بہرحال یہی تبدیلیاں بہت ہی آہستہ آہستہ ہوتی ہیں
اور ان میں اکثر اہتزازی کیفیت پیدا ہوتی رہی ہے جن کے درمیان طویل وقفے ہوتے
تھے جن میں خشکی اور تری اپنے اپنے مقامات پر قائم رہتے تھے۔ پس ہر طبقاتی زمانے میں
جو عظیم تغیرات واقع ہوئے ہیں ان کی شہادت سے بھی وہی نتیجہ نکلا جو طبقہ سازی کی مدد سے
ہم نے حاصل کیا تھا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ طبقاتی زمانہ کے حساب کے لئے لاکھوں برس کی مدت
پیمانہ قرار پائے گی۔

طبقاتی زمانہ کی اس طویل العمری کی تصدیق ایک دوسرے طریقہ سے ہوسکتی ہے۔
یعنی ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آتے وقت حیاتِ حیوانی میں جو تغیرات ہوئے ہیں وہ بھی

اس طویل العمری کا پتہ دیتے ہیں۔ کسی مقررہ عہد میں حیات کے آثار میں تغیر نہایت ہی تدریجی ہوا ہے عہد تاریخی میں کوئی قابل احساس تغیر نہیں ہوا۔ اور عہد پلوسین میں بھی جس کو ۲۰۰۰۰۰ برس سے کم کا زمانہ نہیں گزرا، بہت ہی قلیل تغیر ہوا ہے۔ خشکی کے بڑے جانوروں کی محدود تعداد میں تو یہ تغیر بہت ہوا ہے لیکن اگر ہم کثیر التعداد مونگا مچھلی اور دیگر بحری زندگی کی شکلوں کو لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ پرانی انواع کے معدوم ہو جانے کے بعد نئی انواع جو ظہور پذیر ہوئیں وہ کل انواع کا صرف ۵ فیصدی ہیں۔ یہ اس وجہ سے اور بھی قابل غور ہے کہ اس مدت میں آب و ہوا نے طرح طرح کے پلٹے کھائے اور بحری پنسال میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

ان واقعات سے استدلال کرکے اور نیز یہ فرض کرکے کہ حیات کی مختلف شکلوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ پہلے بھی ہوتی تھیں نیز ان سب تبدیلیوں پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈال کر لیل اس نتیجہ پر پہنچا کہ ارضیات کی رو سے تمام مشاہدہ کو وہ مظاہر کی تاویل کے لئے ۲۰۰۰۰۰۰ (۲۔ ارب) برس کی مدت درکار ہے۔

طبقاتی زمانہ کی یہ مدت بہت طویل معلوم ہوتی ہے۔ بایں ہمہ کائنات کی تاریخی کتاب کا یہ صرف ایک باب ہے۔ ارضیات کی ابتدا اس زمانہ سے ہوئی جب کہ زمین سرد ہو کر موجودہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس زمانے میں ہوائیں چلتی تھیں، پانی برستا تھا، دریا اور سمندر چٹانوں کو کاٹتے اور طبقے بناتے تھے۔ اور حالات کچھ ایسے موافق ہوئے جس کی وجہ سے حیات ممکن ہو سکی نہیں حیاتی آثار کی بدولت ہم ان طبقوں کو پہچانتے ہیں۔

لیکن اس عہد کے شروع ہونے سے قبل جس میں ہماری زمین پختہ یا تیار ہو رہی تھی جس کو ہم عہد بلوغ کہہ سکتے ہیں، ایک اس سے طویل تر مدت گزری ہوگی جس میں اثیر کے بخارات تبرید و انقباض کے بعد زمین کی موجودہ صورت میں رونما ہوئے ہوں گے۔ اور اگر زمین کے لئے یہ مدت اس قدر طویل ہے تو زمین سے بڑے بڑے سیاروں شلاً مشتری کے لئے یہ مدت کتنی کچھ طویل نہ ہوگی، مشتری کی جسامت اس قدر عظیم ہے کہ تبرید و انقباض اور بھی آہستہ آہستہ ہوا ہوگا۔ مشتری

ہیں ابھی گویا جوانی کی حرارت اور چمک دمک موجود ہے۔ درآنحالیکہ ہماری زمین اس منزل سے لاکھوں برس ہوئے گزر چکی تھی۔ اب اس سے سُورج کے لئے مدت کا خیال کیجئے کہ سورج کی جسامت اس سے کہیں بڑی ہے جتنا کہ مشتری کی زمین سے زیادہ ہے۔

اب اس کے بعد طویل العمری یا طوالت کا ایک تیسرا درجہ اور آتا ہے جس میں ان ستاروں یا دور دراز سورجوں کی عمر ہے جو ہمارے سُورج سے کوئی ۳۰۰ گنا زیادہ جسیم ہیں اگرچہ ہمارے سورج کے مقابلے میں یہ سورج ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔

ان طول طویل مدتوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے چند اعداد شمار لیے جانے ہوں گے۔ ریاضیات کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ زمین کی گردش رفتہ رفتہ سُست ہوتی جاتی ہے یا بالفاظ دیگر دن بڑا ہوتا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ پانی کا مدوجزر اس گردش کو روکتا ہے جیسے کسی پہیہ پر کوئی روک لگا دیجائے اگر یہ صحیح ہے تو ریاضیاتی حساب سے یہ پتہ لگتا ہے کہ زمین پر چاند کی جو کشش ہے اس کا ردعمل خود چاند پر یہ اثر پیدا کرے گا کہ جیسے جیسے زمین کی گردش کم ہوتی جائے گی چاند اُس سے دور ہوتا جائے گا۔ اور اسی طرح جب زمین کی گردش تیز تر تھی تو چاند نزدیک تر تھا چنانچہ ہم ایک ایسے وقت کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں جب کہ چاند بالکل سطح زمین پر تھا اور دن صرف تین گھنٹوں کا تھا۔ ایسی حالت میں چاند کا زمین سے علیحدہ ہو جانا کسی بڑی تلاطم کا نتیجہ تھا یا غالباً پہلے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے جو مل کر زحل کے حلقوں کی طرح ایک حلقہ بن گئے اور پھر یہ سب حلقے مل کر ایک واحد تابع بن گئے۔ چونکہ مدوجزر کا سبب چاند ہے اس لئے چاند کے اس قدر نزدیک ہونے پر مدوجزر بہت ہی عظیم ہوتے ہوں گے بنابریں زمین کے اپنے محور پر پورا چکر لگانے کی مدت میں دو مرتبہ ۵۰۰ یا ۱۰۰۰ فٹ کی لہریں گزر جاتی ہوں گی یعنی ارد گرد کے زمینوں کے سوا چھوٹے سمندروں اور خلیجوں پر ہر تین یا چار گھنٹوں میں گزرتی ہوں گی۔

عہد سلوریں سے قبل حیاتِ ارضی کے متعلق یہ خیالات صحیح ہوں یا نہ ہوں (اور اس عہد کے

بعد سے اس قسم کی تبدیلیاں ہوئیں تھیں) لیکن جو بات ذہن نشین کرانا ہے وہ یہ ہے کہ جس بنیاد پر نظریہ کی یہ عمارت قائم ہے وہ قابلِ تصدیق وحساب ہے۔

ہیلے نے یہ دریافت کیا کہ سورج گرہن کے پرانے حالات کا موجودہ حالات سے مقابلہ کیا جائے تو چاند کی شرح حرکت میں ایک فرق معلوم ہو جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت چاند کی حرکت کسی قدر سست ہو گی لاپلیس نے اس فرق کی یوں تاویل کی کہ اس کلیہ کو تجاذب کا ایک لازمی نتیجہ ہونا چاہئے چنانچہ اس نے حساب لگایا تو یہ خیال صحیح نکلا، لیکن ایک دوسرے ریاضیاتی آدمس نے جو دوبارہ لاپلیس کے تجربے کئے تو معلوم ہوا کہ لاپلیس نے چند اجزاء ضربی چھوڑ دئے تھے جس کی وجہ سے نصف کی تاویل ہو جاتی تھی اور نصف باقی رہتی تھی جس کی توجیہ اس طرح بھر کی گئی کہ دن کے طول میں اضافہ ہو جاتا ہے چاند کی حرکت کی اس تعویق سے یہ آسانی سمجھ میں آ گیا کہ ۲۰۰۰ برس میں سوا گھنٹہ کا فرق کیسے پیدا ہو گیا ؟ بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دو ہزار برس ہوئے دن کی جتنی مدت تھی اس سے اب دن $\frac{1}{۸۴}$ ثانیہ زیادہ ہے اس شرح سے دن کی مدت میں ایک ثانیہ کا فرق پیدا کرنے کے لئے ۱۶۸۰۰۰ برس کی مدت درکار ہو گی ایک دقیقہ کے لئے ۱۰۰۸۰۰۰۰ برس، اور ایک ساعت کے لئے ۶۰۴۸۰۰۰۰۰ برس ضرور ہوں گے۔ زمانۂ ماضی میں یہ شرح یکساں نہ رہی ہو گی کیونکہ چاند کے نزدیک ہونے سے لہریں بہت زبردست پیدا ہوتی ہوں گی جن سے اور بھی زیادہ تعویق ہوتی ہو گی۔ تاہم زمانہ کچھ ایسا لاانتہا ہے کہ ہم اس مدت کا قیاس ہی نہیں کر سکتے جب زمین کی گردش میں تین گھنٹے لگتے ہوں گے اور جبکہ چاند زمین سے علیحدہ ہو گیا ہو گا۔

بہ ایں ہمہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر زمانہ کے متعلق جملہ ریاضیاتی حسابات اس شرح کی بنیاد پر کئے جائیں جس سے تکوینی مادہ سورجوں اور سیاروں میں سرد ہو کر بن گیا، اور پھر یہ بھوس اور سکونت کے قابل زمین بن گئی تو نتیجہ بیشتر ناقابل اعتبار ہوں گے۔ اگر یہ اصلی قضایا درست ہیں تو حساب بالیقین درست ہو گا لیکن اگر یہ غلط ہیں یا یوں کہئے کہ جزوی اور نامکمل ہیں تو حسابات

کا بھی یہی حشر ہوگا - چنانچہ صورت موجودہ میں ہم ان اعمال کی "حقیقت" سے نا واقف محض ہیں
مثال کی طور پر آپ سورج کا مسئلہ لیجئے جو فنی زمانہ ایک مشکل مسئلہ گردانا جاتا ہے، کیا سبب ہے
کہ سورج اس قدر حرارت خارج کرنے کے بعد اپنے اندر کی حرارت اس بحالی سے قائم
رکھے ہوئے ہے یہ اشعاع یعنی اخراج حرارت ہر سمت میں جاری ہے اور ہمارے اس ننھے سے
سیارے تک جو حرارت پہنچتی ہے وہ کل کا ایک بہت ہی حقیر جزء ہے دیگر سیارے صرف
۲۲۳۰۰۰۰۰۰۰/۱ (۲۲۳ کروڑواں حصہ) پاتے ہیں بقیہ حرارت بالکل ضائع جاتی ہے -
اب جو حرارت ہماری زمین تک پہنچتی ہے اس کی بنا پر ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ سورج سے اشعاع
حرارت کس قدر ہوتا ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ سورج سے ایک ثانیہ میں اتنی حرارت خارج
ہوتی ہے جتنی کہ ۶۴۲۶ پدم میں تپھر کا کوئلہ جلانے سے حاصل ہوتی ہے -

ارضی زمانہ کی ابتدا سے اسی شرح سے حرارت خارج ہوتی رہی ہے خود ارضی زمانہ کا
حساب بھی کروڑہا برس کا ہے -

دیکھو ظاہر میں قوت کا اس طرح ضائع ہونا فطرت کا اسراف معلوم ہوتا ہے جس نے بڑے بڑے
بڑوں کے قدم ڈگمگا دئے ہیں -

لیکن اس میں مطلق شک وشبہ کی گنجایش نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے عین قوانین و نوامیس
فطرت کے مطابق ہے - سوال یہ ہے کہ وہ قوانین یا کلیات کیا ہیں ؟ فی الحال ہم صرف ایک
کلیہ کو جانتے ہیں جس سے تولید حرارت کی تاویل بھی ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ضبابہ[1] جس سے
سردی پاکر سورج نے اپنی موجودہ صورت اختیار کی، اس کے سرد ہونے سے جبلی قوت یا توانائی
(energy) حرارت میں تحویل ہوگئی یہ تعلیل صحیح ہے - یہ بھی درست ہے کہ جب ایک
جسم سکڑتا ہے تو اس میں سے حرارت نکل جاتی ہے جیسے پانی کسی اسفنج سے نکل جاتا ہے
لیکن اس میں کلام ہے کہ تعلیل کافی بھی ہے یا نہیں، ریاضی دانوں نے تو حساب لگایا ہے

---

[1] ضبابہ (nebulae) گرد نابان نور کی وہ گرہ جو ستاروں وغیرہ کی اصل ہے -

کہ اگر تکوینی مادے کو غیر محدود مان لیں جب بھی سردی پاکر سورج کی موجودہ صورت میں آنے سے
جو حرارت حاصل ہوتی وہ صرف ۱ کروڑ ۲۵ لاکھ برس تک سورج کی حرارت قائم رکھ سکتی تھی۔
اور اس کا ایک کثیر حصہ تو زمین کے علٰحدہ ہونے اور قابلِ سکونت بننے تک صرف ہو گیا ہوگا۔
اس پر بھی اگر ہم ان سب کا شمار کرلیں تب بھی ناکافی ہے۔ جملہ ماہرین فن متفق ہیں کہ حیات کے
سب سے اول رونما ہونے کے وقت سے اب تک جو تغیرات زمین کی سطح پر ہوئے ہیں ان کے لئے
۱۰ ارب (۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰) برس کی مدت درکار ہے۔

اس کمی کی تاویل کے لئے بہت سی کوششیں کی گئیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ شہابیہ اور تکوینی
مادے کے سورج پر متواتر گرتے رہنے سے حیلی توانائی کا بہت سا حصہ برباد ہو گیا ہوگا۔
جو بصورت دیگر حرارت میں تبدیل ہوتی۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ قیاس میں نہیں آتا کہ
لاکھوں برس کی طویل مدت تک سورج ان شہابی گولوں کا نشانہ رہا ہو جس کی وجہ سے وہ
ایک ہی حالت پر مشتعل رہا۔ اس سے بہتر توجیہ غالباً یہ ہے کہ ہم سورج کی اندرونی کیفیت سے
بالکل واقف نہیں ہیں اور یہ بہت ممکن ہے کہ اس کا مرکز اس سے کہیں زیادہ دباؤ پر ہو
جتنا کہ ہم اس کی قرص کو دیکھکر اندازہ لگاتے ہیں خود اس قرص میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور ابخرے
ہیں۔ ممکن ہے یہی درست نکلے، لیکن ہر طرح کا غور و خوض کرنے کے بعد ہم کو پھر اسی نتیجہ پر آنا
پڑتا ہے کہ (اتنی طول طویل مدتوں سے سورج کی حرارت کا اسراف اگرچہ خواہش فطرت
کے موافق ہی کیوں نہ ہو) وہ قوانین ابھی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

سورج کا تو ذکر ہی کیا اسی اپنی زمین کو لیجئے جو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کی اندرونی
کیفیات اور اس کی تبرید ایسے مسائل پیش کرتی ہے جس کا حل ابھی تک نہیں ہوا۔ کانوں
اور عمیق گہرائیوں تک کھودنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جیسا جیسا ہم اس اوپر والی موسم زدہ
سطح سے نیچے جاتے ہیں تپش میں اتنا ہی فرق پیدا ہوتا جاتا ہے یعنی ہر (۶۰) فٹ کی گہرائی
پر پارہ ایک درجہ فارن ہائٹ گھٹ جاتا ہے۔ کیونکہ بعض مقامات اس سے مختلف ہیں۔

اس شرح سے ہم بہت جلد ایسی گہرائی تک پہنچ جائیں گے جہاں جملہ اشیا پگھل جائیں گی۔
ہمارا مبلغ علم ابھی بہت محدود ہے اور ہم اُن کلیات یا قوانین سے کماحقہ واقف نہیں ہیں۔
جن کے ماتحت اندرونِ زمین، اور نیز سورج میں مادۂ حرارت، دباؤ کیمیاوی عمل، برق وغیرہ
مختلف اسباب کے ماتحت کیا کیا کیفیتیں اختیار کرتا ہے۔ جب تک ہم اِن امور پر حاوی ہوں اس
وقت تک ہمارے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ ارضیات کے ان نتائج کو صحیح سمجھیں جو ایسے کلیات پر
مبنی ہیں جنہیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ مثلاً دریائے گنگ یا مسی سپی سال بھر کے اندر جس قدر
گادّ جمع کر دیتے ہیں اس کی مقدار کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نہایت وثوق کے ساتھ یہ تبلا سکتے ہیں
کہ ۱۰۰ مربع میل کے رقبہ کو ابھرآنے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی، نیز یہ کہ اگر خلیج بنگال کو بھرنا
چاہیں تو اس کے لئے گنگا کس قدر مواد ہندوستان سے کاٹ کر لے آئے گی۔ پس اسی طرح اگر
زمانۂ ماضی کی تہوں میں ہم کو اسی قسم کے طبقے ملیں تو ہم ان کی دبازت سے اندازہ لگا سکتے ہیں
کہ کتنی مدت میں وہ بنے ہوں گے۔

اس قسم کے شمارات میں کسی قسم کی نظریات کو دخل نہیں۔ ان کی بنیاد ٹھوس واقعات پر ہے
الغرض ارضیات کے نتائج، کم از کم عہدِ سلورین تک جب کہ موجودہ نظامِ کائنات کی بناء پڑ چکی تھی
بہت کچھ واقعات ہیں نظریات نہیں۔ لیکن فلکی نتائج بیشتر نظریات ہیں جنکی بنا، ایسے قضایا، پر ہے
جن سے اگر ایک طرف نظامِ شمسی کی تکوین کے لئے ایک کروڑ پچاس لاکھ برس کا زمانہ درکار ہوتا ہے
تو دوسری طرف ایسے نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں جو بالکل قرینِ قیاس نہیں۔ مثلاً ایک وہی مثال
جب کہ چاند زمین سے ایسے وقت میں جدا ہوا کہ زمین کی محوری گردش صرف تین گھنٹے کی تھی
حالانکہ مشاہدات کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جو تعویق اندازی گئی ہے اس کی رو سے ۲۴ گھنٹے
کی بجائے صرف ۲۳ گھنٹے ہی میں گردش پوری کرنے کے لئے ۶۰ کروڑ برس کی مدت درکار ہوتی ہے
اس شخص کے لئے جو نہ فلکیات کا ماہر ہے نہ ارضیات کا بلکہ صرف غیر جانبدار ناظر ڈالتا ہے۔
فلکئین اور ارضئین کے درمیان اس قضیہ کے ہوتے ہوئے موجودہ صورتِ حالات میں بہتر

یہی ہو کہ وہ مان لے کہ بیشک ارضیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات کو موجودہ صورت اختیار کئے ہوئے ۱۰ کروڑ برس کا زمانہ گزرا ہے ورنہ فلکیات کی رو سے تو ہماری موجودہ سکونت کے قابل زمین جس نظام شمسی کا ایک حقیر سیارہ ہے، اس کی تولید، نمو، بلوغ، کہولت اور بالآخر موت کے لئے ایک بہت ہی طویل مدت درکار ہوگی۔

جہاں تک کہ اس مضمون کا تعلق ہے یعنی علوم عصریہ کا خیالات پر جو اثر پڑا ہے اس کے لئے نہ تو کسی طویل مدت سے کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ کوئی قلیل تر مدت اس کے لئے رکاوٹ ہے کائنات میں انسان کا جو مرتبہ ہے اور اس کے پرانے عقیدوں کی صداقت یا غیر صداقت کی تاریخی شہادت کے لئے مساوی ہے کہ ہم انسان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ کی کل مدت میں سے صرف ۵۰۰۰۰ برس سے آباد مانیں یا ۱۵ کرور کی مدت میں سے ۵۰۰۰۰۰ (۵ لاکھ) برس سے زندہ مانیں۔ البتہ علمی حیثیت سے یہ جاننا ضروری ہے کہ نظام شمسی کی عمر کیا ہے، زمین مسکن حیات کب سے ہوئی، اور پھر وہ متواتر سلسلے اور تاریخیں کیا ہیں جب کہ حیات اس زمین پر فی الواقع رونما ہوئی اور پھر تعقل اور استدلال کی طاقت رکھنے والا اور سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی یعنی انسان نے کب اور کس طرح اس دنیا میں جنم لیا۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینا سائنس کا ایک دلچسپ پہلو ہے جن لوگوں کو مزید شوق ہو، اور کوئی وجہ نہیں کہ اس بیسویں صدی میں بھی شوق کی کمیابی ہو ورنہ پھر سفیہ و فہیم، وحشی و متمدن میں فرق ہی کیا رہے گا۔ تو ان کو چاہئے کہ لیل، ٹنڈال، ہرائکر وغیرہ کے کارنامے ملاحظہ کریں، جہاں یہ بحث بالتفصیل ملے گی۔ لیکن اتنا کہے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ اخلاقی اور دماغی اور مذہبی نقطۂ نظر سے کائنات کی طویل العمری یا قلیل العمری دونوں کچھ مساوی ہی ہے فقط

ملل ہنود کا فلسفہ

از نواب سرامین جنگ بہادر، ایم، اے

نواب سرامین جنگ بہادر، ایم، اے صدر المہام پیشی بارگاہِ خسروی اپنی شخصیت اور مشاغل علمی کی بدولت ہمارے تعارف و تعریف سے بے نیاز ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون ناتمام حالت میں اپنی محققانہ و فلسفیانہ شان کے ساتھ رسالۂ **ذخیرہ** جلد ۴ نمبر ۵و۶ میں شایع ہوا تھا۔ اب نواب صاحب موصوف نے غایت کرم سے اس کا بقیہ حصہ ہمیں عنایت فرمایا ہے، لیکن تسلسل مطالعہ کے خیال سے اول رسالۂ ذخیرہ سے پہلا مضمون "ترقی" کے صفحات پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ نمبر میں اس کا دوسرا حصہ نذر ناظرین کیا جائے گا۔

علم کلام کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ قبل دعوت کوئی قوم معذب نہیں ہوتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم کسی قوم یا گروہ کو بغیر تبلیغ رسالت اور اتمام حجت کے مستوجب عذاب و عقاب سمجھیں کیونکہ واجب تعالیٰ کا مدبر و مؤثر عالم ہونا ثابت و متحقق ہے۔ بلاد و عباد کا نظم و نسق، تدبیر و انتظام بھلائی برائی، ہدایت ضلالت اسی کے ارادہ و مشیت اور دست قدرت میں ہے اس صورت میں وہ قوم جس پر خدا کی جانب سے کوئی نبی اور رسول ہی نہیں بھیجا گیا معذب کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ہر قوم و ملک کیلئے کسی نہ کسی رہ نما اور ہادی کی ضرورت ہے۔

آیات ذیل :-

(۱) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ ۔ ہر ہر قوم کے لئے رسول ہے۔

(۲) وَمَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۔ کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نذیر یعنی نبی نہ گیا ہو۔

ہمارے اس ایقان کا باعث ہیں کہ ہنود کی کثیر التعداد قومیں اور ہندوستان کی سی وسیع قلمرو، جب کہ

اجودھیا میں حضرت شیث علیہ السلام کی قبر ہو (جن کو ہندو رام جی کا ساوہ بتاتے ہیں) اور لنکا میں ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ورود ہوا ہو، کسی رہنما اور رسول سے خالی نہیں رہ سکتی۔ قرآنِ مجید میں ایک موقع پر ارشاد ہوا ہے:-

وَمِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ " انبیا میں سے بعض ایسے ہیں جن کا قصہ ہم نے تجھ سے بیان کیا اور بعض ایسے ہیں جن کا قصہ ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا"

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہتیرے نبی ایسے ہیں جن کا حال ہم کو معلوم نہیں، پس ان بزرگوں کی نسبت جو ہندوستان میں راہنمائے حق گزرے ہوں، جن کی تلقین، رہنمائی، خدا پرستانہ زندگی اور تعلیم و ہدایت مفید و مصلح قوم رہی ہو، ہمارا یہ خیال کہ وہ نبی یا پیغمبر نہیں ہیں کسی طرح درست نہیں ہے۔ اسلام کے اکثر علمائے عظام بھی مثلاً حضرت، مرزا مظہر جان جاناں، حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، رام چندر جی، لچھمن جی و کرشن جی وغیرہ اوتار ہنود کو انبیائے مبعوثین میں شمار کرتے ہیں - اور حضرت سید عبدالرزاق صاحب بانسوی مجدد الف ثانی بھی اس کے قائل ہیں کہ سرزمین ہند انوارِ نبوت سے معمور رہے -

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اسلامی روایتوں میں وارد و ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کی جبین مبارک پر ودیعت تھا اس طرح گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کا ظہور بھی اولاً ہند ہی میں ہوا - غرض یہ ہے کہ ہندوستان کی ہدایت کے لئے بھی جناب باری نے کچھ بزرگوں کو مبعوث فرمایا ہوگا اور وہ نفوس قدسیہ ارباب زاکیہ محسوب فی الانبیا ہو سکتے ہیں -

گو اقوام ہنود استداد زمانہ کی وجہ سے اپنی اصلی تعلیم سے دور جا پڑے ہوں تاہم موجودہ زمانہ میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان کی اصلی تعلیم قدامت کی گرد سے پاک کر کے روشنی میں لائی جائے۔

نواب سر امین جنگ بہادر نے اپنے اس فرض کو جس محنت و جانکاہی سے انجام دیا ہے

وہ قابل تشکر ہے، ہم اُمید کرتے ہیں کہ نواب صاحب موصوف اس بارہ میں ملک و قوم کو آئندہ بھی اپنی عمدہ تحقیق سے استفادہ بخشتے رہیں گے۔

مدیر

ہند میں اگرچہ صدہا سال سے ہند و مسلمان بود و باش رکھتے ہیں مگر شاذ و نادر ہی ہندو اپنے ہم وطن مسلمانوں کے عقائد سے واقف ہوں گے، دوسری طرف ان مسلمانوں کی بہت ہی کم تعداد ہے جو اپنے ہم وطن ہندوؤں کے عقائد میں کسی اچھی بات کا پایا جانا تسلیم کرتے ہیں بلکہ علی العموم تمام قوم کو بت پرست خیال کرتے ہیں اس لاعلمی کا نتیجہ تعصب ہے جو ہند کے کسی نہ کسی شہر یا قصبہ میں کبھی کبھی ہندو مسلمانوں میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس مذہبی فساد کو مٹانے کے طریقوں میں ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے عقاید سے واقف ہونیکی کوشش کریں۔ اس بارہ میں راقم السطور نے اپنے حد تک جو کوشش کی اس کا نتیجہ ایک عزیز و معزز دوست کے ایما سے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ہنود کی مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب دراصل خدائے تعالیٰ (پرمیشور) کی توحید پر مبنی ہے۔ ان کے تمام فرقوں کے علما کا اتفاق اُصولِ ذیل پر ہے۔

(۱) خدا کی ذاتِ پاک ایک ہے (ایکم ایو ادی وتیم) وحدہٗ لاشریک لہٗ۔

(۲) البتہ ذاتِ باری کے صفات بے حساب و بے شمار ہیں [چند اولیا و اتقیا (رشی) نے صفات باری (دیوم) کا شمار تینتیس لاکھ تک کیا ہے۔]

(۳) لیکن ان میں تین بڑے جامع صفات ہیں جو موجوداتِ عالم (لوکم) کے قیام و نظام کے باعث ہیں۔

(i) خالق (برہما) = پیدا کرنے والا۔

(ii) حافظ (وشنو) = بچانے والا = حفاظت کرنے والا۔

(iii) مالک (سیوا) = مارنے جلانے والا، سزا جزا کا مختار۔

(۴) ان ہر سہ صفاتِ باری کا ظہور ایک ایک خاص قوت (سکھتی) یعنے ذریعہ سے ہوا ہے اور ہوتا ہے ۔

(ا) خالق (برہما) نے اپنی حکمت (سرسوتی) سے دنیا کو پیدا کیا ہے یعنے خالق میں صفتِ حکمت مستور رہے ۔

(اا) حافظ (وشنو) اپنی رحمت (لچھمی) کے ذریعہ سے دنیا کا محافظ ہے یعنے حافظ کی صفت میں رحمت موجود ہے ۔

(ااا) مالک (سیوا) اپنی قدرتِ (پاروتی) سے دنیا میں سزا و جزا کا مختار ہے مارتا جلاتا ہے یعنی مالک کی صفت میں قضا و قدر کا ظہور ہے ۔

(خدائے تعالیٰ) = (خالق × حکیم) × (حافظ × رحیم) × (مالک × قادر)
(پرمیشر) = (برہما × سرسوتی) (وشنو × لچھمی) × (سیوا × پاروتی)

مگر علمائے ہنود نے پہلے اصل اُصول (اکیم ایوا ادی وتیم) وحدہٗ لاشریک لہٗ کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے جس کی صراحت متعاقب کی جائے گی اور انھوں نے دوسرے اُصول اکثر ایسے استعارات و تشبیہات کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے یہ غلط فہمی عام طور پر رواج پاگئی ہے کہ ہنود تین خدا (برہما، وشنو، سیوا) کے قائل ہیں اور ہر ایک خدا کے لئے انھوں نے ایک زوجہ (سرسوتی، لچھمی، پاروتی) مقرر کر دی ہے اور جس طور سے انھوں نے صفات باری کو علحدہ علحدہ مشخص و موسوم کیا ہے اُس سے بھی یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ گویا ہنود (۳۳) لاکھ خدا کو مانتے ہیں مگر یہ غلط فہمی ہرگز بجا نہیں ہے کیونکہ اصل عقیدہ جس کی نسبت ان کے تمام علما و فضلاء متفق ہیں وہ فقط اسی قدر ہے کہ خدا کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اس کے تین مرتبے جامع صفات ہیں، جو موجودات عالم کے بانی مبانی ہیں اور ہر ایک صفت کے ظہور کا طریقہ جو اس دنیا میں انسان کو محسوس ہوتا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ خدا حکمت والا خالق، رحم والا حافظ، قدرت والا مالک ہے یعنے دوسرے الفاظ میں خدائے تعالیٰ خالق حکیم، حافظ رحیم، مالک،

معتقد رہے۔

یہاں تک تو الٰہیات ہنود میں ان کے تمام علماء کا اتفاق ہے، مگر اس کے بعد اکثر مسائلِ الٰہیہ کی نسبت ان میں اختلاف واقع ہوا ہے جس نے ہنود کے مختلف فرقے پیدا کئے ہیں۔ ہر فرقہ ہر مسئلہ کو اپنے طور پر حل کرتا ہے اور دوسرے طریقوں کو رد کرتا ہے۔ یہ مسائل کب اور کس لئے معرض بحث میں آئے؟ اس کی صراحت ہنود کے تمدنی و اخلاقی تاریخ پر نظر ڈالے بغیر نہیں کیجا سکتی اور تاریخی اُمور کے مجمل بیان کی بھی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ یہاں فقط تین چار اہم سوالات اور اُن کے جوابات کا ذکر کیا جاتا ہے جو علمائے ہنود کے آپس کے مباحثات و مناظرات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتے ہیں اور جن پر چند موجودہ فرقہ ہائے ہنود کے عقیدوں کا دارومدار ہے۔

I خدائے تعالیٰ (پرمیشر) سے دنیا یعنی موجوداتِ عالم (لوگم) کو کیا اور کیسا تعلق ہے؟

یہ سوال کلمہ سنسکرت (ایکم ایوا ادی وتیم) کے معنوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کلمہ کا ترجمہ ہم نے اوپر (وحدہٗ لاشریک لہٗ) کیا ہے لیکن علمائے ہنود نے اس کا لفظی ترجمہ مختلف طور سے کرکے خدا اور دنیا کے باہمی تعلق کے مسئلہ کو تین طور سے طے کیا ہے۔

(۱) سری شنکرا چاریہ نے (جو دو ہزار سال قبل ہند میں واعظ تھے) اس کے لفظی ترجمہ کے ساتھ اس کی تعبیر یوں کی ہے۔

(ایکم ایوا ادی وتیم) خدا ایک ہی ہے، اُس کے سوا کوئی دوسرا نہیں، سوائے خدا کے اور کوئی موجود نہیں۔

لہٰذا جو موجود ہے وہ خدا ہی ہے، اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے، عالم جس کو ہم دنیا کہتے ہیں وہ اگر موجود ہے تو خدا ہی ہے اور کوئی نہیں، خدا عالم ہے اور عالم خدا ہے، خدا سے دنیا جدا نہیں اور دنیا سے خدا جدا نہیں۔

سری شنکرا چاری اور ان کے معتقدین (وحدت الوجود) کے قائل ہیں یعنی خدا کا موجودات عالم سے الگ ہونا نہیں مانتے۔ یہ نہ صرف (ہمہ اوست) کہتے ہیں بلکہ ہرچہ ہست اوست کہتے ہیں

اس فرقہ کا نام (ادوتیا) دوئی کو ترک کرنے والا فرقہ ہے اس فرقہ والے برہمن (سمارتھا) اور کبھی (سائیوا) بھی کہلاتے ہیں جن کے پیشانیوں کے قشقہ کا نمونہ ایسا (═══) ہوتا ہے۔ اس فرقہ کی دو شاخیں ہیں ایک جبریہ، دوسرے قدریہ۔ جن کو مسئلہ جبر و قدر میں اختلاف ہے۔

(۲) سری رامانجا چاریہ نے (جو تقریباً نوسوسال قبل ہند میں واعظ تھے) یوں تعبیر کی ہے۔

ایکم ایوا اَدی وتیم۔
خدا الگ بغیر دوسرے کے ہے۔
خدا کے سوائے اگر کوئی دوسرا موجود ہے، تو فقط اسی کا ظہور ہے اور کوئی نہیں۔

لہذا جو موجود ہے اور جو ہم کو محسوس ہوتا ہے وہ خدا نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں۔ دنیا اور خدا میں باہمی تعلق مثلاً ایسا ہی ہے جیسا کہ قالب اور روح میں ہے۔ روح سے قالب زندہ ہے اور نشوونما پاتا ہے پھر بھی قالب جدا ہے اور روح الگ ہے اگرچہ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ اسی طرح خدا اور موجوداتِ عالم یعنے دنیا ایک دوسرے سے الگ ہیں اگرچہ خدا بغیر دنیا نہیں اور دنیا بغیر خدا نہیں مگر ہم دنیا کو خدا نہیں کہہ سکتے اور خدا کو دنیا نہیں کہہ سکتے جس طرح روح سے (زندہ) جسم خالی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ زندہ موجوداتِ عالم خدا سے خالی نہیں ہیں۔ خدا دنیا میں مانند روح کے موجود ہے۔

صوفی اگرچہ اوست و لے او نمی شود آئینہ رونماست و لے رو نمی شود

سری رامانجا چاری اور اُن کے معتقدین ایک خاص قسم کے (وحدت الوجود) کے قائل ہیں جس کی ہم نے (غالباً غیر مکمل) صراحت کی ہے یہ فرقہ خدا کا دنیا سے برتر ہونا مانتا ہے اگرچہ خدا کو دنیا سے بالکل جدا نہیں کرتا ہے یہ (ہمہ اوست) اور (ہمہ از دست) دونوں مقولوں کے معنے ایک سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کا نام (وشست اوتیا ہے) جو ایک محدود (دوئی) کا قائل ہے۔ اس فرقہ والے برہمن (وشنوا) کہلاتے ہیں جن کے پیشانیوں کے قشقہ کا نمونہ ایسا (ﺍﺍﺍ) یا ایسا (ﺍﺍﺍﺍ) ہوتا ہے اس فرقہ کے بھی دو شاخیں جبریہ و قدریہ ہیں جن کو مسئلہ جبر و قدر میں اختلاف ہے

ایک فرقہ اور بھی ہے جس کے بانی سری ولبھا چاریہ ہیں (جو تقریباً پانچ سو سال قبل ہند میں واعظ تھے)
اور جن کے معتقدین بھی ایک خاص قسم کے وحدت الوجود کے قائل ہیں ایک محدود (دوئی)
خدا اور دنیا میں مانتے ہیں گویا دنیا مانند روشنی کے ہے اور خدا مانند روشنی دینے والے چراغ کے کہ
بغیر چراغ کے روشنی نہیں اور روشنی بغیر چراغ نہیں پھر بھی چراغ الگ ہے اور روشنی الگ ہے۔

آدم کو مت خدا کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

ولبھا چاریہ فرقہ کے اعتقادات اور وشنوا فرقہ کے اعتقادات میں زیادہ فرق نہیں ہے اس فرقہ
والوں کے پیشانیوں کے قشقہ کا نمونہ ایسا (ا) یا ایسا (ا) ہوتا ہے۔

(۳) سری مادھوا چاریہ نے جو تقریباً سات سو سال قبل ہند میں واعظ تھے یوں تعبیر کی ہے

ایکم ایوا ادی وتیم۔
خدا ایک ہے دوسرا خدا نہیں ہے۔
خدا کے ساتھ دوسرا کوئی شریک نہیں ہے۔

لہٰذا موجوداتِ عالم جن کو ہم دنیا کہتے ہیں وہ خدا کے ساتھ کسی طرح شریک نہیں بلکہ خدا سے بالکل
جدا مخلوق ہیں خدا الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ ان دونوں میں فقط خالق و مخلوق کا تعلق ہے
اور کچھ نہیں۔

سری مادھوا چاری اور ان کے معتقدین (وحدت الوجود) کے قائل نہیں ہیں دنیا سے خدا کی
ذات برتر اور بالکل جدا سمجھتے ہیں مقولہ (ہمہ اوست) کے منکر فقط (ہمہ ازوست) کے قائل ہیں
اس فرقہ کا نام (دوتیا) ہے جو خدا اور دنیا میں بالکل (دوئی) جدائی کو تسلیم کرتا ہے اس
فرقہ والے برہمن (مادھوا) کہلاتے ہیں۔ جن کے پیشانیوں پر قشقہ فقط ایک سیاہ نقطہ ہوتا ہے
اور ان کے کنپٹیوں پر اور داہنے بائیں مونڈھوں پر صندل کے چھاپے رہتے ہیں۔

II . خدا کے تین جامع صفات (برہما، وشنو، سیوا) معہ اُن صفات کے جو ان کے لازم

وملزوم ہیں (سرسوتی، لچھمی، پاروتی) اِن میں کونسی صفت سب سے بڑی ہے یعنے سب سے بڑھ کر انسان کے لئے قابل پرستش ہے؟

اگرچہ مان لیا جاتا ہے کہ فقط خدائے تعالیٰ (پرمیشر) کی ذات ہی قابلِ پرستش ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ خدا کی ذات بیچون جو انسان کے حس فہم وخیال سے بالاتر ہے اس کی پرستش انسان ضعیف العقل سے نہیں ہوسکتی انسان کے لئے پرستش کے واسطے کوئی ایسی شی یا کوئی ایسا مفہوم ہونا چاہیئے جو اُس کے عقل وفہم میں آسکتا ہو۔ اس لئے خدا کے صفات جس کا ظہور موجودات عالم میں ہے انہیں کی پرستش انسان کرسکتا ہے اور تمام صفاتِ باری کی یکساں پرستش بھی انسان کے امکان سے باہر ہے لہذا فقط کسی ایک صفت باری کی پرستش ہی انسان سے اچھی طرح ہوسکتی ہے۔

خدائے تعالیٰ کے لکھو کھا صفات میں سے فقط ایک صفت کی پرستش ہی انسان کرسکتا ہے اور کسی ایک صفت کی پرستش انسان کے واسطے درصل خدا کی ذات کی پرستش ہے کیونکہ صفت اُس کے موصوف سے جدا نہیں ہے اور نہیں ہوسکتی ہے۔ لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے تین جامع صفات میں سے کونسی صفت ہی جو دنیا میں اچھی طرح ظاہر ہے جس کی پرستش انسان اپنے دل وجان سے کرکے خدائے تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے جو پرستش کا مقصود ہے۔

(۱) سائیوا فرقہ والے جو ادوتیا ہیں (مالک ومقتدر) کے صفات کو سب سے بہتر پرستش کے قابل سمجھتے ہیں۔

(۲) وشنوا فرقہ والے جو وشست ادوتیا ہیں (حافظ رحیم) کے صفات کو سب سے بہتر پرستش کے قابل سمجھتے ہیں۔

(۳) لینگائت، رکھتا، یہ دو فرقے خالق وحکیم کے صفات کی پرستش کو دوسرے صفات کی پرستش سے بہتر سمجھتے ہیں۔

لنگائت خالق کی صفت کو مذکر تصور کرتے ہیں اور رکھتا حکیم کی صفت کو مؤنث تصور کرتے ہیں

صفت مؤنث کو صفت مذکر پر ترجیح دیتے ہیں ہر ایک فرقہ اپنی پرستش میں غلو و مبالغہ کرتا ہے۔ صفت کو چھوڑ کر موصوف یعنی مظہر صفت کی پرستش جائز رکھتا ہے۔ اس بات سے یا بت پرستی کے وجوہ سے ہمیں یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم تمام فروع سے قطع نظر کر کے فقط ہر فرقۂ ہنود کے اُصول کی صراحت کرتے ہیں اور کوئی اعتراض یا نکتہ چینی اس تحریر کے مقصد سے خارج ہے۔

زنّار پہننے والے ہنود جو ہند میں ہیں ان میں فیصدی (۷۵) سائیوا فرقہ والے ہیں اور فیصدی (۱۵) وشنوا فرقہ والے ہیں بقیہ فیصدی (۱۰) دوسرے فرقہ والے ہیں۔

III انسان کو کس قسم کے جوش و خلوص کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی پرستش کرنی چاہیئے؟ آدمی سے آدمی کو محبت تین قسم کی ہوتی ہے ایک محبت ماں بیٹے میں ہوتی ہے، دوسری محبت میاں بیوی میں ہوتی ہے تیسری محبت مرید و مرشد میں یا شاگرد و اُستاد میں ہوتی ہے انسان کے لئے خدا کے ساتھ ان تینوں قسم کی محبت کا رکھنا جائز سمجھا گیا ہے لیکن ہر ایک فرقہ اِن میں سے ایک قسم کی محبت کو دوسرے دو قسموں کی محبت پر ترجیح دیتا ہے۔

IV دنیا میں انسان کے لئے ذریعۂ نجات کیا ہے؟ یہاں دنیا سے مراد کل موجودات عالم نہیں ہے۔ فقط ہر فرد بشر کا ماحول مراد ہے یعنے وہ دنیا جس کو ہر آدمی اپنے اطراف و جوانب میں پاتا محسوس کرتا ہے یہ دنیا ہر آدمی کے خیال عقل و حواس کے فراخور چھوٹی بڑی ہوسکتی ہے علمائے ہنود کے نزدیک ایسی دنیا بے ثبات و ناپائدار و فانی ہے اس دنیا کی جملہ لذتیں محض گندم نما جو فروش ہیں جن سے انسان کو خوشی سے زیادہ دکھ درد حاصل ہوتا ہے علی الخصوص جب کہ انسان دنیاوی خواہشات و لذتوں میں مبتلا ہو کر اپنے خدا کو بھول جاتا ہے تو اس سے اس کو جسمانی و روحانی مضرت کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہر فرد بشر کے لئے لازم و ضرور ہے کہ اس محسوسہ دنیا سے جس قدر جلد ہوسکے نجات حاصل کرے۔

(الف) چند ہنود کے نزدیک نجات سے مراد نیست و نابود ہو جانا ہے اُن کے عقیدہ میں

ہر آدمی کے وفات کے بعد اس کی روح دوسرے قالب میں پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح بار بار مختلف قالبوں میں پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح بار بار مختلف قالبوں میں پیدا ہو کر دنیا کے آفات و مصائب جھیلتی رہتی ہے تاوقتیکہ ہر انسان کی روح نیست و نابود نہ ہو جائے اور بار بار قالب بدل کر دنیا میں آنے سے رک نہ جائے اس کو نجات حاصل نہیں ہوتی ہے یعنے نجات ہر منفرد روح کو اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ (نرواناً) نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ غرض (نرواناً) حاصل کرنا انسان کے واسطے (نجات) ہے۔

(ب) چند دوسرے ہنود کے نزدیک (نجات) سے مراد ہے انسان کی روح کا خدائے تعالیٰ کی روح سے مل کر ایک ہو جانا۔ ان کے اعتقاد میں ہر آدمی پرمیشر کی روح کا ایک بہت ہی خفیف سا جزو ہے جو انسان کی پیدائش کے وقت اس کے قالب میں کسی نہ کسی طور سے آجاتا ہے۔ نیک انسان کی روح تو اس کے وفات کے وقت اس کا قالب چھوڑ کر فوراً اپنے اصل یعنے پرمیشر کی روح کی طرف رجوع کر کے اس سے مل جاتی ہے لیکن گنہگار انسان کی روح اس کے وفات کے بعد اکثر دوسرے قالبوں میں پیدا ہو کر آفتیں سہتی رہتی ہے اور کبھی یونہی بغیر قالب کے بھٹکتی پھرتی ہے البتہ جب اس کا فرزند یا اور کوئی قریب کا رشتہ دار سخاوت وغیرہ نیک کاموں سے اس کی روح کو ثواب پہنچاتا ہے تو اس وقت وہ روح پرمیشر کی روح میں جا کر مل جاتی ہے اور نجات ہو جاتی ہے۔

الغرض اس دنیا میں انسان کی نجات کے واسطے خواہ اس سے کچھ بھی مراد ہو ہر فرقہ ہنود کے نزدیک (بھگتی) کی ضرورت ہے فقط بھگتی ہی ذریعہ نجات ہے لیکن (بھگتی) کے معنوں میں علمائے ہنود میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

(ا) ایک گروہ کے نزدیک بھگتی سے مراد افعال حسنہ ہے افعال وہی نیک ہیں جو خالصتاً للہ کئے جائیں جو کام دنیا میں کیا جائے وہ کسی ذاتی یا دنیاوی غرض یا خیال سے نہ کیا جائے بلکہ فقط اللہ کے واسطے اللہ کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے۔ انسان اس دنیا میں (کرما یوگ)

حاصل کرلے یعنے (فنا فی فعل اللہ) ہوجائے ۔

دوسرے گروہ کے نزدیک (بھگتی) سے مراد عشق ہے دنیا میں آدمی ہر انسان و ہر شے کو مظہر صفاتِ الٰہی جان کر اس سے محبت کرے یعنے اس کو اپنے نفس اور اپنے ذات پر ہر امر میں ترجیح دیتا ہے حتی کہ اس کو اس عشق مجازی کی وجہ سے عشق حقیقی حاصل ہوجائے اللہ سے عشق پیدا ہوجائے ۔ اس دنیا میں انسان کا ما یوگ حاصل کرے یعنے وہ فنا فی صفات اللہ ہوجائے۔

(۳) تیسرے گروہ کے نزدیک (بھکتی) سے مراد عرفان ہے دنیا میں انسان کبھی خدا کو نہ بھولے ہر وقت و ہر لحظہ یادِ الٰہی میں مشغول رہے اللہ کی قدرت و دیگر صفاتِ الٰہی پر غور کرکے خدا کے پہچاننے کی کوشش کرتا رہے حتی کہ وہ اپنے کو خدا میں دیکھے اور خدا کو اپنے میں دیکھے انسان اس دنیا میں (گیان یوگ) حاصل کرے یعنے (فنا فی اللہ) ہوجائے ۔

ہر قسم کا یوگ حاصل کرنے کے لئے ہر گروہِ ہنود کے پاس زہد و تقوی، عبادت و ریاضت کے جداگانہ خاص خاص طریقے ہیں۔ جو مرشد مریدوں کو سکھاتے ہیں ۔

باقی آئندہ

خانہ آبادی

از جناب مولوی سید عمر ابو طالب صاحب شمسؔ

میں آپ سے پوچھتا ہوں، معاف کیجئے! جملہ ذرا ٹھکانہ ہو گیا، کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ خانہ آبادی کس کو کہتے ہیں؟

اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو میرے اس سوال، بادی النظر میں آسان، مگر درحقیقت مشکل سوال کا آپ بلا تامل بغیر دم لئے یہی جواب دینگے کہ کسی ان بیاہے مرد و عورت کا باہمی رضا و رغبت سے ایک دوسرے کو عقد مناکحت میں لا کر میاں بیوی کی شکل میں منتقل ہونا خانہ آبادی ہے! جواب بیشک درست، واقعی درست! اس پر میری، میری کیا ساری دنیا کی صاد!

اچھا اب بقول "در کرہائے تو مارا کر دگستاخ" ایک اور سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں! خفا ہونے کی سند نہیں! میں مانتا ہوں کہ میں نہ کسی دار القضاء کا رکن ہوں اور نہ محتسب، اور نہ خدانخواستہ آپ میں سے کوئی ہوگا، پھر خواہ مخواہ ایسے سوالات کیوں؟ ..... مگر ہاں! جس دن سے میں نے "علم بے بحث نمی ماند" والا قول دیکھ لیا، دیکھ لیا کیا، پڑھ لیا بلکہ رٹ لیا ہے۔ اس دن سے عادتاً کوئی نہ کوئی علمی، اخلاقی، ادبی، معاشرتی، ایسی، ویسی، بحث کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہوں! البتہ سیاسی مباحثہ سے کوسوں دور رہوں بالکل اسی طرح جس طرح سٹروں سے انسانیت! ہاں تو مطلب کہ اس عرض حال کا یہ ہے کہ میں بحث کے لئے عادتاً بالکل چست اور مستعد ہوں! سچ تو یہ ہے کہ اس میں بگڑتا ہی کیا ہے بشرطیکہ بحث، بحث رہے اور حد سے متجاوز ہونے نہ پائے۔ ادھر دیکھئے تو تفنن طبع ہے اور ادھر غور کیجئے تو گنجینۂ معلومات

لبالب بھرتا جاتا ہے! ہم خرما و ہم ثواب! خانہ آبادی تو خوش قسمتی سے ایک اچھا موضوع ہاتھ آگیا ورنہ میں "عادتاً بحث کرنے والا".......کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ کوئی موضوع نہ ملے تو کم از کم "آئیں" "بائیں" "شائیں" کی حقیقت دریافت کرنے پر تُل جاتا ہوں۔

بحمد اللہ میں نے اپنی خصوصیت طبع سے آپ کو بقدر ضرورت روشناس کر دیا ہے۔ اگر آپ کا مزاج انگریزیت پسند واقع ہوا ہے جیسا کہ آجکل فی صد ننانوے سٹروں کا ہے، تو میں، آپ کی خاطر سے، محض اس لئے کہ دل آزاری ناقابل معافی گناہ ہے، روشناس کی جگہ "انٹروڈیوس" کو کرسی دینے کے لئے آمادہ ہوں۔

اب اس تمہید کو جس پر نہ صرف ضروری بلکہ غیر ضروری بھی ہونے کی تعریف بجا طور پر صادق آسکتی ہے؛ یہیں چھوڑ کر اصل مطلب سے رجوع ہونے کی ضرورت ہے!

ہاں تو آپ نے خانہ آبادی کی تعریف، صحیح تعریف بیان کر دی۔ اچھا سنئے! ایک شخص ایسا ہے جس کی شادی ہو چکی، اوسکی زندگی سر تاپا مسرت ہے، سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا حقیقی لطف اٹھا رہا ہے ایسے شخص کی نسبت میرے، نہ صرف میرے بلکہ آپ کے خیال میں بھی کسی پوچھ گچھ کی ضرورت بالکل نہیں! یہی نا کہ خانہ آبادی اسم بامسمٰی ہو گئی اور بس! اب اسکو چھوڑ کر آگے بڑھئے۔ ایک دوسرے مسٹر سے آپ کا انٹروڈیوس ہوتا ہے۔ اس شامت کے مارے کا حال کچھ عجیب ہے۔ خوش قسمتی سے کہئے یا بد قسمتی سے، یہ بھی متاہل ہے۔ معیشت سے بیفکر اور آسودہ حال، صحت اچھی، رہنے کو گھر اچھا، غرض یہ کہ ہر طرح سے بخت ہے، مگر باایں ہمہ زندگی کے حقیقی لطف سے محروم! صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نام نہاد خانہ آبادی کے ہاتھوں برباد ہو چلا ہے۔ لفظ "خانہ آبادی" کو وہ صرف ایک عرفِ عام جانتا ہے جو معنوی اعتبار سے صفر، محض صفر ہے اور بس۔ یہ کیوں؟ آخر اس بیچارہ نے کیا قصور کیا؟ بفضلہ تندرست ہے، فکر معیشت سے آزاد ہے۔ گھر کی بیوی بھی اچھے گھرانے کی اچھی ملی! آنکھوں کا سکھ کلیجے ٹھنڈک! اب اور

کیا چاہئے ! بظاہر تو ہماری آپ کی نظر میں اُس کے آسودہ اور خوش نہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں پا
ہے ! پھر وہ کیا بات ہے جس نے اس کو زندگی کے حقیقی لطف سے محروم کر رکھا ہے؟

یہی وہ سوال ہے جس کے پوچھنے کی میں نے بتقاضائے تہذیب' معاف فرمائیے
بتقاضائے اٹیکیٹ' آپ سے کچھ منٹ پہلے' اگر آپ کو یاد ہو' اجازت چاہی تھی۔
پہلے سوال کا جواب تو آپ نے بلا تامل دیدیا اور بلا تامل بھی ایسا کہ سانس تک نہ لی اور آپ
اس دوسرے سوال پر آپ کا سکوت بیجان بیج تو یہ ہے کہ یک گونہ مجھے بھی پریشان
کرتا ہے ! کیا خوب ! میرا سوال نہ ہوا' حاتم طائی کا حمام باد گرد ہوا جس کی کوئی خبر
لاتا ہی نہیں ! میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس سوال کا جواب نہ دیں گے اور ہرگز نہ دینگے
یا تو اس لئے کہ اس کے لئے کسی قدر وقت اور غوض کی ضرورت ہے یا اس لئے کہ....
کہتے ہوئے ڈرتا ہوں .... یہ آپ بیتی ہے۔ اگر آپ جواب دے ہی نہیں سکتے ہیں
تو یہ قدرتی مجبوری ہے اور اگر دیسکتے ہیں گر کسی مصلحت سے دینا نہیں چاہتے تو آپ
جانیں اور آپ کی مصلحت' مگر میں تو اپنے عقیدۂ راسخ " علم بے بحث نمی ماند" پر
عادتاً کاربند ہو کر انتظارِ مزید کی ناقابل برداشت تکلیف گوارا نہیں کر سکتا۔ مجبوراً سمجھئے
یا استثنیاً' دونوں صورتوں میں سے کسی کی واقعیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا مجھے
اپنے سوال کا آپ جواب دینا ضرور ہوا۔ اب ایک بات کا اعلان باقی رہ گیا'

وہ یہ کہ اگر آپ سننے والوں میں ہیں' آپ بگڑیں نہیں اس سے میرا مطلب یہ نہیں
ہے کہ کہیں خدانخواستہ آپ ..... میں صرف کہنا یہ ہے کہ اگر آپ نئی روشنی کے دلدادہ مگر
ہٹ دھرم جنٹلمنوں کی طرح کسی اچھی بات کو اس کان سے سنکر اُس کان سے اڑانے والوں میں
نہیں ہیں' اور خدا کرے نہ ہوں' بلکہ گوش حقیقت نیوش رکھتے ہیں تو میرے بیان کی واقعیت کا
اعتراف کریں اور بصدر بجز دل کریں اور اگر حسن اتفاق سے یا سوء اتفاق سے یہ رام کہانی بالکل
آپ بیتی نکلے تو بیچ کھیت نہ سہی' دل میں اور صرف دل میں قائل ہو جائے۔ میری سعی مشکور

ہو کر رہے گی۔

یہاں اعادۂ سوال کی ضرورت داعی ہوئی ہے اور اس سے پیشتر کہ اعادۂ سوال کروں آپ سے اُس کی معافی مانگ لینا جا یہ اٹیکیٹ کے اٹل گر زٹل قوانین کی رُو سے ازبس ضروری ہے ورنہ مسٹری محکمۂ احتساب سے میرے لئے جو فتویٰ صادر ہوگا وہ معلوم ہے۔ سوال مجملاً یہ ہے کہ ایک متاہل شخص زندگی کے حقیقی لطف کے مزے لے رہا ہے ادھر متاہل شخص اگرچہ اُسکو بظاہر ہر طرح مسرور رہنا چاہئیے مگر فی الواقع زندگی کے حقیقی لطف سے بالکل محروم ہے۔ یہ کیوں؟ یہ متحد الاصل مگر متباین النوع صورتیں کیسی؟ یہ تضاد کس لئے؟

سنئے! دنیا عالم اسباب ہے' اس کی کوئی بات بے سبب نہیں ہوتی۔ خانہ آبادی کا اسم باسمی ہونا تو بالکل نیچرل ہے مگر ایسی صورت بھی جہاں خانہ آبادی محض عرفِ عام سے بڑھکر ثابت نہ ہوئی ہو کوئی اچنبھہ کی بات نہیں ہے۔ ایک کام فی نفسہ بدرجہ اتم سود مند ہوتا ہے مگر بعض اوقات اُسی کام سے بجائے فائدہ کے مضرت پہنچتی ہے۔ اِسکی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ فی نفسہ وہ کام بُرا ہے بلکہ اِس کا بڑا باعث خود ہماری آپ کی ناعاقبت اندیشی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں جو آغاز کار سے پہلے مآل کار سوچ لیتی ہیں۔ کسی کام کو عام اِس سے کہ وہ فی نفسہ کیسا ہی اچھا کیوں نہو بلا آؤ تاؤ دیکھے کر بیٹھنا سخت ترین غلطی ہے۔ اور اس کا نتیجہ سوائے ندامت کے اور کچھ نہیں۔

ازدواج بہترین سنتے ہے۔ اس کو خانہ آبادی کا مترادف تسلیم کرنے میں کسی اعتراض کو دخل کبھی نہ تھا' نہ ہے' اور نہ ہوگا۔ اگر کہیں یہ خانہ بربادی پر منتج ہوا ہے تو محض ناعاقبت اندیشی کی بدولت ورنہ اپنی ذاتی اصلیت میں یہ آبدار موتی ہے۔

جب چھوٹے سے چھوٹے کام کا بلا سوچ بچار کے کرنا نادانی اور اُسکا لازمی نتیجہ اکثر و بیشتر پشیمانی ہے تو ازدواج جیسے معاملہ میں ضروری اور بہاضروری غور و خوض سے

ہاتھ دھو بیٹھنا حماقت نہیں تو، آپ ہی فرمائیے، اور کیا ہے جس کے ناخوشگوار نتیجہ کی زندہ اور چلتی پھرتی مثال، دور کیوں جائیے اسی مضمون کی پچھلی سطروں میں ایک مجہول الاسم مسٹر کی صورت بن کر آپ سے فیصلہ طلب ہوئی ہے۔

میرے سوال کے جواب میں آپ نے، بلا شرکت غیرے محض آپ نے خانہ آبادی کی جو مختصر مگر مفید توجیہ فرمائی ہے وہ کافی سے زیادہ ہے۔ کسی ان بیاہے مرد و عورت کا میاں بیوی کے خلعت فاخرہ میں جو قاضی بلغ العلیٰ صاحب قبلہ مدّ کرمۂ کے مبارک مگر دقیانوسی ہاتھوں سے عطا ہوتا ہے، باہم ایک دوسرے کا شریک زندگی بننا، یا زیادہ دلخوش کن الفاظ میں، ایک جان دو قالب ہو جانا ہے تو بہت خوشگوار اور ایسا خوشگوار کہ محض اس کے خیال ہی سے ایک خاص اور جوش کا قدرتی طور پر پیدا ہونا ناگزیر از بس ناگزیر ہے۔ مگر اس جوش میں ہوش کو پروانۂ راہ داری دیدینا، ساعتے عیش و غصہ سالے چند، کا پورا مصداق ہے۔ ممکن، اور بہت ممکن ہے، کہ تاہل یعنے وہ خوشگواری جس کو نہ صرف آپ بلکہ خاص و عام بھی، ابتدائی مرحلہ میں خانہ آبادی سے تعبیر کرتے ہیں آگے کینچلی بدلکر ناگواری کی صورت اختیار کرلے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خانہ بربادی پر تُل جائے۔

اگر آپ خوش قسمتی سے مسٹر واقع ہوئے ہیں تو، اور باتوں کا ذکر ہی کیا ہے، میں آپ سے، صرف یہ پوچھتا ہوں، توبہ! توبہ! بھئی خفا نہ ہونا! سہواً اٹکیٹ ہاتھ سے جاتا رہا، کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو مسٹری وقار یعنے پوزیشن کے نباہنے میں کسقدر دقت پیش آتی ہے؟ مسٹری زندگی کے دیگر ابواب اور زیادہ اہم ابواب سے قطع نظر کرکے، صرف یہی ایک بات دیکھئے کہ روزانہ کسی کلب یا سوسائٹی میں جانا اور ناخواندہ مہمان بن کے جانا، آپ کے نظام العمل کا جزو لاینفک ہے ر اس خصوص میں اس وقت نہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور نہ درحقیقت میں کوئی روشنی ڈال سکتا ہوں

اس لئے کہ میں بدقسمتی سے آج کل کے کلب اور سوسائٹی کی خصوصیات سے بیگانہ محض ہوں) - ہاں اور سنئے ! روزانہ ایک مرتبہ اور بعض دفعہ تو کئی بار آپ کو بمبئی میں چوپاٹی، دلی میں چاوڑی بازار، اور لکھنؤ میں چوک کے چکر، غیر ضروری چکر، محض تبقاضائے مسٹرپیٹ، کاٹنے پڑتے ہیں - اپنے اس دورہ، لازمۂ حیات دورہ، پر روانہ ہونے کے کم سے کم چھ گھنٹہ پیشتر سے آپ کو اپنے توشک خانہ کا (اگر میرا قیاس غلطی نہ کرے تو مسٹری توشک خانہ نام ہے ایک یا دو کپڑوں کے صندوق کا اور بس) مطالعہ شروع کرنا پڑتا ہے - یہ سُوٹ دیکھا، پسند نہیں ہے رکھدیا، وہ سوٹ نکالا، موزوں نظر نہ آیا، چھوڑدیا ! مختصر یہ کہ کامل چھ گھنٹہ کی چھان بین، جانچ پڑتال، اور غور و خوض کے بعد آپ نے موقع اور وقت کے مناسب حال لباس کا انتخاب کیا اور یہ دردسری محنت کی دردسری، محض غیر ضروری دردسری صرف اس لئے کہ آپ کے مسٹری جبروت کو آپ کے لباس کی ہم آہنگی، آپ کی سطحی موزونیت برقرار رکھے ! آپ خفا نہ ہوں کہ میں بار بار آپ، لکھکر آپ اور صرف آپ ہی کو مخاطب کررہا ہوں ! آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ مجذوب کی بڑ ہے، روئے سخن کسی کی طرف ہو تو میں ہار ا، آپ جیتے۔

اچھا تو آمدم برسر مطلب ! جب مسٹری دنیا میں لباس کے پہننے اور سج دھج کی درستگی میں اسقدر غور و خوض جواز کی صورت رکھتا ہے تو پھر ایک ایسا کام جو زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے - اور جس سے زندگی کی کایا لازماً پلٹ جاتی ہے کس قدر غور و خوض کا محتاج ہونا چاہئے - اس کا تصفیہ خود ہمارے مسٹروں، لباس کے انتخاب میں چھ گھنٹہ صرف کرنے والے مسٹروں کو کرنا چاہئے !

ازدواج کی اہمیت کا کوئی منکر نہیں ہوسکتا اِلاَّ اُس شخص کے جو نہ مرد ہو نہ عورت بلکہ کسی درمیانی درجہ پر فائز ہو اور شکر ہے کہ ہمارے عالم خیال کا مخاطب کوئی ایسا شخص نہیں ہے - ازدواج کسی ادعا سے منتج ہو یا نہ ہو، اس سے شخصیت کا بدلنا یقینی

اور ایسا برحق ہے جیسا قیامت کا آنا۔ انسانی زندگی کا یہ وہ اہم ترین واقعہ ہے جو قوتِ خیال، خصائل، خوشی، اور طریق معاشرت کو بدلے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یا تو خیالات بلند ہوتے اور قوت پاتے ہیں یا پست اور کمزور ہوتے ہیں۔ یا تو خوشی میں اضافہ ہوتا ہے یا کمی۔ نئے فرائض، نئے اغراض، نئی عادتیں، نئی امیدیں، نئے افکار، نئے آلام، اور نئی خوشیاں اس کی غاشیہ بردار ہیں جو انسانی سرشت میں حلول ہو کر سابقہ زندگی کا روپ بدل دیتی ہیں۔ اگر اس بیان کی صداقت مطلوب ہو تو آپ خود اگر متاہل ہوں، ورنہ کوئی اور متاہل خانہ آباد مسٹر، تھوڑی دیر کے لئے اپنی سابقہ اور حالیہ زندگی پر غور کریں! چودہ طبق نظر میں روشن نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ!

ازدواج ایک نہایت مستحکم اور مہتم بالشان پیماں ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ پیماں بلا آؤ تاؤ دیکھے بے خبری اور بےفکری سے کر لیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟

ہمارے مسٹروں، معمولی سے معمولی سوال کا صحیح جواب دینے کے ناقابل مسٹروں، کو ان غیر متوقعہ سوالات کا ٹھونسنا ناگوار ہوگا مگر وہ گھبرائیں نہیں! جواب دینے کا منصب میرا ہے! صرف وہ سنتے جائیں اور غور سے سنتے جائیں!

ہاں تو یہ پیمان اکثر بلا سوچ بچار کے کیوں کر لیا جاتا ہے؟ اس کی وجہ شاید آپ کی سمجھ میں کچھ نہ ہو اور یقیناً کچھ نہ ہوگی اگر آپ مسٹر ہیں، مگر درحقیقت اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان اسباب کی تفصیل بتانے کے لئے ہم کو کئی صفیں ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ آپ کہینگے کہ یہ مضمون نہ ہوا میدان کارزار کا نقشہ یا کسی تھیٹریکل کمپنی کا پنڈال ہوا۔ خیر! آپ جو چاہیں خیال کریں، ہم تو اپنی دُھن کے پکے ہیں!

صفِ اوّل ہے۔ یہاں وہ اشخاص نظر آتے ہیں جو ہوائے نفسانی، متاعِ خرد لوٹنے والی ہوائے نفسانی کی زبردست اور ناقابل مدافعت تحریک کے باعث

ایسی عمر میں شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جب کہ زندگی محض خیالی داستان یا گیت سے بڑھکر اہمیت نہیں رکھتی ہے ۔ بعض جہاندیدہ لوگ (آپ کو معلوم کر دینا ضروری ہے کہ میں جہاندیدہ نہیں ہوں اور اس لئے دروغ گو کے جائز اور استحقاقی لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا) یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ایسی شادیوں سے جہل اور بوالہوسی عبارت ہے ۔ اس قول کے قول فیصل ہونے یا نہ ہونے کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تجربہ کی بناء پر اتنا ضرور کہونگا کہ ایک جھوٹ کا عادی انسان ممکن ہے کہ بعض وقت سچ بھی کہہ دے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

صفِ دوم :- یہاں وہ حضرات متمکن ہیں جن کے ازدواج کا سبب محض مال ومتاع کی خواہش یا مرتبہ اور عہدہ کی ہوس ہوا کرتی ہے ۔ ایسے حضرات کو جن میں اگر میرا قیاس غلطی نہ کرے تو زیادہ تر ہمارے مسٹر شریک ہیں) کیا خطاب ملنا چاہئے وہ آپ خود معلوم کر سکتے ہیں ۔

صفِ سوم :- یہ صف اُن اشخاص کی یادگار اور زندہ یادگار ہے جن کے حق میں فریق ثانی سے مغلوب کُن محبت کا پیدا ہو جانا (یہ محبت جائز ہوتی ہے یا ناجائز اس سے بحث نہیں مگر ہاں صورت آخر الذکر کی اکثریت ناقابل انکار ضرور ہے) ازدواج کا سب سے زبردست سبب ہوا کرتا ہے جو دوسرے تمام ضمنی اسباب کو چھپا دیتا ہے یہاں بھی ہم کو زیادہ تر مسٹر ہی کارفرما نظر آتے ہیں ۔ ایسی صورتوں کو مغلوب کُن محبت ! عقل سلب کرنے والی محبت سے تعبیر کرنا کافی ہے ۔

صفِ چہارم :- یہ صف اُن حضرات کے لئے مخصوص یعنے ' رزرو ڈ ' ہے جو محض خواہش ازدواج ہی کے زیر اثر ازدواج پر مجبور ہوتے ہیں ۔ ان کی مختصر مگر جامع تعریف اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ پیٹ بھر کے ...... ہیں ۔ مناسب اور موزوں لفظ کے انتخاب کا حق آپ کو ہے ۔

اب آپ پر واضح ہو گیا ہو گا اور ہو جانا چاہئے کہ اکثر و بیشتر ہمارے مسٹروں کے ازدواج کی علت غائی وہ نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے جو فی الواقع ہونی چاہئے۔ اگر ایسی خانہ آبادی آگے چل کر خانہ بربادی کی مہیب شکل میں مسخ ہو جائے تو آپ کوئی تعجب نہ کریں، برعکس اس کے ایسی خانہ آبادی کا اسم بامسمیٰ بننا بسا حیرت انگیز ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ اکثر مسٹروں کی شادی ایک ایسا فعل عبث ہے جس میں فائدہ تو کچھ نہیں ہاں نقصان بہت سے ہے۔ یہ ایک ایسی قرعہ اندازی ہے۔ جس میں ایک ہزار مسٹروں میں سے نوسو ننانوے کے لئے ہار بالکل متیقن ہے اور شاید ایک کے لئے جیت ہے جو خود مسٹری نقطۂ خیال سے محض اتفاق یعنے "چانس" کہہ کر ٹالدینے کے قابل ہے۔

یہ بات ٹھنڈے دل سے تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ اکثر اوقات ازدواج سے بیشتر دیگر ضروری اور قابل قدر خوبیوں کے مقابلہ میں محض حسن صورت، امتداد زمانہ سے پامال ہونے والے حُسن صورت کو ترجیح بلا مرجح دیجاتی ہے میں سمجھتا ہوں اور آپ بھی میری تائید ضرور کرینگے، کہ محض صورت کی دلکشی، دلربائی، اور دلفریبی اُن اوصاف کے دائرہ سے کوسوں دور ہے جو ازدواج کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری، ازبس ضروری ہیں۔ اِن اوصاف سے ازدواج اپنے عرفِ عام یعنے خانہ آبادی کی حقیقی تعریف میں کبھی داخل ہوا ہے نہ ہو گا۔ ایسے خیالات اور خصائل جن سے عشوہ گری کی تکمیل ہوتی ہے اور جو ایک کشتۂ نازوادا مسٹر، کو گھر کی چاردیواری میں روک رکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں ان خیالات اور خصائل سے ہرگز تعبیر نہیں کئے جا سکتے جن سے متاہلانہ زندگی کے خوشگوار ہونے کی بدرجۂ اتم توقع کی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو اِن اوصاف سے اُن حقیقی مسٹروں کا خون ہو جاتا ہے جو ازدواج سے پیدا ہونی چاہئیں۔

ممکن ہے کہ حُسنِ صورت اور محض حسنِ صورت کی پوجا کرنے والے مسٹروں کے دل میں میری اس گستاخی سے ٹھیس لگے اور جائے تعجب نہیں اگر وہ برافروختہ ہو کر اپنی

مسٹری عدالت، انصاف کا خون ناحق کرنے والی عدالت سے مرتکب گستاخی کے خلاف فردِ قرار داد جرم مرتب کر دیں لیکن اس سے پیشتر کہ ایسی تعزیزی کارروائی کیجائے ہمارے مسٹروں حسنِ صورت کے پرستار مسٹروں کو ذرا غور سے کام لینا چاہیئے! میں اس گستاخی کا ذمہ دار ہیں دور از حال، حسن صورت کو بُرا سمجھنے والا نہیں ہوں۔ خاکم بدہن جو حُسن صورت کی مذمت بیان کرنے کی ٹھانوں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جو شخص حسن صورت جیسی پیاری شئے کو بُرا سمجھے اُس سے خدا سمجھے! کہنا صرف یہی ہے کہ محض صورت کی دلا ویزی اور سطحی خوبی ازدواج کو حقیقی معنوں میں اُس کے عرف عام یعنے خانہ آبادی کا مترادف نہیں بنا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات حُسن صورت سے تاہل کے خوشگوار ہونے میں مدد ضرور ملتی ہے مگر بہت تھوڑی، اسی قدر جس قدر آٹے میں نمک۔ جو مسرت حسن صورت سے حاصل ہوتی ہے اُسکا امتداد زمانہ کے ساتھ زوال پذیر ہوتا جانا ایک قدرتی بات ہے اور اس سے کسی کو انکار ہوا ہے، نہ ہوگا، برعکس اس کے حسن سیرت کی پوری دلفریبی دم واپسیں تک برابر قایم رہتی ہے، اگر ہمارے مسٹروں کی کوتاہ بین نظر میں شادی سے پیشتر اکثر سج دھج، ناک نقشہ، اور رنگ روپ ہی کو دیگر اوصاف ستودہ پر فوق حاصل رہتا ہے تو رہا کرے، اور ایسا ہونا کوئی اچنبہ کی بات بھی نہیں ہے، مگر شادی کے بعد خیالات، اور خصائل یعنے حسن سیرت غیر متوقع طور پر سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی شئے ثابت ہوتا ہے۔ ہے کوئی ایسا جو اس بیان کی واقعی تردید کر سکے الا اُن مسٹروں کے جو ہر واقعی بیان کی مضحکہ انگیز تردید کو مسٹری پوزیشن کا شعار سمجھتے ہیں؟

خانہ آبادی کے لفظی معنی گھر بسنے کے ہیں اور محض ان لفظی معنی پر اعتماد کر کے گھر بسی کی فکر کرنا ایک مہذب انسان کا تقاضائے انسانیت نہ ہونا چاہیئے ہاں ہمارے مسٹروں کے حق میں جو زندگی میں اپنے ہر فعل کا تلخ تجربہ اٹھانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

یہ لفظی معنی اور محض لفظی معنی آئندہ مسرت اور حقیقی لطف کا کبھی نہ پورا ہونے والا وعدہ بن سکتے ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلق ازدواج بے انتہا خلوص اور اعتبار کا تعلق ہوتا ہے۔
اگر آپ ذی ہوش ہیں، نیز اور غیر متاہل بھی تو ازدواج کو زندگی کا ایک بہترین اور اہم ترین واقعہ جانئے مگر تمیز، تقابل، اور ضروری غور و خوض کو اپنے دربار سے رخصتانہ دے کر آنکھیں بند کئے اپنے منشاء کی تکمیل نہ کیجے ورنہ یاد رکھئے خانہ آبادی کے بھیس میں خانہ بربادی آپ کے خیر مقدم کو تیار رہے۔ یہاں میرا روئے سخن سٹروں سے نہیں ہے۔ سٹری دنیا سے تو ہوش و خرد، اور مآل اندیشی کو دیس نکالا ہمیشہ کے لئے مل چکا ہے۔ ان کی بگڑی خدا ہی بنائے تو بنائے۔
میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مجذوب کی بڑ ہے خانہ آبادی کی خوبیاں میں بالتفصیل بیان نہ کر سکا۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر خامہ فرسائی کی کوشش کرنا حقیقت کے سمندر ذخار کے ساحل پر کھڑے ہو کر سنگریزے چننے سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض اوقات محض ناعاقبت اندیشی کی بدولت ہمارے سٹروں کی خانہ آبادی کس طرح خانہ بربادی پر منتج ہو جاتی ہے۔ اب میں آپ سے سمع خراشی کی اور سٹروں سے گستاخی کی معافی مانگتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔
پھر ملینگے اگر خدا لایا۔

نظم المطالع

از جناب مولوی سید رفیع الدین ضیاء الدین صاحب ضیا جج ہائیکورٹ حیدرآباد

امروز در زمانہ کجا خرمی بکام | جز بارگاہِ حضرتِ آصف شہ نظام

گردونِ حکمتست و سیاست ہلال او | بدری کہ نقص رانہ پزیرد کمال او

باغیست ملک او کہ خزانش حریف نیست | گر بلبلی بہ شکوہ سراید شریف نیست

ماموں کہ در زمانہ نظیری نداشتے | اندیشۂ عناد وزیری نداشتے

عُثمان یگانہ می دہد انجام کار ملک | چوں گلشن از گل است ز مالک بہار ملک

ظل آلہ جامعِ دنیا و دیں توئی | شاہاں چو خاتم اند و نجاتم نگیں توئی

نجم سعادتِ تو درخشندگی کند

در زیر سائۂ تو ضیا زندگی کند

خدا کے یہاں سینیارٹی

از جناب مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر

اک عہدہ دار کی عادت تھی اپنے دفتر میں — ترقی دیتا اسی کو جو سینیر ہوتا
ہمیشہ رہتے تھے محروم جونیر اس سے — کبھی اضافہ نہ کرتا تھا ایک دمڑی کا
سمجھتا تھا وہ دیانت کو ایک فعل عبث — امانت اس کی نظر میں تھی ایک خبطِ بیہودہ
کمال و علم و لیاقت کی اس کو قدر نہ تھی — پڑے تڑپتے تھے ہشیار و لایق و یکتا
پرانے جتنے سند یافتہ تھے، نالایق — ترقی ملتی تھی ان کو بغیر چون و چرا
خدا کی شان۔ یہ ایک روز اس نے دیکھا خواب — کہ آ گئی ہے قیامت، ہوا ہے حشر بپا
نکل کے آئے ہیں مردے، تمام قبروں سے — خدا کے آگے ہے حاضر ہر ایک چھوٹا بڑا
اس انتظار میں ہر شخص ہے سراپا چشم — کہ دیکھئے ملتی ہے کس کس کو جنت الماوا
یکایک آئی یہ آواز، ایہا الحضرات — بہشت اس کو ملے گی جو سینیر ہوگا
یہ لفظ سنتے ہی ہاتھوں کے اڑ گئے طوطے — رہے نہ خوف کے مارے کسی کے ہوش بجا
جب آیا مسئلہ سینیارٹی درپیش — جھپٹ کے لائے سول لسٹ کاتبانِ قضا
کسی نے دیکھا نہ صدق و صفا نہ فسق و فجور — جو دیکھا بھی تو قدامت کا ایک دم چھلا
کسی کے کام نہ کچھ آ سکے یہاں اعمال — بس ایک لکڑی سے ہانکا گیا گدھا گھوڑا
جو چھوٹے بچے تھے جنت میں کس طرح جاتے — گریڈ ان کا تو سب سے ہی نچا گیا گذرا
ملی نہ خلد جوانانِ پارسا کو بھی — کہ نمبر ان کا بھی دیکھا تو جونیر نکلا
پرانے پاپی تھے از بس کہ سینیر سب میں — ملے بہشت میں ان کو مراتب اعلے

غزلیات

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم

جان دی میں نے تو، اپنا مجھے جو یاں سمجھا
ہائے سمجھا بھی تو کس وقت وہ ناداں سمجھا

آپ اپنے کو وفاؤں میں پشیماں سمجھا
مجھکو اتنا نہ سمجھنا تھا مگر ہاں سمجھا

چھوڑ دوں چاہ تو چھپ جاؤں مصیبت سے مگر
سب سے مشکل ہے یہ سب جسے آساں سمجھا

جان تو جان کے لیتا ہے۔ یہ میں جان گیا
وہی ناداں ہے جس نے تجھے ناداں سمجھا

تجربے سے تو نہیں سمجھنا تھا ری ہاں کو
منفعل شوق! انہیں کو بھی تری ہاں سمجھا

اور ہی ہے یہ نظر نیچی نگاہیں کیسی؟
خود پشیمان ہوں کیوں تجھکو پشیماں سمجھا

میں نے جو کچھ تجھے سمجھا ہے۔ وہ سمجھا تو نے؟
یہ تو سمجھا! مجھے کیا تو نے مری جاں سمجھا؟

وسعت آباد جہاں تنگ ہے مجھ وحشی پر
اس بڑے گھر کو بھی، دل نے مرے زنداں سمجھا

ہم تو سب سچ سمجھ کر ترے دیوانے ہیں
دوست کس نے تجھے او دشمن ایماں! سمجھا

کب کسی چاہنے والے کی خبر لی تو نے؟
اپنی زلفوں کے سوا کس کو پریشاں سمجھا؟

کوئی پوچھے مرے دل سے ترے بھولپنے کو
آپ ناداں ہیں۔ وہ جس نے تجھے ناداں سمجھا

شوق میں ہو گئی آپے سے زلیخا باہر
دامن یار کو بھی - اپنا گریباں سمجھا

اب مری بات سمجھ میں نہیں آتی کیا تو؟
یاد؟ وہ وقت کہ ہر بات پہ "جی ہاں سمجھا"

ہم نے بھی حضرت غالب کی طرح سے کیفی!
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

از مولوی سید نوازش علی صاحب لمعہ

ترے سوا کوئی پیش نظر نہیں
یہ تیر درد ہے درد جگر میں نہیں

سرشک غم ہے وہ کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
گہر وہ کیا ہے جو آب گہر گہر میں نہیں

تصور مژۂ یار کی خلش ہی رہی
یہ ایک خار ہے تار نظر میں نہیں

سیاہی شب غم ہی رہی مرے گھر میں
سحر ہوئی بھی تو نور سحر میں نہیں

علاج کر کے مسیحا نے بوٹے ہیں کانٹے
خلش یہی ہے کہ درد جگر میں نہیں

عدم کی راہ میں چھوڑا ہے ساتھ جسم نے بھی
چلا ہوں اور کوئی ہم سفر سفر میں نہیں

وہ آج آئے ہیں مقتل میں کس کے اکت سے
کمر تو باندھے ہیں لیکن کمر کمر میں نہیں

کمال کا جو نہ ہو لمعہ قدرداں کوئی
کمال کی کوئی خوبی ہنر ہنر میں نہیں

از ڈاکٹر سید علی احمد حسینی ایچ ایم ایس وکیل خورشید

تری ہر جفا میں ادا دیکھتے ہیں
ترے ظلم ہر دم سوا دیکھتے ہیں

زمانہ کا کچھ رنگ بدلا ہے ایسا
جسے دیکھتے ہیں خفا دیکھتے ہیں

اوائل میں سمجھے تھے ہر شئے کو باقی
اواخر میں سب کو فنا دیکھتے ہیں

مری جاں مرے درد کی کچھ دوا کر
ترے ہاتھ میں ہم شفا دیکھتے ہیں

تو زہر ہلاہل ہی دے کیوں نہ ہمکو
مگر ہم تو اس کو دوا دیکھتے ہیں

اٹھا جب کہ آنکھوں سے پردہ خودی کا
ہر اک شکل میں ہم خدا دیکھتے ہیں

نہیں نور ظلمت سے خورشید مطلب
بہر حال رب کی رضا دیکھتے ہیں

ضابطۂ اشتہار

(۱) ایک مرتبہ و تین مرتبہ چھپنے والے اشتہار کی اُجرت کامل پیشگی لی جائے گی۔

(۲) بقیہ تمام اشتہاروں کی اُجرت کی ادائی اس طرح ہوگی کہ دو ماہ کی رقم آرڈر کے ساتھ روانہ کی جائے جو دفتر ہٰذا میں بطور ضمانت جمع رہے گی اور ہر ماہ اشتہار معہ رسالہ وی۔ پی۔ کر دیا جایا کرے گا۔

(۳) معاہدہ اشتہار اندرون مدت منسوخ نہ ہوگا۔

(۴) اشتہار کا صرف مسودہ اور نمونہ روانہ کرنا کافی ہے۔

نرخ نامہ

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ یا اس کا جزو
۱۲	۵۸ روپے	۳۰ روپے
۹	۴۴ روپے	۲۵ روپے
۶	۳۰ روپے	۱۸ روپے
۳	۱۴ روپے	۱۰ روپے
۱	۵ روپے	۳ روپے

ٹائٹل کے صفحہ کی اُجرت اُجرتِ بالا سے فیصدی عہ زیادہ

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۲۲)

اُردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابو المکارم محمد انوار اللہ صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدر آباد دکن سے شائع ہوگا

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کیجائے۔

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی۔ سالانہ (صہ) ششماہی (ے) نمونہ ۸ر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ ــــ بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ ــــ نمبر ۷

فہرست مضامین

روزہ

مذہب اسلام جو باوجود اس کے کہ اس کے پیرو مختلف ممالک و اقوام کے اشخاص ہیں، ضرورت کے وقت جن خصوصیات کی بنا پر ان کو آن واحد میں ایک پرچم کے نیچے جمع کر سکتا ہے، ان کے منجملہ ایک خصوصیت روزہ بھی ہے۔

روزہ سے مراد یہ ہے کہ فجر سے غروب تک کچھ نہ کھائیں نہ پئیں مگر یہ تعریف صرف ظاہری ہے روزہ کا خاص مفہوم جو قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے، یہ ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (البقرہ)

مسلمانو! تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے لکھے گئے تھے تاکہ تقویٰ تم میں پیدا ہو (یا تم پرہیزگار بن سکو)۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقرہ)

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لئے سراپا ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے، پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے وہ روزے رکھے، اور جو مریض یا مسافر ہو وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزے رکھ لے، خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو۔ اور روزے اس لئے فرض ہوئے کہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو، اور شکر بجا لاؤ۔

ان آیات سے روزہ کے تین نتائج مترتب ہوتے ہیں :۔

(۱) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ، تاکہ تم متقی بنو،

(۲) لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ، تاکہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی تکبیر و تقدیس کرو،

(۳) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ، تاکہ تم اس نزول خیر و برکت اور اس عطائے فرقان پر خدا کا شکر بجا لاؤ،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کی حقیقت تین اجزا سے مرکب ہے :۔

(۱) اتقا ، (۲) تکبیر و تقدیس ، (۳) حمد و شکر ،

اور جب تک اجزائے مذکور ملحوظ نہ ہوں غایت روزہ مفقود و معدوم ہے ۔

اسلام میں اتقا کا مفہوم تمام دنیاوی آلائشوں سے تمام انسانی کمزوریوں سے، تمام جسمانی خواہشوں سے، اور تمام نفسانی نجاستوں سے، جسم و روح کو پاک رکھنا ہے اور یہی روزے کی حقیقت ہے ۔

گویا روزہ دار کے لئے ضروری ہے کہ :۔

(۱) جسمانی خواہشوں، شہوتوں کو روک دے خواہ وہ کسی حصۂ بدن کے متعلق کیوں نہ ہوں جیسے غذا، مباشرت وغیرہ

(۲) حواس خمسہ اور اعضائے ظاہری کو بدی اور گناہ سے روک دے، جیسے دیکھنا، سننا، کہنا، کرنا چلنا، ان تمام باتوں میں برے افعال سے باز رہے ۔

(۳) دل و دماغ سے ماسوائے اللہ کے، اور خیالات کو قطعاً علیحدہ کرے اور تمام دنیاوی خواہشات سے قطعاً مجتنب رہے ۔

روزہ کی حسب ذیل قسمیں ہیں :۔

(۱) فرض، جو لازم ہیں یعنے صرف پورے ماہ رمضان المبارک کے روزے ۔

(۲) نفل، یہ اختیاری ہیں جو سوائے رمضان کے اپنی خوشی سے رکھے جاتے ہیں۔ ان کی حسب ذیل قسمیں ہیں :۔

الف۔ صوم داؤدی، یعنے ایک دن آڑ کا روزہ

ب ۔ صوم عاشورہ، ماہ محرم کی دسویں کو رکھا جاتا ہے قبل فرضیت رمضان یہ رائج تھا۔

ج ۔ صوم ماہ شعبان ۔

۵ ۔ صوم عرفہ، جو زمانہ حج میں کوہ عرفات اور وادی منا میں رکھا جاتا ہے یہ روزہ دوسرے مقامات میں بھی مسلمان رکھ سکتے ہیں ۔

۸ ۔ صوم ایام البیض، جو ہر ماہ ہلالی کی ۱۲، ۱۳، ۱۴ کو رکھے جاتے ہیں ۔

۹ ۔ ہر دو شنبہ و جمعہ ۔

روزے کے اقسام صدر میں جو روزے فرض ہیں، وہ بتلا دئے گئے ہیں کہ ماہ رمضان المبارک کے ہیں اس لئے قبل ازیں کہ ہم روزہ کے فوائد پر روشنی ڈالیں مناسب خیال کرتے ہیں، کہ ماہ رمضان المبارک کی فرضیت کے خصوصیت کا اجمالاً ذکر کردیں ۔

کلام مجید میں جہاں روزوں کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے :۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ	ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لئے
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ	سر تا پا ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ	پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے وہ روزے رکھے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ رمضان کا مہینہ اور مہینوں سے افضل ہے کہ اس میں وہ روح پرور کلام جس نے صرف تمام عالم ہی کو منور نہیں کیا بلکہ ہم جیسی زار و نزار قوم کو قوی کیا، اور جس نے ۱۳۵۴ برس ہوئے ہیں کہ ہمارے سینوں میں توحید کی آگ روشن کی، اور جس نے ہمارے سر پر خیر الامم کا تاج رکھا، نازل ہونا شروع ہوا ۔

موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے پہاڑ پر چڑھے، اور چالیس روز بدلی کے درمیان خدا کے حضور میں رہے، (خروج ۴۰ ـ ۱۸) اور مسیح علیہ السلام قبل اس کے کہ وہ خدا کی منادی شروع کریں، جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکے پیاسے رہے تھے (متی ۴ ـ ۲) چنانچہ اسی طرح کوہ حرا کا مقدس عزلت نشین (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی ماہ میں آج سے ۱۳۵۴ برس پہلے جب کہ سخت گرمی کے دن تھے، اور شدت حرارت سے سرزمین بطحیٰ کا ذرہ ذرہ تنور بن رہا تھا، بھوکا، پیاسا سر بزانو تھا کہ ہدایت و فرقان کا ایک آفتاب عالم تاب (قرآن مجید) مطلع خطیرۃ القدس سے طلوع ہو کر اس کے سینہ میں غروب ہو گیا اور ماہ رمضان کی تقدیس کی یادگار خود ضروریات ملکیہ سے

مستغنی ہوکر قائم کردی اور اسی لئے ضروری ہوا کہ پیروان ملت اسلامیہ اور متبعین طریقت محمدیہ بھی ان ایام میں مادی ضروریات سے مستغنی رہیں کہ اس توفیق و ہدایت کا شکریہ ادا ہو۔

اس قدر بیان کے بعد ہم روزہ کے فوائد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں انسان کو دنیا میں دو چیزوں کی بہت ضرورت ہے

(۱) بقاء شخصی کے لئے غذا کی اور

(۲) بقاء نوعی کے لئے بیوی کی۔

اب دیکھو انسان تنہا گھر میں بیٹھا ہے، بڑی شدت سے پیاس محسوس ہو رہی ہے، دودھ موجود ہے، برف مہیا ہے، شربت حاضر ہے، کوئی روکنے والا نہیں، مگر پھر بھی اسلام کا روزہ دار فرزند ان چیزوں کے چکھنے کا مطلق ارادہ تک نہیں کرتا۔ اسی طرح بیوی پاس ہے، کوئی چیز مانع بھی نہیں، مگر پھر بھی وہ اس سے محترز ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ نزول قرآن کی یادگار اور حامل قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ حسنہ اور سنت مستحسنہ کی اتباع و تقلید میں روزہ دار ہے اور اس کے مولیٰ کا حکم ہے کہ باوجود ضرورت اور سامان مہیا ہونے کے وہ روزہ کی حالت میں ان چیزوں سے مجتنب رہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے روزہ جیسے بادی النظر میں سخت اور مشکل العمل حکم میں ارشاد کے بعد:-
یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں،
کیا آسانی رکھی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم کو اور مذاہب پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہیئے

نصرانی راہبوں نے رہبانیت کی بنیاد ڈالی، جس کی رو سے شرعی بیاہ ان پر حرام ہوا، ترک آسایش و لذائذ جسمانی ان کی مرغوب عبادت تھی، قربان گاہ، صلیب اور کنواری کے بت کے سامنے گھٹنوں کے بل گھنٹوں تک جھکے رہنا، ہاتھ جوڑے کھڑے رہنا، ایک پاؤں پر کھڑا ہونا، خاص خاص قسم کے تکلیف دہ ریاضتوں میں مشغول رہنا، کئی کئی روز کھانا پینا چھوڑ دینا، زہد و تقویٰ کی انتہا تھی۔

یہودیوں کے ہاں قربانی اس قدر طویل و کثیر رسوم پر مشتمل تھی، جس کے صرف شرائط و ضروریات کا بیان توراۃ کے چار پانچ صفحوں میں مذکور ہے۔ افطار کے بعد ایک وقت صرف روزہ میں کھا سکتے تھے، اس کے بعد سے دوسرے

روزے کے وقت افطار تک کچھ نہیں کھاتے تھے، بغیر کھائے ہوئے اگر بدقسمتی سے نیند آگئی، تو پھر کھانا مطلق حرام تھا، ایام صیام میں بیویوں سے نہیں مل سکتے تھے۔

جینیوں کا فرقہ ناک، کان، منہ بند رکھتا ہے کہ کسی کیڑے کو اذیت نہ ہو، بودھ بھکشو جنگل اور پہاڑوں میں رہتے تھے، اور گھانس اور پتوں پر گذر کرتے تھے۔ ہندو جوگی، چلے کھینچتے ہیں جن میں کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے کبھی کبھی ایک دو لقمے کھا لیتے ہیں اور سالہا سال تک کھڑے رہنا، شدید دھوپ میں قیام کرنا، گرمی کے دنوں میں آگ کے شعلوں کے دائرہ میں بیٹھنا، جاڑوں میں برہنہ تن رہنا، دس دس برس تک ایک ہاتھ ہوا میں بلند رکھنا، سالہا سال تک ایک نشست پر قائم رہنا، ایک ایک چلہ تک ترک اکل و شرب کرنا، تقرب الی اللہ کے راستے تھے۔

لیکن اسلام ان تعذیب جسمانی و ریاضتہائے شاقہ کو دین فطرت کے خلاف سمجھتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں جا بجا ارشاد ہوا ہے:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی امر کا مکلف نہیں کرتا

اسلام نے اوقات روزہ کی تحدید کی، اور اس کی مدت صرف صبح سے شام تک قرار دی، رات کو سو جانے کے بعد کھانا حرام تھا، اس کو منسوخ کیا، ایام جاہلیت میں روزہ کے ایام میں بیوی سے مقاربت حرام تھی، اسلام نے اس حکم کو بھی صرف وقت صوم تک محدود رکھا، (جو صبح سے شام تک کا زمانہ ہے) قدیم شریعتوں میں بوڑھے، کمزور، معذور، بیمار مستثنیٰ نہیں تھے، اسلام نے ان تمام اشخاص کو مختلف طریق سے مستثنیٰ کر دیا۔

عورتوں کے فطری عذرات کا لحاظ ضروری تھا، چنانچہ ایام عادیہ، ایام حمل اور ایام رضاعت میں ان کے روزے معاف کئے اور ان کو، اور دنوں میں قضا رکھنے کی اجازت دی۔ بھول چوک اسلام میں مغفور ہیں، اسی طرح وہ افعال جو گو منافیٔ صوم ہیں، لیکن انسان سے قصداً سرزد نہیں ہوتے، بلکہ وہ اس میں مجبور ہوتا ہے ناقض روزہ نہیں مثلاً محتلم ہونا وغیرہ!

ہے کوئی ایسی سمجھ دار ہستی جو اپنے آپ کو انسان سمجھے اور ان ناقابل تردید حقایق کا صدق دل سے اعتراف نہ کرے؟ اگر تم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اس وقت سے جب رات کا تاریک خط، صبح کے سپید خط سے ممتاز

ہو جائے، ابتدائے شب تک، نہ کھاؤ نہ پیئو، خدا کی عبادت کرو، کسی کی برائی نہ کرو، لغو و شر سے پرہیز کرو، کذب اور جہالت کو ترک کرو، یہاں تک کہ اگر کوئی آمادۂ شمشیر زنی ہو تو کہہ دو کہ میں روزہ میں ہوں، اللہ اللہ غور کرو کہ تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور طہارت روح کے لئے اس سے بہتر، سادہ، آسان، ہمہ گیر احکام کوئی اور مذہب پیش کر سکتا ہے۔ سُبُّوحٌ، قُدُّوسٌ، رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوحِ۔

اس کے علاوہ روزے کے فوری فوائد اسی دنیا میں جو حاصل ہوتے ہیں یہ ہیں:۔

(۱) نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

(۲) مزاج میں عجز و انکسار پیدا ہوتا ہے۔

(۳) صحت جسمانی کے لئے مفید ہے یعنی:۔

رطوبات ردیہ مولد امراض زائل ہوتی ہیں، اشتہا و ہاضمہ اعتدال کی حالت میں رہتے ہیں، اور قویٰ اپنا اپنا کام بخوبی کرتے ہیں۔

(۴) بھوکوں اور پیاسوں کی مصیبتوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۵) بیکسوں کی ہمدردی کی تحریک ہوتی ہے۔

(۶) بھوک پیاس کے برداشت کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے، جو اسلام کا مقصد اعظم ہے کہ مسلمان چست چالاک رہیں نہ کہ شکم پرست کہ تھوڑی دیر بھی بھوک پیاس کی برداشت نہ کر سکیں۔

(۷) صابر و رضا بجا بننے سے چستی و چالاکی بڑھتی ہے۔

(۸) اخلاقی حالت کی اصلاح ہوتی ہے۔

(۹) قوائے شہوانی و غضبی اعتدال پر آتے ہیں۔

اب رہا اخروی اجر تو اس کے متعلق صرف یہ ارشاد ربانی لکھ دینا کافی ہے:۔

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ، روزہ میرے لئے ہے، میں اس کی جزا ہوں، اسی لئے حضرات صوفیہ کے نزدیک روزہ کی حقیقت ہی کچھ اور ہے، مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:۔

ہست ظاہر روزہ امساک طعام ٭ روزۂ معنی توجہ داں تمام
ایں بود آں بندہ کہ چیزے کم خورد ٭ داں بہ بندد چشم و غیرے ننگرد
ہست گر بہ روزہ دلہا نہ اصام ٭ خفتہ کردہ خویش بہر عیدم
کردہ بد زیں [illegible] قوم را ٭ کردہ بدنام اہل جود و صوم را

سلمان ساؤجی

(از جناب مولوی سید خورشید علی صاحب)

گزشتہ سے پیوستہ

ان اشعار میں سلمان نے بیان کیا ہے کہ تقریباً چالیس برس تک انھوں نے اپنے اس مربی سلطان کی مدحت سرائی کی، اور اس کی توصیف کا آوازہ مشرق و مغرب میں بلند کرتے رہے ہیں، اب ضعیف و ناتوان ہو گئے ہیں، پاؤں میں لنگ آ گیا ہے، بینائی میں ضعف پیدا ہو گیا ہے، اس لئے دربار کی حاضری سے معذور ہیں، اور خواہش ہے کہ باقی ایام حیات سلطان کی دعاگوئی میں بسر ہوں، اب تک تو شعرا کی مملکت کی بادشاہی کی، اب آرزو ہے کہ غریبوں اور فقیروں کے خادم بنیں، یہ تو یقین ہے کہ سلطان ان کا وظیفہ بحال و جاری رکھیں گے لیکن یہ استدعا ہے کہ اس کی مقدار اور ذریعۂ ادائی کا تعین ہو جائے نیز یہ کہ وہ نہایت درجہ مقروض ہیں، اور ادائی کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں اس لئے سلطان سے اس قرض کی ادائی کی درخواست ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان نے جواب میں اس منظوم درخواست پر دو شعر لکھے پہلے شعر میں تو حکم نافذ فرمایا کہ سلمان کا وظیفہ بدستور جاری رہے، دوسرے میں رَے کے قریب ایرین کے قصبہ کی آمدنی بطور جاگیر عطا فرمائی:-

هر چه تا غایت به نام او مقرر، بوده است (۱) همچناں باشد به نام او مقرر، همچناں
ده ایرین که در حدود رَے است (۲) به دهندش که التماس، وے است

مولانا شبلی نعمانی نے سلمان کے تذکرہ کو ایک نہایت مفصل اور جامع تقریظ کے ساتھ ختم کیا ہے جس میں مختلف اصناف سخن میں اس نامور شاعر کے کمالات کی خوبیاں ظاہر کی ہیں، سلمان کا کمال شاعری خاص طور پر قصائد میں نمایاں ہے، سلمان کے قصائد زبان کی صفائی و روانی اور ترکیبوں کی چستی میں نہایت

ممتاز ہیں، ان خصوصیات سے متعلق جو انداز سلمان کے کلام میں ہے، وہ قدما میں موجود نہ تھا بلکہ وہ متوسطین شعرا کا خاص انداز ہے، اس لئے سلمان قدما اور متوسطین میں گویا برزخ ہیں۔

مولنا شبلی نے اپنے اس بیان کی تائید میں ذیل کی مثالیں دی ہیں:۔

خندۂ زد دہنت تنگ شکر پیدا کرد (۱) سخنے گفت لبت لولوئے تر پیدا کرد
بود نایافت میان تو ولیکن کمرت چست بربست میان را و بزر پیدا کرد
پردہ از چہرہ برانداز کہ آں زلف سیاہ در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نو روز نسیم گل رعنا آورد (۲) گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد
شاخ را باغ بنقش کرم طاؤس نگاشت غنچہ را باد بہ تشکل سر ببغا آورد
لالہ از دامن کوہ آتش موسیٰ بہ نمود شاخ بیروں ز گریباں ید بیضا آورد
از پئے خسرو گل ملبل شیریں گفتار نغمۂ بار بد و صوت نکیسا آورد
سرو را باد صبا منصب بالا بخشید لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

مولنا شبلی نے اس کے بعد، سلمان کی کمال شاعری کی وہ مثالیں درج کی ہیں جو دقیق اور نازک مضمون آفرینی سے متعلق ہیں، اس کمال پر متوسطین اور متاخرین شعرا کو فخر ہے۔ ذیل کی مثالیں غالباً کافی ہوں گی:۔

در درج درعقیق لبت نقد جاں نہاد (۱) جنس نفیس بود بجائے نہاں نہاد
قفلے ز لعل بر در آں درج زد لبت خالت ز عنبر آمد و مہرے بر آں نہاد
باریک تر ز مو کمرت را دقیقہ ناگاہ در دل آمد و آمش میاں نہاد

بعد ازیں از گرہ زلف مغاں کن تسبیح (۲) پس ازیں از خم ابروئے بتاں کن محراب
خوش برآ ہمچو حباب از مئے گلگوں و منہ ہیچ بنیاد بریں گنبد گرداں چو حباب

مدتے گردش ایں دائرہ مارا از ہم (۳) ہمچو پرکار جدا کرد و بہم باز آورد

غنچہ را پیش دہان تو صبا خنداں یافت (۴) آنچناں بر دہنش زد کہ دہن پر خوں شد

پا ازیں دائرہ بیروں نہ نہم یک سر مو (۵) گر سراپائے چو پرکار کنندم بدو نیم

مولانا شبلی نعمانی نے سلمان کی شاعری کے جن دوسرے خصوصیات پر بحث کی ہے، ان میں ایک مشکل ردیفوں کی کامیاب ایجاد بھی ہے۔ سلمان کے متعدد طویل قصائد ایسے ہیں جن کی ردیف دست، پائے، رو، بر سر وغیرہ ہے، لیکن ہر جگہ قوافی کے ساتھ نہایت روانی، صفائی اور خوبی سے یہ ردیف نمایاں ہوتی ہے۔

مولانا شبلی نے اس کے بعد سلمان کے قطعات سے بحث کی ہے، ان قطعات کا شاعر کی زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق ہے، اس لئے یہ قطعات غزلیات و قصائد کے مقابل زیادہ تر سلمان کی ذات سے وابستہ ہیں، افسوس ہے کہ بمبئی میں سلمان کا جو دیوان چھپا ہے، اس میں یہ قطعات نہیں ہیں۔

ایک موقع پر سلطان نے سلمان کو ایک سیاہ گھوڑا مرحمت فرمایا، سلمان اس رنگ کے گھوڑے کو پسند نہ کرتے تھے، انھوں نے چاہا کہ اس کے عوض دوسرے رنگ کا گھوڑا عنایت ہو، داروغۂ اصطبل نے اس کی اجازت نہ دی، اس پر ذیل کا قطعہ اپنے مربی و قدرداں سلطان کی خدمت میں گذرانا۔

شاہا مرا بہ اسپے موعود کردہ بودی — در قول پادشاہاں قیلے دگر نباشد
اسپے سیاہ و پیرم دادند من برآنم — کاندر جہاں سیاہی زاں پیر تر نباشد
آں اسپ باز دادم تا دیگرے ستانم — درصورتیکہ کس را ازیں سرخبر نباشد
اسپ سیہ بدادم رنگ دگر ندادند — آرے پس از سیاہی رنگ دگر نباشد

سلمان نے ایک اور قطعہ میں اس قسمت زدہ گھوڑے کی ہجو کی ہے:-

شاہا امید بود کہ خواہم بہ دولتت — بر مرکبے بلند و جواں در واں نشست
اسپیم و پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند — اسپے نہ آنچناں کہ توانم براں نشست
چوں کلک مرکبے سیہ و ست و لاغر ست — جہل مرکب ست براسپے چناں نشست
از بندہ مہتر ست بہ سی سال راستی — گستاخی است بر زبر مہتراں نشست

ایک قطعہ میں سلمان نے دربار میں حاضر ہونے سے معذرت کی ہے۔ عذر یہ ہے کہ آنکھوں میں آشوب ہے، اور اگرچہ سلطان کے آستانہ کی خاک سرمۂ چشم ہے لیکن چشم بد کو بارگاہ سلطان سے دور ہی

رہنا چاہئے :۔

خسروا، خاک درگہ تو مراست — از غبار زر و در نیکو تر

لیک در عین حالتے کہ مراست — غیبتم از حضور نیکو تر

حال چشم بد است دور از تو — چشم بد از تو دور نیکو تر

اسی طرح ایک اور موقع پر درد پا کی وجہ سے حاضر دربار نہ ہونے کی پر لطف پیرایہ میں عذر خواہی کی ہے :۔

بہر استقبال شاہ از فرق و سر کردم قدم
خواستم تا او بدرگاہ ہمایوں آورم

درد پایم گشت ازاں مانع کہ آرم دردسر
من کہ درد پائے دارم در دسر چوں آورم

خاتمہ پر مولانا شبلی نے سلمان کی بدعات سے بحث کی ہے اور خاص طور پر بتلایا ہے کہ سلمان نے صنعت ایہام کو کس کمال کے ساتھ برتا ہے۔ تمام تقریظ و تنقید کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قصیدہ گوئی میں سلمان کا شمار مشہور اساتذہ اور کاملان فن میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہایت پاکیزہ خوش فکر اور طباع شاعر تھے، ایک حد تک ان میں جدت بھی تھی، لیکن ان کے کلام میں گرمی، جذبات سوز و گداز اور اثر کی وہ شدت نہیں، جو کسی شاعر کی شہرت اور منزلت کو اس کے زمانہ اور ملک کے حدود سے متجاوز کر دیتی ہے :۔

یہ ہے پورا ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات فارسی (۱۲۶۵ء تا ۱۵۰۲ء) کے اس باب کا جو "سلمان ساوجی" سے متعلق ہے۔ اس کے بعد اب فاضل محترم مرزا عبداللہ بن عبد الغفار تبریزی معلم زبان فارسی مدرسۃ السنۂ شرقی ماسکو (روس) کے مختصر، دلچسپ مضمون کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین رسالہ "ترقی" ہے :۔

(پیدائش ۶۹۲ھ - وفات ۷۷۹ھ مطابق ۱۲۹۱ء - ۱۳۷۷ء)

آٹھویں صدی ہجری میں جو کہ فضل و ہنر کی غیر معمولی بارش کے لئے مشہور اور عقد ثریائے حافظی سے موسوم ہے، ایران کے مشہور شعرا کے منجملہ، غزل کہنے میں۔ حافظ کے بعد سب سے پہلا درجہ خواجہ جمال الدین سلمان ساوجی نے حاصل کیا تھا جو حافظ سے بھی دس سال قبل سے غزل کہتے تھے۔

سلمان ساوجی کا کمال فن اور بلند و برتر درجہ جو ایران کے ادبیات کی تاریخ میں انہیں حاصل ہے، مسلمہ ہے۔ اس سے نہ کسی کو انکار ہو سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی اعتراض۔ آٹھویں صدی ہجری میں جب کہ ایران کے جنوب میں خاندان آل مظفر کی سلطنت میں بمقام شیراز خواجہ شمس الدین محمد حافظ غزل کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے، ایران کے شمال غرب میں بعہد سلطنت جلائریاں، تبریز میں خواجہ جمال الدین سلمان ساوجی نے غزل سرائی کے ملک کو مسخر کر رکھا تھا۔

لیکن آئندہ نسلوں میں ان دونوں صاحب فضل و کمال شعرا کی شہرت ایک ہی طرح کی قائم نہ رہی، یہاں تک کہ آج تمام ایران میں کوئی صاحب ذوق ایسا نہیں مل سکتا جو حافظ سے واقف نہ ہو دیوان حافظ نہ صرف ایران یا دیگر ممالک میں متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔ بلکہ حافظ کی غزلیں دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں لیکن سلمان ساوجی کا دیوان خود ان کے وطن میں بھی مکمل طور پر طبع نہیں ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ کیوں؟ تو اس کا جواب شعرائے ایران کی ستائش اور ان کی اس طرح کی قسمت کے متعلق جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے یہ دیا ہے:۔

"ایرانیوں نے قدیم شعرا میں سے سات شاعروں کو پسند اور منتخب کر لیا ہے"
"حالانکہ باقی شعرا میں کئی ایک ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ بلند مراتب رکھتے ہیں"

سلمان ساوجی کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ نہایت خوشخط مدرسۃ السنۃ شرقی لازاروف واقع ماسکو کے کتب خانہ میں ۶۷۸ نشان پر موجود ہے۔ بوجہ کامل ہونے کے یہ نسخہ نہایت نادر اور قیمتی ہے یورپ کے بہترین کتب خانوں میں جو قلمی نسخے کلیات سلمان ساوجی کے محفوظ ہیں ان کے متعلق جو یادداشتیں مرتب اور شائع ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتب خانہ مدرسہ شرقی ماسکو کے اس نسخہ کو تمام دوسرے نسخوں پر فوقیت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس نسخہ پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ مگر رسم الخط

وغیرہ اکثر علامتوں سے اس کا زمانہ اواخر عہد سلطنت تیموریہ یعنی پندرھویں صدی کے اواخر یا ابتدائے سلطنت صفویہ یعنی سولھویں صدی کے اوائل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہو تو ظاہر ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد ہی کا ہے۔

کتاب خانہ مدرسۃ السنہ شرقی ماسکو میں ایک اور مطبوعہ نسخہ بھی موجود ہے۔ لیکن اس پر بھی سال طبع درج نہیں ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ سنہ ۱۸۹۰ء میں بمقام بمبئی طبع ہوا ہے۔ اگرچہ کہ اس کو کلیات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لیکن کامل ہونے میں قلمی نسخہ سے یہ کسی طرح بہتر نہیں ہے۔

پطروگراد (روس) کی انجمن دانش کے رکن رکین پروفیسر آلکسی وسہ لووسکی کے مدرسۃ السنۂ مشرقی ماسکو کی مدرسی ادبیات روسی پر منتخب و مقرر ہونے کی تیسویں سالگرہ کے جشن کے موقع پر سنہ ۱۹۱۴ء میں اس فاضل بزرگ کے جملہ رفقاء اور شاگردوں نے ایک "مجموعہ" موسوم بہ "الشرقیات" مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ کے لئے میں نے سلمان ساوجی کی بیس غزلیں متذکرۂ صدر قلمی نسخہ سے انتخاب کی تھیں اور ان کی مطبوعہ نسخہ سے مطابقت کرنے کے بعد ان کا روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ مع فارسی متن کے اس مجموعہ میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد سلمان ساوجی کی داستان "جمشید و خورشید" کو جو نہایت لطافت و خوش اسلوبی کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس قلمی نسخہ سے میں نے مرتب کیا تھا اور اب اس کو طبع کرانے کا قصد تھا لیکن افسوس ہے کہ یورپ کے عالمگیر جنگ اور روس کے مسلسل انقلابات نے اس ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا۔

اس موقع پر خواجہ سلمان کی دو غزلیں بطور نمونہ محترم ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:-

اول

محتسب گوید کہ بشکن ساغر و پیمانہ را

غالباً دیوانہ می داند من فرزانہ را

بشکنم صد عہد و پیماں نہ شکنم پیمانہ

ایں قدر تمیز ہست آخر من دیوانہ را

گرچہ بنیاد مے و معشوق ویراں کردہ اند

کردہ ام وقف مے و معشوق ایں ویرانہ را

ما ز بیرون خمستان فلک می میخوریم

گو بر انداز ند بنیاد خم و خمخانہ را

عقل را با آشنایاں درش بیگانگی ست

ساقیا در مجلس ما رہ مدہ بیگانہ را

جام دردے دہ بمن و زمن بجائے می ستاں

ایں رواں روشن و جامے بدہ جانانہ را

سرخیاں گرم است شمع مجلس ما راز می

کز سرگرمی نہ خواہد سوختن پروانہ را

ما ز جام ساقی مستیم کز شوق لبش

درمیاں خون ست دایم ساغر و پیمانہ را

راست می خواہی نخواہد کرد سلماں ترک می
ناصحا افسوں مدم واعظ مگو افسانہ را

دوم

امشب من و تو ہر دو مستیم ز مے اما
تو مست مے حسنی من مست مے سودا

از صحبت ما با تو برخاست بسے فتنہ
دیوانہ چو بنشیند با مست بود غوغا

آں جان کہ بغم دادم از بوئے تو شد حاصل
آں عمر کہ گم کردم در کوئے تو شد پیدا

اے دل بہ رہ دیدہ کردی سفر از پیشم
رفتی و نمیدانم حال سفر دریا

انداخت قدت دل را شکست بیکبارش
چوں رہ شکندا و آخر افتاد از آں بالا

تا چند زنم حلقہ در خانہ بغیر از تو
چوں نیست کسی دیگر برخیز و درم بکشا

از بوئے تو من مستم ساقی مدہم ساغر

بگذار کہ می ترسم از درد سر فردا

در رہ گزر مسجد بر مصطبہ بنشستم

بگرفت مرا دامن رندے کہ مرو زینجا

نقشے کہ تو می جوئی در کوئے مسلمانی

من یافتہ ام آں را در میکدۂ ترسا

---

(۲)

نطشے کا فلسفۂ معاشرت

(از جناب مولوی سید وہاج الدین احمد صاحب، بی۔ اے، بی۔ ٹی)

گزشتہ صحبت[1] میں ہم ارتقائے حیات کے متعلق نطشے کے خیالات پیش کر چکے ہیں۔ اس مضمون میں معاشرت اور تمدن کے متعلق اس کے آراء کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس سلسلۂ مضامین کو نطشے کے فلسفۂ ارتقا سے شروع کرنے کی ایک خاص وجہ ہے، اور وہ یہ کہ حیات کی جو تعریف اس نے کی ہے، اور ارتقائے انسانی کا جو نصب العین اس نے مقرر کیا ہے (یعنی انسان اعلیٰ) یہ دونوں اس کے فلسفہ میں اولیات کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب کبھی دوسرے عمرانی یا اخلاقی مباحث پر نطشے قلم اٹھاتا ہے، تو یہی دو اصول اس کے افکار و معتقدات کا سرچشمہ نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ارتقا کے متعلق اس کے خیالات پہلے ظاہر کر دئے گئے، تاکہ ان کی روشنی میں اس کے دیگر خیالات کا جائزہ بخوبی لیا جا سکے، اور ان کی صحت یا غلطی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

نطشے کا خطاب عوام سے نہیں بلکہ خواص سے ہے اگر تم نے نطشے کے فلسفۂ ارتقا کو سمجھ لیا ہے، اور "انسان اعلیٰ" کے متعلق اس کی تلقین کو غور سے سنا ہے، تو تم کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس میں اور دوسرے فلاسفہ میں اصلی باعث اختلاف اس کی "انفرادیت" اور ان لوگوں کی "جمہوریت" ہے۔ دوسرے فلاسفہ غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ جدوجہد حیات کا مقصد "کثیر ترین" افراد کی خوشی ہے یا ہونا چاہئے، **اسپنسر** نے کثیر ترین راحت کو زندگی کا مطمح نظر قرار دیا، اور **بنتھم** نے "اکثر سعادت بہ اکثر افراد" کو اپنے فلسفہ اخلاق کی بنیاد بنایا، لیکن **نطشے** کا پیغام ان سب سے الگ تھا، اس نے اپنے آپ کو "انسان اعلیٰ" کا حامی بنایا اور جمہور سے

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ ترقی جلد ۸ نمبر ۵ بابتہ ماہ رجب ۱۳۵۱ھ۔

بحث نہ رکھی۔ ریت کے ڈھیر میں سے سونے کے ریزوں کو چن لینا ، اور ان کی قدر افزائی کرنا ، یہ اس کا مقصد تھا۔ صاف لفظوں میں یوں کہو کہ اگر دیگر فلاسفہ "حامیان جمہور" کہے جائیں تو نطشے کا نام "حامی انسان اعلیٰ یا خواص" ہوگا۔

نطشے کی اس رائے کے جان لینے کے بعد تمہارا اس کی طرف سے بدگمان ہو جانا مقام تعجب نہیں، اور در اصل جو شے اس کی بدنامی کا سب سے بڑا سبب بنی، وہ اس کی یہی تلقین تھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ محض اس تلقین کی بنا پر نطشے کو معتوب بنانا کس حد تک جائز ہے؟ اس سے تو تم انکار نہیں کر سکتے کہ بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز جو ہے، وہ یہی ہے کہ اعلیٰ اور منتخب افراد کو اپنے منتہائے کمال پر پہونچنے کا موقع دیا جائے، یہ حقیقت اس قدر صحیح ہے کہ اس کے ثبوت میں مثالیں پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی ، ہر شخص بجائے خود دیکھ سکتا ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے والی وہی قومیں ہوی ہیں ، جو "جوہر شناسی" اور ان جواہر کی قدر افزائی کافی طور پر کرتی ہیں۔ جن لوگوں کو آج تم "ابطال زمانہ" کے نام سے یاد کرتے ہو، یہ وہی لوگ ہیں، جن کے جوہر کو زمانے نے پرکھا اور پھر اس کی قرار واقعی قیمت لگائی ، آج بھی خدا معلوم کتنے جوہر قابل محض اس وجہ سے معدوم ہیں کہ تاریکی سے نکال کر ان کو روشنی میں لانے والا کوئی نہیں ملتا ، اور کتنی ہی ہستیاں جو افق قومی پر آفتاب مہتاب بن کر چمکتیں محض قوم کی ناشناسی کی وجہ سے گمنام ہیں۔ غرض یہ کہ اگر دنیا اپنے منتخب افراد کی حفاظت نہ کرے ، اور عروج و ترقی کے مواقع سے انھیں محروم کر دے ، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ زمانہ کی رفتار ترقی ایک دم سست پڑ جائے جس کو تم قوموں یا ملکوں کی ترقی کہتے ہو وہ درحقیقت چند افراد کی ترقی ہے ، کسی قوم کے جملہ افراد یا کسی ملک کے تمام باشندے فرداً فرداً ترقی نہیں کرتے ، اسی حقیقت کو سمجھ کر نطشے نے منتخب افراد کو اپنا مخاطب قرار دیا ، اور ان کو ترقی کی تلقین کرنے لگا ، لیکن دنیا اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہی ، اور جمہور نے نطشے کو مطعون بنایا۔

نظر انصاف سے دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ نطشے کے متعلق رائے قائم کرنے میں انصاف سے کام

نہیں لیا گیا ، اگر میں چند خاص آدمیوں کو مخاطب کر کے کوئی رائے دوں ، تو تمہارا یہ خیال کہ میری رائے تمام آدمیوں سے متعلق ہے ، صریح بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ صحیح و تندرست آدمیوں کو جو نصیحت کی جاتی ہے ، کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کا انطباق سب انسانوں پر ہو سکتا ہے؟ نطشے کے ساتھ بالکل یہی سلوک کیا گیا ، معترضین نے جوش مخالفت میں یہ تو نظر انداز کر دیا کہ اس کے ہدایات و نصائح خاص اور چیدہ افراد سے متعلق ہیں ، اور یہ قیاس کر کے کہ وہ تمام دنیا کے لئے شاہراہ عمل تجویز کر رہا ہے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دئے ، ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ نطشے کے بعض بعض خیالات ایسے ہیں کہ جن کو اگر ہر شخص عملی طور پر کام میں لائے تو یقینی برا نتیجہ پیدا ہو ، مثلاً ایک موقع پر وہ " رحم " کی برائیاں گنواتا ہے ، اور اپنے مخاطبین کو اس سے احتراز کرنے کے لئے کہتا ہے ، اب اگر تمام لوگ اس نصیحت کو اختیار کر لیں ، یا یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ نصیحت سب لوگوں کے لئے یکساں طور پر قابل عمل ہے تو اس تلقین کا کیا حشر ہو ، لیکن نہیں خود نطشے نے اُن لوگوں کی صراحت کر دی ہے جن کو اس نصیحت پر چلنا چاہئے ، بہرحال انصاف سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ غلطی نطشے کی نہیں ، بلکہ ان لوگوں کی ہے ، جو اس سے بھی جمہوریت کے متمنی ہیں ، اس کا خطاب اکثر چیدہ چیدہ افراد سے ہوتا ہے ، اور اس میں قباحت ہی کیا ہے؟ اختلاف استعداد خود اختلاف مساعی کا متلزم ہے ، ہر شخص خارزار ہستی میں کامیابی سے سفر کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا ،

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

جن لوگوں سے اس کا خطاب ہوتا ہے ، ان کے لئے وہ بے شک قابل عمل ہے ، لیکن اگر آنکھ بند کر کے اس کی ہر تلقین کو صحیح و مریض ، قوی و کمزور ، نیک و بد ، کارآمد و ناکارہ غرض کہ سب افراد کے لئے ایک شاہراہ قرار دے لو ، تو یہ ہرگز درست نہیں ہے ، یہ تو خیر ایک مثال تھی ، ورنہ نطشے کے متعلق جتنی بدگمانیاں ہیں ، سب اسی قسم کی ہیں ، اگر وہ منتخب افراد کو مخاطب کرتا ہے ، تو لوگ سمجھتے ہیں کہ سب کے لئے طریق کار تجویز کر رہا ہے ، اگر کبھی عام طور پر لوگوں کو کوئی تلقین کرتا ہے ، تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ خاص افراد سے خطاب ہے ، غور کرو اور بتاؤ کہ سوء ظن کی یہ کثرت مہر روشن سے روشن حقیقت کے ابطال کے لئے کافی ہے یا نہیں؟ ماحصل یہ کہ اس کے فلسفہ پر اعتراض کرتے وقت ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس

مخاطبین یا اعلیٰ انسان ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو انسان اعلیٰ بننے کی صلاحیت اور آرزو رکھتے ہیں۔

مساوات | **نطشے** "مساوات" کا قائل نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ جب قدرت نے خود انسان کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے حتیٰ کہ ذہنی، جسمانی، اخلاقی ہر نقطہ نگاہ سے کوئی سے دو انسان بھی یکساں نہیں ہیں، تو پھر "مساوات" کا مطلب کیا ہے، **ہکسلے** کی طرح اس کی بھی یہی رائے تھی، کہ انسانوں میں جو چیز فطرۃً پائی جاتی ہے وہ ایک کی دوسرے سے یکسانیت نہیں بلکہ اختلاف ہے، بنی نوع انسان کا یہ اختلاف **نطشے** کو مایوس نہیں کرتا، برخلاف اس کے، یہی وہ چیز ہے جو اس کی رائے میں انسانیت کی ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے مصلحان قومی، اعضائے حکومت، حاکمان عدالت، قائدین جماعات، معلمان اطفال، ان سب کا کام یہی ہے کہ انسانوں کے اس باہمی اختلاف کو مٹانے کی بجائے، اسے اور وسعت دیں، اور وہ اس طرح کہ اعلیٰ اور قابل افراد کو پہچان کر، انھیں اعلیٰ تر، اور قابل تر بنائیں، اور زندگی کے ایسے معیار مقرر کریں کہ ناکارہ اور مجہول افراد خود بخود معدوم ہو جائیں۔ بظاہر آثار یہ بیان کسی قدر تلخ معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر تم اس حقیقت کو تسلیم کر سکتے ہو کہ ہر جماعت کی زندگی اس کے بہترین افراد کے ساتھ وابستہ ہے، تو تم اس سے کس طرح انکار کر سکتے ہو کہ ارتقائے انسانی کی امید صرف اسی جماعت میں ہو سکتی ہے جو اعلیٰ و ادنیٰ، کمزور و قوی، چست و مجہول، مفید اور بیکار افراد میں فرق مراتب کو قدرتی خیال کرتی ہو، اور اس کے حسب حال عمل کرتی ہے، خود **نطشے** کے الفاظ سنو، حامیان مساوات و جمہوریت کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

"میں ان مدعیان مساوات و جمہوریت کے طبقہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا،"
"اس لئے کہ انصاف کا تقاضا مجھ سے یہ کہلوا رہا ہے کہ انسان مساوی نہیں ہیں۔"
"اور نہ ان کو مساوی ہونا چاہئے! اگر میں اس کے خلاف کہوں تو انسان اعلیٰ"
"کے ساتھ جو الفت مجھے ہے اوس کا کیا حشر ہو؟"

"زندگی کی عمارت کو ستونوں اور زینوں کی مدد سے بلند کرو تا کہ دور دراز کے"
"انبساط افزا، اور دلفریب مناظر تمہاری حد نظر میں آجائیں، لیکن اس کے لئے ارتفاع"

"کی ضرورت ہے۔"

"اور چونکہ زندگی کو مرتفع ہونا چاہئیے اس لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ زینے
"موجود ہوں اور زینوں کا ہونا اختلاف مدارج کے لئے مستلزم ہے، یعنی پستی اور بلندی کے تمام
"درمیانی مدارج حیات بے چین ہے کہ کسی طرح بلند ہو اور اپنی پہلی حالت سے بھی زیادہ
"ترقی یافتہ ہو جائے۔"

جو لوگ مساوات، اور یکساں حقوق کے طالب رہتے ہیں، وہ ایک حقیقت نفس الامری کو فراموش کر دیتے ہیں، ذرا سے غور و فکر سے کام لے کر دہ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر 'حقوق' مساوی ہوتے تو لفظ 'حقوق' کا وجود بھی نہ ہوتا، موخر الذکر کا ہونا، خود ان کے مختلف اور غیر مساوی ہونے کو مستلزم ہے، اس تجریدی بحث کی تشریح کے لئے، دنیا کی سب سے پہلی جماعت کا تصور کرو، جہاں حقوق کا وجود بھی نہ تھا، اور یہ محض اس لئے کہ فرائض کا بھی تعین نہ تھا، اور نہ ان کے کوئی مدارج تھے، ہر شخص کو فرداً فرداً جملہ فرائض خود ادا کرنے پڑتے تھے، رفتہ رفتہ جب فرائض کا احساس پیدا ہوا، تو ان کی بلحاظ اہمیت ترتیب و تقسیم کی گئی، اور ہر فرقہ کے سپرد کچھ فرائض اس کی اہلیت کے لحاظ سے کر دئے گئے، اور اس کے معاوضہ میں ان کو خاص خاص "حقوق" اور "مراعات" دئے گئے، اب یہ تو ظاہر ہے کہ اگر دنیا فرائض کا صحیح اندازہ نہ کرتی، اور مختلف فرائض کی مناسبت سے مختلف 'حقوق' نہ دئے جاتے تو یقیناً ان (فرائض) کی ادائیگی کما حقہ نہ ہو سکتی، اور تہذیب و تمدن کا ارتقا، ناممکن ہو جاتا بالکل یہی کیفیت آج بھی ہے، خاص خاص 'حقوق' کی تشویق و ترغیب سے لوگوں کو ادائیگی فرائض کا شوق ہوتا ہے، اور وہ اپنے اور دوسرے ناکارہ لوگوں کے درمیان کسی خاص فرق کا احساس کر سکتے ہیں اگر تم اس حد فاصل کو توڑ ڈالو، تو یقینی طور پر اسی دن سے مقابلہ و مسابقت بھی بند ہو جائے اور یہ چیز بہت سی ذیلی خرابیوں کے باوجود ترقی کے لئے ناگزیر ہیں، دنیا میں حقوق کے غیر مساوی ہونے سے اتنے فتنہ و فساد نہیں ہوتے، جتنے کہ 'مساوی حقوق' کے دعوے کی وجہ سے ہوتے ہیں، اس کی تشریح تم کو آئندہ صفحات میں نظر آئے گی۔

مساوات کی تلقین کرنے والوں کو ایک اور اہم بات بھی یاد رکھنی چاہیے، اور وہ یہ کہ مساوات اور یکسانیت حقوق کی خواہش، اچھے اور برے دونوں طرح کے نتائج پیدا کر سکتی ہے اس خواہش کا (ناکارہ افراد کے نقطۂ نظر سے) ایک تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ سب کو ایک ہی سطح پر ڈھکیل دیا جائے یا دوسری طرف اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ سب کو اپنی طرح بلند سطح پر لے آیا جائے، غرض کہ ترقی اور تنزل کی یہ دونوں صورتیں "مساوات" میں مضمر ہیں۔ اتنا بتا دینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں ہے کہ اگر کسی جماعت میں "مساوات" کی روح پھونک دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اوسط اور ناکارہ افراد اپنی تعداد کے غلبہ کی وجہ سے، اعلیٰ افراد کو ان کی بلند سطح سے کھینچ کر اپنے ہی برابر کرنا چاہیں گے۔

جمہوریت اور اشتراکیت | جس شخص نے اپنا مطمح نظر "منتخب اور اعلیٰ افراد" کی ترقی قرار دے لیا ہو، اس سے ہم جمہوریت پسندی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس مضمون کے شروع میں ہم بتا چکے ہیں کہ **نطشے** اور دوسرے فلاسفہ کے درمیان اصل فرق یہی ہے کہ اول الذکر چیدہ چیدہ افراد کی اصلاح و ترقی کر کے انھیں (یا ممکن ہو تو کل بنی نوع انسان کو) معراج کمال پر پہنچانا چاہتا ہے اور ثانی الذکر غالب تعداد افراد کی ترقی چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ **نطشے** جمہوریت کا مخالف ہے۔

نطشے کی رائے میں حکومت صرف اسی شخص کو سزاوار ہے جو اپنے زور بازو اور ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی مدد سے، اپنے ہم عصروں کو تابع فرمان بنا سکے۔ جمہوریت پسندوں کا خیال یہ ہے کہ تلاش اور کوشش سے ہر آبادی میں سے ایسے فرد یا افراد کو "منتخب" کیا جا سکتا ہے جو حکومت کے اہل ثابت ہوں لیکن حکمرانوں کے "انتخاب" میں جمہوریت پسندوں کی یہ سعی و کوشش **نطشے** کی نظروں میں ان حضرات کا اعتراف عجز، اور زمانہ کے انحطاط کی روشن دلیل ہے، کیا خود یہی بات کہ حکومتوں اور حکمرانوں کے انتخاب کی ضرورت پڑتی ہے، اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ اعلیٰ افراد جو حکومت کے اہل ہیں مفقود ہو گئے ہیں۔ جواہرات کے ڈھیر میں سب سے بڑا ہیرا خود اپنی آب و تاب کی وجہ سے لوگوں کی نظروں کو کھینچ لیتا ہے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی ضرورت وہیں پڑتی ہے جہاں یہ "بڑا ہیرا" موجود نہ ہو، زمانۂ جدید کا جمہوری حکومت کی طرف میلان **نطشے** کے خیال میں انسان اعلیٰ کے عدم کو ثابت کرتا ہے، اگر یہ انسان موجود

ہوتا تو تلاش و کوشش کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، چنانچہ کہتا ہے:۔

"حیات انسانی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدبختی نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے قوی ترین

"افراد بہترین افراد نہ ہوں، جب کبھی ایسا ہوتا نظر آئے تو سمجھ لو کہ ہر شئے باطل مصنوعی اور بیہودہ ہے"

"اے میرے بھائیو! بہترین افراد کو حکومت کرنا چاہئے اور بہترین افراد ہی حکومت کے لئے ہیں"

"اور جہاں اس کے خلاف تعلیم دیجاتی ہو، وہاں سمجھ لو کہ بہترین افراد کا وجود ہی نہیں"

نطشے کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ جمہوریہ نظام جماعت کا مخالف ہے اور اعلیٰ اور ادنیٰ کے مختلف طبقوں میں ہر سوسائٹی کی تقسیم ضروری خیال کرتا ہے نطشے کا یہ عقیدہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ "شورش پسندی" کے جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں، وہ سراسر بے بنیاد ہیں، اشتراکیت اور جمہوریت کی ظاہری نظر فریبیاں اسے لبھانہ سکیں، ان دونوں تحریکات کا مقصد اسے یہی نظر آیا کہ "غلامی" کی مہذب اشکال ترقی پائیں اور ہر فرد بشر کو منتہائے کمال پر پہنچانے کی بے سود کوشش کی جائے، وہ بخوبی جانتا تھا کہ شورش و بغاوت وہیں رونما ہوتے ہیں، جہاں آزادی کی امنگیں اس حد تک سروں میں بھر جاتی ہیں، کہ ناکارہ افراد بھی بہتر افراد کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

نطشے کی نظروں میں روایات قدیم اور قانون کی بہت کچھ وقعت تھی۔ اور وہ شورش اور خودسری کا سخت دشمن تھا، اس نے دیکھا کہ جمہوریت اور اشتراکیت کے زعیمانہ دعوے اس سے زیادہ، ورکچھ وقعت نہیں رکھتے کہ مہذب طریقوں سے شورش پسندی کو تحریک پہنچائی جائے اور انفرادیت بر پیمانۂ کثیر کو تائید ہو ہر شخص بجائے خود غور و فکر سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ سب افراد کو مساوی بنانا، اور چیدہ چیدہ مستحق افراد کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ بڑی بڑی شاخوں والے تناور درختوں کو جڑ سے کاٹ ڈالنا، جن کا سایہ ایک طرف تو مویشیوں کو بارش اور دھوپ کی سختیوں سے بچاتا ہے، اور دوسری طرف ناکارہ اور بدنما جھاڑیوں کو غذا سے محروم کر کے ان کو فنا کر دیتا ہے، نطشے کی رائے میں دنیا کے بہترین افراد کی یہی حیثیت ہے، یہ لوگ اگر ایک طرف عوام الناس کے بقا و قیام کے موید ہوتے ہیں، داخلی اور خارجی خطرات سے ان کو محفوظ رکھتے ہیں، تو دوسری طرف ذلیل اور ناکارہ لوگوں کو کالعدم کر دیتے

ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھو، تو مساوات کی گرم بازاری، آزادی عمل کا دور دورہ، حریت کا جوش یہ سب باتیں "انسان متوسط" کی افزائش کی محرک تو ضرور ہیں، لیکن بلند خیالی، عالی ظرفی، عالی ہمتی، غرض کہ انسانیت کے جملہ اعلیٰ مدارج اس فضا میں ترقی نہیں پا سکتے۔

نطشے اشرافیت[1] اور فرقہ بندی کا موید تھا جو لوگ **نطشے** کو انتہا درجہ کا انقلاب پسند بتلاتے ہیں ان کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ وہ روایات قدیم کی بہت کچھ توقیر کرتا تھا، اور ان کے اتباع کو ترقی کے لئے ناگزیر جانتا تھا، اس کا اعتقاد تھا کہ زبردست اور دیرپا ترقی صرف ان رسوم و رواج کا نتیجہ ہوتی ہے، جن پر عرصۂ دراز تک کسی فرقہ کے افراد عمل پیرا رہیں مثلاً فرقہ بندی یا ذات بندی۔ آج کل کے احرار اور جمہوریت پسند یہ سمجھتے ہیں کہ افراد کی ذاتوں میں تقسیم خلاف فطرت ہے اور ایک طرح کا ظلم ہے، **نطشے** جانتا تھا کہ چیدہ چیدہ اور اعلیٰ درجے کے انسان کی تخلیق اور افزائش اگر کسی حالت میں ہو سکتی ہے تو یہ حالت یہی ہے کہ کسی نظام کی پابندی ملحوظ رکھی جائے، اس کو بہت تعجب ہوتا تھا کہ لوگ جمہوریت کے بے سروپا انتخابات اور تلاش کی مدد سے کیونکر افراد اعلیٰ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ خود سری اور آزادی عمل، کو وہ کسی قوم کے لئے انتہا درجہ کی بدبختی سمجھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ یہ چیزیں کسی قوم میں اسی وقت رونما ہوتی ہیں، جب اس کے "ناکارہ" افراد اپنی حقیر شخصیتوں کا ادعا اور ان کا اظہار کرنے لگتے ہیں "رسوم و قیود" کے "خمار" سے "سرگشتہ" اور آئین و ضوابط کے پابند افراد ہی اس کی نظروں میں ترقی کے علمبردار تھے،

ان خیالات کی بنا پر یہ سوال حل کرنا کچھ دشوار نہیں رہ جاتا کہ **نطشے** منتخب افراد اور "اشرافیت" کا موید کیوں تھا، خود اسی کے الفاظ سنو، اس سے تمہیں اندازہ ہو جائیگا کہ وہ کس تشدد کے ساتھ مستقبل کے طبقۂ امراء کو قائم کرنے کی اپیل کرتا ہے:۔

> "اے میرے بھائیو! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ کچھ ہو کر رہو میں آنے والے "اشرافوں (Aristocrats.) کا راستہ تم کو بتاتا ہوں تم کو ہی مستقبل کا بونے والا، "کاٹنے والا اور اگانے والا بننا چاہیئے"

---

[1] Aristocracy

"یاد رکھو کہ تم کو اس طبقۂ امراء کا فرد نہ ہونا چاہیے، جو معمولی اشیائے خرید"
"فروخت کی طرح زرِ نقد دیکر دوکانوں سے خرید لیا جاتا ہے، اس لئے کہ ہر وہ چیز"
"جس کی قیمت معین ہو بہت ہی کم قیمت ہے"
"تمہاری آئندہ عزت کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ تم کہاں سے آرہے ہو"
"(یعنی تمہارے اسلاف کیسے تھے۔ راقم) بلکہ اس پر ہے کہ کس طرف جارہے ہو،"
"اقتدار اور ترقی کی راہ میں اٹھنے والے قدم تمہارے لئے سرمایۂ عزت"
"ہونے چاہئیں۔"
"تم کو اپنے اخلاف کی سرزمین سے الفت کرنا چاہیے اگلے لوگوں کے"
"برخلاف (جو اسلاف کی سرزمین سے الفت کرتے تھے۔ راقم) تمہارا طغرائے امتیاز"
"یہ ہی ہونا چاہئے۔ کونسی سرزمین؟ وہ جو دور دراز کے سمندروں میں نہاں ہے اور"
"آج تک لاپتہ ہے، اپنے جہازوں کو اس سرزمین کی طرف پھیرو، اور اس کو تلاش کرو"
"تم سے بس میری یہی خواہش ہے۔"

نطشے فرقہ بندی کو روحانی اور اخلاقی ارتقا کے لئے بھی ناگزیر مانتا تھا، اس کا اعتقاد تھا کہ جب تک فرقِ مراتب نہ ہو، اور انسان 'مساوات' اور 'فرقوں' میں منقسم نہ کیا جائے، اس وقت تک حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ میں ارتقا نہیں ہو سکتا، خود اس کے الفاظ یہ ہیں:۔۔۔

"حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ کو لو، تم کو یہی نظر آئے گا کہ اس کا ارتقا صرف
'اشرافیت' اور فرقہ بندی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے اسی طرح سے آئندہ ترقی کی امیدیں"
"بھی ہمیشہ اسی سوسائٹی کے ساتھ وابستہ رہیں گی جو بنی نوعِ انسان میں فرقِ مراتب"
"اور اختلافِ استعداد کو تسلیم کرتی ہو، اور غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں جائز رکھتی ہو"
"اگر مختلف طبقاتِ انسانی کے درمیان اس فرق کا وجود نہ ہوتا، اس کے علاوہ افراد"
"اپنے ماتحتین کو حکومت کی پر رعب نظروں سے نہ دیکھتے اور یہ ماتحتین اطاعت"
"شعاری سے کام لے کر اپنے آقاؤں سے دور دور نہ رہتے تو یقین"

" جانو کہ خود روح میں مختلف فاصلوں کا وجود نہ ہوتا، اور چونکہ فاصلہ پر "
" ترقی یافتہ حالت کے لئے لازمی ہے (یعنی ادنی، اعلیٰ اور اعلیٰ تر) اس لئے روح "
" ان بلند اور نایاب کیفیتوں سے بھی محروم رہتی جو انسان اعلیٰ کے ظہور اور قیام کے "
" لئے بمنزلہ لوازمات کے ہیں ۔"

نطشے کا مجوزہ نظام جماعت اس بحث کے بعد تم شاید یہ سوال کرو کہ اگر نطشے "جمہوریت" "اشتراکیت"، "مساوات" ان سب کا مخالف ہے، تو آخر خود اس کی رائے نظام جماعت کے متعلق کیا ہے اور وہ اصول اور معیار کون سے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر وہ مختلف فرقہ ہائے آبادی کی تقسیم کرنا چاہتا ہے؟ اس سوال کا جواب اگرچہ آسان نہیں، تاہم مختصر طور پر اسے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور پر اس کے مجوزہ نظام جماعت سے کچھ واقفیت ہو جائے۔

سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ بنی نوع انسان مختلف اعتبار سے آپس میں مختلف ہیں یہ اختلافات، رسم و رواج کے شکنجہ یا تمدن کی سختیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ خالصتہً وہبی اور فطری ہیں۔ (۱) ذہن کا اعلیٰ درجہ کا ہونا (۲) قوائے جسمانی کی مضبوطی (۳) قوائے عقلی و جسمانی کا متوسط یا (۴) اوسط سے گرا ہوا ہونا نطشے کی رائے میں آپس کے اختلاف کی یہ چار ممکنہ شکلیں ہو سکتی ہیں، یہ فروق مسلمہ ہیں، اور کسی نظام جماعت کی ترتیب کے وقت ان کو نظر انداز کر دینا، اتنا ہی حماقت خیز ہے جتنا کہ تعمیر میں مختلف سامان اور مصالحوں کے محل استعمال کو فرو گذاشت کر دینا، اگر تم جماعت کو ایک مخروطی مینار فرض کر لو اور اس کی بنیاد پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بنیاد اگرچہ اعلیٰ درجے پتھروں کی نہ بھی ہو، تاہم مضبوطی، اور وسعت اس کی لازمی شرطیں ہیں جماعت کی بنیاد کیا ہے؟ نطشے اس کے جواب میں کہتا ہے کہ "طبقہ اوسط ہی جماعت کی اساس ہے اور جب تک یہ مضبوط نہ ہوگا، اس وقت تک جماعت کا قیام اور استحکام ناممکن ہے۔" اب اگر تم مخروطی مینار کی شکل اپنے تصور میں جمائے رہو، تو تم کو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد تو وسیع ہوتی ہے، لیکن جوں جوں یہ مینار بلند ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی پتلا ہوتا ہے، اور پتھروں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ چوٹی میں صرف

ایک یا دو پتھر ہی موجود رہتے ہیں نطشے کے مجوزہ نظام جماعت کا بھی یہی اساسی اصول ہے، وہ ادنیٰ سے شروع کر کے، اعلیٰ تک جملہ فرق مراتب کو لازمی خیال کرتا ہے، اگرچہ مراتب اعلیٰ میں افراد کی تعداد کم ہوتے ہوتے ایک ہی کیوں نہ رہ جائے۔ جس طرح کسی مینار کے چوٹی کے پتھر تعداد میں کم ہوتے ہیں، لیکن اپنی عمدگی کی وجہ سے بارش، دھوپ، برق ان سب کا مقابلہ انہیں کو کرنا پڑتا ہے، اسی طرح جماعت کے اعلیٰ ترین افراد (خواہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں) وہی ہیں جو ہر مخالفت کے مقابلہ کے لئے تیار رہیں نطشے کا قول ہے۔

"جوں جوں ہم چوٹی کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، اتنی ہی زیست سخت ہوتی جاتی ہے"
"سردی میں اضافہ ہوتا ہے، فرائض اور ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔"

ع۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

نطشے نے جماعت کے چار مدارج قائم کئے ہیں:۔

(ا) پہلے درجہ میں اس نے ان لوگوں کو رکھا ہے جو اعلیٰ درجہ کی ذہنی استعداد رکھتے ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے انبساط، حسن، نیکی کا نمونہ بنتے ہیں۔ دنیا ان لوگوں کو ڈرا نہیں سکتی، ماحول کی ناساعدت سے ان کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے۔ لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ (زمانہ کو برا بھلا مت کہو) کے زرین مقولہ پر ان کا عمل ہوتا ہے، یہ اسے ہر صورت سے مکمل خیال کرتے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں کے لئے حوصلہ شکن اور برباد کن ثابت ہوتی ہیں، وہ ان کے لئے مایۂ انبساط ہیں۔ پیچ در پیچ راستے جن میں بھٹک کر کمزور ہستیاں اپنی جان دے دیتی ہیں، ان کو مرغوب ہیں۔ اپنی ذات پر اور دوسروں پر سختی و تشدد، سعی و عمل، ضبط نفس ان باتوں میں ان کو خاص لطف آتا ہے۔ غرض کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت ہمارا قومی شاعر اقبال کہتا ہے

نائب حق در جہاں بودن خوش است	بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است	ہستی او ظل اسم اعظم است
خیمہ چوں در وسعت عالم زند	ایں بساط کہنہ را برہم زند

پختہ سازد فطرت ہر خام را | از حرم بیروں کند اصنام را
نوع انساں را بشیر و ہم نذیر | ہم سپاہی، ہم سپہ گر، ہم امیر
خشک سازد ہیبت او نیل را | می برد از مصر اسرائیل را

(۲) اس کے بعد دوسرے درجہ میں وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قوائے جسمانی رکھتے ہیں محافظین امن، ناموران رزم، سپاہی، مقنن، بادشاہ، یہ سب لوگ اس زمرہ میں آتے ہیں۔ ان کا فرض بقول نطشے کے یہ ہونا چاہئے کہ درجۂ اول کے افراد کے دست و بازو ثابت ہوں، اور ان کی ہدایات واصول کو عملی طور پر عوام الناس سے منوائیں۔

(۳) اس کے بعد تیسرا درجہ اوسط لوگوں کا ہے، یعنی وہ لوگ جو کسی خاص استعداد سے تو محروم ہیں، لیکن عقلی اور جسمانی حیثیت سے اوسط کہے جا سکتے ہیں۔ اس طبقہ میں وہ تمام افراد آجاتے ہیں، جن کا کام دستکاری، صنعت، تجارت، زراعت وغیرہ ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں اوسط استعداد ذہنی و جسمانی چاہتی ہیں۔ یہ نہ خیال کرو کہ چونکہ نطشے 'انسان اعلیٰ' کا موید ہے اس لئے وہ طبقۂ اوسط کو ذلیل خیال کرتا ہوگا، گزشتہ سطور میں ہم بتا آئے ہیں کہ نطشے طبقہ اوسط یا جمہور کو ہر تہذیب و ترقی کے لئے ناگزیر، اور ہر جماعت کے لئے اساس خیال کرتا ہے۔ وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ "ہر جماعت کا استحکام اس اساس کے استحکام سے وابستہ ہے"۔

(۴) ان سب مدارج کے بعد جماعت کا ادنیٰ ترین طبقہ آتا ہے، اس میں وہ افراد شامل ہیں جن کی خوشیاں دوسروں کی عنایات پر منحصر ہیں، جو بغیر دوسروں کی دست گیری کے زندگی کے نعمات سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتے، اس طبقہ کے متعلق نطشے کہتا ہے کہ اسے 'خدمت' کو اپنا شرف سمجھنا چاہئے، اور اسے بندگی بیچارگی نہیں بلکہ برضا و رغبت، اور اپنی کوتاہیوں کا احساس رکھتے ہوئے بجا لانا چاہئے، جمہوریت، اور مساوات کے مدعیوں کی تلخ و زہر آلود تلقین پر ان لوگوں کو مطلق کان نہ دھرنا چاہئے، مختصر یہ کہ اس امر کو محسوس کر کے کہ خود قدرت نے ہم میں، اور اعلیٰ افراد میں فرق قائم کیا ہے، ان لوگوں کو چاہئے کہ جبراً یا قہراً نہیں بلکہ فرض سمجھ کر 'خدمت' انجام دیں۔

تم نے نطشے کے مجوزہ نظام جماعت کو دیکھ لیا، اگر تم کو اس میں استبدادیت کا شائبہ نظر آئے، اور بالخصوص شق چہارم تمہاری مساوات، جمہوریت، آزادی اور اسی قسم کے دیگر معتقدات کی ہم آہنگی نہ کرے تو **نطشے** کو فوراً ہی مطعون نہ قرار دے تو، بلکہ غور کرو کہ کسی جماعت کے افراد کو اس طرح گروہوں میں تقسیم کر دینا کیا عارضی، اور بعید از انصاف ہے؟ دیکھو ذاتوں کا اختلاف، مراتب کا فرق، استعداد کی بوقلمی، فرائض کا تنوع یہ سب کے سب اس بات کے بین ثبوت ہیں کہ تفریق اور اختلاف اہم ترین قانون حیات ہے، سوسائٹی کے قیام کے لئے فرائض اور حقوق کا یہ اختلاف ازبس ضروری ہے مدعیان مساوات کو یاد رکھنا چاہئے کہ **حقوق کا غیر مساوی ہونا حقوق کی موجودگی کی لازمی شرط ہے** (اس کی تشریح ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں) **نطشے** کے خیالات سے بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جمہور کو پامال کر رہا ہے اور "چیدہ چیدہ" افراد کے قبضۂ اقتدار میں ان کی باگ دے رہا ہے لیکن یہ خیال ہی غلط ہے، جمہور کو **نطشے** نے جو کچھ اہمیت دی ہے وہ تم دیکھ ہی چکے ہو، باقی رہا استبدادیت اور اس کے ظہور پذیر ہونے والے شر کا سوال، تو اس کے متعلق صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ افراد کے حقوق کا مساوی نہ ہونا کسی ظہور شر کا مستلزم نہیں ہے **شر کا باعث غیر مساوی حقوق نہیں بلکہ مساوی حقوق کا دعویٰ ہوا کرتا ہے**. دنیا میں ہر جنگ و جدل اسی کی وجہ سے ہوتی ہے، ملکوں کی جدال و قتال، سلطنتوں کی خانہ جنگیاں، رعایا کی شورش، کارخانوں کی ہڑتال، خاندانوں میں والدین کے اقتدار کے خلاف بچوں کی کوشش، رشک، حسد، انتقام، یہ سب باتیں کس چیز کا نتیجہ ہیں، اگر دنیا کے تمام لوگ اس پر متفق ہوتے کہ چونکہ ہر شخص اپنی استعداد کے لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، اسی لئے حقوق بھی مختلف ہونے چاہئیں، تو کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ سب باتیں ظاہر ہوتیں، برخلاف اس کے آج جب کہ مساوات حقوق کا نعرہ دنیا کی تمام قومیں لگا رہی ہیں، ادنیٰ اور ناکارہ ہستیاں کسی نہ کسی طرح سے اپنی ہستی کے ادعا و اظہار میں مشغول ہیں، تو سب دیکھ رہے ہیں کہ یہ خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں، یاد رکھو کہ فطرت اختلاف پسند ہے، اور ہمیشہ رہے گی، انسان آج کل مساوات پسند ہو گیا ہے، اور فطری اور ذہنی اختلافات سے برسر پیکار رہتا ہے. فطرت کا تقاضا

ہے کہ کارزار حیات میں زید کے سر سہرا رہے، عمر کو مساوات حقوق کا تقاضا مجبور کر رہا ہے کہ زید کے ہم پلہ ہو جائے، لیکن چونکہ استعداد مفقود ہے، اس لئے اس خواہش کا تقاضا عمر میں رشک و حسد پیدا کر دیتا ہے۔ سنو وہ اشتراکیت، اور جمہوریت کے حامیوں کے متعلق کیا کہتا ہے،

"یہ مکڑیاں (اس سے مراد مذکورہ بالا دو گروہ ہیں) آپس میں عہد و پیمان"
"کرتی ہیں کہ "ہم ان سب لوگوں کے خلاف جو ہمارے جیسے نہیں ہیں، انتقام اور"
"توہین کے حربے استعمال کریں گے، ہماری زبان میں نیکی کا دوسرا نام حب مساوات"
"ہوگا، اور تمام ذی اقتدار لوگوں کے خلاف ہم ایک ہنگامہ بپا کر دیں گے۔"
"اے واعظان مساوات! تمہاری کمزوریوں کا طوفان جو تمہارے دلوں"
"میں بپا ہے، تم سے مساوات کا تقاضا کر رہا ہے، تمہارے مخفی ظالمانہ رجحانات"
"جب سطح پر آتے ہیں، تو نیکی کے الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں۔"

کیا اب بھی تم نطشے کو شورش پسند اور مغوی خیال کرتے ہو؟

نطشے کے مجوزہ اخلاقی اصول | جس طرح ہر نظام جماعت کے لئے ایک اخلاقی نظام العمل بھی معین کر دیا جاتا ہے، اسی طرح سے نطشے نے بھی اپنی مجوزہ جماعت کے لئے چند اساسی اصول قائم کئے ہیں، اگرچہ فی الحقیقت یہ اصول اس کے فلسفۂ اخلاق سے متعلق ہیں، تاہم اس موقع پر ضمناً ان کا بیان غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا، اس کے فلسفۂ اخلاق سے آئندہ صحبتوں میں بحث کی جائیگی،

(۱) "خیر" کسے کہتے ہیں؟ ہر وہ چیز "خیر" ہے، جو انسان میں اقتدار کا احساس"
"اقتدار کی خواہش، اور خود اقتدار کو زیادہ کردے۔"

(۲) "شر" سے کیا مراد ہے؟ ہر وہ چیز "شر" ہے جو ناتوانی، ضعف، حسد"
"اور انتقام سے ظہور پذیر ہو۔"

(۳) "میں قناعت نہیں چاہتا بلکہ اقتدار طلب کرتا ہوں، میں مجبوری کی صلح کا"
"آرزومند نہیں بلکہ جنگ و جدل کا متمنی ہوں۔ میں تمہاری واعظانہ تلقین "اور"

" تمہاری زبانی نیکیوں کا متحمل نہیں۔ میں صلاحیت، اور استعداد کا جویا ہوں، "

اس مضمون کو اپنے قومی شاعر کی زبان سے سنو،

جذب[1] و استیلا شعار قوت است — فتح راز آشکار قوت است

زندگی مضمون تسخیر است و بس — آرزو افسون تسخیر است و بس

حربہ دون ہمتاں کین است و بس — زندگی را این یک آئین است و بس

زندگانی قوت پیدا ستے — اصل او از ذوق استیلا ستے

ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است — ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است — اصلش از خوف و دروغ آبستن است

گر خرد مندی فریب او مخور — مثل صرباہر زماں رنگش دگر

گاہ او مستور در مجبوری است — گاہ پنہاں در تہ معذوری است

زندگی کشت است و حاصل قوت است — شرح رمز حق و باطل قوت است

مدعی گر مایہ دار قوت است — دعوے او بے نیاز از حجت است

یا پھر قناعت کی خواب آور تلقین کے خلاف صدا بلند کرتا ہے، اور جستجو، جد و جہد کی ان الفاظ میں دعوت کرتا ہے:۔

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا ست

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است

زندہ را نفی تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم

از شعاع آرزو تابندہ ایم

آئندہ مضمون میں **نطشے** کے فلسفۂ معاشرت کے اس حصہ سے بحث کی جائے گی جہاں رحم، ایثار، ہمدردی، کے متعلق اس نے اظہار خیال کیا ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] یہ اشعار ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرار خودی سے نقل کئے گئے ہیں۔ ان کی ترتیب میں ادائے مطلب کی مناسبت سے تبدیلی کر دی گئی ہے (د۔ ع)

گلشنِ عشق

یعنے

مثنوی محمد نصرت "نصرتی" ملک الشعرا دربار علی عادل شاہ

(از مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی)

مجھے، اپنی ایک کتاب کے (جس کا موضوع "جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اس کی ترقی" ہے) دوران فراہمی مواد میں، ایک مثنوی نظر آئی، چونکہ میری کتاب تیار ہونے کے لئے ہنوز عرصہ درکار ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ناظرین "ترقی" کا اس مثنوی سے تعارف کرا دوں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ولی کو اردو شاعری کا آدم خیال کیا جاتا تھا، اور فارسی میں جو درجہ رودکی کو اور انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے، وہی رتبہ ولی کا بھی تصور کیا جاتا تھا لیکن سلطان قلی قطب شاہ کے دیوان[1] نے اس یقین کو باطل کر دیا اور اہل ذوق پر ظاہر ہو گیا کہ ولی کے بہت پہلے اردو شاعری کی صرف ابتدا ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے ایک حد تک مکمل صورت بھی اختیار کر لی تھی۔

سلطان قلی قطب شاہ کے دیوان کے بعد جہاں تک میرا خیال ہے کسی اور اردو دیوان کا پتہ ولی کے دیوان تک نہیں چلا، چونکہ قلی قطب شاہ کا دیوان ۱۰۲۵ھ کا مرتبہ ہے، اور ولی کا زمانہ ۱۱۲۵ھ کا اس لئے ہم اردو شاعری کی ابتدا سلطان قلی قطب شاہ سے تصور کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ مدت میں اردو نے بہت کچھ ترقی کی ہو گی لیکن افسوس ہے کہ اس وقت کی کتابوں کا پتہ تقریباً معدوم ہے، تاہم کبھی کبھی کوئی ایک کتاب دستیاب ہو جاتی ہے، جو اپنے وقت کے رسم و رواج تمدن اور زبان کا پتہ بتاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایک مثنوی "نصرتی" کی موسوم بہ "گلشن عشق" داخل ہوئی ہے۔

---

[1] دیوان سلطان قلی قطب شاہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے اس کے متعلق رسالہ "اردو" بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

نصرتی کا نام "محمد نصرت" اور وطن کرناٹک تھا، وہ حاکم کرناٹک کے اقربا سے تعلق رکھتا تھا تحصیل علم کے بعد ایک زمانہ تک اپنے وطن ہی میں رہا اس کے بعد علی عادل شاہ والی بیجاپور کی علم دوستی یہاں کھینچ لائی اور قدردانی نے منصب ہفت ہزاری سے سرفراز کرکے ملک الشعرائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔

اگرچہ نصرتی خطاب و منصب کے لحاظ سے صاحب شوکت امیر تھا لیکن اس کی طبیعت نہایت سادگی پسند اور صوفی مشرب تھی، جو کچھ ملتا آدھا غربا میں تقسیم کردیا کرتا اور آدھا اپنے تصرف میں لاتا۔

نصرتی کے کلام سے خود ظاہر ہے کہ وہ علوم مروجہ سے واقف، اور عربی و فارسی کے علاوہ بھاشا سے بھی بخوبی آگاہ تھا، قدرت نے اس کو سخن سنجی و شعر فہمی کا خاص ملکہ ودیعت کیا تھا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ نصرتی شعر و سخن میں کس کا شاگرد تھا مگر ہمارا خیال ہے کہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا بلکہ فطرتاً اس میں یہ مادہ موجود تھا

۱۰۷۶ھ میں نصرتی نے ایک مثنوی "علی نامہ" لکھی جس میں علی عادل شاہ کے کارنامے اور فتوحات وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ اس مثنوی کے صلہ میں اس کو نہ صرف خلعت عطا ہوئی بلکہ خطاب ملک الشعرائی سے بھی سرفراز و سربلند کیا گیا، ان حالات کے لکھنے کے بعد مثنوی گلشن عشق کے مختلف مقامات سے چند اشعار نقل کرکے نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

یہ ایک ضخیم مثنوی ہے بعض اشعار نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق، کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بہتات حسب رواج مروجہ حمد و مناقبت سے ابتدا ہوئی ہے چنانچہ کہتا ہے:۔

عنایت کا تجہ بہت ہے عالم نواز	کوئی ذرہ خورشید تجھی سرفراز
غریباں پہ بخشش میں نیارا سو تو نچہ	منگی پوپی دین ہار سو تو نچہ
دو عالم کون سو جاتوں لک بات میں	دیکھنا چھپا تا پی تجہ ہات میں
دیا ہے تون خاکی کون ایسا شرف	جو تس سجدہ توری کبھی صف بصف

علی عادل شاہ امامیہ مذہب رکھتا تھا لیکن اس کی بے تعصبی ملاحظہ ہو کہ اس کے دربار کا سُنی المذہب شاعر علی الاعلان اپنی مثنوی میں کہتا ہے:۔

ابوبکر صدیق "" یار غار	اہر یا سقف دین رکن تی جس ادھار

عمر ابن خطاب رضی نیک رائے کہ ات عدل سوں دین کا گھر بسائے
جو عثماں دھنی شرم ایمان کی دو جامع اچھی جملہ قرآن کی
وصی نبی ذی شرف ات بلی سو وو شاہ مرداں علی ولی
علی دلدل تیز کا شہسوار علی سور نر صاحب ذوالفقار
وصی محمد علی ولی ولی عہد احمد علی ولی
علی تھا برادر محمد کوں سوں سو موسیٰ پیغمبر کوں ہارون جیوں

حمد وغیرہ کے بعد وہ بادشاہ کی مدح میں کہتا ہے :-

خصوصاً شہنشاہ عادل علی ترا ناؤں کاری جو ہے ات بلی
فضیلت میں تجھ آج ہے بے خطا کہ علم لدنی تجھے ہے عطا
تو دانش سوں سب کیوں نہ محفوظ اچھے تیرا مدرسہ لوح محفوظ اچھے
توں جامع فضائل منی سب ہوا توں عالم سوں دل کی مغرب ہوا

اس کے بعد عقل اور پھر عشق کی تعریف میں چند صفحے لکھے گئے ہیں چنانچہ کہتا ہے :-

اچھی عقل یک دولت ناپدید اچھی عقل مشکل کے جال کی کلید

اچھی عشق خلقت کی جگ کا سبب اچھی عشق گنجینۂ راز رب
کوں ہار امرت کوں شرمندہ عشق دہری ناؤں سو جگ میں نت اندہ عشق

ان ابتدائی بیانات کے بعد اصل مثنوی میں ایک فرضی قصہ جیسا کہ قدیم نثر و نظم میں نظر آتا ہے بیان کیا گیا ہے، جس کے چیدہ چیدہ مقامات کے اشعار حسب ذیل ہیں :-

نول نسکوں ویس ماہ جگ میں سعید اتھا مجھ فرخندہ روز عید
شرفدار دین تج سورج تی ایار خوشی کا مگر جگ پہ تھا نوبہار
سبھی صبح مکھ یوں صفائی نظیر کہ جیوں عارفاں کا ہے روشن ضمیر

پچی صبح کا دیکھتی جہاں نول عیش پانی لکیا پی کران

عجب حق کی تقدیر کا کام ہے نہ کس پر عیاں تس کی انجام ہے
بھلا ہے اسی تج سہنا بلا خوشی دی پچھیں کر اون نیلا
کہنا ریو قصہ دلپذیر کبھی کھول کر بات یوں پی نظیر
کہ یک روز خسرو نیک فن سخاوت تی بھرا کہ الم ثمن
سو یکھ ھات دھونی تی فارغ ہو سب کیا اپنی رانی تی پوچھن طلب
و تب نار کون دن کی جھوکی پیلال دھوی جشرت کا آن بھوجن کا تھال
تبیا ھات جیون شاہ نعمت کی دھیر پکاریا ہمی تل تالک یک فقیر

شکاری جونت لیا م سنداین کری نین کون تس ولی کا انجن
دیا نس تجی فضا خوش خیال اوتاریا سو بھی اس عقبقی کی بال
سو ظلمات لک عکس فلس پان تھا سب اس میں کارس آب حیوان تھا
زبان کھول طوطی شکر مقال کہ ہے داستان شیرین یون حسب وحال

مثنوی کے خاتمہ میں کہتا ہے :—

میری ہر بچن ہے لعانی موٹ رکھیا ہوں سو دونکر کون کاڑی کی اوٹ

ہر یک داستان بوستان دلکی زین ہر یک بیت ہر یک محل جانشین
صفائی کی صورت کی ہے آرسی دکھنی کا کیا شعر ہوں فارسی
فصاحت میں کر فارسیاں کا کلام دھری مغز ہندی بچن پر مدام

دکر شعر ہندی کی بعضی ہنر نسکیتن ہے لیا فارسی میں سنور

جلک عشق کا قصۂ دلپذیر اچھی درس میں ضع کی بینظیر

لکھیا ہوں جو یو قصہ خوس دھاسوں علی شاہ عادل کیری نادن سوں
تلک جک میں مقبول اچھو یو مدام بحق محمد علیہ السلام

خصوصاً جو میں قصہ بے مثال کہ احق ہے مجھ فہم کا ایک خیال
میری طبع کی تیر ناری کی تیں یون سوں کر نہار بازی کی نیں

مندرجہ بالا اقتباس سے نصرتی کے کلام کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے نصرتی ۱۰۹۵ء میں مرا۔ اس کی تصنیفات سے اب تک علی نامہ اور گلشن عشق کا پتہ چلا ہے۔

ابو العلاء المعری

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ترقی جلد ا نمبر ۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ

(از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ)

چنانچہ اس قسم کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ابو العلاء یقیناً خاصہ دولت مند تھا۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ ابو العلاء کے بے شمار شاگرد جو اس کی تعلیمات سے مستفید ہوتے ہوں گے ضرور اس کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا سلوک کرتے ہوں گے۔ خلافت عباسیہ کے انتہائی عروج کے زمانے میں بغداد کے مشہور نحوی ابن العربی کا ایک شاگرد اسے تین سو دینار سالانہ ادا کیا کرتا تھا، اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابن العربی انہیں مضامین کی تعلیم دیتا تھا جو خود ابو العلاء نے اپنے لئے مخصوص کر لئے تھے۔ اگرچہ معرہ اور بغداد میں زمین آسمان کا فرق تھا اور پانچویں صدی میں مسلمانوں کی وہ حالت نہ رہی تھی جو دوسری صدی ہجری میں تھی لیکن پھر بھی ابو العلاء کا پیشۂ استادی بالکل روکھا نہ ہوگا۔ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ جب ۴۱۶ھ میں معرہ پر مصری افواج نے قبضہ کیا تو اس وقت ابو العلاء کو کیا کیا تکالیف برداشت کرنی پڑیں تھیں۔

دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد اس کی زندگی کا تھوڑا وقت تو درس و تدریس میں مگر زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا۔ ابو الحسن علی بن عبد اللہ ابن ابی ہاشم نام ایک شخص اس کا کاتب تھا۔ افسوس ہے کہ اس شخص نے کوئی سوانح عمری یادگار نہیں چھوڑی۔ ورنہ یقیناً یہ چیز نہایت دلچسپ ہوتی۔ ابو العلاء کا ایک اور کاتب ابو المجد نامی تھا۔ لیکن خود شاعر کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھے سمجھ دار کاتبوں کا ملنا اس زمانہ میں بھی ایک دشوار امر تھا۔

ابو العلاء نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جیسے کہ اکثر ہوا کرتا ہے جس کتاب کے متعلق وہ بالکل مایوس تھا وہی کتاب ہے جس نے اسے اس قدر شہرۂ آفاق کیا ہوا ہے۔ اس کی ابتدا

زمانے کی تمام نظمیں مع چند ایسی نظموں کے جو بغداد سے واپسی کے بعد کہی گئیں تھیں ایک کتاب کی صورت میں جمع کی گئیں اور اس کتاب کا نام "سقط الزند" ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول خاص و عام ہوئی کہ اس کی اور کوئی تصنیف اس درجے کو نہ پہنچ سکی۔ علامہ تبریزی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔ حاشیہ کے دیباچے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ معرہ آنے کے بعد انھوں نے ابو العلاء سے درخواست کی کہ یہ نظمیں ان کو پڑھا دی جائیں لیکن شاعر نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ان میں قدیم عربی شعراء کی طرح اس نے بہت کچھ افتخار سے کام لیا ہے اور یہ کہ اُس زمانۂ مابعد کی نظمیں زیادہ قابل غور و فکر ہیں۔ لیکن باوجود اس کے تبریزی نے "سقط الزند" کی شرح لکھی۔ یہ کتاب کی اچھی شرحوں میں شامل نہیں اور اس کے علاوہ اور بہت سی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں سقط الزند کے جس کثرت سے نسخے ملتے ہیں ان سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب اسلامی ممالک میں کس قدر ہر دلعزیز و مقبول ہوگی۔

سقط الزند کے بعد ابو العلاء کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "لزومیات" ہے یہ کتاب ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو شاعر کے تیسرے حصۂ زندگی میں وقتاً فوقتاً لکھی گئیں تھیں۔ اور ان کو ابو العلاء نے ہی شائع کر دیا تھا یہ نظمیں زیادہ تر ابو العتاہیہ کے رنگ میں کہی گئی ہیں۔ اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ ان کا موضوع ہے لیکن ان میں سے اکثر ایسی بھی ہیں جن میں ابو العلاء نے اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ کی ہے۔ یہ عقائد اس کے سوانح نویسوں کے خیال میں برہمنی بت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر موجودہ محققین نے بتایا ہے کہ ان کا اصل منبع جین مت تھا اور شاعر غالباً ان خیالات سے بغداد اور اپنی دیگر سیاحتوں کے دوران میں واقف ہوا تھا۔ ان عقائد میں سے تین بالخصوص قابل ذکر ہیں:۔

(۱) وہ نہایت سختی سے اس خیال کا پابند تھا کہ محض گوشت کی غرض سے جانوروں کو ذبح کرنا گناہ ہے اور ان کو کسی اور طرح نقصان پہنچانا درست نہیں۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ مسکین کو ایک دینار دینے کے مقابلہ میں ایک مکھی کی جان بچانا زیادہ نیک کام ہے۔ عام سوانح نویسوں کا خیال ہے کہ اس نے یہ عقیدہ بغداد سے واپس آنے کے بعد اختیار کیا تھا۔ خود اس کے رسائل سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۲) وہ مردے کو بجائے دفن کرنے کے جلانے کا طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ

موخرالذکر ایک خالص ہندی رسم ہے۔

(۳) وہ فنا کا درجہ حاصل کرنے کا خواہشمند صوفیانہ عقائد کے مطابق نہیں بالکل بودھ اور جین مت کے نروان کے مطابق۔

اس موضوع کے علاوہ لزومیات میں شاعر نے مختلف باتوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جب یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس وقت بھی اور اس کے بعد جب یورپ اس سے واقف ہوا تو سب سے زیادہ جس چیز نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا وہ مصنف کے مذہبی خیالات تھے جن میں اس نے عیسائیت، یہودیت اور خود اسلام پر کھلم کھلا حملے کئے تھے اور ان پر مذاق اڑایا تھا۔ ان میں بعض قطعات خصوصیات کے ساتھ ابو العلاء کے دشمنوں نے مشہور کئے، اور ابو الفداء نے ان کو اپنی مشہور و معروف تاریخ میں نقل کیا۔ اس طرح وہ یورپ میں پہنچے۔ مگر ساتھ ہی ایسے قطعات جن میں شاعر نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے نظر انداز کر دئے گئے۔ ایسی حالت میں ابو العلاء کی تکفیر کے مسئلہ پر بحث شروع ہوئی اور اسی وجہ سے خود اس نے اپنے ایک رسالہ میں الحاد سے انکار کیا اور لکھا کہ یہ تمام الزام ایسے اشخاص کے لگائے ہوئے ہیں جو اس سے حسد کرتے ہیں۔ مگر اس کا جواب دشمنوں نے یہ دیا کہ ایسے شخص سے کوئی کیا حسد کرے گا جو مردود بارگاہ لم یزلی ہو اور اس دنیا کی تمام خوشیاں بھی کھو چکا ہو۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ تمام دنیا اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ خود اس کا ایک شاگرد جو آخر میں مذہبی نظر سے بہت کچھ مشہور ہو گیا تھا۔ جب معرہ سے واپس آیا اور لوگوں نے ابو العلاء کے مذہبی اعتقادات کے متعلق اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا وہ پکا اور کٹا مسلمان ہے ایک اور شاگرد جو بعد کسی مقام کا قاضی ہو گیا تھا، بیان کرتا ہے کہ اس نے ابو العلاء کو تنہائی میں اس خشوع و خضوع سے قرآن پڑھتے سنا ہے کہ جس سے اس کے مسلمان ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ چند مشہور و معروف شامیوں اور دیگر مسلکوں کے علماء نے شاعر کی حمایت میں کتابیں تصنیف کی تھیں۔

مگر باوجود ان تمام حمایتوں کے لزومیات کے قطعات ویسے کے ویسے ہی موجود تھے اور ان کے سبب ابو العلاء پر الحاد کا الزام لگایا جا سکتا تھا بعض مرتبہ ان قطعات کا یہ جواب دیا گیا کہ محض شاعرانہ خیالات ہیں اور شاعر کے اصلی عقائد پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا بہرحال عام طور پر ان لزومیات پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ نہیں کیا گیا

اور ان کو ہر طرح بے کار سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ آخر ایک یوروپین مستشرق ہمبر پگستال نے دنیا کو یہ تبلایا کہ ان اشعار میں ابوالعلاء نہ صرف ایک شاعر معلوم ہوتا ہے بلکہ وہ ایک زبردست فلسفی بھی ہے۔ اس مستشرق کی رائے کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ فان کریمر جیسی شخصیت نے متعدد کتابوں اور رسائل کے ذریعہ دنیا کو یہ تبلایا کہ حقیقت میں ابوالعلاء ایک ایسا فلسفی ہے کہ جو اپنے زمانہ کے خیالات سے کچھ آگے بڑھ گیا تھا اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ فان کریمر نے بہت کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے تو یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ لزومیات میں بہت سے خیالات ایسے ظاہر کئے گئے ہیں جو اس زمانے کے لحاظ سے عجیب و غریب ہیں لیکن ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ خود شاعر نے ان خیالات کو یہ سمجھ کر ظاہر نہیں کیا تھا، کہ وہ کوئی نئی بات کہہ رہا ہے، بلکہ محض شاعرانہ حیثیت سے اس نے ان کو لکھ دیا تھا۔

لزومیات اور سقط الزند کے علاوہ ابوالعلاء نے اور بھی بہت سی کتابیں اپنی یادگار میں چھوڑی تھیں ان کی تعداد (۵۵) بیان کی جاتی ہے، مگر وہ سب کی سب مفقود ہو چکی ہیں۔ ایک مصنف نے جو سنہ ۶۴۲ھ میں مرا بیان کیا ہے کہ ان کا بڑا حصہ اس وقت ضائع ہوا تھا جب کہ عیسائی مجاہدین نے سنہ ۴۹۲ھ میں معرہ کو فتح کر کے لوٹا تھا۔ ابوالعلاء نے اپنے خطوط خود جمع کئے تھے۔ اگر وہ اصلی نسخہ اس وقت ہاتھ آ جائے تو نہایت ہی ضخیم ہوگا۔ لیکن اس وقت جو نسخہ موجود ہے وہ بہت ضخیم نہیں۔ اور یہ بیروت اور اکسفرڈ میں چھپ چکا ہے۔

ابوالعلاء سنہ ۴۴۹ھ - ۱۰۵۸ء میں تین دن کی بیماری کے بعد مرا۔ اور معرہ ہی میں دفن ہوا۔ بہت سے علماء نے اس کے مرثیے کہے اور الذہبی کا بیان ہے کہ اس کی قبر آخر میں مرجع خاص و عام ہو گئی تھی۔ مگر آج کل باوجود تحقیق کے اس کی قبر کا نشان نہ معلوم ہو سکا۔

معارضہ بر غزل غالب
کے
متعلق ایک چٹھی

گزشتہ سے پیوستہ نمبر میں مولوی محمد فخرالدین صاحب کا ایک مضمون "معارضہ بر غزل غالب" پر طبع ہوا تھا اس کے متعلق جناب مولوی سید نوازش علی صاحب سلمہ نے ایک چٹھی روانہ کی ہے جو بجنسہ طبع کی جاتی ہے۔

مدیر

خدمت جناب اڈیٹر صاحب رسالہ "ترقی"

جناب من،　　تسلیم

حضرت غالب کی غزل پر، میں نے جو معارضہ لکھا تھا اس کے متعلق ترقی کے نمبر (۵) میں مولوی محمد فخرالدین صاحب مدرس سٹی ہائی اسکول نے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے، جس کا ماحصل کچھ بھی نہیں ہے نہ تو میرے معارضہ میں کچھ سقم بتایا ہے اور نہ کوئی غلطی ظاہر کی ہے صرف اتنا لکھا ہے، کہ معارضہ کا لفظ خونخوار ہے، اس نے مدرس صاحب کو چونکا دیا، اس میں کوئی خوبی نہیں ہے، اس میں کوئی شعر حضرت غالب کے کسی شعر سے بہتر یا اس کے لگ بھگ نہیں ہے مثال میں میرے دو چار شعر بلا کسی رائے کے نقل کر دئے ہیں اور اس ضمن میں مجھ کو سخت سست کہا ہے اس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" اور حضرت کے ایک ایک فقرے کو لکھ کر اس کا جواب عرض کرتا ہوں امید کہ یہ رسالہ ترقی میں طبع کر دیا جائے گا۔ ورنہ اصل مضمون مولوی فخرالدین صاحب کے پاس بھجوا دیجئے، مگر صورت اول اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ اہل علم ایک دوسرے کے متعلق کوئی ایک اچھی یا بری رائے قائم کر سکیں گے۔

قولہ "شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے فلسفیانہ نکات جنہیں ان کی زندگی کے تجارب کا نچوڑ سمجھنا چاہئے آج تک اہل بصیرت کے لئے سرمایۂ نصیحت و متاع عبرت بنے ہوئے ہیں آپ کا ایک شعر مشہور ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ"

اقول ۔ لاریب فیہ آپ کا ارشاد بجا اور درست ہے ۔

قولہ ۔ مگر آہ اسی دنیا میں ایک ذی روح نوع ایسی بھی ہے کہ جس کی بینائی کے حق میں آفتاب مع اپنی بے پایاں روشنی کے بیکار ہی نہیں بلکہ موجب تیرگی و ظلمت ہے ۔

اقول یہ بھی بالکل درست ہے ۔

قولہ ۔ غالب کی شاعری کا آفتاب آسمان شعر و سخن پر تاباں و درخشاں ہے ۔ الخ

اقول ۔ صدقنا ۔

قولہ مگر آہ اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی بستے ہیں کہ غالب کی شاعری کے اس آفتاب جہاں تاب سے ان کی آنکھیں بے نور ہو رہی ہیں ۔ الخ

اقول شاید ایسا ہی ہوگا ۔

قولہ ۔ رسالہ ترقی کے چوتھے نمبر میں معارضہ بر غزل غالب کے عنوان سے کچھ اشعار دکھائی دئے ۔

اقول اسی غرض سے چھاپے گئے تھے کہ لوگ ان کو دیکھیں ۔

قولہ ۔ پہلے تو معارضہ کے خونخوار لفظ ہی نے چونکا دیا ۔

اقول آپ اچھی طرح نہیں چونکے اگر اچھی طرح چونکتے تو لفظ کی صفت خونخوار نہ فرماتے کوئی لفظ خونخوار نہیں ہوتا!

قولہ ۔ اس کے بعد ہم نے ان اشعار کو بہ غور مطالعہ کیا ۔

اقول ۔ آپ نے بیجا زحمت گوارا فرمائی یہ کام آپ کا نہ تھا ۔

قولہ ۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صاحب معارضہ کا ناظرین کرام سے تعارف کرا دیا جائے ۔

اقول تعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" ہاں پہلے آپ اپنا تعارف کرائیے، دکن سے ہند تک مجھ کو اکثر اہل علم جانتے ہیں، متفرق ماہانہ پرچوں میں میرے مضامین برسوں بالالتزام چھپا کئے ہیں، میرے متعدد تالیفات و تصنیفات مطبوعہ اس وقت ملک میں موجود ہیں، میں عربی و فارسی کا ماہر ہوں، انگریزی پڑھ کر عربی و فارسی علوم میں دخل دینے والے لوگوں میں نہیں ہوں، سرکار عالی کا نمک خوار ہوں، آبائی منصبدار ہوں ضلع کا محاسب ہوں ۔ آپ کے سوا یہاں مجھ کو سب لوگ جانتے ہیں مہینہ دو مہینے سے تو

آپ بھی مجھ کو جاننے لگے ہیں۔

قولہ ۔مگر افسوس کہ ہم آپ کی عظیم الشان اور مشہور و معروف شخصیت سے اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں کہ آپ کا اسم گرامی نوازش علی صاحب ہے۔

اقول گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ممکن نہیں کہ یہاں کا کوئی شاعر میرے نام یا تخلص سے واقف نہ ہو۔ اگر خاندانی حالات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو ملاحظہ ہو تاریخ دکن مولفہ مولوی نصر اللہ خاں خورجوی مطبوعہ مطبع منشی نول کشور بہ ضمن ذکر جدی میر احمد علیخاں بہادر شہید دہلوی و ذکر قبلہ گاہم حضرت میر کاظم علی شعا مرحوم ؎

تا گوہر آدم نسبم باز نہ استد ز آبائے خود ارشمرم اصحاب کرم را

اما نہ بود وصف اضافی ہنر ذات ایں فتویٰ ہمت بود ارباب ہمم را

میں اخرو، فخرو، نتھو، خیرو نہیں ہوں جو مجھ کو کوئی نہ جانے لیکن میرا عمل اس شعر پر ہے ؎

لیس الفتی من یقول کان ابی ان الفتی من یقول ھا انا ذا

؎ المنۃ للہ کہ ننازم بہ نسب نیست اینک بہ گواہی طلبم لوح و قلم را

کسی روز دفتر ترقی میں تشریف لائیے، کوئی مصرع طرح دیجیے، آپ اور میں دونوں مل کر غزلیں لکھیں گے اس وقت میری شخصیت آپ کو نظر آجائے گی۔ ع ہر کہ می خواہد بہ بیند در سخن بیند مرا۔

قولہ ۔چونکہ آپ شاعر بھی ہیں۔

اقول بیشک میں شاعر میرے والد شاعر میرے دادا شاعر تقریباً چالیس سال سے میں شعر کہتا ہوں ضرورت فن شعر سے بخوبی واقف ہوں اس کے متعلق مضامین لکھے ہیں رسالے تالیف کیے ہیں یہاں کے شعرا کا شاید ہی کوئی تذکرہ ہو گا جس میں میرا اور میرے آبا و اجداد کا ذکر نہ ہو۔

قولہ ۔اور ایسے شاعر کہ غالب اور ان کے کلام کو ہیچ اور قابل اصلاح سمجھ کر آپ نے معارضہ کی تکلیف گوارا فرمائی

اقول میں نے نہیں آپ نے حضرت غالب کے کلام کو قابل اصلاح سمجھ کر اس مضمون کے لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے چنانچہ ع اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا، کی جگہ اگر اور زندہ رہتے یہی انتظار ہوتا، لکھا ہے۔

قولہ۔ اس لئے لمعہ تخلص فرماتے ہیں۔

اقول۔ یہاں اس لئے کہنا غلط ہے یہ دلیل نرالی ہے نہ لمی ہے۔ نہ لمعہ کے لئے معارضہ ضروری ہے نہ معارضہ کے لئے لمعہ لازمی ہے۔ مجھ سے قبل بھی شعرا نے فارسی میں بعض اشعار پر معارضہ کیا ہے یہ تفنن طبع ہے اس سے کسی کی منقصت مقصود نہیں ہے، اس سے زور قلم اور طبیعت کی جودت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

قولہ اس تعارف کے بعد اب ہم معارضہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اقول۔ بسم اللہ ہو جائے۔

قولہ۔ معارضہ کی ترتیب اس طرح واقع ہوئی ہے الخ۔

اقول۔ جی ہاں اسی طرح واقع ہوئی ہے۔

قولہ۔ ہم اس موقع پر مثال کی طور پر صرف دو شعر نقل کرتے ہیں۔

اقول۔ یہ تحصیل حاصل ہے ناظرین سب شعر دیکھ چکے ہیں۔

قولہ۔ جس سے یہ مخالفت اور ضد بخوبی منکشف ہو جائے۔

اقول۔ پہلے ہی منکشف ہو چکی ہے اور لفظ معارضہ سے خود یہ بات ظاہر ہے۔

قولہ۔ آخر اس معارضہ کی غرض و غایت کیا تھی۔ الخ

اقول۔ اس کی غرض و غایت وہی ہے جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔

قولہ۔ ہم اس معارضہ کی قدر کرتے۔ الخ

اقول۔ اگر آپ اس معارضہ کی قدر کرتے تو وہ عین ناقدری ہوتی خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی قدر کی ورنہ تحسین ناشناس کی تعریف اس پر صادق آتی ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

قولہ۔ کم از کم اتنا تو ہوتا کہ حضرت لمعہ کا کوئی شعر غالب کے کسی شعر کے لگ بھگ ہوتا۔

اقول۔ اس کا مجھ کو بھی اعتراف ہے کہ میرا کوئی شعر حضرت غالب کے کسی شعر کے لگ بھگ نہیں ہے چنانچہ

میں نے معارضہ کے آخری شعر میں اس بات کو بیان کر دیا ہے کما قلت ؎

میرا کوئی شعر ہوتا جو نظیر شعر غالب		تو میں لمعہ فخر کرتا مجھے افتخار ہوتا

جس بات کو میں خود مان چکا ہوں پھر آپ اس کے متعلق کیا فرما رہے ہیں۔

قولہ غالب کے اشعار کی مخالفت میں جس قدر اشعار بہم پہنچائے گئے ہیں ان میں نہ تو کوئی لفظی خوبی ہے اور نہ معنوی لطافت

اقول لفظی خوبی کو آپ نہیں سمجھ سکتے اس لئے کہ آپ لفظ کی صفت خونخوار لکھتے ہیں پھر آپ سے لفظی خوبی سمجھنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے اب رہی معنوی لطافت وہ بخوبی ظاہر ہے کہ شاعر نے جس بات کو ثابت کیا ہے اس کو دلیل کے ساتھ الٹ دیا گیا ہے بس یہی لطافت اور لطیفہ ہے شعر میں واقعیت سے بحث نہیں ہوا کرتی ہے کما لایخفی علی من لہ ذوق سلیم

قولہ دو شعر تو اوپر گذر چکے ہیں جس سے ناظرین کرام پر اس معارضہ کی حقیقت کسی قدر بے نقاب ہو گئی ہو گی مگر ہم چار پانچ شعر اور نقل کئے دیتے ہیں کہ معارضہ مذکور کی پوری قلعی کھل جائے۔

اقول دو شعر نقل کر کے آپ نے ان کے متعلق کچھ بیان کیا نہ اب پانچ شعر نقل کر کے کچھ بیان فرماتے ہیں اگر ان کی قلعی کھلنے والی تھی تو جبھی کھل گئی ہو گی جب کہ وہ رسالہ ترقی میں چھپ چکے تھے اب آپ کے نقل کرنے میں کیا رکھا ہے کہ کچھ کہے بغیر ان کی قلعی کھل جائے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے یہ عجب طرح قلعی کھولنا ہے لکڑی کا ٹکڑا تلوار کے میان میں رکھ کر آپ ہر وقت قبضہ پر ہاتھ ڈال ڈال کر ڈراتے ہیں لیکن ذرا میان سے کھینچئے تو سہی تاکہ سب کو اس کی آبداری نظر آجائے۔

قولہ اس موقع پر شاید یہ مناسب ہوتا کہ غالب اور حضرت لمعہ کے اشعار پر موازنہ کیا جاتا الخ

اقول اگر ایسا ہوتا تو خوب مزا ہوتا۔ آپ کا شمار سخن فہموں میں ہوتا لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ نہ غالب کا شعر سمجھ سکتے ہیں نہ لمعہ کا۔

قولہ جناب لمعہ ایک نامور شاعر ہی نہیں۔ بلکہ آپ کا اردو انشا پردازی پر بھی ایک خاص احسان ہے الخ

اقول بیشک اگر اس میں آپ کو شک ہے تو کم از کم صحیفہ اور ذخیرے ہی کے ماہانہ پرچے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔

قولہ ایسے مضامین کے لئے تو صرف ایک ہی جگہ بہت زیادہ مناسب ہے یعنے ردی کی ٹوکری۔

اقول میں نے بیسیوں مضمون لکھے اس وقت تک میرا کوئی مضمون کسی اڈیٹر نے ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا

یہ آپ کا پہلا مضمون تھا۔ جو بالکل ابتدائی اور نوشقی کی حالت ہے اگر اڈیٹر صاحب آپ کے اسکول کے طلبہ میں نہ ہوتے تو ضرور اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے اگر آپ کو میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو کسی دوسرے پرچہ کے اڈیٹر صاحب کے پاس اس کو بھیج کر دیکھ لیجئے۔ سارا مضمون پڑھ جائیے مطلب کچھ بھی نہیں۔ مطلب ہے تو صرف اتنا کہ لمعہ نے حضرت غالب کے کلام پر معارضہ کیا جو غالب کے کلام سے بہتر نہیں ہے اس کے لگ بھگ نہیں ہے۔

قولہ۔ جناب ہاشمی صاحب کا مضمون جس کے جواب کی حضرت لمعہ نے تکلیف گوارا فرمائی کس پایہ کا تھا؟

اقول۔ یہ ہے ماحصل اس مضمون کا، یہ بہت ہے ٹیپ کی، اے حضرت وہ جواب لمعہ کا ایسا تھا کہ اس کو ماننا ہی پڑا اس کا کچھ بھی رد نہ ہو سکا اگر ہو سکتا تو بھلا آپ چوکنے والے تھے۔ جہاں اتنا لکھ مارا اس کا جواب ہی کیوں نہ لکھتے۔ جب نہیں تو اب سہی۔ یہیں گوئے ہمیں میداں۔

قولہ۔ ہم جناب ہاشمی صاحب کی پر متانت خاموشی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے ایک خاص گروہ کے جواب میں وہی کیا جو عقلمند کرتے چلے آئے ہیں۔

اقول بیشک انہوں نے عقلمندی کی، رد جواب کی گنجایش ہی نہ تھی اگر کچھ لکھتے تو اور زیادہ رسوائی ہوتی خیر انہوں نے تو پر متانت خاموشی اختیار کی یہ آپ کی شاندار پسپائی کس لئے ہے، آپ سب کچھ کہہ جاتے ہیں اتنا نہیں کہہ سکتے کہ لمعہ نے اس مضمون کے رد میں فلاں بات غلط کہی ہے، وہ ذو معنے والی بات کو ذو معنے کہتے ہیں اور لمعہ اس کو رد کرتا ہے، وہ وقعت سے وقیع بتاتے ہیں لمعہ اس کو غلط کہتا ہے وہ قاضی کے معنے نہیں جانتے لمعہ ان کو سمجھاتا ہے، جناب مولوی صاحب خدا کے لئے انصاف کیجئے، کسی کی بیجا طرف داری نہ فرمائیے۔ میرے مضمون میں آپ کو لہجہ کی اگر شکایت ہے تو میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں لیکن آپ بھی اظہار حق کے لئے آمادہ ہو جائیے اور کہہ دیجئے کہ لمعہ نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ اگر یہ نہیں کہہ سکتے ہیں تو اس کا رد لکھئے، اس کو طبع کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں تو یوں ہی لکھ کر میرے پاس بھیجدیجئے۔ میں نہایت ممنون ہوں گا۔ اور اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر آپ کی خدمت میں شکریہ کے لئے حاضر ہوں گا۔

سید نوازش علی لمعہ

حیات تمدن

حصۂ اول

عہد سلف

(از جناب مولوی محمد مرتضٰے صاحب مولوی فاضل)

بسلسلۂ گزشتہ

عربی زبان کا اقتدار بھی بہت گھٹ گیا ہے۔ عربی ادب و شاعری کے قدردان مٹ چکے تھے۔

ایرانی معاشرت کے ساتھ ہی ایرانی زبان بھی اس حصۂ دنیائے اسلام کی عام اسلامی زبان تھی فارسی کے عام غلبہ کا اس سے زیادہ اندازہ کس چیز سے ہوسکتا ہے کہ ایرانیوں کے پرانے تاریخی رقیب ترک بھی اب اسی زبان اور معاشرت کے پابند تھے ایک قلمرو کے عوض کئی مطلق العنان قلمرو ہیں جو باہم ہمیشہ دست و گریبان رہتے ہیں لیکن ہر جگہ فوجی اقتدار عام طور سے غلامان ترک کے ہاتھ میں ہے۔ ہر جگہ انہی تازہ خون ترکوں کی جدید بھرتی ہوتی رہتی ہے۔ ان اختلافات قومی جنسی اور لسانی کو متحد بنانے والی چیز مذہب ہے اور اس سے حسب بیان سابق جس طرح ایک طرف اسلام کی ہمہ گیر جذب کی خاصیت ظاہر ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ اس گرہ کشائی کا راستہ ملتا ہے کہ مابعد پیشقدمی سے وہ نتائج کیوں مترتب نہیں ہوئے۔ جو ابتدائی پیشقدمی سے اس طرح ظاہر ہوئے کہ ملک کی اصلی آبادی مسلمان ہوگئی اور جس پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

محمود غزنوی ۳۸۶ھ ۹۹۶ء تیس سالہ نوجوان مگر سنجیدہ محمود کو جب ایک منتظم حکومت ورثہ میں مل گئی تو ابتدا سے راستہ بالکل صاف تھا، نہ صرف پنجاب جو اب بجائے وسیع سندھ کے ایک حصہ کے بطور جدید جغرافیہ میں داخل ہوا تھا اسلامی صوبہ بن گیا۔ اور محمد بن قاسم کا مدتوں سے فراموش شدہ تخیل محمود نے اپنے قنوج میں داخلہ سے پورا کیا بلکہ ملتان اور سندھ کو بھی اسمٰعیلیت کے اقتدار سے چھڑا کر اپنی قلمرو میں داخل کرتے ہوئے گجرات کے سومنات میں

جا پہنچا۔ اس قدر طویل سفر اس کی خوش تدبیری کا نمونہ ہے تو قنوج کے مہاراجہ کے ساتھ اس کا برتاؤ اس کی حسن سیرت کی قوی شہادت ہے جس کو مغربی مصنفوں نے اس قدر مہیب شکل میں دکھایا ہے۔

دربار غزنی کی بدولت ایک طرف ہندوستان میں اسلامی عملداری کا دروازہ کھل گیا تو دوسری طرف اسماعلیت کے اور تشیع بویہی کے روز افزوں اقتدار کو ایک سخت ضرب لگی اور اس کے ساتھ ہی علم و حکمت کی ترقی میں جان تازہ آگئی۔ اور اس میدان میں بھی دربار غزنی سامانی اور بویہی درباروں سے آگے بڑھ گیا غزنی اس وقت دنیا کا نامور دارالعلوم تھا۔ ابوریحان بیرونی جیسا فخر حکمائے اسلام جس نے اسی زمانہ میں ہندوستان آکر سنسکرت میں کمال حاصل کیا۔ اسی دربار کی آرائش ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فوج کشی کے ساتھ ہی ہندوستان کی علمی تحقیقات کس بلندترین درجہ تک پہنچ گئی۔ جس پر آج بھی بہت کم اضافہ ہوسکا ہے۔ شمشیر بازان اسلام علم و حکمت کو بھی اسی طرح جلا دے رہے تھے۔ جس طرح فرزندان ارض مغرب۔

فارسی کی گرم بازاری اب بیحد بڑھ گئی اور گویا ایران اسلامی رنگ میں زندہ ہوگیا۔

جانشینان محمود | اسلامی عہد کے اس عام نقص (خودسری) نے جو ہر وقت اور ہر جگہ نظر آتا ہے جانشینان محمود کو بھی باہمی جنگ و جدال میں مصروف کردیا۔ اسمٰعیلیت بحری راستہ سے بہت جلد پھر اپنی سابقہ حالت پر قائم ہوگئی۔ اور ملتان بدستور انہی کے اقتدار میں تھا۔ مستنصر فاطمی کے شصت سالہ دور حکومت میں (جو عہد اسلام میں سب زیادہ طویل المدت فرماں روا گذرا ہے) اسمٰعیلی نقیب و داعی تمام اطراف عالم میں پھیل گئے۔ بویہی اور غزنوی وغیرہ دربار سست ہوگئے تھے۔ بہت ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کے بعد پھر ایک شیرازہ کی ضرورت ہوتی ہے

آل سلجوق | اس وقت تک جتنے ترک آئے وہ کسی دربار کے متوسل رہتے تھے جو عربی یا ایرانی نسل ہوتے لیکن ان درباروں کے سست ہوجانے کے بعد کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ ترک خود عصائے حکومت نہ اٹھالیں جن کی تلواریں ہی ہر دربار کی زینت تھیں۔ تازہ وارد ترکان آل سلجوق جنہوں نے اولاً اسلام کو پامال کیا۔ حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں اور اب خود اپنا ایک پرسطوت دربار جماتے ہیں چھوٹی چھوٹی طاقتیں ان کے دائرہ اقتدار میں جذب ہوجاتی ہیں۔ ایران سے شام تک انہی کی حکومت کا آفتاب چمکتا ہے۔ عربی زبان کے نفوذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ جب کہ دفتری زبان جو اب تک عربی رہی تھی ان اجنبی سلجوقی ترکوں کے زیر حمایت

فارسی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ آل سلجوق علمی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کرتے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ علم ادب میں جمود آ جاتا ہے، علم وفن آگے بڑھنے کے عوض پیچھے ہٹنے لگتے ہیں، سوسائٹی کی خرابیاں قرمطیت کے عوض اب باطنیت کے رنگ میں اور زیادہ بھانے لگتی ہیں۔ طرہ یہ کہ نصرانیان یورپ، ارض مقدس کے دعویدار بنتے ہیں اور حروب صلیبیہ کا زمانہ آغاز ہوتا ہے (سلجوقی اور اسمٰعیلی مٹ بھیڑ اس کا راستہ دیتی ہے) اور ارض مقدس پر ان کا قبضہ بھی ہو جاتا ہے (۴۹۲ھ) اگرچہ ترکان سلجوقی میں بھی بہت جلد خودسری کے منازعتیں برپا تھیں لیکن بہر نوع یہی ترک نسل فاروق اعظم کی مفتوحہ ارض مقدس پر دوبارہ اسلامی جھنڈا قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ نورالدین و صلاح الدین جیسے ترک مدافعین اسلام نے نہ صرف نصرانیان فرنگ کو ناکام یورپ واپس جانے پر مجبور کر دیا، بلکہ مصر کی اسمٰعیلی سلطنت کی بھی جو معمولی اسباب زوال سے فنا ہو رہی تھی جگہ لے لی۔ اسلام کا اثر کیا چیز ہے کہ تو مسلم قومیں جب اس دام میں پھنستی ہیں تو پھر ہمیشہ کے لئے اس کے حلقہ بگوش ہیں؟

دربار غور | جس طرح ادھر سلجوقی ترک ابھر رہے تھے، اسی طرح ادھر غوری خاندان ابھرا۔ اس خاندان کی نسل ایران کے ضحاک سے ملائی جاتی ہے، جو عربی الاصل تھا۔ بہر حال کوئی نسل ہو، وہ صدیوں سے غور کا متوطن خاندان تھا، اور کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی کے حد خوف سے وہ سواحل ہند میں بھاگ گیا اور تجارت شروع کی۔ بہر نوع پھر دربار غزنی میں ہی اس خاندان کا وہ سیاسی نشوونما ہوا، جس کے بدولت غور کی صوبہ داری اس کو ملی۔ جس اصول پر دربار سمرقند سے غزنی کا دربار الگ ہوا بعینہ اسی اسلوب پر غور کا تازہ دم جنگی اسپرٹ دربار غزنی سے علیحدہ قائم ہوا، گو اس میں غوری الوطن فوج ہو لیکن فوجی اقتدار اس وقت کی متمدن دنیا کے ہر حصہ کی طرح یہاں بھی ترک غلاموں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ الحاصل جب غزنوی شان و شوکت غور میں منتقل ہو گئی تو ایک مستعد تازہ دم حکمراں اور اس کے قوت بازو وبھائی سپہ سالار کے بدولت پھر پیشقدمی کا دورہ آیا چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس سپہ سالار محمد غوری نے ملتان اور سندھ میں اسمٰعیلی پھر قائم شدہ زور کو توڑتے ہوئے دہلی میں اسلامی عملداری اسی سنۃ التاریخ ۵۸۸ھ کے مطابق قائم کر دی جس کو اس وقت کے دیسی حکمرانوں کی گو وہ بھی باہری سے آگئے تھے) دوسروں کی جگہ باہمی نا اتفاقی، قوت انتظامی کی کمی، ہندو فسق کی کثرت، نظام معاشرت کی خرابی، امراء اور عوام کا عدم تعاون، حالات زمانہ کی بے خبری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تلوار اگر

اپنی انتظامی حکومت قائم کر رہی تھی تو اس کے ساتھ ہی یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ مبلغین اسلام جو مدتوں سے سواحل ہند پر اپنا مستقل اخلاقی و مذہبی اثر قائم کر چکے تھے اور پنجاب میں تو پہلے سے کافی اسلامی اثر موجود تھا، اب خود ہندوستان کے دل میں اپنا گھر بنا رہے تھے۔ دہلی میں اسلامی جھنڈا لہرانے کے پیشتر خواجہ معین الدین قدس سرہ اپنے عزیز وطن کی دلچسپیوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اجمیر کی پہاڑیوں میں وہ روحانی اثر تازہ کر رہے تھے جو غار حرا سے تمام دنیا پر عالمگیر اخوت کے جذبہ کی تکمیل کے لئے روشن ہوا تھا اور یقیناً اس وقت کے باشندگان ملک کو یہ روحانی اثر سری کرشن اور بودھ کی مدتوں سے بھولی ہوئی تعلیم یاد دلا رہا ہوگا۔

ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت شہاب الدین محمد غوری کے جانباز اور باہمت غلامان ترک سپہ سالاروں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی (ترک) نے ترک و تاجیک و افغان نوجوان سے شمالی ہند سے بنگالہ تک اسلامی عملداری قائم کر دی۔ یہ نبی امی علیہ السلام کی عام تعلیم مساوات و توحید کا اثر ہے جس نے عربوں سے ایک بہت دور اور بالکل بے تعلق ایسی ہی کی طرح امی قوم کو اسی رنگ میں رنگ دیا کہ وہ اس کے نام لیوا بن کر ایک طرف ارض مقدس فلسطین پر اپنے ہی بلند اقتدار برقرار رکھیں تو دوسری طرف ہندوستان کو بعثت نبوی کے (۶۰۰) برس کے بعد اسلامی حکومت بنائیں

ایبک کے ترک غلام اور داماد شمس الدین التمش نے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بغداد کی سوسائٹی میں زندگی بسر کی تھی۔ دہلی کو اس وقت کی دنیا کے مرکز تہذیب و وضعداری بغداد کا نمونہ بنا دیا۔ حوض شمسی عراق کے مشہور ذرائع آبرسانی ہی کی تقلید تھی۔ بغدادی معاشرت اور بغدادی کاریگر دہلی میں اس کی ہندی سابقہ معاشرت و صناعی سے جداگانہ نیا رنگ جمانے لگے۔ فخر الملک عصامی جس نے بغداد میں (۳۰) سال وزارت کی تھی۔ دہلی میں آکر التمش کا وزیر بنا۔

نظام حکومت کسریٰ و قیصر کی جو سنت بدبختی سے پہلی صدی کے نصف میں ہی اختیار کی جا چکی تھی اور جس کے خون فشاں نتائج مسلسل خاندانوں کے تخت الٹتے رہتے تھے وہ ہندوستان میں بھی اس فتحمندی کے ساتھ ساتھ موجود تھی۔ فرماں روا کی ناتجربہ کار اور نا اہل اولاد جب کام بگاڑنے لگتی تو اس وجہ سے کہ ابھی تازہ حکومت تھی، لہٰذا تخت خود بہت جلد موزوں اور اہل فرماں روا کا انتخاب کر لیتا چنانچہ ایبک کے بعد جب اس کا بیٹا نا اہل نکلا تو خود امرا نے التمش سے درخواست کی اسی طرح جب التمش کی اولاد نا اہل کے برخلاف

ناصر الدین محمود اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو خود امرا دربار نے بھڑوچ سے طلب کرکے بادشاہ قرار دیا جس کے زمانہ میں التمش کا ترک غلام اور داماد بلبن مدار المہام تھا۔

مغل | اب تماشا گاہ عالم میں نیا پردہ اٹھتا ہے معتصم کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک جن باشندگان ترکستان نے عربوں کی غلامی سے تاج شاہی حاصل کیا وہ ترک تھے۔ یہ وہ قوم تھی جو ایران سے متصل بستی تھی اب ترکستان بھی ناز پرور دہ ہو کر زبردست اور جری نوجوں کو پیدا کرنے سے گویا عاجز آ رہا تھا نیز معاشرت میں جو بدترین خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور جن میں ترک عربوں سے زیادہ رنگیلے بن گئے تھے اور جن کی وجہ سے باطنیت یورپ کے انارکزم کی رہنمائی کر رہی تھی، ان کے خاتمہ کے لئے ناموس تاریخ کے عام اور ہمہ گیر اصول کے مطابق ایک زبردست سیلاب کی تیاری ہو رہی تھی۔ ترکستان کے اوراوپر سے اس وحشی خانہ بدوش قیامت آفریں قوم مغل کی آمد آمد کا شور محشر مچا۔ جو وسط تاتار میں بستے اور ترکوں ہی کے ہم نسل تھے (سنہ) جس سال محمد غوری کی شہادت ہوئی، اسی سال چنگیز کا نام بلند ہوا، جس کو قدرت نے جہاں کشائی کی نئی طاقت بخشی۔ آل چنگیز کا نام قتل اور غارت کے لئے یادگار رہ گیا۔ ادھر ہندوستان میں ترک اسلامی تہذیب و تمدن کی بہار تازہ کر رہے تھے تو ادھر مغل ترکستان اور وسط ایشیا میں ناز و تنعم کا خاتمہ کر رہے تھے، ہر طرف سیلاب خون کی گرم بازاری تھی۔ وحشیان مغل نے ادھر بغداد (دارالاسلام) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ رسم پرستی اور باطنیت دونوں کو کچل ڈالا تو ادھر ہندوستان کا بھی تبت اور افغانستان دونوں طرف سے رخ کیا، لیکن دونوں جگہ ہندوستان کے مسلمان ترک چنگیزی مغلوں کی مدافعت میں کامیاب رہے کیونکہ شمشیر آزمائی کا جوہر ابھی تازہ تھا۔ اس وقت جب کہ اسلامی دنیا میں قیامت برپا تھی تو دہلی خانہ برباد مسلمان نامور اور باعظمت خاندانوں کے لئے پناہ گاہ تھی۔ برباد شدہ ریاستوں کے بیسیوں شہزادے اور شرفاء دہلی میں آسرا پاتے تھے، اس ترکی اور مغلی (یا مسلم اور غیر مسلم) باہمی کش کش کی بدولت ہندوستان کی اسلامی حکومت کو جنوبی ہند میں پیش قدمی کا موقع نہ تھا، جیسا کہ خود بلبن نے صراحت کی ہے۔

خلجی خاندان | بلبن کا جانشین پوتا (کیونکہ اس کا نامور بڑا بیٹا مغلوں کی مدافعت میں شہید ہو چکا تھا) جب عصائے حکومت اٹھانے کے قابل نہ رہا تو دربار کے ایک ذی اثر رکن بلکہ مدار المہام حسب تصریح ضیاء برنی

جلال الدین خلجی نے (یہ بھی ترک قوم تھی، لیکن ایک عرصہ سے افغانستان میں بس گئی تھی اور اس طرح ترکوں سے متمائز حیثیت رکھتی تھی) ۶۸۹ھ ساتویں صدی کے اخر آخر میں محمد غوری کے حملہ کے ایک صدی بعد باتفاق امراء عصائے سلطنت خود اٹھالیا، یہی سنت مستمرہ ما قبل کی طرح مابعد بھی نظر آتی رہے گی۔ انقلاب خاندان کا سبب اور اثر بعینہ وہی ہوتا تھا جو خود ایک خاندان کے نااہل بادشاہ کی علیحدگی اور اسی خاندان کے ایک موزوں بادشاہ کے تقرر کا ہو۔ موروثی نظام حکومت کا نقص اور حسن انتظام کی عام خواہش خود اس تبدیلی کی داعی ہوتی۔ غرض اس طرح جلال الدین خلجی نے پھر انتظام حکومت قائم کر دیا۔

مشایخ طریقت | ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام نے جو اثر ڈالا، اس کا سب سے اہم جزو وہ روحانی کوشش ہے جو مشایخ طریقت نے لازوال طور پر سرزمین ہند میں اپنی یادگار چھوڑی ہے، اسی جاہ و جلال کے زمانہ میں جب نشۂ دولت اور ترفہ سے سلطان فاتحین متوالے بن رہے تھے، یہ سماں کس قدر پر اسرار اور دلکش معلوم ہوتا ہے کہ بزرگان طریقت کا فقیرانہ دربار الگ جما ہوا ہے، جو باقاعدہ طور سے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھتے ہیں اور دولت کی اس عام برگ ریز زمانہ میں سادہ زندگی کے بورئے اور جوار کی روٹی پر قناعت کرتے ہیں۔ مافوق العادت اور اس زمانہ میں ناقابل وثوق ریاضتوں سے نفس سرکش بالطبع اور خودی پسند فطرت انسانی کو رام بناتے روحانی طاقت کو مجلا کرتے، اور اس طرح تمام فرزندان مادر ہند کے دلوں میں عام اس سے کہ وہ مسلمان حکمران جماعت سے ہوں یا یہاں پہلے سے آئی ہوئی مختلف الطبقات سوسائٹیاں۔ نہ مٹنے والی حکومت کا سکہ جاتے ہیں، یہ مشن اسی طرح اپنے کام میں مصروف نظر آتی ہے جس طرح زمانۂ حال کے مسیحی مشن، وہ ہندوؤں کے آباد اور معاشرتی مرکزی مقامات میں جا کر بستے اور اپنی ریاضت سے جوگ اور ہندی فلسفہ کے تہ کے اندر گھس کر اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ تمام ملک میں سلسلۂ خلافت پھیلا دیتے ہیں اور ہر جگہ ایک منتظم اصول پر کام ہوتا ہے جس سے نظر آتا ہے کہ ایک ہی سالویشن آرمی کے ماتحت اجزا ہیں جو مطلق اپنے مقررہ اصول و قواعد سے انحراف نہیں کرتے اس اہم اثر پر تاریخی نگاہ سے (عقیدت مندی کی نظر سے علیحدہ) اس وقت تک حقیقت میں کافی غور و توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن در اصل یہ ایک مہتم بالشان اور قابل غور تاریخی مسئلہ ہے، جس پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔ (باقی آئندہ)

یا ایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ و رسولہ

از جناب مولوی سید احمد حسین صاحب امجد

توحید
خوش ہم سے رہے جاناں، ہم عید اسے کہتے ہیں
بس ایک کے ہو جانا، توحید اسے کہتے ہیں

نماز
گرنا ترے قدموں پر، ہے عین نماز اپنی
ہے اس میں سر افرازی، اے بندہ نواز اپنی

روزہ
بھولے سے نہیں آتا، کھانے کا خیال اب تو
دھن وصل کی رہتی ہے، ہے صوم وصال اب تو

زکوٰۃ
مر جانا محبت میں، ہے عین حیات اپنی
نقد دل و جاں دینا، گویا ہے زکوٰۃ اپنی

حج
عاشق کے لئے حج بھی، اک خاص بہانہ ہے
ہم کو درِ جاناں تک، ہر حال میں جانا ہے

حج
کام آ نہ سکی آخر، کچھ بخیہ گری اپنی
لے جاتی ہے جنگل کو، شوریدہ سری اپنی

حج
حلقہ درِ کعبہ پر، ہے حلقہ بگوشوں کا
ہے زانوئے دلبر پر، سرِ خانہ بدوشوں کا

اے مستِ مئی وحدت، کہہ اب تجھے کیا کم ہے
کوثر ہے مدینہ میں، اور کعبہ میں زمزم ہے

تفسیر ہو، یا قرآں، سب ایک ہی مطلب ہے
اسلام کے ارکاں ہیں، یا عشق کا مذہب ہے

جو کچھ ہے شریعت میں، وہ عین طریقت ہے
توحید محبت ہے، توحید محبت ہے

شایاں نہ بود امجد! بے صدق دعا کردن
بے شائبہ لذت، از فرض ادا گشتن

رباعی

اُنزل فیہ القرآن

افضل ہر ماہ سے ہے ماہِ رمضاں
انوارِ شبِ قدر ہیں اس میں پنہاں
اس ماہ کو کیوں منزلِ رحمت نہ کہوں؟
قرآن میں ہے، اُنزل فیہ القرآں

امجد

رخصت اے ماہِ صیام!

(از حضرت کیفی حیدرآبادی)

اے خداوند تعالیٰ کی سراپا رحمت! وہ فضیلت اثر و مایۂ خیر و برکت!
ہو سکی ہم سے ادا، تیری نہ شرطِ خدمت رخصت اے ماہِ صیام! آہ، دریغا رخصت!

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تیرے آنے کی مسرت کا عجب عالم تھا منزلوں دور مسلمانوں کے دل سے غم تھا
ایک اک دن ترا، گھٹتا تھا تو اک ماتم تھا اب تو رخصت ہے تری، ہائے غنیمت دم تھا

رفتی و حال دل زار، پہ جفا می کردی؟
کاش می بودی و صد گونہ جفا می کردی

مسجدوں میں ترے آنے سے بڑھی کیا زینت دل پہ ہر ایک مسلماں کے تھی، کیا کیا فرحت
اب برس دن میں، نظر آئے گی تیری صورت جا، خدا کو تجھے سونپا رمضاں! جا، رخصت

تا بہ سال دگر اے ماہ! کہ زندہ ماند
باش تا دل بہ مسرت، گوہر اشک افشاند

ہم سفر، ہم نہیں بن سکتے، تری منزل کے حوصلے، دل میں رہے جاتے ہیں، کیا کیا دل کے
ہو کشش، جاتے ہیں ترے ساتھ، ترے اُل کے پاس آ، پاس! کہ رو لیں گے گلے مل مل کے

جانے والے ترا اللہ نگہبان رہے
ہم گناہ گار ہیں اس کا بھی ذرا دھیان رہے

اک مہینہ رہے تم، گھر میں ہمارے مہماں اور ہم کرتے رہے، ہم پہ ہی الٹے احساں
سیکڑوں نعمتیں کھلوائیں، سنائے قرآں چھوڑ کر ہم کو، چلے جاتے ہو ماہ رمضاں!

پھر کہاں ہم ہیں؟ کہاں آپ کہاں یہ جلسے؟
رنگ، کچھ اور ہی ہو جائے گا اپنا، کل سے

اے شب قدر سی دولت کے نگہباں رخصت اے بہار گل سی پارۂ قرآں! رخصت
گل شاداب تر گلشن ایماں! رخصت رخصت اب آپ سے، بس کہے مہ تاباں رخصت

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

غزلیات

از جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی بی۔ اے (رکن دار الترجمہ)

رخ و کاکل، کہ صبح و شام کردند | مدار، گردش ایام کردند
کشیدند از خُم و در جام کردند | شراب شوق وقف عام کردند!
بہ جانان عاشقان، پاک طینت | زوند آتش، محبت نام کردند
شہیدان حریم کعبہ دوست | کفن را جامہ، احرام کردند
نہ دور نرگس مستانۂ او | رواج مے پرستی، عام کردند
رہ صد سالہ، طول امل را | حریفاں طے، بہ یک دو گام کردند
مترس از فتنہ کیش عاشقی را | جدا ز کفر و ز اسلام کردند
کشاد کار می جستم کہ از غیب | اشارہ سوئے پیر جام کردند
بیا محوی، ترا بعد از عراقی | دریں میخانہ دردآشام کردند!

از جناب مولوی عبد اللہ خاں صاحب کامل

در رہ عشق زخود رفتہ پشیماں بودن | سر بہ صحرا زدن و چاک گریباں بودن
ہر شب و روز بہ سودائے تلاشش لیلیٰ | بادیہ گرد چو مجنون بیاباں بودن
گل رویش چو زند خندہ بہ غنچۂ حسن | ہمچو بلبل بہ صد آہنگ غزلخواں بودن
کفر صد مرتبہ بہتر ز ریاکاریٔ ما | خرقہ در کردہ تبزویر مسلماں بودن
سالکی پیشہ ہمین است کہ در راہ سلوک | دست شستہ ز ہمہ بے سروساماں بودن
پیش آں قاتل سفاک بہ تسلیم رضا | سر بہ تیغ قضا دادن و خنداں بودن
مشرب فقر ہمین است بہ نزد قانع | کہ بر او رنگ غنا افسر شاہاں بودن
آنچہ قسام ازل داد بر آں قانع شو | تا بکے در طلبہ این شدن و آں بودن
دہن خویش پئے غیبت مردم مکشا | بہتر آں است کہ ہر حال ثناخواں بودن
کاملا منت مخلوق مکش در پئے زر | مرد را عیب بود بستۂ احساں بودن

اطمینان قلب

از جناب قاضی ظہیر الدین صاحب

اے سرافراز بوستان خیال — تا بکے رنج دہر سے یہ ملال
کیا تجھے دل فریبی دنیا — نہیں دکھلاتی راہ بیں الحال ؟
گرد باد جہاں کی خوش رنگی — ہاتھ میں دے گی تیرے جام سفال
خاک بازی ہے شوق تعیرات — خاک بیزی اخذ مال و منال
جمع دولت میں تو نہ بن طامع — سنگریزوں کے واسطے حمال
ہو چکا ہے جہاں میں آوارہ — جیسے داموں کے شوق میں دلال
کنج عزلت نصیب حکما ہے — کارآمد نہیں ہے قیل و قال
بے نصیبی میں خوش نصیبی ہے — ہو جو اس کلیہ پہ استدلال
پھر نہ ہوگی کبھی تجھے حاجت — نہ کھلے گی کبھی لسان الحال
پاک بازی سے زندگی ہوگی — دل فزا ہوگا تیرا حسن خیال
شب امید ہوگی نورانی — تجھے چاہیں گے شب روان خیال
کام وہ کر کہ جس سے دل کو رہے — لطف و راحت بغیر حزن و ملال
دل مجھے دے رہا تھا یہ تدریس — پر نہ تھا ایک سو خیال مآل
بن نہ آتی تھی کوئی بھی تدبیر — دل میں پیدا تھے لاکھ لاکھ سوال
کہہ چکا ہے کہ کام کر لیکن — ہے یہ محتاج گفتگو اجمال
اسی اثنا میں مجھ کو یاد آیا — ایک جلسہ کا لطف فرخ فال

جس میں تھا ہم کلام و گوہر ریز — پیر مرد کہن شکستہ حال
وضع رندانہ تھی قلندر تھا — گرم تھی گفتگو زبان سیال
دل پر نور کی ضیا بخشی — چہرہ صاف کی تھی شاہد حال
کہہ رہے تھے یہ خط و خال اس کے — کسی شاداب باغ کا تھا نہال
تھا بہ ظاہر وہ خستہ گرد آلود — نظر آتا تھا گو پریشان حال
پر تھے اسباب مجتمع اس کے — تھا وہ تسکین دل سے مالا مال
دل پہ تھا ایک سکون کا عالم — بیم دنیا تھی اور نہ خوف زوال
عرض کی میں نے صاحب تسکیں — تجھ سے رکھتا ہوں ایک عرض سوال
مجھے بتلا کہ کیا طریقہ ہے؟ — جس سے اچھی ہو صورت احوال
دل محزوں طمانیت پائے — نہ رہے اضطراب بیش الحال
اب تو حالت عجیب ہے میری — فکر دنیا سے ہوں پریشان خیال
علم و اسباب کی تلاش میں ہوں — جس سے پورا ہو فرض اہل عیال
طالب علم جب تلک تھا میں — امتحانات کا تھا ایک جنجال
جب ہوئی اس سے بھی سبکدوشی — وہ کشش پر ہے تمدن ایک وبال
سن کے فرمایا ناظر قرآن — فہم معنی کا رکھ ہمیشہ خیال
کہہ چکا ہے الا بذکر اللہ — تطمئن القلوب بالاکمال

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۲۳)

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابوالمکارم محمد انوار اللہ صدیقی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچہ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ (عہ) ششماہی (سے) نمونہ (۸/)۔

منیجر

جمال یار

حضرت نوری وشاہ صوفی سلمہم کے پر کیف مکاتیب کا مجموعہ جس کی نسبت ترقی (بابتہ ماہ شعبان ۱۳۲۹ھ) میں تنقید ہو چکی ہے۔ قیمت پانچ آنے

پتہ

(۱) شمس الاسلام پریس چھتہ بازار۔

(۲) دفتر رسالۂ ترقی۔

(۳) سید شاہ ظہور عالم چشتی سجادہ و خلف حضرت افتخار علی شاہؒ رازدار خان اپیچہ چشتی چمن۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ ـــــ بابت ماہ شوال ۱۳۴۱ھ ـــــ نمبر ۸

فہرست مضامین

شذرات

کسی زمانہ میں مسجد مسلمانوں کی جلسہ گاہ، مدرسہ دارالعلوم اور دارالشورہ تھی۔ وہ دن رخصت ہو چکے اور وہ زمانہ گزر گیا، لیکن یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ آئندہ بھی مسلمان اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں، جبکہ وہ کسی جدید نقش قدم کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے اقبال مند اسلاف کے اصول پر عمل کریں گے اور ان سے زمانۂ جدید کی ضروریات پوری کرنے کا گر سیکھ جائیں گے۔

الحمدللہ کہ عام طور پر بھی مسلمان اب اس ضرورت کو محسوس کرنے لگے ہیں چنانچہ کچھ دن ہوئے، مسجد چوک (حیدرآباد دکن) میں چند دردمند حضرات نے ایک دارالمطالعہ کا افتتاح کیا ہے، کتب بھی خاصی تعداد میں جمع کر لی ہیں، مقامی اخبارات و رسائل کے علاوہ باہر کے بھی تقریباً تمام اخبار و رسائل آتے ہیں، ناظرین کی تعداد بھی کافی ہے۔

کتب خانہ اشاعت علم کی بہترین اور متمدن طریقوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہم بانیان دارالمطالعہ کو ان کی ان خدمات پر مبارک باد دیتے ہیں اور دعا ہے کہ خدا ان کے مساعی کو قبول فرمائے۔

بعثت نبوی صلعم سے پہلے، ملت ابراہیمی کی اساس شرک آلود اور کھوکھلی ہو چکی تھی، اور وہ مقام جس کو حضرت ابراہیم نے آباد کیا تھا، بےشمار اصنام کا مسکن تھا، اور حرم محترم کے رہنے والوں کا، بلحاظ تمدن و معاشرت، یہ حال تھا کہ مثلاً حقیقی بہنوں سے شادی جائز تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثتاً ملتی تھی، لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں، بتوں پر انسان قربان کیے جاتے تھے شراب خوری، زناکاری وغیرہ خباثت کا عام رواج تھا، نہ صرف حجاز کا یہ حال تھا، بلکہ تمام دنیا ظلمت کدہ تھی۔ ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسا ہادی اور رہنما پیدا ہو، جو انسانی اعمال کو ان کثافتوں سے دور کر کے ایک ایسے رستے پر ڈال دے، جو ہر نکتۂ نظر سے فطرت انسانی کے موافق ہو۔ چنانچہ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو مصلح عالم اور ہمہ گیر شریعت کے موسس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تولد سے دنیا منور ہوئی، اور یہ جامع و کامل ہستی ۴۰ سال کی عمر میں منصب نبوت سے سرفراز ہوئی، اور اس صدا پر لبیک کہنے والی ایک جان نثار قلیل جماعت نے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کے وہ پاک و فرمانبردار بندے کیسے ہوتے ہیں جن کی نسبت ارشاد ہوا تھا کہ

"ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر، ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر، واولئک ھم المفلحون"

ترجمہ: تم میں سے وہ جماعت ہونی چاہیے جو دنیا کو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے، اور برائیوں سے روکے، ایسے ہی لوگ دنیا میں فلاح یافتہ ہیں"۔ اور یہی وہ فرمان خدائے قدوس ہے، جس کی بنا پر فرزندان اسلام نے دعوت حق کے قیام و اعلان، اور برائیوں کے استیصال، تمام عالم میں صداقت کے پھیلانے، اور برائیوں کی کثافت سے انسانوں کو پاک کرنے کی گرانمایہ خدمت کو انجام دیا۔

اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں تبلیغ کا کام، باوجود کفار کی سفاکیوں اور شدید مظالم کے جس استقلال اور مردانہ طور پر انجام پایا، اس کی تاریخ شاہد ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غزوات کا سلسلہ اور عہد خلافت کی لڑائیاں، جو اسلامی تاریخ کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں کسی ملک گیری اور طمع زر کے لئے نہ تھیں، بلکہ ہر اسلامی لڑائی کا مقصد توحید و دعوت حق کا اعلان و قیام تھا، جس میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ آج دنیا کا ہر گوشہ مسلمانوں سے معمور ہے۔

یہ ہے عمارت اسلام کی مختصر تاریخ، جس کی بنیاد مسلمانوں نے اپنے جسم و استخوان پر رکھی تھی۔ اب غور کرو اور دیکھو کہ کل جب وہ بہت تھوڑے تھے، توحید اور صداقت کے فروغ دینے میں کیا تھے، اور آج جب کہ تعداد میں ہم کہیں زیادہ ہیں کیا ہیں؟

مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض اپنے بنی نوع کی صلاح و فلاح ہے، اور یہی وہ مسئلہ ہے جو حضور اقدس حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے، خود قرآن شریف بھی ناطق ہے۔ "الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر، وللہ عاقبۃ الامور۔ ترجمہ مسلمانوں کی قوم وہ قوم ہے کہ اگر ہم ان کو حکومت و بزرگی دے کر دنیا میں قائم کر دیں، تو وہ اللہ کی عبادت اور اس کے نام کی تقدیس کو قائم کریں گے، مال و دولت سے برائیوں کو مٹائیں گے، اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔" گویا صاف اور واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ دنیا اور دنیا کے رہنے والوں میں خدا کے نام کا اعلان اور اس کی بندگی اور عبادت کی دعوت، عدل و صداقت کا قیام، اور برائیوں کا استیصال مسلمانوں کا اصلی مقصد حیات ہے۔ اگر آج کل مسلمانوں کے مقصد حیات کی تلاش کی جائے تو کیا ہم یہ کہہ سکتے کہ فرزندان اسلام اس معیار پر پورے ہیں۔ ان کے انفرادی مساعی سے قطع نظر اجتماعی کوششوں پر ہی ایک سرسری نظر ڈالئے اور دور نہ جائیے اور صرف ہندوستان کی ایسی کل انجمنوں کی فہرست مرتب کیجئے جن کا خاص مقصد اشاعت اسلام تھا اور ان کی عملیت کی تاریخ ملاحظہ کیجئے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار انجمنیں بنیں، چندے وصول ہوئے، سرمائے جمع کئے گئے کچھ کام کیا، اور جتنا کیا اس سے زیادہ ہی بگاڑا، جلسے ہوئے تقریریں ہوئیں، لمبے چوڑے رزولیوشن پاس کئے اور بعض دفعہ بحث مباحثہ کرکے آپس کے میل ملاپ میں بھی خرابی پیدا کی، یا اس سے زیادہ تحقیق کی نظر ڈالئے تو مجالس میں چار خوری گپ شپ ہوئی، مگر اصلی اور حقیقی کام کچھ نہ ہوا۔ الغرض اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم میں آج کل عملی قوت مفقود ہے اور یہی فقدان ہماری بربادی کا باعث ہو رہا ہے، کسی شعبہ کو لیجئے اور دیکھئے تو ہم اوروں سے بہت پیچھے نظر آئیں گے، پس سب سے پہلے اس چیز کی ضرورت ہے کہ ہم میں ایسی جماعت ہو جو معتبر ہونے کے علاوہ عامل بھی ہو اور اپنی دعوت عمل سے دوسروں کو عامل بنا سکے اور پھر ایسی جماعت مل جانے کے بعد ہمارا یہ اولین فرض ہونا چاہئے کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے، اس کے دل و جان سے شریک و مددگار ہو جائیں۔

اس وقت حیدر آباد دکن میں ایسی تین انجمنیں قائم ہیں، جن سے اشاعت اسلام کا کام متعلق کہا جا سکتا ہے، ایک

صفتہ الاسلام کے نام سے دوسری خادم الاسلام کے نام سے، اور تیسری اصلاح حال مسلمانان کے نام سے موسوم ہیں
ان میں سے پہلی نے اپنے آپ کو ۲۴ رمضان ۱۳۵۲ھ کو ایک عام جلسہ کے ذریعہ پہلے پہل روشناس کرایا ہے، اس کا مقصد غیر اقوام
میں اسلام کی اشاعت ہے، چنانچہ اس کا عملی کام بھی ملاحظہ سے گزرا تقریباً ۵۰۰۴ لڑکے مسلمان ہوئے ہیں، یہ سب حسب مراتب
علاوہ عبادات کے معاملات سے بھی واقف کرائے گئے ہیں، لکھنا، پڑھنا، دستکاری وغیرہ بھی سکھلائی گئی ہے - دوسری انجمن
بھی حال ہی میں قائم ہوئی ہے اور ملکانہ تبلیغ میں کچھ نہ کچھ حصہ لے رہی ہے - تیسری انجمن کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے، اس سے بھی انکار
نہیں کیا جاسکتا، کہ جہاں غیر اقوام میں اشاعت اسلام کی ضرورت ہے، وہاں بدقسمتی سے خود مسلمانوں کو بھی تعلیم اسلام سے
واقف کرنے کی ضرورت ہوگئی ہے، چنانچہ کچھ مدت ہوئی، اسی ضرورت کو محسوس کرکے چند درد مند حضرات نے اس کی بنیاد رکھی، انجمن کے
ایک دو عام جلسہ بھی ہوئے، مگر اس وقت تک اس کا عملی کام کہاں تک ہوا ہے، ہم اس سے بے خبر ہیں، یہاں صرف یہی تین انجمنیں
ایسی ہیں، جن سے کچھ کام کرنے کی توقع ہوسکتی ہے، مگر اشتراک مقصد کا مسئلہ زیر بحث آجاتا ہے جو ان انجمنوں کی بقا وارتقار سے
تعلق رکھنے کی وجہ سے بہت غور کے قابل ہے - یہ ظاہر ہے کہ ان انجمنوں کی بقا وارتقار کا انحصار صرف مالی سرمایہ کے مہیا ہونے
پر ہے اور ایک ہی مقصد کے لئے ان انجمنوں کا چندہ وصول کرنا سخت دشوار، خواہ امیر ہو یا غریب آدمی ہو یا اوسط، چندہ
اگر دے سکتا ہے تو ایک دو کو نہ کہ ایک ہی مقصد کے لئے بار بار مختلف لوگوں کو مداسلام کے سابقہ اور ابتدائی زمانہ پر نظر ڈالئے
اور دیکھئے کہ کہیں ارکان کا رجسٹر نہیں، رسائد کا انبار نہیں، چندہ کا تقاضا نہیں، اور پھر ہر ضرورت خواہ وہ قومی ہو یا انفرادی
پوری ہو جاتی ہے اس کی کیا وجہ تھی؟ یہی کہ خیرات، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ سب ایک جا جمع ہوتے تھے اور ان سے ہر قسم کا کام
بلادقت انجام پاتا رہتا تھا -

پس اس کے لئے بھی اس وقت ضرورت ہے کہ ایک قومی بیت المال قائم کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ خیرات، زکوٰۃ،
صدقات، چندے وغیرہ سب اس میں جمع ہوں اور ایک مرکزی انجمن قائم کی جائے جس کا خاص مقصد اشاعت اسلام غیر اقوام
میں اور تعلیم اسلام مسلمانوں میں ہو، اور اس انجمن کے ماتحت دوسری تمام انجمنیں کام کریں اور اسی مرکزی انجمن کے ماتحت بیت المال
ہو، جو مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت کو پورا کرے -

انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اشاعت میں ہم بیت المال کے فوائد اور قیام کے متعلق اپنی تفصیلی رائے شائع کریں گے

———•———

حجاز کے فرنگی سیّاح

(از جناب مولوی سیّد علی شبیر صاحب شبیر مترجم حیدرآباد ہائیکورٹ)

ابتدا سے، ہر مذہب کا ایک مرکز نظر آتا ہے، اور اس کی عظمت کے قائم رکھنے میں، اس مذہب کے پیرو کمال سرگرمی دکھاتے رہے ہیں، مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فرزندان اسلام نے، اپنے مذہبی مرکز کی عظمت و جلال کے قائم کرنے اور رکھنے میں، جو سر فروشی اور سرگرمی دکھائی ہے، اس کی نظیر نہ اگلی قوموں کی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ پچھلی۔

مقامات مقدسہ کی تقدیس و تحریم کے وہ انتہائی مراتب جو، بہ تعمیل فرمان خداوند عزوجل، مسلمانوں کے مدنظر رہے ہیں، ان کا اندازہ کسی قدر ذیل کے مضمون سے بھی ہو سکتا ہے۔

ایک وہ تھے، جنھوں نے کاٹے کوہ ایک ہم ہیں، نہ کاہ بھی کاٹی

وہ مسلمان، شاید مسلمان تھے، جن کو ہم اپنے اسلاف کہتے ہیں، جن کے اور کارناموں سے قطع نظر، صرف بیت اللہ و بیت الرسول کے احترام و عظمت کے لئے انھوں نے کیسی محیر العقل ثابت قدمی دکھلائی تھی، اور وہی ہم ہیں کہ آج انہی مقامات کو اغیار کا مسکن ٹھنڈے دل سے دیکھ رہے ہیں:۔

نہ داغ تازہ می کارد، نہ زخم کہنہ می خارد بدہ یارب دل کیں صورت بیجاں نمی خواہم

بہر حال ہم اپنے دوست مولوی سید علی شبیر صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے جغرافیے کے ایک خاص حصہ کی جانب توجہ کی، جو فی زمانا مسلمانوں کے لئے نہایت مفید و محرک ہے۔

فاضل مضمون نگار کا اب سے کوئی تیئیس برس پہلے اسی موضوع پر ایک مختصر مضمون "فرنگی حجاج" کے عنوان سے رسالہ "افسر" حیدرآباد دکن میں طبع ہوا تھا، جس میں انھوں نے ان یورپین

سیاحوں کے حالات اور سفرناموں پر بہت اجمالی نظر ڈالی تھی، جنہوں نے مسلمانوں کا بھیس بنا کر حجاز کا سفر کیا ہے اور مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ زاد اللہ شرفاً و تعظیماً کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

چونکہ اس مضمون میں ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا تھا، اور ضرورت تھی کہ اس بارہ میں تفصیلی حالات مع دیگر سیاحوں کے قلمبند کئے جائیں، لہذا ہماری تحریک پر فاضل ممدوح نے اس مضمون کو زیادہ مفصل و مکمل کر دیا ہے، جیسا کہ آئندہ پرچوں میں ناظرین ترقی دیکھیں گے۔ مدیر

تمہید

به لبیک حجاج بیت الحرام   به مدفون یثرب علیه السلام
که چشمم ز راه سعادت مبند   زبانم به وقت شهادت مبند

اکثر ہمارے اہل وطن اس بات سے واقف ہوں گے، کہ اہل یورپ کسی جدید بات کے دریافت کرنے میں کیسے بے خوف ہوتے ہیں۔ کوئی دریا، پہاڑ، جنگل، ریگستان ان کا سدراہ نہیں ہو سکتا۔ ناظرین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ خانۂ کعبہ میں بھی جہاں غیر مذہب والوں کے لئے قدم قدم پر موت کھڑی ہے، یہ بے باک جان پر کھیل کر پہنچتے ہیں۔

۸ھ تک مسلمان خانۂ کعبہ میں مشرکین کے ساتھ ملے جلے حج کیا کرتے تھے[۱]۔ لیکن ۸ھ میں بعد فتح مکہ، جب کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، اور وہ بت، جن کی پرستش سینکڑوں برس سے ہو رہی تھی، توڑ ڈالے گئے، اس مقدس گھر میں بجائے شرک کے توحید قائم ہو گئی اور پھر ۹ھ میں حسب ارشاد خداوندی مشرکین کو حرم کعبہ میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ   مشرک اس قابل نہیں کہ خدا کی مسجدوں میں آئیں
شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ (سورۂ توبہ)   ان کی روحیں کفر پر گواہی دیتی ہیں۔

---

[۱] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقرر کردہ مناسک حج جو خالص توحید پر مبنی تھے بسبب امتداد زمانہ ان میں شرک کی رسوم بھی داخل ہو گئی تھیں۔ بیت اللہ ایک زبردست بت خانہ بن گیا تھا۔ مگر ابتداء میں چونکہ اسلام بہت ضعیف تھا اور مسلمان بیت اللہ سے کفار کو خارج نہیں کر سکتے تھے، اس لئے مسلمان و کفار ملے جلے اپنے اپنے طریق پر مناسک حج ادا کیا کرتے تھے۔

پھر حکم ہوا :-

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا" مشرک نجس ہیں اس برس کے بعد وہ بیت اللہ کے قریب نہ آنے پائیں۔"

ان احکام کی تعمیل، اس وقت سے اب تک، ایسی سختی سے ہوتی رہی ہے کہ سوائے مسلمانوں کے، اور کسی مذہب والے کو، حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، وہ تمام راستے جو مکہ معظمہ کو جاتے ہیں ان کی کامل طور پر حفاظت کی جاتی ہے اور جگہ جگہ مسافروں کی روک ٹوک اور پوچھ گچھ ہوتی رہتی ہے، اگر کسی پر ذرا بھی غیر مسلم ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کی شمشیر برہنہ سے کوئی چیز اس کو نجات نہیں دلا سکتی عیسائی، یہودی، بت پرست، سب ایک ہی تلوار کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ اس مہم کے سرانجام میں غیر مذہب والے جس خطرۂ عظیم میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا اندازہ بمشکل ہو سکتا ہے، مشہور سیاح حجاز برٹن[1] لکھتا ہے کہ :-

"جس وقت میں لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ کعبے کی چار دیواری میں کھڑا تھا، اس وقت"
"میرے دل کی حالت بیان سے باہر تھی، میں جال میں پھنسے ہوئے چوہے کے مشابہ تھا۔"

ٹیبس[2] جو حجاز کا سفر کر چکا ہے، اپنے سفرنامہ میں جب کسی چیز کو نہایت بے قدر و بے قیمت ظاہر کرتا ہے تو ان الفاظ میں کہتا ہے :-

"اس کی اتنی قیمت ہے جتنی کسی عیسائی کی جان کی مکے میں"

غیر مذہب والوں کو سفر حج میں جو خطرہ ہے اس کے متعلق برٹن اپنے سفرنامہ حجاز کی جلد دوم میں لکھتا ہے :-

"مناسک حج میں شرکت کے خطرات اغیار کے لئے اب بھی بے انتہا ہیں، علوم مشرقی کے ایک"
"عالم متبحر[3] نے اپنی ایک تصنیف میں جو چند سال قبل شائع ہو چکی ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ،"
"مکہ بغیر بھیس بدلے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس مصنف کو یقین تھا کہ مکہ کا ترکی گورنر اب"

---

[1] کپتان رچارڈ فریڈرک برٹن جس نے ۱۸۵۳ء میں سفر حجاز کیا ہے اس کے حالات زندگی اور اس کے سفرنامہ پر ریویو ہم آئندہ لکھیں گے
[2] یہ سب سے پہلا انگریز ہے جو ایک غلام کی حیثیت سے ۱۶۹۳ء میں یا تقریب گیا۔ آئندہ صفحات میں اس کا تذکرہ درج ہوگا۔
[3] افسوس ہے کہ برٹن نے اس عالم کا نام یا اس کی تصنیف کا نام نہیں لکھا۔

"کسی یورپین مسافر کی سیاحت میں رکاوٹ پیدا نہ کرے گا، مگر میں (برٹن) اپنے کسی دوست"
"کو ایسی کوشش کرنے کی ہرگز صلاح نہ دوں گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل اگر کوئی فرنگی جدہ میں باب الملکہ"
"کی طرف چلا جائے تو اس کو وہ خطرہ نہیں ہے جو کپتان ہنڈ[1] کے زمانہ میں تھا اور اسی وجہ سے"
"ہمارے نائب کونسل اور سیاح اس شرط کے ساتھ کہ وہ کعبہ پر نظر نہ ڈالیں گے، طائف و مکہ"
"کے مشرقی جانب کے علاقہ کا سفر کر سکتے ہیں اور اگر کسی انگریز کا معاملہ ہو تو اس کو ترکی پاشا"
"و شریف مکہ قانون قدیم کے مطابق سزا دینے کی جرأت نہ کریں گے، جس کی رو سے ایسے غیر"
"مذہب والے سیاحوں کو یا تو قتل کر ڈالتے تھے یا کم از کم ختنہ کر کے چھوڑ دیتے تھے، تاہم"
"جس بدوی کی نظر اس فرنگی سیاح پر پڑے گی وہ اپنے کو مرد نہ سمجھے گا، جب تک کہ وہ اس فرنگی"
"کی ٹوپی کو گولی سے نہ اڑا دے۔ زمانۂ حج میں حاجیوں کے جم غفیر کی وجہ سے آج کل بھیس"
"بدلنا بہت آسان ہو گیا ہے اور اب صرف ان شہدوں کی لپّہ ڈگی کا خطرہ ہے جو مسافر کا"
"پسینہ سونگھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ کہاں کا ہے، اس بدنصیب مسافر کی خرابی ہے جو کہ بھر"
"مجمع میں پہچان لیا جائے کہ یہ کوئی کافر ہے۔"

مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو جانے کے بعد برٹن نے اپنے تئیں ان الفاظ میں مبارک باد دی ہے:۔

"میں اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں کہ پہلے خطرہ سے تو میں بچ کر نکل آیا، مکہ سمندر کے ساحل"
"سے اسقدر نزدیک ہے کہ وہاں اگر کسی فرنگی سیاح کا بھید کھل جائے تو وہ بھاگ کر"
"چند گھنٹے میں جدہ پہنچ سکتا ہے، وہاں اس کو ترکی حکام کی گیر و دار سے انگریزی نائب کونسل"
"کے ہاں پناہ مل سکتی ہے اور پھر وہ کسی انگریزی جہاز میں جو بندرگاہ میں موجود ہو بیٹھ کر فرار"
"ہو سکتا ہے، مدینہ میں اگر اس قسم کے مسافر کا بھانڈا پھوٹ جائے تو اس کی جان کے لالے"
"پڑ جائیں، اب دوسرا خطرہ مجھے مدینہ سے مکے تک کے سفر میں ہے، جہاں مقامی حکام"
"دو تین روپے کسی بدوی کو دے کر مشتبہ مسافر کو قتل کرا سکتے ہیں۔"

---

[1] کپتان سی۔ ایف۔ ہنڈ مصنف کتاب "مشرقی و مصری منظر" ۱۸۲۹ء میں جدہ کے مشرقی دروازہ تک جسے باب الملکہ کہتے ہیں۔ انگریزی لباس میں چلا گیا تھا۔ بدویوں نے اسے پتھر مار مار کر مار ڈالا۔

باوجود اس خوف وتشدد کے بعض فرنگی حرمین الشریفین میں بھی پہنچے ہیں اور اپنی عزیز جانوں کو خطرہ میں جھونک کر اپنے ملک وقوم کے سامنے نئی معلومات کے ڈھیر لگا دئے ہیں۔ غیر مذہب والوں کے لئے سفر حجاز کی خطرناک مہم کی تکمیل کے واسطے اگرچہ عربی دانی اور عقائد اسلام کی واقفیت ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مذہب اسلام نے چونکہ غیر مذہب والوں کے واسطے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے اپنے دروازے کھول رکھے ہیں، اس وجہ سے یہ مہم جس قدر مشکل ہے اتنی ہی آسان بھی ہے، یہ ظاہر ہے کہ احکام شریعت اقرار زبانی و اعمال ظاہری پر جاری ہوتے ہیں اور مذہب اسلام نے مسلمانوں کی طرف بدگمانی کرنے کی بھی ممانعت کر دی ہے، اس واسطے جب کسی مذہب کا پیرو سنجیدگی و متانت سے کلمۂ شہادت پڑھ دیتا ہے تو مسلمان اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں اور پھر چاہے کوئی معمولی مسجد ہو یا بیت اللہ ہر جگہ اس کی آؤ بھگت ہونے لگتی ہے، اس کے واسطے نہ عربی دانی کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی اور خاص زبان کی، نہ اسلامی عقائد سے واقفیت کی، غرض کہ اس نومسلمی کی آڑ میں بہت سے فرنگیوں نے شکار کھیلا ہے اور جب وہ حجاز سے بچ کر نکل آئے ہیں تو اپنی قابلیت و علمیت کے متعلق خوب شیخیاں بگھاری ہیں، ہماری نظر سے فرنگی سیاحان عرب کے جس قدر سفرنامے گزرے ہیں ان سے واضح ہے کہ بعض فرنگیوں نے تو مسلمانوں کے نومسلم غلاموں کی حیثیت سے سفر حجاز کیا، بعض نے اپنے کو نومسلم ظاہر کیا اور بعض نے بقول ان کے اپنے تئیں خاندانی اور پیدائشی مسلمان ظاہر کیا لیکن شبہ ان تینوں قسم کے سیاحوں پر ہوا جو غلام تھے ان کی نسبت تو مسلمانوں کو یہی خیال ہوا کہ غلام کی ذات بے وفا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ بمصداق

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

یہ پھر اپنی قوم میں شریک ہو کر اپنا قدیم مذہب اختیار کر لیں، جو آزاد نومسلم فرنگی تھے وہ مشتبہ نظروں سے دیکھے گئے[1] لیکن شبہ کا فائدہ ہمیشہ ملزموں ہی کو دیا گیا، اب رہے وہ فرنگی جنہوں نے اپنے تئیں آبائی مسلمان کہا، ان کی نسبت یقین نہیں کہ آیا فی الحقیقت انھوں نے عربوں کے سامنے پیدائشی مسلمان ظاہر

---

[1] اس قسم کے سیاحوں کی بہترین مثال شیخ ابراہیم ابن عبداللہ عرف برکھارٹ ہے جس کو خدیو محمد علی پاشا نے طائف میں صرف اسی شبہ پر کہ وہ پکا مسلمان نہیں ہے نظر بند رکھا تھا اور برسر دربار برکھارٹ سے کہا تھا کہ محض ڈاڑھی بڑھا لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

کیا تھا یا محض اپنے سفرنامہ ہی میں لکھ دیا ہے، اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ انھوں نے اپنے تئیں پشتینی مسلمان ظاہر کیا تھا تو خود ان کے واقعات سفر سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر جگہ وہ پہچان لئے گئے اور اس طرح ان کا مکر چھپا نہیں، اس قسم کے سیاحوں میں سے ہم برٹن کو پیش کرتے ہیں، جس کی قابلیت وعلمی تبحر نے اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ نومسلمی کی ذلت گوارا کرتا، اس لئے اس نے اپنے کو رنگون کا رہنے والا آبائی مسلمان سنی المذہب وشافعی مشرب پٹھان ظاہر کیا اور اپنا نام حکیم عبداللہ خان بتایا، مگر شبہ سے بچ نہ سکا جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے، تاہم اگر اس پر مطلق شبہ نہ ہوتا تو بھی کچھ بعید نہ تھا، کیونکہ اس سفر کے لئے جو تدبیریں اس نے اختیار کی تھیں، ان کی وجہ سے اس کی اصلیت کا چھپا رہنا ممکن تھا، مصر سے وہ عربوں کے ساتھ مدینہ و مکہ گیا تھا، جن سے وہ عربی میں بات چیت کیا کرتا تھا، اس وجہ سے اس کی حقیقت کھلنے نہ پائی کہ وہ ہندوستان کا رہنے والا ہے یا کہیں اور کا، اور اسکی زبان اردو اہل زبان کی سی اردو ہے، یا صاحب بہادروں کی سی، اس نے ایک شخص مسمی شیخ نور پنجابی کو بھی قاہرہ میں ملازم رکھ لیا تھا، جو حج و زیارت میں اس کے ساتھ رہا اور جیسا کہ برٹن نے لکھا ہے، شیخ نور ایک بیوقوف آدمی تھا اس گنوار کو کیا معلوم کہ رنگون میں کیسی اردو بولتے ہیں، اس سے اگر برٹن اردو میں بات چیت بھی کرتا ہوگا تو وہ یہی سمجھتا ہوگا کہ رنگون والوں کا لب ولہجہ شاید ایسا ہی ہو، ہاں اگر برٹن ہندوستانیوں کے ساتھ سفر کرتا اور مکہ و مدینہ میں ہندوستانی مہاجرین و حجاج کے ساتھ نشست و برخاست رکھتا تو فوراً قلعی کھل جاتی، پھر بھی اس کے ایک کم عمر عرب ملازم محمد نامی لڑکے نے آخر میں اس کو تاڑ ہی لیا کہ یہ ہندوستان کا کوئی انگریز ہے، اس بارہ میں برٹن کہتا ہے کہ

"مسلمانوں کے ملکوں سے بغیر کسی شخص کے شبہ کئے ہوئے کامیابی کے ساتھ واپس آجانا"

"ناممکن ہے اور یہ مشہور کرنا کہ ہم پر کسی کو شک نہیں ہوا، صریح غلط اور دھوکا ہے۔"

مشہور سیاح پلگریو جس نے ۱۸۶۲ء میں وسط عرب و نجد کی سیاحت کی ہے اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

ؔ چونکہ بجز حرمین الشریفین کے عرب کے دوسرے شہروں میں بازروئے احکام مذہبی غیر مذہب والوں کو داخل ہونے کی ممانعت نہیں ہے، اس لئے عرب کے نجد و یمن وغیرہ ممالک کی سیر اکثر فرنگیوں نے کی ہے جن میں سے ایک پلگریو بھی ہے،

" میں کبھی ان لوگوں کا یقین نہیں کرتا جو یہ مشہور کرتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے بھیس میں "
" بغیر کسی کے شک وشبہ کئے ہوئے اسلامی ممالک کی سیر کی، اکثر ان دھوکے بازوں کے "
" انجام خراب ہی ہوئے ہیں اور جو خوش قسمتی سے زندہ بچ کر نکل آئے ہیں انھوں نے "
" شیخیاں بگھاری ہیں اور دین اسلام کا مضحکہ اڑا کر اپنی فرضی کامیابی کو بڑے فخر سے "
" بیان کیا ہے، مگر مجھ کو یقین واثق ہے کہ ہرگز کوئی شخص بلا شبہ صاف بچ کر نہیں آسکتا "
" میں نے کئی شخصوں سے جنھوں نے درویشانہ وضع اختیار کرکے ان ممالک کی سیر کی تھی "
" بہت کچھ حالات سنے ہیں، یہ لوگ کوئی معمولی لیاقت کے آدمی نہ تھے، بلکہ بڑے عالم "
" اور دین اسلام کے تمام اصول و فروع سے واقف تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم "
" ہر شہر میں شبہ ہوا۔ اکثر جگہ ہم پکڑے گئے، مگر خوش قسمتی سے ایسے آدمیوں کے ہاتھوں "
" میں گرفتار ہوئے، جن کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر جان بچالی، انہی وجوہ سے میں کبھی اعتبار "
" نہیں کرسکتا کہ کم استعداد اور ظاہری طمطراق والے سیاح اپنے مکر میں ان درویشوں سے "
" زیادہ کامیاب ہوئے ہوں۔

برکھارٹ اپنے سفرنامۂ شام میں لکھتا ہے :۔

" ایک مرتبہ میں چند جاہل بدویوں کے سامنے عنترہ شاعر کے کچھ عربی اشعار پڑھ رہا تھا "
" ان وحشیوں کو خوبی کلام کے باعث ایسا لطف آیا کہ جھومنے لگے، مگر عربی الفاظ کا تلفظ "
" چونکہ مجھ سے صحیح ادا نہیں ہو رہا تھا، اس وجہ سے ان کو ایسا غصہ آیا کہ وہ کاغذ جس پر "
" اشعار لکھے ہوئے تھے میرے ہاتھ سے چھین کر پھاڑ ڈالا۔ "

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جاہل عربوں کو بھی دھوکا دینا آسان کام نہیں ہے اور برکہارٹ و برٹن جن کی عربی دانی کے تمام یورپ میں ڈنکے بجے ہوئے ہیں، جب ناکامیاب ہوں تو معمولی آدمی کی مکاری ان کے سامنے کیا پیش جاسکتی ہے، غیر مذہب والے خواہ کتنا ہی فریب کریں اور منافق چاہے جیسا روپ بھریں مگر مسلمان ان کو تاڑ ہی جاتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی برقع می پوش — من انداز قدت را می شناسم

بلحاظ مضامین فرنگی سیاحوں کے سفرناموں سے میں نے حسب ذیل تین قسم کے واقعات لکھے ہیں ا۔

(۱) وہ واقعات جن میں رسمًا یا عادۃً کوئی نئی بات معلوم ہوئی۔

(۲) ایسے واقعات جن میں مسلمانوں کی مدح یا ذم کی گئی ہے۔

(۳) وہ واقعات جن میں مذہب اسلام پر کوئی متعصبانہ حملہ کیا گیا ہے۔

واقعات مذکورۂ بالا کے ضمن میں اکثر موقعوں پر میں نے بغرض اظہار حقیقت اپنا خیال بھی ظاہر کر دیا ہے مجھے امید ہے کہ ان سیاحوں نے مسلمانوں کے جو حقیقی عیوب ظاہر کئے ہیں، ان سے مسلمان عبرت حاصل کریں گے اور خلاف شرع رسم ورواج وعادات سے اپنے مقدس مشہدوں کو بدنام نہ کریں گے۔

لوئس برٹما

سب سے پہلا یوروپین سیاح جس نے مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ کے حالات لکھے وہ شہر روم[1] کا باشندہ لوئس برٹما تھا۔ عجائبات عالم اور دنیا کی سیر نے اس کو اس مہم پر آمادہ کیا تھا۔ آغاز ۱۵۰۳ء میں وہ وینس[2] سے روانہ ہو کر اسکندریہ پہنچا، اور مصر و طرابلس[3] و بیروت[4] و انطاکیہ[5] کی سیر کرتا ہوا دمشق[6] آیا۔ اپریل ۱۵۰۳ء میں

---

[1] شہر روم اطالیہ کا پایۂ تخت ہے [2] وینس اطالیہ کا نہایت خوشنما وخوبصورت تجارتی شہر ہے یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد ہے۔ یہاں نہروں کی یہ کثرت ہے کہ سڑکوں کی طرح گلی کوچوں اور مختلف محلوں میں سے بہتی ہیں۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں جاتے ہیں۔

[3] طرابلس افریقہ کا ایک ملک ہے جو ایک طرف مصر سے اور دوسری جانب بحر روم سے ملا ہوا ہے چند سال قبل اس پر ترکوں کا قبضہ تھا۔ جنگ اٹلی وطرابلس کے بعد ترکوں نے اس کو عربوں کے حوالہ کر دیا اور اب یہ علاقہ شیخ سنوسی کے قبضہ میں ہے۔

[4] بیروت ساحل شام کا سب سے بڑا بندرگاہ اور مشہور شہر ہے۔

[5] انطاکیہ شام کا مشہور شہر ہے زمانۂ قدیم میں یہ بڑی بستی تھی۔

[6] دمشق شام کا نہایت خوشنما اور دنیا کے سب سے زیادہ قدیم شہروں میں سے ہے تخمیناً سو برس تک خلفاء بنی امیہ کا دارالسلطنت رہا ہے ابن بطوطہ وابن جبیر وغیرہ سیاحوں نے اس کو شرق کی جنت لکھا ہے، یہاں کی اکثر مساجد و مقابر زیارت گاہ ہیں

دمشق سے ایک ملوک[1] کپتان کے ساتھ محمل شامی[2] کے ہمراہ حج کو روانہ ہوا اور خود بھی ملوکوں کا سا لباس پہن لیا برٹما لکھتا ہے کہ اس سال قافلۂ شامی کے ساتھ چالیس ہزار حاجی اور پینتیس ہزار اونٹ تھے، راستے میں ایک دفعہ چوبیس ہزار عربوں نے اس قافلہ پر حملہ کر لیا، مگر میدان میں پندرہ سولہ شین چھوڑ کر بھاگ گئے قافلہ میں سے صرف ایک مرد اور ایک عورت ہلاک ہوئی، بقول برٹما کے یہ معجزہ ملوکوں کی بہادری و تجربہ کاری کی وجہ سے ظاہر ہوا تھا، انھوں نے اونٹوں کا ایک قلعہ سا بنا کر سوداگروں کو بیچ میں کر دیا اور حاجی ہر طرف سے بڑی بہادری سے لڑے، علاوہ ازیں عربوں کے پاس ہتیار بھی نہ تھے، وہ باریک ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے تھے، بعض ننگے ہی تھے، ان کے گھوڑوں پر نہ خوگیر تھی نہ کاٹھی، غرض ان وجوہ سے عربوں کو یہ شکست فاش ہوئی، ہمارے خیال میں برٹما نے اس بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ عرب ڈاکو بالکل نہتے قافلہ پر آگرے ہوں، ہتیار باندھنا عربوں کا ہمیشہ سے بانا رہا ہے، اس زمانہ میں بھی کہ عربوں کی لڑائیاں تقریباً موقوف ہوگئی ہیں، عرب کا ایک ایک گدھے والا اور ہل جوتنے والا بھی چھرہ، برچھی، تفنگچہ بغل میں دابے پھرتا ہے۔

برٹما حج و زیارت کے بعد جدہ چلا گیا، اس موقع پر وہ لکھتا ہے "قافلہ کا بگل بجانے والا ملوکوں کو ہوشیار کرتا ہی رہا کہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر سفر شام کے لئے تیار ہو جاؤ اور جو اس کی تعمیل نہ کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا، مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی اور مکہ میں ایک شخص کے گھر میں دبک گیا اور پھر جدے پہنچ کر بحر احمر[3] کی راہ سے ایران کا رستہ لیا، برٹما جب یمن[4] کے بعض بندرگاہوں سے گزر رہا تھا۔

---

[1] ملوک ان عیسائیوں کو کہتے تھے جو ترکوں کی غلامی میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے، ان کا لباس بھی بطور امتیاز کے کسی علحدہ ہی قسم کا ہوتا تھا ۱۲ [2] محمل شامی۔ شامی قافلہ کو محمل شامی بھی کہتے ہیں، محمل ایک تعزیہ نما کجاوہ ہوتا ہے جس پر جھنڈیاں اور پھندنے وغیرہ لگا کر سجاتے ہیں اور ریشمی کپڑا اس پر منڈکر قرآنی آیات زرین کام سے کاڑھ دیتے ہیں اگلے زمانہ میں تو ہر قافلہ کے ساتھ ایک محمل رہا کرتا تھا، اس زمانہ میں دو محمل مشہور ہیں ایک محمل مصری دوسرا محمل شامی، محمل مصری کے ساتھ غلاف کعبہ آتا ہے اور محمل شامی قسطنطنیہ سے شام ہوتا ہوا داخل حجاز ہوتا ہے، یہ حاجیوں کا سب سے بڑا قافلہ ہوتا ہے ہزارہا حاجی اور ہزاروں اونٹ اس میں ہوتے ہیں، جس جس گاؤں سے یہ محمل گزرتا ہے قدم قدم پر حاجی اس کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں مکہ و مدینہ میں اس کی آمد کے وقت بڑی دھوم دھام ہوتی ہے ۱۲ [3] بحر احمر عرب کے مغرب میں ایک دریا ہے جس کا طول (۱۴۰۰) میل اور عرض (۲۰۰) میل ہے اس سمندر میں بعض چھوٹے چھوٹے جانور ایسے ہوتے ہیں، جن سے پانی کا رنگ گہرا سرخ ہو جاتا ہے، اس وجہ سے اس کا نام بحر احمر رکھا گیا ہے بعض کہتے ہیں اس میں مونگا بکثرت ہوتا ہے اس وجہ سے اسے بحر احمر کہتے ہیں۔ مکہ معظمہ کا مشہور بندرگاہ جدہ اسی ساحل پر واقع ہے ۱۲ [4] یمن عرب کا ایک صوبہ ہے پیشتر ترکی کے زیر اثر تھا اب تقریباً خود مختار ہے، یہاں کے حاکم کو امام کہتے ہیں یمن کا پایہ تخت صنعا ہے، عقیق یمن اور برد یمانی (یمن کی چادریں) بہت مشہور ہیں ۱۲

عدن[1] کے مسلمانوں نے اس کو پرتگیزوں کا جاسوس سمجھ کر گرفتار کرلیا اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں
وہ کہتا ہے ایک بت پرست نے (یہ کسی مسلمان کی شان میں فرمایا ہے) اسے دیکھ کر کہا کہ "او کتے کے بچے کتے!"
اور اس کا تعاقب کر کے پکڑوا دیا، جب برتما کو سلطان عدن کے سامنے لے گئے تو اس نے اپنے تئیں نومسلم
رومی مملوک ظاہر کیا، مگر جب اس سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا گیا تو وہ چپ ہو گیا، اس موقعہ پر وہ کہتا ہے
کہ "یا تو خدا کو منظور نہ تھا یا ڈر کے مارے میری ہمت نہ پڑی اور میں اس جرم میں جنت سے محروم رہا" برتما کا
یہ طنز ہے گویا مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بغیر صدق دل سے ایمان لائے ہوئے صرف زبان سے کلمہ
پڑھ کر انسان بہشت میں جا سکتا ہے، سلطان عدن کی قید میں اس نے اپنے تئیں باولا بنا لیا اور جنون کی
آڑ میں طرح طرح کے کھیل کھیلے عجیب عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کیا کرتا تھا مثلاً ایک مرتبہ اس نے ایک بھیڑ کو
مسلمان کیا اور ایک دفعہ ایک گدھے کو اس قصور پر مار ڈالا کہ وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرتا تھا۔ برتما کی اس
قسم کی باتوں سے یہاں والوں کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص پاگل ہے اور پھر اس کی کچھ روک تھام نہ رہی۔ آخر کچھ
روز بعد وہ کسی جہاز کے کپتان کے ساتھ دوستی گانٹھ کر ہندوستانی بیڑے کے ہمراہ ایران روانہ ہو گیا۔
وہاں سے ہندوستان گیا اور پیگو[2]، سماٹرا[3]، جاوا[4]، بورنیو[5] وغیرہ مقامات کی سیر کرتا ہوا کالی کٹ[6] پہنچا۔

---

[1] عدن بحر احمر کے دہانے پر ایک مشہور بندرگاہ و شہر ہے یہاں پیشتر عربوں کی حکومت تھی ۱۸۳۸ء سے اس پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔

[2] پیگو ملک برہما کا ایک صوبہ و شہر ہے۔ یہاں کے ٹانگن مشہور ہوتے ہیں۔ بڑی تجارت گاہ ہے۔

[3] سماٹرا مشرقی مجمع الجزائر ہند میں سے ایک بڑا جزیرہ ہے، جس کا رقبہ ڈیڑھ لاکھ مربع میل ہے اس پر سلطنت ہالینڈ کا قبضہ ہے۔

[4] جاوا: مشرقی مجمع الجزائر ہند کا سب سے زیادہ آباد جزیرہ ہے جو بائیس صوبوں پر منقسم ہے یہاں بھی ہالینڈ کی حکومت ہے۔

[5] بورنیو: مشرقی مجمع الجزائر ہند کا سب سے بڑا جزیرہ ہے، جس کا رقبہ دو لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے، چاول اور گرم مصالحہ یہاں کی خاص پیداوار ہے، حکومت ہالینڈ کی ہے۔

[6] کالی کٹ مدراس کا ایک مشہور بندرگاہ ہے جو مغربی ساحل ہند یعنی ساحل ملبار پر واقع ہے یہاں کا کپڑا بہت مشہور ہے، یہاں کے عرب باشندوں یعنی موپلوں کی بغاوت یا جنگ آزادی نے جس کو دو سال گزرے، اس مقام کی شہرت بہت بڑھا دی ہے۔

اور پھر پرتگیزوں[1] کے جہاز پر ممباسہ[2] و موزنبیق[3] ہوتا ہوا لسبن[4] آیا اور یہاں کچھ روز گزار کر اپنے وطن مالوف روم پہنچ گیا۔

اس پرانے سیاح کے سفرنامے میں بہت سی معلومات پائی جاتی ہیں، مگر عیب یہ ہے کہ اس نے افسانہ گوئی سے کام لیا ہے اور اکثر واقعات بہت ہی مبالغہ سے بیان کئے ہیں مثلاً مدینہ منورہ کے قریب جو ایک قصبہ خیبر ہے، جہاں کی جنگ بہت مشہور ہے، وہاں کے یہودیوں کی نسبت وہ لکھتا ہے :۔"ان کے قد چھوٹے چھوٹے کوئی پانچ چھ بالشت کے یا اس سے بھی کم ہوتے ہیں، ان کی آوازیں عورتوں کی آواز کے مثل باریک ہوتی ہیں، ان کا رنگ عموماً سیاہ ہے، بعض بہت کالے بھی ہوتے ہیں، یہ اپنا یہودی مذہب چھپاتے نہیں، اگر اتفاق سے کوئی مسلمان ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو یہ زندہ کی کھال کھینچ ڈالتے ہیں۔" زمانۂ حال کے سیاح ان یہودیوں کے وجود کی نسبت کچھ ذکر نہیں کرتے، ممکن ہے برٹما نے یہاں کے مسلمانوں کو جو بعض یہودی النسل ہیں یہودی سمجھا ہو اور ان کی آدم خوری اور ان کے بالشتیہ ہونے کا قصہ یا تو کسی جاہل کی زبانی سن کر یا اپنی طرف سے گڑھ دیا ہے۔

مکۂ معظمہ کے حالات میں وہ لکھتا ہے "یہاں دو گینڈے ہیں۔ چھوٹا گینڈا کوئی ایک برس کا ہے، اور بچھیڑا سا معلوم ہوتا ہے، اس کا سر لمبائی میں کوئی چار مٹھی ہوگا اور ہرن کے سر کے مثل ہے، اس کی ٹانگیں دبلی پتلی ہرن کے بچے کی سی ہیں، اس کے کھر بیچ میں سے چرے ہوئے ہیں، جیسے بکری کے ہوتے ہیں، گینڈے ایتھوپیا[5] سے یہاں بھیجے گئے ہیں اور بطور عجائبات کے لوگوں کو دکھائے جاتے ہیں" ہمارے خیال میں غالباً افریقہ کے یہ بارہ سنگے ہوں گے اور ذاتی طور پر یا کسی وجہ سے ان کا ایک ایک سینگ ٹوٹ گیا ہوگا

---

[1] یورپ کا ایک ملک پرتگال ہے یہاں کے باشندوں کو پرتگیز کہتے ہیں، کسی زمانے میں یہ لوگ بڑے جہاز راں تھے، ہندوستان میں بھی پرتگیزوں کے مقبوضات گوا، دمن وغیرہ ہیں، یہاں کی شراب مشہور ہے جسے پورٹ وائن کہتے ہیں۔

[2] ممباسہ مشرقی افریقہ میں انگریزوں کا ایک بڑا شہر و بندرگاہ ہے۔

[3] موزنبیق افریقہ کی مشہور بندر اور مشرقی افریقہ میں پرتگیز حکومت کا ایک بڑا شہر ہے۔

[4] لسبن سلطنت پرتگال کا پایۂ تخت ہے، اس کی آبادی چار لاکھ ہے ۱۷۵۵ء میں یہاں ایک زلزلہ آیا تھا جس میں ساٹھ ہزار آدمی ہلاک ہوئے تھے۔

[5] ایتھوپیا ملک سمالی لینڈ واقع افریقہ کا ایک حصہ ہے۔

تاہم اس قصہ پر جھوٹ کا شبہ باقی رہتا ہے۔

تاریخ خصائص انسانی کے متعلق بھی برٹما بہت ضعیف الاعتقاد معلوم ہوتا ہے مثلاً سلطان صنعا کے لڑکے مسمی محمود کی نسبت وہ لکھتا ہے:۔

"فطرتی ظالمانہ جنون کے باعث اس کو آدمیوں کے گوشت سے بڑی رغبت ہے وہ خفیہ طور پر لوگوں کو قتل کرتا ہے اور ان کا گوشت زہر مار کرتا ہے۔"

مدینہ منورہ کے حالات میں وہ لکھتا ہے:۔

"اب یہ موقع ہے کہ اس اعتقاد کی تردید کر دی جائے کہ محمد (صلعم) کا مزار (مبارک) بغیر کسی چیز کے سہارے کے ہوا میں معلق ہے، اس کی نسبت میری قطعی رائے ہے کہ نہ یہ سچ ہے اور نہ اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ ہے۔"

واللہ اعلم کون سے جاہل مسلمان کا ایسا عقیدہ ہوگا، آج تک ہم نے تو نہ کسی سے سنا نہ کسی کتاب میں دیکھا۔

برٹما اپنے سفرنامہ کی جلد اول باب (۱۲) میں لکھتا ہے:۔

"یہ وہ مقبرہ ہے جس میں محمد (صلعم) اور ان کے صحابہ دفن ہیں جن کے نام نبیؐ، بوبکرؓ، عثمانؓ عمرؓ، فاطمہؓ ہیں، لیکن محمد (صلعم) جو عرب میں پیدا ہوئے تھے، ان کے خاص کپتان تھے، علیؓ ان کے داماد تھے، جن کو (حضرت) فاطمہ بیاہی تھیں، بوبکرؓ ان کے مشیر خاص اور بڑے گورنر تھے، مگر ان کو نبوت یا رسالت کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا جیسا کہ محمد (صلعم) کو حاصل ہو چکا تھا، عثمانؓ و عمرؓ، محمدؐ کی فوج کے خاص سردار تھے۔"

برٹما کا یہ بیان ناواقفیت پر مبنی ہے، کسی مسلمان کا یہ خیال نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت سیدہؓ روضۂ نبوی میں دفن ہیں[1]۔

مسلمانوں کے اختلاف مذہبی کے متعلق برٹما نے جو افسوسناک ریمارک کیا ہے، مسلمان اسے غور سے پڑھیں اور عبرت حاصل کریں، صحابہ کے ذکر کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

---

[1] حضرت عثمانؓ کا مزار مدینہ منورہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں ہے۔

"ان میں سے ہر ایک کے واقعات و روایات کی جدا جدا کتابیں موجود ہیں اور اسی وجہ سے مذہب و طریق کے متعلق ان ناپاک لوگوں میں بڑا جھگڑا چلا آرہا ہے، اپنے اپنے امام و پیران طریقت کے اصول کے لحاظ سے بعض کسی طریق کے پابند ہیں اور بعض کسی کے۔ اس بنا پر مختلف فرقے اور مختلف مذاہب قائم ہو گئے ہیں، جو آپس میں ہمیشہ جوتی بیزار کرتے رہتے ہیں اور جانوروں کی طرح مارنے مرنے پر آمادہ رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حق پر کوئی بھی نہیں ہے، یہی سبب ہے کہ ایرانیوں اور ترکوں میں مخاصمت ہے، باوجودیکہ دونوں مسلمان ہیں، مگر تعصب مذہبی کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، ہر فرقہ اپنے ہی طریقہ کو سب سے اچھا سمجھتا ہے۔"

مدینۂ منورہ کے حالات میں برٹما نے ایک اور واقعہ بھی عجیب لکھا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ واقعہ محض برٹما کی من گھڑت ہے یا مملوک (نومسلم عیسائیوں) کا بنایا ہوا افسانہ ہے، وہ لکھتا ہے:-

"روضۂ رسول اللہ کی زیارت کے لئے جس روز ہم مدینے پہنچے، اسی رات کو ہمارے کپتان نے شیخ الحرم[1] کو اپنے پاس بلا بھیجا اور اس سے کہا یہاں میرے آنے کی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت کے مرقد (مبارک) اور جسد (اطہر) کی زیارت سے مشرف ہوں، میں نے سنا ہے کہ اس فضیلت کے حاصل کرنے میں چار ہزار اشرفیاں خرچ کرنی پڑتی ہیں، یہ بھی میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ یہاں نہ میرے باپ ہیں نہ بھائی بہن نہ بیوی بچے نہ کوئی اور رشتہ دار نہ یہاں میں تجارت کے لئے آیا ہوں نہ کسی اور رنج بیوپار کے لئے، صرف میرا عقیدہ مجھے یہاں کھینچ لایا ہے، میں حضرت رسول خدا کی روح پاک پر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں اور ان کے جسد مطہر کی زیارت کی تمنا ہے۔"

یہ سن کر شیخ الحرم نے جسے سب لوگ سید سید کہہ کر پکارتے تھے، بہت ہی حیرت زدہ صورت بنا کر کہا:-

"تو ان آنکھوں سے جنھوں نے بے شمار گناہ کبیرہ کئے ہیں، اس برگزیدہ نبیؐ کی زیارت کی تمنا رکھتا ہے، جس کی خاطر خدا نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں۔"

---

[1] روضۂ منورہ کے خادموں اور خواجہ سراؤں کے افسر کو شیخ الحرم کہتے ہیں۔

ہمارے کپتان نے جواب دیا۔

"اے میرے سید! آپ کا فرمانا بجا ہے، لیکن اگر آپ اس قدر عنایت فرمائیں کہ میں آنحضرت صلعم کی زیارت کرلوں تو زیارت کے بعد فوراً میں اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا تاکہ پھر دنیا کی کسی چیز پر میری نظر نہ پڑے۔"

سید نے جواب دیا: "اے شہزادے تیرے لئے میں سب چیزیں کھول دوں گا۔"

اس گفتگو کے بعد ہمارے کپتان نے مسجد نبوی سے باہر آکر ہم سے کہا "کیا اچھی چیز کے لئے میں چار ہزار اشرفیاں خرچ کرنے کو تیار تھا۔"

اسی روز رات کو تین بجے دس بارہ مقطع مجاور ہمارے قافلہ میں جو شہر کے باہر ٹھیرا ہوا تھا آئے، یہ لوگ بادلوں کی طرح اوپر اوپر بھاگتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے:۔

"محمد رسول اللہ دنیا میں اب دوبارہ تشریف لانے والے ہیں۔ یا رسول اللہ! یا اللہ! محمد پھر پیدا ہوگئے، یا اللہ ہم کو بخش دے۔"

یہ آوازیں سن کر ہمارا کپتان اور ہم سب چونک آئے اور جھپٹ کر اپنے اپنے ہتیار اٹھالئے، ہم کو یہ گمان گزرا کہ ہمارے قافلہ کو لوٹنے کے لئے شاید عرب ہم پر آپڑے، یہ لوگ اس طرح غل مچا رہے تھے، جیسے کسی معجزے کے ظہور کے وقت شور مچاتے ہیں[1]، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ اس شور و غل کا کیا سبب ہے تو بڑے مجاور نے جواب دیا کیا تم نے وہ روشنی نہیں دیکھی جو آنحضرت کے روضۂ منورہ سے ظاہر ہو رہی ہے؟ ہمارے کپتان نے کہا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا اور ہم سب نے بھی یہی جواب دیا۔ اس پر ان بڈھے مجاوروں میں سے ایک نے پوچھا کیا تم غلام ہو یعنی خریدے ہوئے مملوک؟ ہمارے کپتان نے کہا ہاں۔ ہم حقیقت میں مملوک ہیں، یہ سن کر بڈھا کہنے لگا۔ صاحبو تم ایسی آسمانی چیزیں کہاں دیکھ سکتے ہو، تم نو مسلم ہو اور

---

[1] بیت المقدس میں حضرت عیسیٰ کی قبر پر (جسے ہولی سپلکر (مزار شریف) کہتے ہیں اور جس میں مسیحی اعتقاد کے موافق حضرت عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد دفن کئے گئے تھے اور تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے) مجاور لوگ بہت سے شعبدے دکھاتے ہیں جو معجزے سے تعبیر کئے جاتے ہیں اور ایسے موقعوں پر عیسائی بیت المقدس کی گلی کوچوں میں شور مچاتے پھرتے ہیں۔

ابھی مذہب میں پکے نہیں ہوئے۔ کپتان نے کہا۔ اے باولو! بیوقوف حیوانو! میں نے تم کو چار ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا اور اب تو اے کتے کے بچو تم کو میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مقبرے میں سے کوئی روشنی بھی نہیں نکلتی بجز اس شعلے کے جو خدام مقبرے کے ایک حصہ میں روشنی کر کے نکال لاتے ہیں۔ یہ اس ترکیب سے انھوں نے ہم کو ٹھگنا چاہا تھا، اس کے بعد ہمارے کپتان نے کہہ دیا کہ اب مسجد میں مت جاؤ۔"

واقعۂ مذکورۂ بالا کی نسبت دو باتیں قابل غور ہیں، اول ملوک کپتان کی آنحضرت صلعم کے جسد اطہر کی زیارت کی استدعا، دوسرے قبر شریف و مرقد منیف سے روشنی ظاہر ہونا۔ امر اول کے متعلق ہر مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ کپتان کی درخواست محض نادانی کی درخواست تھی، آنحضرت کا جسد اطہر حجرے کے اندر قبر میں مدفون ہے اور یہ حجرہ چاروں طرف سے بند ہے، اس میں کوئی دروازہ کھڑکی یا شبکہ تک نہیں، جس میں سے جھانک سکیں، اس حجرے کے باہر ہر طرف چار چار گز جگہ چھوڑ کر ہشت دہات کی ڈھلی ہوئی ایک جالی لگی ہوئی ہے، اس پر سبز گنبد استادہ ہے، حجرے اور جالی کے درمیان جو جگہ ہے اس میں مختلف قسم کے تحائف سونے چاندی کے ظروف وغیرہ رکھے ہوئے ہیں اور جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے ہیں اس جالی کے اندر داخل ہونے کے لئے دروازے ہیں اور اسمیں صرف خدام روشنی وصفائی وغیرہ کے لئے داخل ہو سکتے ہیں، معمولی زائرین کچھ تو خود بھی بلحاظ ادب و تعظیم اس جالی کے اندر نہیں جاتے اور کچھ ممانعت بھی ہے کہ مبادا کسی سے کوئی بے ادبی سرزد ہو جائے یا کوئی لچا لفنگا نومسلم وہاں کی بیش قیمت اشیا میں سے کچھ لے اڑے۔ تاہم یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض متمول اور با اثر حاجی خادموں کو کچھ دے دلا کر یا شیخ الحرم[1] کی اجازت لے کر جالی کے اندر جا سکتے ہیں اور اس طرح اس مقدس مقام میں پہنچ کر اور حجرۂ شریف کی بیرونی

---

[1] شیخ الحرم نہایت واجب التعظیم اور محترم شخص ہوتا ہے، بڑے بڑے سلاطین اور شہزادے اس سے مصافحہ کرنا فخر سمجھتے ہیں، ایک نومسلم کپتان کی اس کے ساتھ یہ بے ادبانہ گفتگو قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔

[2] واقعی آنحضرت کے مقبرے سے اس قسم کی روشنی نہیں نکلتی جیسی کہ قبر مسیح علیہ السلام سے راہب اور پادری بیت المقدس میں نکالتے ہیں اور جس کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم نے متن میں کیا ہے، اب رہا وہ شعلہ جو مقبرے کے ایک حصہ میں روشنی کرنے کے بعد خدام باہر لاتے ہیں وہ کوئی معجز نما روشنی نہیں ہے بلکہ ایک معمولی فتیلہ یا موم بتی ہوتی ہے جس سے حجرۂ شریف کے باہر جالی کے جھاڑ فانوس روشن کرتے ہیں اور فتیلہ ہاتھ میں سلئے باہر نکل آتے ہیں تاکہ دوسرے چراغ بھی اس سے روشن کر دیں، اس شعلہ میں کوئی کرامات نہیں ہے۔

دیواروں کو مس کر کے سعادت دارین حاصل کر سکتے ہیں، کپتان کی درخواست کی نسبت زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جالی کے اندر داخل ہونے کی استدعا کی ہوگی، جس پر برٹما نے قبر شریف وجسد اطہر کی زیارت کا حاشیہ چڑھا دیا، اب رہا امر دوم یعنی قبر شریف سے نور یا روشنی کا نمودار ہونا۔ یہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ قبر شریف ایک ایسے حجرے میں ہے جو چاروں طرف سے بلکہ شش جہت سے بند ہے، پس جو نور اس قبر مطہر کو احاطہ کئے ہوئے ہے، وہ خدام اور عام زائرین سب کی نگاہ سے اوجھل ہے اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ قبر مبارک سے یا حجرۂ شریف سے ایسا نور ساطع ہوتا ہے کہ اس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، اس قسم کی چیزوں کا تعلق عقائد و تصورات سے ہے، اگر کسی کے تخیلات پست اور نظر کوتاہ ہے تو یہ اس کا قصور ہے، ورنہ عاشقان رسول کو تو مدینے میں ہر طرف نور ہی نور نظر آتا ہے اور جن کو تعصب نے اندھا کر دیا ہے اور بد بینی نے جن کی آنکھوں میں خاک جھونک دی ہے ان کو اجالے میں بھی اندھیرا ہی دکھائی دیتا ہے، جس طریقہ سے برٹما نے اس مقام پر معجزہ نور کا ذکر کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر برٹما کا بیان صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خادموں نے شاید ان نو مسلم عیسائیوں کو سمجھانے کے لئے حضرت عیسیٰ کی قبر کی روشنی کے قصہ کو آنحضرت کے روضۂ منورہ سے بھی منسوب کر دیا ہو ورنہ قیاس غالب یہ ہے کہ قبر مسیح علیہ السلام پر بیت المقدس میں جو معجزہ روشنی کا ظاہر ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں برٹما بڑی شیخی سے کہتا ہے کہ "آنحضرتؐ کے مقبرے میں سے کوئی روشنی بھی نہیں نکلتی"۔ اب ہم لگے ہاتھوں اس معجزے کی حقیقت بھی بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، اس سے عیسائیوں کے خیالات اور برٹما کے عقائد پر کسی قدر روشنی پڑے گی۔

انجیل میں وارد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھانے کے بعد ایک قبر میں دفن کر دیئے گئے تھے، تیسرے روز جب آپ کے بعض حواری قبر پر گئے تو قبر کھلی ہوئی دیکھی اور آپ کی لاش وہاں نہ پائی، اس کے بعد ایک فرشتہ نے جس کا چہرہ بجلی کے مثل چمکدار تھا، ان کو خوش خبری سنائی کہ آپ آسمان پر تشریف لے گئے، چنانچہ جناب مسیحؑ نے خود اپنے شاگردوں پر ظاہر ہو کر اس کی تصدیق بھی فرمائی۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ زندہ ہونے کی یادگار میں عیسائی ایک عید مناتے ہیں جسے ایسٹر کہتے ہیں، یہ عید ۲۱ مارچ کے

بعد سے آخر اپریل تک کسی اتوار کو واقع ہوتی ہے، اس دن تمام عالم مسیحی میں خوشی منائی جاتی ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ بیت المقدس کے کلیسۂ ہولی سپلکر (مزار شریف) میں جو قبر مسیح سے موسوم ہے، بڑی دھوم دھام ہوتی ہے اور جیسا کہ بعد صلیب قبر مسیح سے برقی فرشتہ نمودار ہوا تھا، اب بھی سال کے سال اس عید کی شام کو روح القدس آگ کی شکل میں اس قبر پر نازل ہوتی ہے، اس کی زیارت کے لئے تمام دنیا سے عیسائی زائرین بیت المقدس پہنچتے ہیں اور روح القدس کی آگ سے اپنی شعلیں روشن کرکے سعادت دارین حاصل کرتے ہیں، کلیسۂ مزار شریف میں زائروں کی کثرت اور ان کی وحشیانہ دوڑ جھپٹ اور دھکا پیلی سے ہر سال کتنے ہی زائر کچل کر مرجاتے ہیں، اس آتشیں معجزہ کی کیفیت و اصلیت ہم کتاب مناظر فلسطین مرتبۂ ریلجس ٹریکیٹ سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۶۷ء سے ترجمہ کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

"بیت المقدس کے پادری اور ان کے مددگار جو کچھ شعبدہ بازیاں سال کے سال زائروں کو دکھاتے ہیں، ان میں سب سے بڑا وہ شعبدہ ہے، جو عید ایسٹر کی شام کو ہولی سپلکر (مزار شریف) میں کیا جاتا ہے، یہ شعبدہ تمام بیہودگیوں اور مکاریوں سے سبقت لے گیا ہے۔ سالہا سال سے وہ خدا کا گھر اس کافرانہ فریب سے ناپاک کیا جاتا ہے، اس شعبدہ کا نام "مقدس آگ کا معجزہ" رکھا گیا ہے، اس روز صبح ہی سے کلیسۂ مزار شریف میں زائروں کے جم غفیر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور تمام کلیسہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے، صرف تھوڑی سی جگہ ترکی سپاہیوں کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے، دوپہر تک زائرین کا مجمع بڑھتا جاتا ہے اور غول کے غول اس جمگھٹ میں شریک ہوتے جاتے ہیں اور دیوانہ وار قبر کے گرد ناچتے اچھلتے، کودتے، تالیاں بجاتے، وحشیانہ آوازیں نکالتے چیخیں مارتے، ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ ٹیک ٹیک کر اچھلتے ہوئے چکر لگاتے ہیں، اس کے بعد دفعۃً تھوڑا سا راستہ صاف ہو جاتا ہے، اور ایک زرق برق جلوس ہاتھوں میں زربفت کی جھنڈیاں لئے ہوئے ادھر سے ادھر تین مرتبہ گزرتا ہے، اس کے بعد ایک چھوٹا سا گروہ پادریوں کا اپنے حلقہ میں آگ والے بڑے پادری کو لئے ہوئے لوگوں کو چیرتا پھاڑتا کلیسہ کے دروازہ تک پہنچتا ہے، دروازے میں اس پادری کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو جاتا ہے، کلیسہ کی

"بیرونی دیوار میں ایک سوراخ ہے، یہاں ایک دوسرا پادری کھڑا رہتا ہے، اس جگہ سے لے کر گرجے کی دیوار تک آدمیوں کو ہٹا ہٹا کر مجمع کے بیچ میں ایک پتلی گلی سی بنا لیتے ہیں، یہ وقت بڑے تاؤ کا ہوتا ہے اور ہر ایک زائر کا جوش و جذبہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اتنے میں یکایک ایک چمکدار شعلہ سوراخ میں سے نمودار ہوتا ہے، اور یہ پادری اپنی مشعل اس سے روشن کر لیتا ہے اور پھر چاروں طرف سے اس آگ تک پہنچنے کے لئے ایک زبردست یورش اور ہلہ ہوتا ہے اور ہر شخص جان پر کھیل کر اس آگ سے اپنی مشعل روشن کرنے کے لئے سخت ترین جد و جہد کرتا ہے، یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ہزار ہا موم بتیاں اور مشعلیں روشن ہو جاتی ہیں، اس کے بعد دھوئیں اور گرمی سے بچنے کے لئے ہر شخص باولوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر دیوانوں کا یہ مجمع اپنے اپنے گھروں کو لوٹتا ہے اور سارے شہر میں وہ مقدس آگ لئے لئے پھرتا ہے۔

پیشتر عیسائیوں کے تمام فرقے اس رسم میں شریک ہوا کرتے تھے، لیکن جب کلیسائے روم کو کلیسائے یوناں نے اس گرجے سے خارج کر دیا اور اس فریب اور پاکھنڈ سے ان کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ رہا تو وہ اسے شعبدہ بازی اور مکاری سے تعبیر کرنے لگے، یہاں کے پادری اور ضعیف الاعتقاد زائر یہ خیال کرتے ہیں کہ روح القدس آگ کی شکل میں اس مبارک قبر پر نازل ہوتی ہے، جب مشعل روشن کر کے باہر پہنچا دی جاتی ہے تو آگ والا پادری جو فی الحقیقت مشعل اندر سے روشن کر دیتا ہے لوگوں کے کندھوں پر ایک مصنوعی وجد اور بیہوشی کی حالت میں باہر نکلتا ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالےٰ کے جاہ و جلال سے جس کی بارگاہ سے وہ ابھی واپس آ رہا ہے، متاثر ہو گیا ہے، بیت المقدس کے پادریوں کو اس فریب سے بڑے فائدے ہیں، تمام دنیا کے عیسائی اس معجزے کو دیکھنے کے لئے دور دراز ملکوں سے یہاں کھچے چلے آتے ہیں۔"

اب ہم پھر برٹن کے سفرنامے کی طرف رجوع ہوتے ہیں، مدینہ سے مکۂ معظمہ کے سفر کے حالات میں وہ لکھتا ہے

"جب مسلمانوں کے مذہب کی قابل نفرت ریاکاری و دغابازی سے ہمارا جی بھر گیا تو ہم نے سفر کا ارادہ کیا اور ایک مطوف کی رہنمائی سے جو قطب نما کے ذریعہ سے ہم کو راستہ بتاتا چلتا تھا ہم روانہ ہوئے۔"

مذہب اسلام کی عبادت کے متعلق برٹمانے جو کچھ لکھا ہے ہم بجز اس کے اور کیا کہیں کہ اس نے اپنے تئیں نومسلم ظاہر کر رکھا تھا، اور اس کے تمام کام مکاری و ریاکاری پر مبنی تھے، اس لئے اس نے اپنے نفس پر قیاس کرکے دین اسلام کے متعلق رائے قائم کی ہے۔ فقرۂ مذکورۂ بالا میں یہ امر قابل غور ہے کہ عرب مطوف یا رہنما قطب نما استعمال نہیں کرتے، بلکہ وہ ہمیشہ ستاروں کے شمار سے یا جڑی بوٹیوں اور پہاڑوں کے کھوج پر اپنا راستہ نکالتے ہیں، آگے چل کر وہ لکھتا ہے:-

"مغرب کی طرف کچھ دور چلنے کے بعد ہم کو ایک چشمہ ملا، جس میں سے پانی بہ کثرت بہہ رہا تھا، اس مقام کے باشندوں نے ہم سے کہا کہ یہ سینٹ مارک یعنی مرقس[1] رسول کا کنواں ہے یہاں کا علاقہ ناقابل برداشت گرمی و خشکی سے جھلس رہا تھا، خدا نے مرقس کی دعا سے بطور معجزہ اس کنوئے کو ظاہر کیا تھا۔"

حجاز میں مرقس کا نام بھی کسی نے نہیں سنا غالباً یہ بھی مملوک عیسائیوں کے دماغ کی ایجاد ہے مدائنے کی کیفیت میں وہ لکھتا ہے:-

"اس موقع پر میں ریت کے اس سمندر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو ہم کو رستے میں ملا تھا، یہ سمندر یہودیوں کے پہاڑ تک چلا گیا۔ اس میں ہم تین دن رات تک چلتے رہے، یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور سفید ریت سے بھرا ہوا ہے۔"

مکہ و مدینہ کے درمیان ریت کے اس سمندر کا ذکر کسی سیاح نے نہیں کیا۔

مکۂ معظمہ کے حالات میں وہ لکھتا ہے "مشرق کی طرف ایک کھلا میدان دو پہاڑوں کے بیچ میں

---

[1] مرقس رسول حضرت عیسیٰ کے ایک حواری تھے جنھوں نے حضرت مسیح کے حالات زندگی ایک کتابی صورت میں قلمبند کئے جو انجیل مرقس کے نام سے مشہور ہے اور منجملہ اناجیل اربعہ کے ایک انجیل مرقس کی بھی ہے۔ انگریزی میں مرقس رسول کو سینٹ مارک کہتے ہیں۔

وادی کے طور پر ہے، یہ راستہ اس پہاڑ کو گیا ہے جہاں ابراہیم و اسحاق کی سنت پر قربانیاں کی جاتی ہیں"۔ یہ غلط ہے کہ یہ راستہ جبل[1] عرفات کو گیا ہے اور قربانی عرفات میں نہیں ہوتی بلکہ منیٰ[2] میں ہوتی ہے۔

قربانی کو حضرت اسحاق کی سنت بیان کرنا بھی عیسائیوں کا خیال ہے، بیت اللہ کے دروازوں کی تعداد برٹمانے (۹۰) یا (۱۰۰) لکھی ہے، یہ بے اندازہ جھوٹ ہے، قدیم سیاحوں نے کم سے کم بیس اور زیادہ سے زیادہ (۲۴) تعداد لکھی ہے، آج کل کے سیاح (۴۰) دروازے بتاتے ہیں، خانۂ کعبہ کے طول عرض کی نسبت وہ کہتا ہے کوئی چھ چھ قدم ہوگا، یہ بھی غلط ہے، برک ہارٹ نے ۱۸ قدم طول اور ۱۴ قدم عرض تحریر کیا ہے، برٹن نے ۲۲ قدم لمبائی اور ۱۸ قدم چوڑائی لکھی ہے، اس زمانہ کے مسلمان سیاح خانہ کعبہ کو ایک مختلف الاضلاع مستطیل لکھتے ہیں، جن کے حساب سے اس کے چاروں اضلاع (۲۱ و ۲۵) و (۲۲ و ۲۴) قدم ہوتے ہیں۔

برٹمانے جس طرح مقام قربانی میں غلطی کی ہے ایسے ہی تاریخ قربانی میں بھی دھوکا کھایا ہے وہ لکھتا ہے "دامن جبل عرفات میں نویں ذی حجہ کو قربانی کی جاتی ہے اور پھر کہتا ہے یہاں دو روز تک حاجی ٹھہرے رہتے ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹ ذی حجہ کو خطبۂ عرفات میں شریک ہوکر اسی روز شام کو چار یا پانچ بجے تک حاجی واپس ہو جاتے ہیں اور رات مزدلفہ[3] میں گزار کر صبح منیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور ۱۰، ۱۱ و ۱۲ ذی حجہ کو منیٰ میں قیام کرکے یہیں قربانیاں کرتے ہیں۔ عموماً تمام حجاج ۱۲ ذی حجہ کو مکۂ معظمہ سے واپس آجاتے ہیں، بعض حاجی ۱۰ ذی حجہ کو مکۂ معظمہ جاکر بعد زیارت کعبہ اسی دن منیٰ واپس چلے جاتے ہیں۔

---

[1] عرفات مکہ معظمہ سے جانب مشرق نو میل ہے، یہاں ایک بہت بڑا میدان اور ایک پہاڑی ہے جسے جبل عرفات یا کوہ رحمت کہتے ہیں۔ نویں ذی حجہ کو تمام دنیا کے حاجی یہاں جمع ہوتے ہیں، پہاڑی کے نزد ایک مسجد ہے جسے مسجد ابراہیمی کہتے ہیں یہاں منبر کے پاس کھڑا ہوکر امام خطبہ پڑھتا ہے، اس کے بعد ہر شخص حاجی کے لقب سے پکارا جانے لگتا ہے۔

[2] منیٰ مکۂ معظمہ سے تین چار میل عرفات کے راستہ پر واقع ہے، یہاں بہت سے مکان بنے ہوئے ہیں جو صرف ایام حج میں کرایہ پر دیدیئے جاتے ہیں باقی ایام میں خالی پڑے رہتے ہیں، حاجی عرفات سے واپس آکر منیٰ میں تین دن قیام کرتے ہیں، اس جگہ قربانی بھی کی جاتی ہے

[3] مکہ معظمہ سے عرفات کی سڑک پر چار کوس کے فاصلہ پر ایک میدان ہے جسے مزدلفہ کہتے ہیں، منیٰ سے ڈیڑھ دو کوس ہوگا، یہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے جس کا صرف ایک ہی مینار ہے، حاجی عرفات سے واپسی کے وقت ۹ ذی حجہ کی رات کو یہاں قیام کرتے ہیں کنکریاں جو شیطان پر منیٰ میں پھینکی جاتی ہیں، حاجی اسی جگہ سے چنتے ہیں۔

قربانی اور اس کے گوشت کی تقسیم کے ذکر میں برٹما لکھتا ہے ۔ "بھیڑ بکریاں دن نکلنے ذبح کی جاتی ہیں اور اسی وقت ان کا گوشت خدا کے نام پر غریبوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے، یعنے کوئی بیس ہزار حاجی بہت ہی خراب وخستہ حال دیکھے، جو قربانی کا گوشت لینے کے لئے یہاں موجود تھے، انھوں نے کھیتوں میں لمبی لمبی نالیاں کھودی تھیں اور ان میں اونٹ کی مینگنیوں کی آگ سلگا رکھی تھی، گوشت جو ان کو ملتا تھا وہ اس آگ پر بھون کر وہیں چٹ کر جاتے تھے، مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ حج کے لئے نہیں آتے، بلکہ اسی کھانے پینے کے مارے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، یہاں ککڑی کھیرے بہت فروخت ہوتے ہیں، لوگ ان کے چھلکے اپنے گھروں کے باہر جس جگہ غریبوں کا جمگھٹ دیکھتے ہیں پھینک دیتے ہیں، یہ کنگلے خاک دھول میں سے ان چھلکوں کو سمیٹ کر کھا لیتے ہیں اور ایسے ندیدے ہوتے ہیں کہ ان چھلکوں پر لڑے مرتے ہیں۔"

ہم کہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بہت سے فاقہ کش غریب کھانے پر جان دیتے ہوں گے مگر برٹما کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ محض کھانے کے لئے وہ یہاں آجاتے ہیں، غریب سے غریب اور فقیر سے فقیر مسلمان کے دل میں بھی ایک ایسی آگ ہوتی ہے، جو بیت اللہ و بیت الرسول کی زیارت سے ہی بجھ سکتی ہے اور اس کی حقیقت کا علم کسی عیسائی کو نہیں ہو سکتا۔

خطبۂ عرفات کی نسبت وہ لکھتا ہے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ " رو رو کر ٹھنڈے سانس بھر بھر کے اور چھاتیاں کوٹ کوٹ کر اپنے گناہوں کی خدا سے معافی مانگو" جس وقت خطیب بہ آواز بلند یہ الفاظ کہتا ہے کہ "یا حضرت ابراہیم خلیل اللہ، یا حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ امت نبی کے حق میں خدا سے دعا کیجئے" تو چاروں طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں" غنیمت ہے اس خطبہ کی نسبت برٹما نے کوئی بدگوئی و بدزبانی سے کام نہ لیا۔

(از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم)

نیا ارمان ہوتا تھا، نئی امید ہوتی تھی
عجب دن تھے کہ اپنی عید اپنی عید ہوتی تھی

پیالے کورے کورے۔ گورے گورے ہاتھ ساقی کے
ہماری بزم رشک محفل جمشید ہوتی تھی

وہی دن، آج بھی ہے جس کی ہم خوشیاں مناتے ہیں
ہماری عید کیا؟ وہ تو تمہاری دید ہوتی تھی

کبھی تو، شوق بڑھ بڑھ کے گلے ملنا سکھاتا تھا
کبھی کچھ شرم دامن گیر کی تاکید ہوتی تھی

یہ حسن و عشق تھے جس وقت تک دنیا میں عزت سے
مری رسم وفا بھی قابل تقلید ہوتی تھی

ہمیں وہ خط لکھا کرتے تھے پہلے کس تکلف سے
بڑا القاب ہوتا تھا، بڑی تمہید ہوتی تھی

وہی کہنا پڑا غیروں کو آخر ہم جو کہتے تھے
ہمارے قول کی اول بڑی تردید ہوتی تھی

برا ہو بدگمانی کا الٰہی! کیا زمانہ تھا
کہ اک اک بات کی سو سو طرح تنقید ہوتی تھی

پڑے رہتے تھے پی کر مست ہم قدموں پہ ساقی کے
کہاں کی عید؟ کیسی عید؟ کس کی عید ہوتی تھی؟

زبردستی خفا ہونا ترا بے چین کرتا تھا
کبھی تو یاس ہوتی تھی، کبھی امید ہوتی تھی

ادب سے شوق پابوسی جھجکتا تھا مگر کیفی!
کسی کے مسکرانے سے بڑی تائید ہوتی تھی

حصۂ اول

عہد سلف

(از جناب مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مولوی فاضل)

بہ سلسلۂ گزشتہ

یک صدی میں کس قدر ملکی انقلاب اور معاشرتی تغیر ہندوستان کی اس قدامت پسند سرزمین میں پیدا ہو گیا تھا، دراصل یہ مشنری اس غیر فانی آرگنائزیشن کا ایک جزو تھی، جو تمام اسلامی دنیا کے اعلیٰ معنوی اقتدار کا باعث رہی ہے، زرخرید ترک غلاموں کا علم بردار اسلام بن جانا زیادہ تعجب خیز نہ تھا لیکن یہ واقعہ کہ پاؤ صدی کے اندر اندر خلافت کو نیست و نابود اور عربی تہذیب و تمدن کے پامال کرنے والے عربوں کے دین اسلام میں داخل ہونے کو اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیں اور خود اپنے ہاتھ سے خاک میں ملائے ہوئے اسی تہذیب کے محافظ بن جائیں بقول آرنلڈ "ایک عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہے جب کہ بودھ، نصرانیت، اسلام اس جدوجہد میں تھے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو مطیع بنائیں۔ بالآخر اس میدان جنگ میں اسلامی ظاہری اور باطنی تہذیب و روحانیت نے بودھ اور نصرانیت کو شکست دے کر تاتاریان مغل کے دلوں میں اپنی فتح مندی کا جھنڈا گاڑ دیا (اسلام غازان ۶۹۶ھ)

سنت اللہ (بعضکم لبعض عدو) اور دفع اللہ الناس بعضھم ببعض کا جلوہ قوموں میں یکساں نظر آتا ہے، وہی آل چنگیز و ہلاکو چند ہی سالوں میں باہمی نزاعوں مبتلا تھے اور وہی

ہیئت زا فوج جس سے تمام متمدن دنیا تھرا اٹھی تھی باہم دست وگریباں تھی۔

اس طرح جلال الدین خلجی کو مغل حملہ آوری سے جب بے فکری ہوگئی تو گویا اب جنوبی ہند (دکن) میں اسلامی پیشقدمی کا وقت آگیا

دکن پر اسلامی فوج کشی ادھر خلجی طاقت کو بیرونی خدشہ رفع ہوگیا تو ساتھ ہی وہی معمولی اسباب زوال جو تمام قوموں کو یکساں نگاہ قہر سے دیکھتے ہیں، اس وقت کی دکنی حکومتوں میں جو باہر سے آکر یہاں حکمراں بنے تھے اپنے آخری درجہ کو پہنچ گئے تھے، قدیم آرین باعظمت قوم کا نظام حکومت اور معاشرت شمالی ہند کی طرح یہاں بھی مختل تھا، قوم میں وہ اوصاف جو بنار حکومت کے وقت تھے اب مفقود تھے، باہمی بے تعلقی بلکہ سخت نفرت اور حالات زمانہ سے بے خبری شمالی ہند کی طرح یہاں بھی زوروں پر تھی، قدرت نے اسلامی فاتحین کے لئے اسی طرح راستہ صاف کر دیا تھا جس طرح اس سے پہلے آریا کے لئے اور اس کے بعد اقوام ارض مغرب کے لئے اور اس طور سے سلطان علاؤالدین خلجی کے لئے فاتح دکن ہونا مقدر تھا

سلطان علاءالدین خلجی فاتح دکن

علاءالدین اپنے چچا اور خسر جلال الدین خلجی کے زمانہ میں کڑہ کا صوبہ دار تھا (ص ۲۲۰ ضیا برنی) (کڑہ الہ آباد سے ۲۲ میل شمال غرب میں واقع ہے، الہ آباد کا قلعہ تعمیر ہونے سے پہلے جو اکبر نے بنایا، اس علاقہ کا صوبہ دار کڑہ میں رہا کرتا تھا۔ عجائب الاسفار صفحہ ۲۱) کڑہ سے اس نے اولاً بھیلسان[1] پر فوج کشی کی جہاں سے اس کو بہت غنیمت ہاتھ لگی، یہیں اس نے دیوگیر (دولت آباد) کے تمول و دولت کی خبر سنی اور اس کا راستہ بھی اس نے دریافت کر لیا، جو اس وقت مرہٹواری راج کا دارالحکومت تھا، اس نے تین چار ہزار سوار اور دو ہزار پایک (پیدل) تیار کئے (ص ۲۲۳ ضیا برنی) اور ایلچپور (برار) کے راستہ سے گھٹی (گھاٹی) لاجورہ (راجورہ)

---

[1] بھیلسان۔ ضیا برنی نے بھیلسان لکھا ہے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالوہ کا علاقہ ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں صوبۂ مالوہ کے تحت سرکار اجین، سرکار ہنڈیہ، سرکار رائے سین و چندیری میں بتانے کے بعد سرکار رائے سین میں بھیلسہ بھی لکھا ہے، یہی ضیا برنی کا بھیلسان معلوم ہوتا ہے۔ (آئین اکبری جلد اول طبع کلکتہ ص ۴۸۱)

میں یکایک پہنچ کر اپنا جھنڈا بلند کر دیا، اس وقت رام دیو راجۂ دیوگیر کی فوج اس کے بیٹے کے ساتھ کسی دور علاقہ میں گئی ہوئی تھی، دیوگیر کی مخلوق نے اس وقت تک کسی مسلم فاتح کی صورت نہ دیکھی تھی اور دیوگیر کی حالت اس وقت ۶۹۵ھ (ساتویں صدی ہجری کے خاتمہ پر) قریب قریب اس طرح قیاس کی جا سکتی ہے، جس طرح دہلی اور قنوج کی اس سے ایک صدی پیشتر شہاب الدین محمد غوری کے حملہ کے وقت حکمرانان وقت کی (جنہوں نے دراصل مسلم فاتحین کے طرح اس سے پہلے یہاں تازہ وارد ہو کر سابق اقوام کی جگہ بالجبر حاصل کی تھی) باہمی منازعتیں پھر تفرقہ در تفرقہ افراد شاہی خاندان کے امراء مقامی رؤسا خود سری کی ہوس میں مست ہوتے حالات زمانہ سے بے خبری، ضابطہ اور انتظام کی کمزوری، عیش پسندی، نظام معاشرت کی خرابی امراء اور عوام کا باہم عدم تعاون، جس میں شمالی ہند کی بہ نسبت دکن میں حاکم و محکوم میں اور زیادہ اختلاف قومی، مذہبی، جنسی، لسانی موجود تھا، تلنگانہ اور کرناٹک کو مرہٹواری سے کوئی ہمدردی نہ تھی، بہرکیف جب رام دیو کو اس تازہ وارد فوج کی خبر ہوئی تو اس نے مدافعت کی کوشش کی، لیکن علاء الدین کو اسی طرح انہی حالات و اسباب میں کامیابی حاصل ہوئی، جس طرح محمد غوری کو شمالی ہند میں اور علاء الدین کی مختصر مگر جاں باز اور تازہ جوش سے بھری ہوئی فوج کا جلوس بغیر کسی خوں ریزی کے اس شاندار متمول شہر دیوگیر میں داخل ہو گیا، شہر فتح ہو جانے کے بعد رام دیو نے قلعہ میں پناہ لی بالآخر صوبۂ ایلچپور (برار) کی سپردگی پر صلح ہو گئی (فرشتہ) بہت بڑی دولت علاء الدین کے ہاتھ آئی، جس سے ایک صدی پہلے زمانہ فتح دہلی کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس جدید فتح دیوگیر کا نقارہ جلال الدین خلجی فرماں روائے عصر کے دنیا سے کوچ کا نقارہ تھا، دیوگیر کی مہم اس اصلی فتح تخت دہلی کے لئے تھی، بقول ضیاء برنی وہ سمجھ گیا تھا کہ "گرہ لشکر بسیار مستعد و مرتب تواں کرد و ممکن ست کہ از گرہ دہلی دست آید۔ زد می آید" چنانچہ اس بنا پر وہ یہ چاہتا تھا، جائے دور دست بردو و زر بسیار بیارد۔ شب و روز از مسافران و جہاں دیدگاں تفحص اقالیم اطراف می کرد"۔ غرض علاء الدین نے جلال الدین کے خون سے ہاتھ رنگ کر تخت دہلی پر قدم رکھا، ایسے جرائم کے ارتکاب کی علت خود سوسائٹی کا منحوس اثر تھا، اب اس زمانہ میں قومیت نے شخصیت کی جائے لے لی ہے لیکن

اس وقت تک نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی شخصیت ہی واقعات تاریخ کا محور ہوتی تھی اور ان جرائم کا منشا حفاظت خود اختیاری کا فطری جذبہ، علاء الدین کیا کرتا جب کہ بادشاہ کے بیٹے ولی عہد سلطنت کے علاوہ ملکہ جہاں ساس اور خود بیوی کی سخت ناموافقت سے اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

علاء الدین کے قوانین — علاء الدین نے جو اکبر کی طرح بالکل امی تھا تخت دہلی پر قدم رکھنے کے بعد ثابت کر دیا کہ درحقیقت وہ اس کا مستحق تھا، فوج کشی کے وقت وہ ایک بہادر و دور اندیش سپہ سالار تھا تو امن کے حالت میں وہ نہایت بیدار مغز، مدبر، ترکوں کے سلطان سلیمان قانونی اور اکبر کے آئین و قوانین کی طرح قوانین علائی کچھ کم قابل ستایش نہیں حقیقت یہ ہے کہ علائی قوانین ہی استاد زمانہ کی وجہ سے مابعد مقننین کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔

(۱) تنخواہوں کا معیار اعلیٰ رکھنا علاء الدین کے طبع نکتہ سنج کی ایجاد ہے "مصرفان و عہدہ داران را آں قدر مواجب تعین کند کہ ایشاں را بآبرو بگذرد (ص ۲۹۲ ضیا برنی)۔

(۲) نرخ اجناس کا تعین اس کا شاندار کارنامہ ہے، اگرچہ چند روز پہلے تک یہ ایک ناجائز طریقہ سمجھا جاتا تھا، لیکن اس عالمگیر جنگ نے جو نئی روشنی پیدا کر دی ہے، اس کے لحاظ سے اس طریقہ کی عمدگی نمایاں ہو گئی ہے، اس اصول میں وہ اس قدر کامیاب ہوا کہ بقول مورخین عصر اس سے پہلے کبھی اس عہد کی سی ارزانی نہیں ہوئی تھی، ضوابط کی تفصیل ضیا برنی میں موجود ہے صفحہ ۳۰۴ اور ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جرمن ماہران فن دولت نے انہی کی تقلید کی ہے، یہ ضوابط اس قدر وسیع اور مکمل ہیں کہ ان پر اضافہ دشوار ہے۔

(۳) انسداد مسکرات، مورخین عصر نے تصریح کی ہے کہ سزاؤں کے ذریعہ سے اس نے اس میں اس قدر کامیابی حاصل کی تھی کہ جرائم کا ارتکاب ہی گویا مٹ گیا تھا۔

علائی قوانین کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکلیہ عملی اصول پر مبنی تھے اور اس لئے وہ صرف کاغذ پر لکھے ہوئے نہیں رہ گئے بلکہ ان کی تعمیل اس موثر طریقہ سے کرائی جاتی تھی کہ بہت بڑی حد تک سوسائٹی کے قدیم نقائص اصلاح پذیر ہونے لگے تھے، اور عام طور پر کاروبار میں خوشحالگی پیدا ہو گئی تھی۔

ابن بطوطہ نے بھی علاؤ الدین کے زمانہ کے امن وامان ۔ آئین وضوابط کی بیحد توصیف کی ہے جس کے قریب زمانہ میں ہی وہ ہندوستان آیا تھا، اسوقت تک اس کی یاد بالکل تازہ تھی، ابوالفضل کو بھی باوجودیکہ اس نے علاؤ الدین کا اچھے الفاظ میں تذکرہ نہیں کیا ہے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ آئین ہائے شگرف برنہاد"۔

فتح دکن جب سلطنت مضبوط ہاتھوں میں ہو اور انتظام قائم ہو جائے تو خود بخود فاروڈ پالسی سامنے آجاتی ہے، اب فوج سے کیا کام لیا جائے ؟ یہ سوال ہر وقت اس کو اپنی طرف مشغول رکھتا تھا، ایک اولوالعزم واقف اسرار فطرت سے یہ راز جہانگیری وسکندری چھپا ہوا نہیں رہ سکتا کہ کسی جرار لشکر کے سامنے کام مہیا رہنا چاہئے، ورنہ پھر وہی فوج محافظ تاج وتخت کے حق میں بلائے جان بن جاتی ہے، علاء الملک کوتوال جو ضیاء برنی کا چچا تھا اور علاء الدین کے جو مکالمے ضیاء برنی نے نقل کئے ہیں ان سے ان تمام اسرار سیاست پر پوری روشنی پڑتی ہے (ص ۲۶۷)۔

غرض شمالی ہند میں جو راجے باقی رہ گئے تھے، ان کو بخوبی مطیع ومنقاد بنایا گیا تاتاری غیر مسلم مغلوں کے حملے مضبوطی سے بند کر دئے گئے، جب شمالی ہند بے خوف وخطر ہو گیا اور گجرات وکھمبایت بھی علائی عملداری میں شامل ہو گئے تو اب لامحالہ دکن کی طرف پیشقدمی کا وقت آگیا۔

کافور وسیرائے دکن اس فتح دکن کا سہرا **کافور** کے نام سے بندھا ہوا ہے، اس کے ابتدائی حالات نامعلوم ہیں کہ وہ دراصل کس قوم سے اور کہاں کا باشندہ تھا، تاریخ میں اس کا ابتدائی داخلہ اس طور سے ہوتا ہے کہ کھمبایت سے یہ خوش رو کافور ہزار دیناری اپنے مسلمان تاجر آقا کے پاس سے بالجبر چھین کر لایا جاتا اور دربار علائی میں پیش کیا جاتا ہے[1]، جس طرح سمرقند وفرغانہ کے غلام بغداد کے دربار خلافت میں ترقی پاکر سپہ سالار بن جاتے تھے، اسی طرح خوش رو کافور ہزار دیناری نے جو دربار کے مقامی لیڈروں سے بالکل اجنبی تھا، بہت جلد اپنی جانبازی اور وفاداری کے ثبوت پیش کر دئے اور سلیمان شاہ کی بغاوت کے وقت

---

[1] فتح گجرات کے بعد نصرت خاں سپہ سالار کھمبایت گیا جو گجرات کا قدیم تاریخی بندرگاہ ہے، ضیاء برنی لکھتا ہے کہ اس نے خواجگان کھمبایت سے جو نہایت مالدار ہو گئے تھے، بہت سے جواہر ونفائس حاصل کئے اور کافور ہزار دیناری کو نصرت خاں اس کے خواجہ سے بزور لے لیا اور سلطان علاؤ الدین کے پاس لایا ص ۲۵۱ خواجگان کھمبایت سے مراد وہاں کے مسلمان تاجر ہیں جو سواحل پر آباد تھے اور اس زمانہ میں تجارت اور جہازرانی کے مالک تھے، جیسا کہ پیشتر بھی ہم نے جا بجا صراحت کی ہے۔

جب کہ علاء الدین خطرناک طور پر زخمی ہو گیا تھا، کافور نے جواب ملک[1] کافور بن گیا تھا، مسلح ہو کہ حرم سرائے شاہی کی سرمکیف محافظت کی اسی طرح بادشاہ کو اس پر نہایت اعتماد تھا، چنانچہ سپہ سالار افواج دکن ہونا اس کی قسمت میں مقدر تھا، اس وقت اس کو ملک نائب (دیسرائے) کا عالیشان خطاب حاصل تھا۔

بقول ضیاء برنی یہ امر تاریخ میں ہمیشہ عجوبہ خیز رہے گا کہ فتح دکن کے لئے ایک خواجہ سرا کا انتخاب کیا جائے جس کے پورے انسان (مرد) ہونے میں بھی شبہ ہے، اس خواجہ سرا کے ماتحت ایک لاکھ عظیم الشان جرار فوج دی جائے اور پھر اس کو سایہ بان لعل اور سرا پردہ کے خاص شاہی لوازم سے اعزاز بخشا جائے۔ ملک نائب کافور کے اسٹاف میں انتظام کی غرض سے خواجہ حاجی نائب عرض ممالک مامور کیا گیا، جس کی صفت ایک مرد حلیم الطبع بیان کی گئی ہے۔

کافور کا پہلا حملہ سنہ ۷۰۶ھ میں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ رام دیو نے عہد نامہ کے شرائط کی تعمیل میں کئی سال سے معینہ رقم پیش کش نہیں کی تھی، نیز رائے کرن گجرات کے راجہ کی تائید کر کے کوہستان بگلانہ میں اس کو قدم جمانے کی اجازت دی تھی، کافور نے بہ تعمیل ہدایات علاء الدین ثابت کر دیا کہ اس کا مقصد لوٹ مار نہیں ہے بلکہ انتظام قائم کرنا ہے۔ مورخین عصر نے تصریح کی ہے "ملک نایب چوں بہ دکن آمد سکنۂ آں ولایت را در ظل حمایت و شفقت خویش جائے دادہ آزار مورے نہ پسندید و مانند تیاشیر صبحگاہی شربت کافوری بکام تشنہ لباں آں دیار ریختہ ہمگی رعیت و سپاہ را مطیع و منقاد ساخت" افسوس ہے کہ ایسے اہم نکات کو جو ان فتوحات کے روح و رواں ہیں اور سلسلہ علت و معلول کے لحاظ سے بھی خیر قابل تذکرہ ہیں مروجہ تصانیف میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کافور اس نمایاں فتح کے بعد رام دیو کو ساتھ لے کر دربار علائی میں حاضر ہوا، علاء الدین نے جس عزت کے ساتھ رام دیو سے ملاقات کی، اس سے اس کی قوی شہادت ملتی ہے کہ علاؤ الدین کوئی بد مزاج خونخوار درشت خو شخص نہ تھا، جیسا کہ مروجہ تاریخوں میں اس کی تصویر بنائی گئی ہے، بلکہ اکبر کے پیشتر گویا اس کو اپنی بلند مشربی کا نمونہ دکھانے والا تھا۔ رام دیو کے ساتھ پورے شاہانہ لوازم برتے جاتے تھے، بقول مورخ عصر "خلائق درگاہ فرقے میان او و بادشاہ نمی نہادند" شاہی علامت چتر سفید کے استعمال کی اس کو اجازت دی گئی۔ (باقی آئندہ)

---

[1] ملک کا خطاب سلطان محمود غزنوی کی ایجاد ہے، جسے وہ اپنے منظور نظر اشخاص کو دیا کرتا تھا (از فرشتہ)۔

آنکھیں

از جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب

آنکھیں بھی حواس ہی ہیں، حاسہ حاسہ میں فرق ہے اور ہر حاسہ کی خدمات یا قوتیں جدا جدا ہیں یا یوں کہو کہ ہر قوت اور ہر حواس کی فطرت بجائے خود الگ الگ ہوتی ہے، انسان ایک مجموعی فطرت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فطرت افرادی میں فطرت مجموعی فطرت افرادی کی تابع ہے اور ہر جزدی فطرت بطور خود اپنا اپنا کام کرتی ہے۔

چشم جو کام دیتی ہے وہ کان اور ناک سے نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ قدرت نے ہر عضو اور ہر حس کا کام جدا جدا رکھا ہے، انہی جداگانہ کاموں سے پتہ لگتا ہے کہ افرادی فطرتیں جداگانہ ہیں، قوت باصرہ وہ قوت ہے، جو انسان کے اکثر معلومات اور کمالات کا سرچشمہ ہے، حس بصر تمام دوسری حسوں سے تیز اور صحیح ہے، اپنی حد میں آنکھوں کی فطرت کا ادراک بہت بڑا ہے، تمام مناظر قدرت کا تماشا اسی بصارت یا قوت باصرہ کے ذریعہ ہوتا یا ہو سکتا ہے، دوسرے حواس لامسہ، ذائقہ وغیرہ کی فطرت فردی بہت تھوڑا کام رکھتی ہے، آنکھ کی قوت احساس زمین پر ہی کام نہیں دیتی اس کا ادراک بصارت آسمانوں، ستاروں اور سیاروں کو بھی محتوی ہے، دیکھو رات کے وقت لاکھوں کروڑوں میل تک بھی آنکھ اجرام سماوی کا تماشا کرتی ہے قدرت خدا ہے کہ یوں آنکھ ایک میل یا دو میل تک بھی دیکھ نہیں سکتی، لیکن سماوی اجرام کو اسی طرح دیکھتی ہے، جیسے زمین کی چیزیں قریب سے دیکھتی ہے۔

ہم صرف آنکھوں کے سامنے کے حصہ دیکھتے ہیں، جسے قرنیہ کہتے ہیں اور ایک پردہ کا نام عینیہ بھی ہے اس پردہ کے مرکز میں ایک سیاہ نقطہ ہوتا ہے جسے پتلی کہتے ہیں اور اسی پتلی میں سے چیزوں کا عکس ہوتا ہے اور

شبکہ میں جو ایک جھلی سی ہوتی ہے، جس میں چیزوں کی تصویر اترتی ہے، نظر کا مرکز دماغ ہے۔ آنکھ ایک عصب کے ذریعہ سے دماغ سے مربوط ہوتی ہے، روشنی کی شعاع جب قرنیہ اور پتلی میں سے گزر کر آنکھ کے زجاجیہ پر عمل کرتی ہے تو بصارت چشم کا کام دینے لگتی ہے اگر دماغ اور آنکھوں کا رشتہ عصب نہ جوڑے تو انسان دیکھ نہیں سکتا، اگرچہ شبکہ پر چیزوں کی تصویریں کیوں نہ بنتی رہیں۔

یہ بات زیر بحث رہی ہے کہ:-

"آنکھ میں سے روشنی نکلتی ہے۔

"یا باہر کی روشنی سے بصارت حاصل ہوتی ہے، قدیم زمانے میں حکمائے متقدمین کا یہ مذہب تھا کہ آنکھوں سے شعاعیں بہ ہیئت مخروطی نکلتی ہیں، جس کا مرکز بصر ہوتا ہے، اور اس کا قاعدہ اس شے کی سطح کے نزدیک ہوتا ہے، جو دکھائی دیتی ہے مطلب یہ ہے کہ آنکھوں میں سے ہی کوئی چیز نکلتی ہے، جس سے روشنی پیدا ہو کر بینائی عمل پذیر ہوتی ہے، مگر متاخرین کا یہ مذہب ہے کہ خارج میں کوئی چیز ہے، جو آنکھوں کو آن کر لگتی ہے، یا آنکھوں سے ٹکر کھاتی ہے اور اس سے بینائی پیدا ہوتی ہے۔

متاخرین کے مذہب سے یہ بات نکلتی ہے کہ آنکھوں میں ذاتی روشنی یا نور تو کوئی نہیں ہے، البتہ اس میں ایک طاقت یا ایک مرکز ایسا رکھا گیا ہے، جس پر باہر کی روشنی پڑتی ہے اور اس سے آنکھوں میں بینائی پیدا ہو جاتی ہے اور آنکھ دیکھتی ہے۔"

اگرچہ متاخرین کا اب یہ مذہب ہے، لیکن اب تک یہ فیصلہ قول فیصل نہیں ٹھہرایا سکتا، متقدمین کے مذہب پر اب بھی کچھ نہ کچھ دلائل لائے جا سکتے ہیں اور دونوں مذاہب کی رائے سے یہ ماننا پڑے گا کہ آنکھ میں قدرت نے اس قسم کی طاقت دی ہے کہ وہ باہر کی روشنی اور شعاعوں کو قبول کرتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ طاقت مثل آئینہ کے ہے، کہ جو عکس قبول کرتی ہے، اگر آئینہ بذاتہٖ غیر منور ہو تو وہ کس طرح عکس قبول کر سکتا ہے، اس کی شفافیت انعکاس کا موجب ہوتی ہے، اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آنکھوں میں ایسی شفافیت رکھی گئی ہے، جو شعاعوں سے مستفید ہوتی ہے اور اس سے وہ دیکھتی ہے۔

سوچو کہ یہ آنکھیں قدرت نے تمہیں کیوں دی ہیں اور ان کی مدد کے واسطے یہ روشنی کیوں بنائی ہے

نہ صرف اس واسطے کہ تم اپنے اردگرد کی چیزیں اور مناظر دیکھ کر اپنے اپنے گھر کا راستہ تلاش کرسکو، یا ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، یہ بھی ایک غرض ہے مگر ابتدائی اور جزوی اصل غرض یہ ہے کہ تم اس جہان کا ان دوسری آنکھوں سے تماشا اور نظارہ کرو، جو ان آنکھوں کے علاوہ ہیں، تم حیران ہوگے کہ وہ دوسری آنکھیں کونسی ہیں اور ان کے محل کونسے ہے، وہ دوسری آنکھیں وہ ہیں جو ان آنکھوں کے معلومات سے ان نتائج تک پہنچتی ہیں جو تنقیدی نتائج کا حکم رکھتے ہیں اور جن کی بدولت دولت روحانیت نصیب ہوتی ہے یہ ظاہری آنکھیں بند کرکے بھی ان آنکھوں کے ذریعہ سے تم ایسا ہی دیکھ سکتے ہو اور یہ معلوم کرسکتے ہو کہ قدرت نے دماغ اور آنکھوں کے شعاعوں اور آنکھوں کا جو ربط اور جو واسطہ رکھا ہے، وہ کہاں تک ایک صانع کی صنعت کا اظہار کررہا ہے اور کس خوبصورتی سے صانع حقیقی کا ثبوت دے رہا ہے۔

دیکھو تو سہی تمام نظام جسم بجائے خود گوشت اور ہڈیوں اور اعصاب کا مجموعہ یا چرخہ ہے اور وہ صانع کی حکمت سے وہ کام دے رہا ہے، جو بڑے بڑے سائینس دانوں اور فلاسفروں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا اور باوجود کچھ نہ کچھ جاننے کہ جاننے والے بھی حیران ہیں اور جان کر بھی کہتے ہیں کہ کچھ نہ جانا۔

ہماری آنکھیں بیداری میں ہی کام نہیں دیتیں نیند اور خواب میں بھی کام دیتی ہیں، اگرچہ یہ ظاہری آنکھیں بند ہوتی ہیں، لیکن باطنی آنکھیں یا دوسری آنکھیں برابر کام کرتی ہیں، انسان گہری نیند سوتا ہے ظواہر سے غافل اور بے خبر ہوتا ہے، خواب میں ایک تعجب خیز سماں دیکھ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ عالم خواب میں ہے یا کسی ایسے مقام سے تعلق ہوتا ہے، جو کوئی دوسری کیفیت رکھتا ہے۔

خواب میں قوت حافظہ بھی کام دیتی ہے اور دیگر قوتیں اور حواس بھی، لیکن قوت حافظہ عالم بیداری کی یاد نہیں کراتی، کیونکہ ہم خواب میں عموماً یہ نہیں تمیز کرسکتے کہ ہم کسی اور عالم سے بھی واسطہ رکھتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ عالم خواب میں بھی عالم بیداری کا علم کبھی کبھی ہوجاتا ہے، اگر ہم چند گھنٹے عالم خواب میں رہ کر ایک رویا دیکھیں تو ہم ان چند گھنٹوں میں یہ نہیں خیال کرسکتے کہ ہم کوئی عالم بیداری بھی رکھتے تھے اور بیدار ہوکر پھر اسی عالم میں جاتا ہے اور یہ عالم خواب یا عالم رویا ہے، کیا یہ کیفیت عالم خواب اس بات پر روشنی نہیں ڈالتی کہ اس زندگی کے بعد ایک اور عالم بھی ہے، جو اس عالم سے کچھ اور کیفیت رکھے گا، کیونکہ جب ہم اسی زندگی میں ایک دوسرے عالم میں منتقل ہوجاتے یا ہوسکتے ہیں تو خاتمہ اس زندگی پر کوئی دوسرا عالم کیوں

اسی طرح نہ مل سکے جب ہماری زندگی خواب میں بھی ایک دوسرا عالم پالیتی ہے تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ زندگی دوسرا عالم مستقل بھی رکھتی ہے، کیونکہ اس عارضی انتقال سے اس کی ضرورت ثابت ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس زندگی کے واسطے کوئی دوسرا مستقل عالم بھی ہے اور یہ وہی دوسرا عالم ہے، جسے اہل مذہب یا مذہبی فلسفہ یوم الحشر یا یوم الدین اور قیامت کے نام سے تعبیر اور موسوم کرتا ہے، خواب کا عالم بھی دراصل ایک قسم کا حشر ہی ہے، حشر وہی ہے، جو عالم بیداری یا عالم اول سے کوئی دوسری کیفیت رکھتا ہو اور جس میں انسان یا محشور کے جذبات اور قدرتیں بدستور باقی رہیں، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حشر ثانی یا قیامت میں انسان کی قوتیں اور جذبات اسی طرح رہیں گے، بلکہ اس سے بھی زیادہ تر صاف اور مزے کے ہوں گے، دیکھو خواب میں ہی بعض وقت ہماری قوتیں اور ہمارے جذبات کیسے مزے کے ہوتے ہیں۔

بعض خواب جو ہم دیکھتے ہیں وہ کبھی کبھی پورے بھی ہو جاتے ہیں، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انسان ایک ایسا ملکہ بھی رکھتا ہے، جو بعض وقت مغیبات پر بھی حاوی ہو سکتا ہے اگرچہ مغیبات پر فائز ہونا انسان کا براہ راست مشکل ہے، مگر جب قدرت اس کے واسطے ایسے سامان اور ذرائع مہیا کر دیتی ہے تو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے دیکھو خواب میں انسان بعض ذرائع مخفی سے کبھی کبھی قبل از وقت کچھ معلوم ہی کر لیتا ہے، چنانچہ بعض فلاسفروں نے بھی یہ مان لیا ہے کہ غیب پر اطلاع پانا بیداری اور خواب میں ممکن ہے، کیونکہ صور جزئیات اور جو کچھ عالم میں سرزد ہوتا ہے وہ سب کچھ عالم عقل میں منقوش ہے۔

یہ ملکہ دو طرح پر ہوتا ہے:۔

الف۔ وہبی جیسے کہ نبیوں کو ملا ہوتا ہے۔

ب۔ بذریعۂ ریاضت اور مجاہدہ جیسے کہ نبیوں کے ماتحت اور لوگ بھی پیدا کر لیتے ہیں، اگر آنکھیں دوربین اور خوردبین کے ذریعہ سے بصارت اور ادراک میں ترقی کر سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بذریعہ ملکۂ وہبی ریاضت کے انسان اس میں ترقی روحانی رنگ میں نہ کر سکے۔ تزکیہ دماغ اور تصفیۂ قوتوں سے انسان بہت سے قیاسات اور اجتہادات میں پورا اترتا ہے اور ہو بہو نتیجہ نکلتا ہے روحانیت کا تزکیہ بھی ایک قوت اور ایک ملکہ رکھتا ہے، اور اس سے بھی انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس سے انسان مختلف اوقات کی

نسبت رائے لگا سکتا ہے۔

آنکھوں اور دماغ میں ایک مضبوط نسبت رکھی گئی ہے، دیکھو جب انسان کوئی چیز اور کوئی سماں دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دماغ میں بھی تخیل متموج ہونا شروع ہو جاتا ہے، گویا آنکھوں اور دماغ میں ایک قسم کا لازمی رابطہ ہے اور ایک موقعہ پر جا کر دونوں کا کام مشترکہ ہو جاتا ہے اور اس کی کیفیت ایک ہی نوعیت کی سی ہو جاتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ آنکھ کس قدر دماغ کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے اور کس خوبصورتی سے اپنی فطرت کا فرض پورا کرتی ہے، دیکھو حواس اور قوائے انسانی کس متانت اور کس خوبی سے اپنے اپنے فرائض پورا کرتے ہیں، انسان کا یہ فرض ہے کہ قدرت کے نظام پر غور کر کے سوچے کہ اس نظام عالم کا صانع کیسا یکتا اور کیسا حادی اور کیسا مقتدر ہے۔

اور ان مراحل کو طے کرتا ہوا مختلف علوم اور فنون کی داغ بیل ڈالے اور مشاہداتی آنکھوں سے توحیدی منظر کا تماشا کر کے راست بازی سے اپنے صانع کا عملی رنگ میں اعتراف کرے، آنکھ کی اصلی کیفیت اسی صورت میں صورت پذیر ہو سکتی ہے۔

سروش وحید

(۲)

از شرم برخ نقاب تا کے	در پردۂ زین حجاب تا کے
ایں عہد شباب بے ثباتے	چوں موج رواں بر آب تا کے
از ناز و ادائے دلبرانہ	سازی تو مرا خراب تا کے
عمرت کہ بہ عربدہ بسر شد	ساقی تو خوری شراب تا کے
ایں سوزش فرقت تو تا چند	از جور تو دل کباب تا کے
ہر چیز را چو انتہائیست	ایں جور تو بے حساب تا کے
ہشیار شو وحید از خواب	ایں عمر بسر بہ خواب تا کے

وحید صدیقی

از جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

ہمارے محترم دوست، مولوی سید خورشید علی صاحب کے زیر سیادت، یہاں چند دردمند نوجوانانِ اسلام کی ایک مختلف جماعت "انجمن اسلامیہ" کے نام سے علمی، اور عملی خدمات انجام دے رہی ہے۔

اس جماعت کی ایک نمایاں خصوصیت ارکان کا باہمی ارتباط انما المؤمنون اخوۃ کی سچی مثال ہے جس کے دیکھنے کے بعد اس جماعت کی حالت بالکل ایک ایسے کنبہ کے مشابہ ہے جو اتفاق و یگانگی میں اپنا نظیر ہو، انجمن مذکور نے ۱۳۴۲ھ میں ایک رسالہ "مجموعہ مضامین انجمن اسلامیہ" کے نام سے شائع کیا تھا، ہم ممنون ہیں کہ صدر انجمن نے انجمن مذکور کے مضامین بجائے اس کے کہ وہ اپنے طور پر شائع کروائے ہمارے پاس روانہ کئے ہیں۔

مضمون ذیل اسی انجمن کے ایک سرگرم رکن مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے تلاش و تفحص کا نتیجہ ہے، جن کا علمی شوق اور سرگرمی نہایت تعریف اور ہمت افزائی کے قابل ہے۔

مدیر

جنس نازک کو تعلیم کی کیوں ضرورت ہے؟ مخالفین تعلیم نسوان کا یہ پہلا سوال ہوتا ہے، اس کا جواب مذہبی اور تمدنی لحاظ سے دینا ضروری ہے۔

قبل اس کے کہ کسی ایک حصہ سے بحث کی جائے، اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مختصر طور پر تعلیم نسوان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ تعلیم نسوان کا جواز، کیا بہ لحاظ مذہب اور کیا بہ لحاظ تمدن، اپنی تاریخ کے ساتھ ملزوم ہے۔

تاریخ | اگر ہم ابتدائے تعلیم نسواں کی تحقیقات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سے حضرت انسان کا وجود عمل میں آیا اور ان کی تعلیم بارگاہ صمدیت سے ہوئی، اسی وقت جنس نازک کو بھی اس نعمت عظمیٰ میں برابر کا شریک

اور حصہ دار کیا گیا۔ جس طرح حضرت آدمؑ کو ہر ایک شئے کے نام سے آگاہی بخشی گئی اور انھیں اشرف المخلوقات کا خطاب عطا ہوا۔ اسی وقت حضرت حواؑ کو بھی تعلیم دی گئی اور آگاہی بخشی گئی، اس کے بعد جس وقت حضرت آدمؑ کی خطا معاف کرنے کا وقت آیا اور انھیں اپنی مغفرت کے لئے رب العزت سے " ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین والی دعا کی تعلیم ہوئی تو اس میں حضرت حواؑ بھی برابر کی شریک نظر آرہی ہیں، کیونکہ صرف مرد کی تعلیم مقصود ہوتی تو ضمیر واحد مذکر کا استعمال ہوتا ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا پس اس سے صاف عیاں ہے کہ جس وقت مرد کی تعلیم ہوئی اسی وقت ان کی شریک زندگی کو بھی اس سے محروم نہ کیا گیا۔

آدم کے بعد دنیا کی قدیم متمدن سلطنتیں مصر، بابل، ایران، ہندوستان میں بھی عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری و لازمی سمجھا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان ممالک میں خواتین جہانبانی کے رتبہ تک پہنچ گئیں۔ بابل کی ملکہ تو یہاں تک اولوالعزم تھی کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک پر بھی حملہ کیا، ایران کے فرمانروایاں پوران دخت۔ آرزمی دخت سے ہمارے کان ناآشنا نہیں ہیں جنھوں نے نہایت ہی نازک زمانہ میں جب کہ شیرازۂ سلطنت منتشر ہو رہا تھا سلطنت کو سنبھالا اسی طرح ارض مقدس، یونان، روما، اور ہندوستان بہت ساری تعلیم یافتہ خواتین کے اگر پنیا، ایملا اسنتھا، جزبیل، رحمت، حنا، لیلاوتی وغیرہ مشہور ہیں چنانچہ حنا کی شاعری کا ثبوت انجیل سے ملتا ہے جزبیل مردوں کی طرح پبلک امور میں حصہ لیتی تھی۔ لیلاوتی ہندوستان کی بہت بڑی ریاضی داں تھی۔

جس طرح ان ممالک میں تعلیم نسواں کا وجود پایا جاتا ہے اور حکمرانی میں ان کو حصہ دیا گیا ہے، اسی طرح ملک عرب کی بھی حالت تھی ملکہ بلقیس کے نام سے کون واقف نہیں جو، حضرت سلیمان علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ تھی، یہ دراصل ملک عرب کے خطۂ زمین کی نامور فرمانروا گزری ہیں۔

عرب کی خطابت اور شاعری مشہور ہے، جس میں ان کو بجا ناز تھا، اسی طرح علم ادب میں خواتین کا نام بھی ہمیں جلی حرفوں میں نظر آتا ہے، مثال کے طور پر چند خواتین کے نام پیش کئے جاتے ہیں، جو فصیح و بلیغ شاعر تھیں اور جن کا لوہا عرب مانتے تھے۔

آمنہ، عتبہ بن حارث کی لڑکی، اخت النضر، اروٰی، اسماء، امامہ، تماخر، عبسیہ، حبیبہ بنت عبدالعزیٰ

خذام وغیرہم ان میں سے بعض کا کلام حماسہ میں درج ہے، جس سے ان کی فصاحت و بلاغت کا کامل ثبوت ملتا ہے، عبدالمطلب کی کل لڑکیاں شاعرہ تھیں، ہر ایک نے باپ کی فرمائش پر ان کی نزع کے وقت مرثیے لکھے ہیں، جو شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ہند بنت عتبہ جو ابوسفیان کی زوجہ اور معاویہ کی ماں تھیں اپنی فصاحت اور حاضر جوابی کے باعث مشہور ہیں، چنانچہ ان کی حاضر جوابی کا ثبوت اس گفتگو سے بخوبی ملتا ہے جو آنحضرت صلعم سے بعیت کے وقت ہوئی تھی، بی بی خدیجۃ الکبریٰ جن کا مذہب اسلام پر احسان عظیم ہے فصیح و بلیغ شاعرہ تھیں۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تعلیم نسواں کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا اور اس پر عمل ہوا ہے، چنانچہ بی بی عائشہ صدیقہ (جن کی پرورش زمانہ اسلام ہی میں ہوئی) کا نام اسلام کی ابتدا تاریخ میں سنہری حرفوں سے نظر آتا ہے، جو نہ صرف علم حدیث و فقہ سے واقف تھیں، بلکہ علم ادب تاریخ اور طب میں بھی کمال حاصل تھا آپ کا مکان علمی انجمن کا مرکز تھا، جہاں بڑے بڑے علمی مباحثے ہوا کرتے تھے، اس انجمن کے ممبر حضرت علی، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر اصحاب تھے۔

آپ کی ہمشیرہ بی بی اسماء، زبیر بن العوام کی بانوئے محترم بھی اسی طرح مختلف علوم میں دخل رکھتی تھیں، ام المومنین بی بی حفصہ بھی تعلیم یافتہ تھیں، آنحضرت نے ان کو ارشاد فرمایا تھا کہ تم فلاں صحابیہ سے کتابت کیوں نہیں سیکھتیں، اسی طرح بی بی فاطمۃ الزہرا علوم مروجہ میں یدطولیٰ رکھتی تھیں۔

ان کے علاوہ بہت ساری صحابیہ علم حدیث، فقہ اور شاعری میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں، جن کے کارنامے آج تک مشہور ہیں مثلاً:۔ ام سنان (بنی لیث) اسماء بنت یزید اشہلی یہ طلاقت لسانی میں شہرۂ آفاق تھیں، انھوں نے آنحضرت کے پاس وفد کی جانب سے تقریر کی، امامہ قبیلہ زید کی مشہور شاعرہ تھی خنسا جریر نے اس کو اشعر الشعراء کہا ہے اور اسی طرح نابغہ نے اس کو کل شاعروں سے افضل کہا کرتا تھا، خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی بہت ساری فصیح و بلیغ شاعرہ، محدثہ اور فقیہہ کا پتہ چلتا ہے مثلاً حفصہ بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق یہ بہت بڑی محدثہ تھیں، ابن ثابت اور ابن ماکہ نے روایت کی ہے کہ سودۃ الہمدانیہ جو حضرت علی کی طرفدار تھیں، معاویہ سے بہت اچھی بحث کی ہے۔

ام حکیم بنت قارظ عبیداللہ ابن عباس کی زوجہ نہایت بلیغ شاعرہ ہوئی ہیں اپنے دو چھوٹے لڑکوں کا

مرثیہ کہا ہے، جن کو معاویہ نے قتل کرایا تھا، اس مرثیہ کے سننے کا اس قدر اثر ہوا کہ ایک شخص نے قاتل کے دو لڑکوں کو قتل کر دیا۔

جب بنو امیہ اور بنی عباس کے زمانہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی تعلیم نسوان کا عام طور پر دستور تھا اور یہی وجہ تھی کہ ساری خواتین ادب، فقہ، حدیث، صرف، نحو، ریاضی، طب اور موسیقی وغیرہ میں مشہور ہوئی ہیں مثلاً۔

فن حدیث

آسیہ بنت صالح ۔ ۔ ۔ سیوطی نے شاگردی کی ہے

ام عمر بنت حافظ تقی الدین ابن حجر عسقلانی نے اجازت روایت حاصل کی ہے۔

عمرہ بنت عبدالرحمن بن سعد بن زرارہ بہت سے تابعین نے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

زینب ۔ ۔ ۔ ۔ سیوطی نے شاگردی کی ہے

زینب بنت احمد کمال الدین خطیب بغدادی اور ابی القاسم الہمدانی نے شاگردی کی ہے

عائشہ بنت مسلم حرانی مشہور محدثہ۔

فاطمہ بنت احمد الحسینی ۔ سیوطی نے شاگردی کی ہے

حمدہ بغدادی ۔ ۔ علم حدیث پر لکچر دیا کرتی تھیں علامہ ابن سمعانی نے اجازت روایت حاصل کی ہے۔

فقہ

زینب ام المویدہ ۔ ۔ خلافت عباسیہ سے اجازت درس حاصل تھا

صرف و نحو

ام ہانی علامہ سیف الدین کی ماں نحو، فقہ، حدیث میں یگانہ دہر تھیں سیوطی نے شاگردی کی ہے

بنت الکینزی ۔ ۔ ۔ نحو، لغت میں ید طولیٰ رکھتی تھیں کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں

عروضہ ابو المطرف عبدالرحمن کی لونڈی صرف و نحو، معانی بدیع فقہ میں یگانہ دہر تھی علم لغات اور نحو اپنے آقا سے حاصل کیا لیکن استاد پر فوقیت لے گئی۔

ادب شاعری

امامہ ۔ ۔ ۔ خلیفہ واثق باللہ کے عہد کی مشہور جادو بیان شاعرہ تھی۔

ثبینہ ۔ ۔ ۔ ۔ جمیل کی معشوقہ مشہور شاعرہ

حمدہ ۔ ۔ ۔ ۔ غرناطہ کے ایک کتب فروش کی لڑکی نہایت قابل شاعرہ تھی۔

ام الخیر بنت عبداللہ غسانی معاویہ کے زمانہ میں حاضر جواب شاعرہ تھی

خدیجہ مامون رشید کی بہن۔ فصیح و بلیغ شاعرہ تھی۔

زبیدہ رشید کی بی بی۔ امین کا دردناک مرثیہ لکھا ہے

زینب اندلسی۔ ۔ مشہور شاعرہ اور ادیبہ ہے۔

زینب ۔ ۔ ۔ ۔ غرناطہ کے کتب فروش زیدی کی لڑکی نہایت اعلیٰ شاعرہ اور تمام علوم مروجہ میں ماہر تھی۔

عائشہ ۔ ۔ ۔ قرطبہ کے ایک شخص احمد کی بیٹی ابن حبان کا بیان ہے کہ اندلس کی عورتوں میں کوئی شریف عورت علم و فن شعر و ادب میں اس کمال کے پایہ کی نہ تھی، وہ اندلس کے بادشاہ سے بے دھڑک بات کرتی، اشعار فی البدیہہ کہتی۔

صفیہ ۔ ۔ ۔ اشبیلیہ کی مشہور خاتون فصیح اور بلیغ شاعرہ اور خوشنویس بھی تھی

لیلے اخیلیہ ۔ ۔ ۔ عرب کے مشہور شاعر توبہ کی معشوقہ خلیفہ عبدالملک کی شان میں نہایت پرمغز پاکیزہ قصائد لکھا کرتی تھی۔

خدیجہ بنت القیم بغدادی کتابت اور قرأت الحدیث میں یگانہ دہر تھی دمشق میں مدتوں ان علوم کا درس دیا ہے اسی طرح ادبیات میں خاص امتیاز حاصل تھا مقامات حریری کی تشریح ایسی عمدہ کرتی تھی کہ بڑے بڑے ادبا نے اس سے اس کتاب کو پڑھا ہے۔

طبابت

بنت زہر محمد بن عبدالملک کی بیٹی ۵۹۶ھ میں فن طبابت میں یکتائے زمانہ تھی امیر منصور کے محلات کا علاج کیا کرتی۔

ریاضی

فاطمہ بن محمد بن حسن۔ یحییٰ برمکی کی بی بی حساب اور منطق میں بہت دخل تھا۔

کتابت

فاطمہ حسن بن علی العطار کی بیٹی فن کتابت میں یہ رتبہ حاصل کیا تھا کہ اس وقت کے جملہ کاتبوں نے اسی کی تقلید اختیار کی تھی غیر ممالک کے صلح نامہ اسی سے لکھائے جاتے تھے

جاریۃ الناصر ۔ ۔ ناصرالدین اللہ خلیفہ عباسی کی لونڈی کتابت میں نہایت اعلیٰ پایہ تھا، خلیفہ کے خط کی بعینہٖ نقل کر دیتی

عائشہ ۔ ۔ ۔ ۔ قاضی علاءالدین حنبلی کی بیٹی محدث اور اعلیٰ درجہ کی خوشنویس تھی۔

موسیقی

غزۃ المیلا مدینۂ منورہ کی اعلیٰ درجہ کی موسیقی داں تھی اس نے کئی ایک راگ ایجاد کیے تھے

لکچرار

جوہرہ ہبتہ اللہ بن حسن کی بیٹی بغداد کی مشہور لکچرار تھی

مندرجۂ بالا کسی ایک فن یا دو فن میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتی تھیں، اب چند ان خواتین کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو اس وقت کے جملہ علوم و فنون میں یکتائے زمانہ ہوئی ہیں:

سکینہ بنت الحسینؑ علاوہ علوم مروجہ میں ماہر ہونے کے بہت بڑی لکچرار تھیں آپ کے لکچر نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے، کوفہ کی جامع مسجد میں آپ اکثر لکچر دیا کرتیں سامعین کا ہجوم ہوا کرتا جس میں علماء وقت شرکت کو فخر تصور کرتے۔

امۃ الجلیل بڑی باخدا اور عارفہ تھیں علماء وقت نے ولایت کی معنی پر بحث کرتے ہوئے آخر فیصلہ ان سے طلب کیا۔

امۃ الرحمٰن حجاج بن یوسف کی زوجہ نہایت عالمہ فاضلہ تھی، حجاج کا بیان ہے کہ میری رات اس کے ساتھ ایسی گزرتی تھی جیسے کسی عالم کی علماء فقہاء کی مجلس میں۔

امۃ الخیر بغداد کی ایک نامی گرامی فاضلہ تھی بڑے بڑے علماء وقت سے علم حاصل کیا خود تدریس پر کمر ہمت باندھی، اسمٰعیل ابن عساکر، قاضی تقی الدین سلیمان ابن سعد وغیرہ محدثین نے ان سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

فاطمہ الحکم اندلسی کی حرم تھی، صرف نحو، ادب، حساب اور باقی کل علوم مروجہ سے آگاہ تھی، علاوہ اس کے اعلیٰ درجہ کی انشاء پرداز تھی، جس کی وجہ سے حکم کے پاس نہایت عزت تھی، حکم کی جانب سے فرامین لکھا کرتی جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتے اس وقت اس سے بہتر نہ کوئی مرد اور نہ کوئی عورت انشاء پرداز تھی۔

تقیہ دمشقی ابوالفرج کی بیٹی علوم متداولہ میں کامل دسترس تھا، علم حدیث میں اس کو یہ فروغ تھا کہ بارہا لکچر دیتی تھی، اس کی مجلس درس میں سامعین کا ہجوم رہتا شاعرانہ مناظرے کرتی تھی ۵۷۹ھ میں اس کا انتقال ہوا اس نے ملک مظفر تقی الدین

کی تعریف میں قصیدۂ عمریہ لکھا تھا
اس کے بعد قصیدۂ حربیہ لکھا جس میں
لڑائی کے نکات وغیرہ بیان کیے تھے

خیزران ۔ ہارون اور ہادی کی ماں نہایت عاقل
اور فاضلہ تھی امور مملکت میں یحییٰ برمکی
کو مدد دیا کرتی تھیں۔

زینب بنت ابوالقاسم عبدالرحمن بہ لحاظ اپنی فضیلت کے علماء عہد کے
ہم پلہ تھی۔

صفیہ اندلسی ۔ عبدالرحمن ثالث کے عہدہ میں یہ فاضلہ
علوم مروجہ سے آگاہ اور نہایت خوشنویس
تھی، اس کے اشعار نہایت سلیس اور عالیانہ
ہوتے تھے جس کو خلیفہ سن کر محظوظ ہوتا

مریم ۔ ۔ ابو یعقوب انصاری کی بیٹی اشبیلیہ میں
رہا کرتی تھی، شہر مذکور میں درس دیا کرتی
معانی، بیان، بدیع، شعر، ادب میں
یگانہ زمانہ تھی اس کے شاگردوں کی
بہت قدر کی جاتی۔

ام الفضل ۔ ۔ مامون کی بیٹی، علوم مروجہ میں
ید طولیٰ رکھتی تھی۔

عائشہ ۔ ۔ خلیفہ معتصم عباسی کی بیٹی کا اپنے
عہد کے علماء اور فضلا میں شمار ہوتا تھا

عائشہ ۔ ۔ قاضی القضاۃ شہاب الدین کی
بیٹی، علوم مروجہ میں کمال پیدا
کیا تھا، امام سیوطی نے اپنے استادوں
میں ان کا نام لکھا ہے۔

فاطمہ ۔ ۔ علامہ علیم الدین یزرانی کی عالمہ
فاضل بیٹی صلاح الدین صفدری نے
شاگردی کی ہے۔

طوالت کے خوف سے میں عہد سلجوقی کو بیان
کر سکتا ہوں اور نہ سامانی کو اور نہ کسی اسلامی دور کو
بلکہ صرف ہندوستان پر سرسری نظر ڈال کر اصل مضمون
کو بیان کروں گا۔

ہندوستان کی تاریخ میں رضیہ سلطانہ،
چاند سلطانہ کے نام جلی حرفوں میں نظر آتے ہیں، جو
جہانبانی میں اپنی آپ نظیر تھے، بابر کی نور نظر گلبدن بیگم
کی لیاقت ہمایوں نامہ سے اور عالمگیر کی لخت جگر،
زیب النساء بیگم کی اس کے اشعار سے روشن ہے،
نور جہاں بیگم سے کوئی ناواقف نہیں ہے، ان ناموں
کے قطع نظر اگر ہم ایک صدی پیشتر کے جنوبی ہند
(علاقہ مدراس) پر نظر ڈالیں، جب کہ وہاں کے علماء
کی مذہبی یا سرداری تعصب کی حد تک پہنچ گئی تھی، علم کلام
کی تعلیم سخت گناہ کبیرہ خیال کی جاتی ہے اور عورتیں تو در کنار

مردوں کو بھی اس تعلیم سے بہرہ مند ہونے کی قطعی ممانعت تھی تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک محترم خاتون اس علم کو حاصل کر کے اس میں کمال حاصل کرتی اور اپنے لڑکے کو خود ہی تعلیم دیتی ہے اور یہی لڑکا آگے چل کر ایک سلطنت کا وزیر ہوتا ہے۔ اسی سے خیال کیا جا سکتا ہے تمام ہندوستان میں تعلیم کا کہاں تک رواج تھا۔ اگر آج کل کی طرح تعلیم نسواں کی مخالفت ہوتی تو ہمیں صرف شاعرہ خواتین کے صدہا نام نہ نظر آتے جو اردو کی سرتاج کہی جا سکتی ہیں مثلاً اختر دہلی کی شہزادی، اختر محل بیگم، اسیر امیر بیگم، بدیہہ گو بیگم، میر محمد تقی میر کی بیٹی ثریا، مرزا علی خاں کی زوجہ اکبر ثانی کے عہد کی مشہور شاعرہ۔ خانم۔ ضیا حکیم انور علی کی بیٹی علاوہ اردو کے عربی فارسی میں بھی مشق سخن تھا، لطیف پٹنہ کی مشہور شاعرہ۔ کیا سرسید، شبلی، حالی کی مائیں جاہل تھیں یا محمد علی کی ماں جاہل ہے؟ سلطانہ جہاں بیگم والی بھوپال اور ان کی ماں شاہ جہاں بیگم کے کارنامے روشن زمانہ ہیں۔

تعلیم نسواں کے جواز پر بحث کرنے کے لئے ہم کو اولاً خداوند کریم کے احکام پر نظر ڈالنی ضرور ہے۔ کلام پاک میں خواتین کے حقوق مردوں کے مساوی رکھے گئے ہیں کسی امر میں ان کو مردوں سے کم حقوق نہیں دئے گئے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

ومن عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولئک یدخلون الجنۃ یرزقون فیھا بغیر حساب۔

ترجمہ۔ یعنی جو مومن مرد اور عورت اچھے کام کریں انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا اور بے حساب رزق دیا جائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانتات والصدقین والصدقات والصٰبرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصٰئمٰت والحافظین فروجھم والحافظات

ترجمہ بیشک مسلمان مرد مسلمان عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرماں بردار مرد، اور فرماں بردار عورتیں، راست گو مرد اور راست گو عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خاکساری کرنے والے مرد اور خاکساری کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ

والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما۔

رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں، کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ نے حفاظت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تیسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

"اے لوگو اپنے رب کا پاس کرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتوں کو پیدا کیا، اللہ کا پاس کرو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور عورتوں کے تعلقات کا پاس کرو یقیناً اللہ تم پر نگہبان ہے"۔

یہ آیات عورتوں کی مساوات مردوں کے ساتھ اور عورتوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی سند ہیں، یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آخری آیت میں مرد کا لفظ نہیں کہا بلکہ جنس کہا اگر مرد کا لفظ ہوتا تو مردوں کو تقدیم کے فخر کا دعویٰ ہو سکتا اس طرح نماز روزہ، زکوٰۃ، حج میں عورتوں کا درجہ مساوی ہے۔

جس طرح عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دئے گئے، اسی طرح تعلیم کے متعلق بھی عام حکم ہے، مردوں کی تخصیص نہیں کی گئی، چنانچہ انسان کو علم حکمت کی طرف سے غفلت اور چشم پوشی کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے النظرو اماذا فی السموت والارض جو لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو ملامت کرتا ہے تاکہ اہل نظر کے لئے عبرت ہو وکائن من آیتہ فی السموت والارض یمرون علیھا وھم عنھا معرضون تعلیم کے متعلق آنحضرت صلعم کے احکام بھی عام تعلیم کا حکم رکھتے ہیں، چنانچہ ارشادات ہیں۔

(۱) ہر مسلم اور مسلمہ پر علم حاصل کرنا فرض ہے (۲) علم کو تلاش کرو اگرچہ وہ چین میں ہو۔

(۳) حکمت کو لے لو یہ امر تمہارے لئے مضر نہیں کہ وہ کس برتن سے نکلی ہے۔

ایسے صاف اور صریح احکام کے بعد یہ کہنا کہ مذہبی رو سے تعلیم نسواں ناجائز ہے کہاں تک انصاف پر مبنی ہے انھیں

احکام کی تعمیل میں بی بی عائشہ صدیقہ، بی بی اسماء وغیرہ جلیل القدر خواتین نے علوم مروجہ حاصل کیا اور نہ صرف حاصل فرمایا بلکہ پایۂ کمال کو پہنچایا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ زمانۂ گذشتہ میں کتنے علماء، فضلاء اور قاضی القضاۃ کی بنات وغیرہ نے علوم مروجہ میں کس درجہ کمال پیدا کیا تھا، درس اور لکچر دیا کرتیں، مناظرہ اور مشاعرہ کی مجلسیں منعقد کرتی تھیں اور بڑے بڑے علماء وقت نے ان کی شاگردی کو فخریہ بیان کیا ہے، کیا اس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی رو سے تعلیم نسواں ناجائز ہے، بڑی بات تو یہ ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی خاتون اپنے مذہب سے، واقف ہی نہیں ہو سکتی تو کیا پھر یہ جائز ہو سکتا ہے کہ عورت کو تعلیم نہ دی جائے، یعنے دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو مذہب سے لاعلم رکھا جائے۔

عورت کی بلحاظ تمدن تین حالتیں قرار دی جاسکتی ہیں، پہلی حالت بہ حیثیت اولاد ہونے کے، دوسری حالت بہ حیثیت شوہر کی زوجہ ہونے کے اور تیسری بہ حیثیت صاحب اولاد ہونے کے، ان تینوں حالتوں کی واجبی انجام وہی بغیر تعلیم کے دشوار، ناممکن اور محال ہے۔

کیا والدین یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ کوئی اولاد بغیر تعلیم کے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے گی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کو تعلیم کے بغیر یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ "ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے" ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے والدین کی اطاعت نہیں کی گئی۔

شوہر کو ہرگز اس عورت سے آرام و آسائش حاصل نہیں ہو سکتا، جو تعلیم یافتہ نہ ہو۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے ایسی ہی عورت کے متعلق کہا کہ ؎

زن بد در سرائے مرد نکو ہست		ہم دریں عالم است دوزخ اوست

جاہل عورت نہ تو امور خانہ داری کو باحسن وجوہ انجام دے سکتی ہے اور نہ اپنے شوہر کے حقوق سے جو منجانب اللہ اس پر مقرر کئے گئے ہیں، واقف اور عمل پیرا ہو سکتی ہے، تعلیم یافتہ خاتون اپنے شوہر کی سمجھ دار مشیر اور قابل مددگار ہوتی ہے، جاہل عورت سے ہمیں اس قسم کی امید کرنا، ایک فعل عبث ہے، بچوں کی اعلیٰ جسمانی پرورش اور اولاد کی اخلاقی اور ابتدائی تعلیم بغیر تعلیم یافتہ ماں کے ناممکن ہے۔

الغرض" اگر نیک اور اطاعت گزار اولاد منظور ہو، وفادار بی بی، انتظام خانہ داری کی عمدہ حالت منظور ہو، اگر آئے دن کے مخمصوں میں کسی کی غمخواری پیش نظر ہو اگر دنیا کے کاروبار میں ایک سمجھ دار مشیر اور مددگار کی ضرورت ہو، اگر قومی توہمات کو دور کرنا منظور ہو، اگر خانگی فسادات کو مٹانا چاہتے ہو، اگر زیور کے مطالبوں سے نجات پانی ہو، بیجا فرمائشوں سے ناک میں دم ہو، فضول خرچیوں سے دیوالہ منظور نہ ہو، بیوہ عورتوں پر رحم آتا ہو اور ان کی بے بسی اور بےکسی شاق گزرتی ہو، اگر بچوں کی اعلیٰ جسمانی پرورش عمدہ اخلاقی اور ابتدائی تعلیم منظور ہو تو ہرگز ہرگز اس سے گریز نہیں کہ صنف لطیف کو تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دی جائے"

کاروبار دنیا مثل ایک گاڑی کے ہیں، جس کے پہیئے مرد اور عورت کو خیال کیجئے، گاڑی اس وقت نہیں چل سکتی، جب تک کہ دونوں پہیئے ایک ساتھ گردش نہ کریں، اب اگر مرد تعلیم یافتہ ہو، اور اس کی شریک زندگی جاہل، تو صاف ظاہر ہے کہ دنیا کا کاروبار چلنا بالکل محال ہے، جس طرح ایک پہیہ کی گاڑی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ "تعلیم بجائے خود ایک عمدہ اور پسندیدہ چیز ہے، حضرت انسان کے بےشمار مسائل بغیر تعلیم کے ناممکن ہیں، اس قوت سے ہم مضر کو مفید، بیکار کو باکار، نااہل کو اہل، ناقابل کو قابل بنا سکتے ہیں تعلیم نہ صرف اپنی خوشی کو بڑھا سکتی ہے، بلکہ دوسروں کی مسرت کا موجب ہو سکتی ہے۔" کیا ایسی عمدہ اور بیش بہا چیز سے اپنے ہمدم، انیس و جلیس کا محروم رکھنا صحیح اور درست ہو سکتا ہے؟ کیا یہ مقام افسوس و حسرت نہیں؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ آدم سے لے کر تا ایں دم عورت نے انسان کی انسانیت، شائستگی اور تمدن کی تعمیر میں بےانتہا کوشش کی ہے، مرد کے لئے کھانے پینے رہنے سہنے کے سامان مہیا کرنا، اس کے آرام کے لئے شبانہ روز کی محنت شاقہ برداشت کرنا، اناج بونا، ہل چلانا، کھیت کاٹنا، چکی ایجاد کرنا، آٹا پیسنا، روٹی پکانے کے اوزار دریافت کرنا، روٹی پکانا، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں بیش قیمت ایجاد سب عورتوں کے ہی کارنامے ہیں، صنف لطیف کے مردوں پر یہ ایسے احسانات ہیں جن سے تاقیامت سر نہیں اٹھایا جا سکتا، کیا پھر ایسی صورت میں خواتین کو تعلیم سے روکنا روا ہے؟ ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کی رائے میں صرف مذہبی تعلیم کافی ہوا کرتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے وہ مخالف ہوتے ہیں، اپنے دعوے میں اکثر مندرجہ ذیل وجوہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) اعلیٰ تعلیم کی جنس لطیف کو ضرورت ہی نہیں، کیونکہ یہ ان کا فریضہ نہیں، بلکہ مردوں کا فریضہ ہے۔

(۲) اعلیٰ تعلیم پانے سے وہ شوہر کی فرماں برداری نہیں کرتی۔

(۳) انتظام خانہ داری کے بجائے اخبار اور ناول بینی کا شوق اور جلسوں کی شرکت کا مرض پیدا ہو جاتا ہے

(۴) جنس لطیف کی جسمانی حالت نہایت نازک ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کی تحمل نہیں ہو سکتی۔

(۵) اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے پردہ ناممکن ہے اور پردہ از روئے مذہب فرض ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ جنس نازک کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں! اس کے متعلق جب ہم احکام خداوندی کو مدنظر رکھیں، تو دعوئی بلا دلیل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو حقوق مرد کو عطا ہوئے وہی خواتین کو بھی دئے گئے ہیں جن کو مختصر طور پر میں نے بیان کر دیا ہے، اسی طرح آنحضرت کے اقوال بھی، جو بیان ہو چکے، تعلیم کے متعلق عام ہیں، مردوں کے لئے کوئی تخصیص نہیں کی گئی، اگر درحقیقت خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہ ہوتی تو ضرور تشریح ہوتی، برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں، آنحضرت کے صحابیہ یہاں تک کہ ازواج مطہرات تک نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، اگر اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہ ہوتی، تو بی بی عائشہ صدیقہ کو کوئی ضرورت نہ تھی، کہ ادب اور طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں، علاوہ اس کے میں نے جو فہرست سابق میں دی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف خلفاء وقت کی اولاد نے بلکہ علما و فضلا یہاں تک کہ قاضی القضاۃ تک کی اولاد اناث اور عام خواتین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ علانیہ ان علوم کا درس اور لکچر دیا۔ ابن عساکر علامہ حجر عسقلانی، علامہ سیوطی ابن خلدون جیسے شیوخ وقت نے اپنے اپنے زمانہ میں خواتین سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہیں، اگر اعلیٰ تعلیم کی خواتین کو ضرورت نہ ہوتی تو کس طرح علمائے سابقہ اس کو جائز رکھتے ان دلائل کے بعد ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مذہبی رو سے اعلیٰ تعلیم جائز نہیں۔

بلحاظ تمدن کے بھی اعلیٰ تعلیم خواتین کے لئے نہایت ضروری و لابدی ہے، خاص کر علم طب وغیرہ کیا کوئی شریف شخص اس امر کو جائز رکھ سکے گا کہ نسوانی امراض کا علاج بجائے لیڈی کے ڈاکٹر سے کرائے۔

کوئی سمجھدار شخص اس امر کو باور نہیں کر سکتا کہ کوئی شریف خاتون مذہبی رو سے شوہر کے حقوق سے آگاہ ہو اور اس پر کاربند نہ ہو، آپ نے تعلیم تو دی مگر مذہبی تعلیم سے نابلد رکھا تو اس میں بیچاری عورت کا اور اعلیٰ تعلیم کا کیا

قصور ہو سکتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ معترضین خود اپنے دل میں سوچیں کہ انھوں نے باوجود اپنی بی بی کے حقوق سے آگاہ ہونے کے کہاں تک اس پر عمل کیا اگر کیا ہوتا تو اس قسم کے سوال کی نوبت ہی نہیں آتی۔

میں اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون امور خانہ داری کو انجام نہ دے، بلکہ سچ تو یہ ہے وہ اور عمدہ طور پر اس کو کر سکتی ہے، اخبار بینی وغیرہ کوئی معیوب امور نہیں، اگر کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے عزیز وقت کو بیکار صرف کرنے کے بجائے مطالعہ میں صرف کرے تو اس سے عمدہ کیا بات ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں چونکہ فی زمانہ تعلیمی نصاب نادرست ہے، اس لئے یہ خرابیاں ایک حد تک پیدا ہوتی ہیں کہ وہ امور خانہ داری سے واقف نہیں کرائی جاتیں، اگر نصاب میں واجبی ترمیم ہو تو احسن نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے، نصاب کی درستی کے بجائے اعلیٰ تعلیم کو بری کہنا اور ناجائز ٹھیرانا کہاں تک درست ہو سکتا ہے نیز ہر ایک عورت کی طبیعت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ امور خانہ داری کو انجام نہ دے اور اس کے بجائے گانے بجانے میں اپنے وقت کو صرف کرے حقیقت تو یہ ہے کہ جن کی سرشت ہی بری ہو اس کو تعلیم نہ بھی دی جائے تو یہ خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں ایک چھوٹی وجہ مانع اعلیٰ تعلیم جسمانی نزاکت بیان کی گئی ہے، اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ ہر خاتون کے اعضا ایک ہی قسم کے نہیں ہو سکتے، یہ کلیہ قائم کر لینا کہ تمام خواتین کی جسمانی حالت اعلیٰ تعلیم کی مانع ہے ایک مہمل خیال ہے، کیونکہ اس کے خلاف آج امریکہ، یورپ میں صدہا بلکہ ہزارہا خواتین ایسی ہیں جنھوں نے مشکل سے مشکل فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہیں، کیا جسمانی حالت ان کے مانع نہ تھی؟ ہاں میں اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں کہ بعض فنون کی تعلیم سے ان کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے، اس کا بہترین علاج یہ ہے اس فن کی تعلیم ان کو نہ دی جائے نہ یہ کہ سرے سے کل اعلیٰ فنون کی اعلیٰ تعلیم سے روک دیا جائے، اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کرنا، گویا اپنی اخلاقی حالت بگاڑنا ہے، کیونکہ ڈاکٹری علاج جیسا کہ میں نے سابق میں عرض کیا ہے مرد کے ہاتھ خاتون کا ہونا معیوب اور غیر مستحسن ہے۔

آخری وجہ میں چونکہ پردہ کا تعلق آتا ہے اس لئے اس پر آئندہ بحث کی جائے گی۔

ترانۂ شمس

(از منشی فاضل مولوی محمد شمس الدین صاحب بی، ڈی، ایچ)

اے خالق البرایا سب جگ کو ہے بنایا
سکہ دلوں پہ سب کے اپنا ہی تو بٹھایا

ہیں گل چمن کے سارے مانو گرام تیرے
رنگ رنگ کے گلستاں میں کیا پھول ہیں کھلایا

کوئی خدا پکارے کوئی ہے، رام بولے
مقصود سب کا تو ہے، اے خالق البرایا

واحد ہے ذات تیری تنہا تو سب کا مالک
وحدت کا تو نے نقشہ ہر دل میں ہے جمایا

بچھڑے تھے تیرے بندے گھر گھر نیا خدا تھا
شیرازہ سب کا یکجا وحدت سے پھر ملایا

بھاگے تھے تجھ کو بھولے، ہو کر وہ تجھ سے غافل
تیرے نبیؐ نے یارب تیری طرف بلایا

کچھ جانتے نہ تھے ہم، ہر بات میں تھے جاہل
تو نے دیا ہے اپنی ہر کام کو سکھایا

جاہل تھے تیرے بندے ہر کام میں تھے کاہل
بگڑی ہوی ہماری ہر بات کو بنایا

افعال جاہلوں کے اعمال سب نکمے
مردہ تھی ساری امت رحمت سے پھر جلایا

یکدن ہمارا وہ تھا ڈرتی تھی ہم سے دنیا
اپنی ہی خودسری نے یہ دن ہمیں دکھایا

اسلامیوں کی کشتی گرداب میں پھنسی ہے
تیرے نبیؐ کا صدقہ تو لاج رکھ خدایا

پھر آپڑا ہے یارب بندوں پہ وقت نازک
سنتا نہیں ہے تو کیوں فریاد کو خدایا

اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت
بھولے ہوؤں کو تو نے کیسا سبق پڑھایا

رحمت کے تیری صدقے بخشش کے تیری قرباں
کیا کیا کرم سے اپنے تو نے ہمیں دلایا

ان پاپیوں میں تیرے یک شمس بھی ہے نادم
جس کے ذہن میں تو نے اس نظم کو سجھایا

جذبات شبیر

(از مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر مترجم حیدرآباد ہائیکورٹ)

عید کی ملاقات

دراِمیر پہ جاکر غریب بیچارہ
سلام عید کا بار گراں اتار گیا

امیر بت بنے بیٹھے رہے خبر نہ ہوئی
کہ ان کے پیٹ میں سر کون آکے مار گیا

فیشن بھی ترقی کا باعث ہے

کپڑوں کو سمجھنا نہ کبھی محض لفافہ
ہے منحصر اس پر بھی ترقی و اضافہ

دلدادۂ فیشن کو سمجھتے ہیں یہ حقدار
حکام کو آتا ہے مگر علم قیافہ

اصلی حقدار

ہر طرح سے چونکہ اپنا دعویٰ حق ہے
ناحق کا بھی نام ہم نے رکھا حق ہے

ہم ہیں عرض اہل دفتر اصلی حقدار
حق پہنچے کسی کو سب میں اپنا حق ہے

بھرتے میں خدا بھرتا ہے

جن کے گھر دفتر کے پاس اور آنا جانا ہاتھ میں
موٹریں ان کو عطا کیں در پہ گاڑی باندھ دی

دور گھر، تنخواہ تھوڑی، حاضری کی پابندیاں
مفلسوں کی یوں اگاڑی اور پچھاڑی باندھ دی

غزلیات

از جناب ابو المعنی مولوی سید منتجب الدین صاحب تجلی حیدرآبادی

ہوا نقصان مرا برباد ان مخمور آنکھوں سے ملائیں ہائے کیوں آنکھیں تری مشہور آنکھوں سے
برا اس نے کہا ہو یا بری نظروں سے دیکھا ہو تو گویائی زباں سے میری جائے نور آنکھوں سے
تصور رات دن اس کا خیال اس کا ہے ہر لحظہ وہ ہے نزدیک اتنا جس قدر ہے دور آنکھوں سے
غلط انداز نظروں سے نہ دیکھو تم مجھے دیکھو کہیں یہ شیشۂ دل ہو نہ چکنا چور آنکھوں سے
ہماری چشم دریا بار کو چھیڑو تو جب چھیڑو اگر طوفاں اٹھانا ہے تمھیں منظور آنکھوں سے
لب میگوں کی یاد آتی ہے فرقت میں عجب کیا ہے بجائے اشک اگر ٹپکے مئے انگور آنکھوں سے
وہ اب آنکھوں سے دل میں بیٹھ کر دل کو مسلتے ہیں بہے کیوں کر نہ زخم دل کا ہر ناسور آنکھوں سے
مرے حال زبوں کو دیکھ سن کر بھی ہیں یوں انجاں کہ گویا کان سے عاجز ہیں اور معذور آنکھوں سے
زمانہ دیکھ ڈالا خاک چھانی سارے عالم کی نہ گزرا تیرا ثانی تجھ سا رشک حور آنکھوں سے
نہ تھا معلوم یہ مجھ کو کہ یہ غماز الفت ہیں نکالوں گا نہ اک آنسو بھی تا مقدور آنکھوں سے
نبات، اس کے لبوں سے مات۔ گل، عارض سے شرمندہ خجل شمشاد قد سے، نرگس مخمور، آنکھوں سے
اسے ہے وصل کا چسکا، اسے ہے دید کا لپکا کروں کیا، دل سے میں ناچار ہوں مجبور آنکھوں سے
تجلی سے ہے سب کچھ ورنہ تجھ کو کون پوچھے گا گرا اس کو نہ دل سے کر نہ اس کو دور آنکھوں سے

جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی

میکش نواز ساقی بہلا نہ گفتگو میں بس آج تو پلا دے جو کچھ بھی ہو سبو میں
اندوہ بیکسی میں جینا نہ تھا مناسب دنیا سے چل دئے ہم راحت کی جستجو میں
اے صرصر حوادث برباد کر نہ دینا کچھ پھول ہم لئے ہیں دامان آرزو میں
خاموشیوں نے خوگر غم کا بنا دیا ہے کیا لطف آئے ہم کو اب شرح آرزو میں
حسرت نصیب آنکھیں کچھ اتنا خون روئیں ٹکڑے دل و جگر کے بہ آئے ہیں لہو میں
فرقت کی شب کسی نے تسکین دی نہ دل کو تڑپا کیا زمیں پر لوٹا کیا لہو میں
کچھ آج خود بخود جی رونے کو چاہتا ہے پہنچے نہ ہوں الٰہی وہ محفل عدو میں
غربت میں دل تپاں ہے یاد وطن سے محوی میں وہ، وہ مند ہوتا اے کاش لکھنؤ میں

(از بھوپال)

ضابطہ اشتہار

(۱) ایک دفعہ تین مرتبہ چھپنے والے اشتہار کی اجرت کامل پیشگی لی جائے گی۔
(۲) بقیہ تمام اشتہاروں کی اجرت کی ادائی اس طرح سے ہوگی کہ دو ماہ کی رقم آرڈر کے ساتھ روانہ کی جائے جو دفتر ہذا میں بطور ضمانت کے جمع رہے گی اور ہر ماہ اشتہار مع رسالہ وی پی کر دیا جایا کرے گا۔
(۳) معاہدہ اشتہار اندرون مدت منسوخ نہ ہوگا۔
(۴) اشتہار کا صرف مسودہ اور نمونہ روانہ کرنا کافی ہے۔

نرخ نامہ

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ یا اس کا جز
۱۲	۵۸ روپے	۳۰ روپے
۹	۴۴ روپے	۲۵ روپے
۶	۳۰ روپے	۱۸ روپے
۳	۱۴ روپے	۱۰ روپے
۱	۵ روپے	۳ روپے

ٹائٹل کے صفحہ کی اجرت اس سے پچاس فیصدی زیادہ

النساء دکن کا واحد اور پہلا زنانہ ماہوار پرچہ زیر ادارت بیگم صاحبہ عالیجناب سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹرایٹ لا حیدرآباد سے ہر ماہ ہلالی کو نکلتا ہے۔

قیمت سالانہ (ے)

دفتر النساء صغرا منزل، ہمایوں نگر سے طلب کر لیا جائے۔

[illegible] النسا

خادمہ عورتوں کا ماہوار رسالہ جو ہر ماہ ہلالی میں حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے جس کی واحد غرض یہی ہے کہ طبقۂ نسواں میں علمی، اخلاقی، تمدنی، مذہبی مضامین شائع کئے جائیں اور ان کو شوق دلایا جائے کہ وہ اپنی اعلیٰ معلومات علمی مشاغل اور نشر علوم میں حصہ لیں تا آئندہ والی نسلیں ان کی بدولت صحیح راستہ پر گامزن رہا ہوں۔ چندہ سالانہ (دے) [illegible]

پتہ۔ بازار عیسیٰ میاں، حیدرآباد دکن۔

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۲۳)

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابوالمکارم محمد انوار اللہ صدیقی

عام قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالۂ ترقی

اندرون چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمۂ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچۂ ڈاک آنے پر واپس کردئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ سرکار سے (عہ) عام خریداروں سے (صہ) ششماہی (سہ) نمونہ (۸؍)۔

منیجر

جمال یار

حضرت نوری و شاد صوفی مدظلہم کے پرلطف مکاتیب کا مجموعہ جس کی نسبت ترقی (بابتہ ماہ شعبان ۱۳۳۲ھ) میں تنقید ہو چکی ہے۔۔ قیمت پانچ آنے۔

پتہ

(۱) شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد

(۲) دفتر رسالہ ترقی۔

(۳) سید شاہ ظہور عالم حسینی سجادہ نشین خلف حضرت افتخار علی شاہ مزار دار خاں پیٹھ چشتی چمن۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد (۱) ——— ماہ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ ——— نمبر (۹)

فہرست مضامین

شذرات

ناظرین ترقی اس سے بدرجۂ اتم واقف ہیں کہ "ترقی" میں عمدہ لکھائی، چھپائی اور دیگر لوازمات اشاعت کا اہتمام خاص طور پر زیادہ تر اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ "ترقی" ایک ایسے مقام سے شائع ہوتا ہے، جہاں "جامعۂ عثمانیہ" کے قیام نے اردو ادب کے قصر ایوان کی تعمیر کے لئے دلی اور لکھنؤ کے کھنڈرات کو صلائے عام دے دیا ہے، اس اعتبار سے اگر ارباب حل و عقد سے اس امر کی توقع کی جائے کہ ایک اردو ادب کے پرچہ کی قیمت میں اضافہ، دراصل، جامعۂ عثمانیہ کی ادبیت سے ہمارے انتساب کا دوسرا نام ہوگا تو حق بجانب ہوگا۔ اس کے علاوہ فن طباعت سے واقف کار طبقہ لاعلم نہیں ہے، کہ یہاں فن طباعت ابھی اس شاہراہ پر نہیں آیا ہے جیسا کہ یہاں سے باہر۔ رسالہ "ترقی" کو شائع ہوئے نواں مہینہ ہے، اس کا ہر نمبر اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری وجاہت میں ہر لحاظ سے دیدہ زیب رہا ہے، اس انتظام کے التزام میں ہم کو علاوہ ذاتی محنت اور خاص وقت صرف کرنے کے، غیر معمولی طور پر روپیہ بھی صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے ہم مجبور ہیں کہ "ترقی" کی قیمت میں اضافہ کریں۔

گو عام خریدار صاحبان سے ہماری اس صدا پر لبیک کہنے کی توقع ضرور ہے، مگر فی الحال ہم عام خریدار حضرات سے قطع نظر کرتے ہیں، اور سرکار سے بجائے سالانہ (عہ) کے (سے؍) قرار دیتے ہیں۔

جرمن کے دارالسلطنت برلن کا ایک تازہ مکتوب مظہر ہے کہ ایک دردمند ہندی مولوی عبدالجبار الخیری وہاں اشاعت اسلام کا کام عرصہ چار سال سے انجام دے رہے تھے۔ ان کا یہ کام اس درجہ کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کہ وہاں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ جماعت میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ، اگر دنیا میں امن قائم کر سکتا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہے۔ مگر وائے بر حال ما۔ کہ مولوی صاحب موصوف کو اپنے مشن کے لئے کچھ مالی مدد کی ضرورت ہوئی، انھوں نے ووکنگ مشن (لندن) کو کئی بار لکھا، جواب نہ آیا۔ بالآخر ایک توسل سے لکھوایا، اس کا جواب آیا۔ امداد کا وعدہ ہوا، مگر قبل اس کے کہ وعدہ پورا کیا جاتا مولوی صدر الدین قادیانی مشنری آدھمکے اور یہی نہیں کیا کہ مولوی عبدالجبار سے مل کر کام کرنے سے انکار کیا بلکہ وہاں اپنی تبلیغ شروع کی اور آج کل یہ سوال پیدا کرا دیا ہے کہ آیا مرزا غلام احمد کو نہ ماننے والا کافر ہے یا نہ ماننے والا؟ مولوی محمد علی مرزائی (لاہوری) کا ترجمہ کلام اللہ قادیانی مشن کی تبلیغی مطبوعہ کتابیں وہاں عام طور پر تقسیم ہو رہی ہیں مولوی عبدالجبار صاحب تا امکان ان کی تردید میں مصروف اور کامیابی کے ساتھ مصروف ہیں تاہم ان کو اس وقت مالی اعانت کی سخت ضرورت ہے، ہم اپنے مستطیع اور دردمند ہموطنوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اس بارہ میں عملی حصہ لے کر ماجور و مثاب ہوں۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ، اصلها ثابت و فرعها فی السماء، توتی اکلها کل حین باذن ربها، و یضرب اللہ الامثال للناس لعلهم یتذکرون۔

کلامِ غالب (اردو) کی شرحیں

(از مولانا محمد جمال الدین صاحب نوری پروفیسر عربی نظام کالج)

یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زبان اردو میں غالب مرحوم جیسا شاعر اس وقت تک پیدا نہیں ہوا خصوصاً ان کے فلسفیانہ خیالات نے ان کے کلام کو آج کل اس درجہ مقبول بنا دیا ہے کہ خود ان کے زمانے میں یہ مقبولیت حاصل نہ تھی یہی وجہ ہے کہ غالب مرحوم کے کلام کی شرحیں اس وقت ایک خاصی تعداد میں موجود ہیں، اور زبان اردو کی موجودہ رفتار ترقی، اور کلام کی مقبولیت سے یقین ہے کہ آئندہ اور شرحیں لکھی جائیں گی۔

گو سب سے پہلے شرح مولوی عبدالعلی والہ مرحوم پروفیسر نظام کالج حیدرآباد نے "وثوق صراحت" کے نام سے ۱۳۱۱ھ میں لکھی، مگر انھوں نے یہ شرح محض درسی اغراض کے واسطے لکھی تھی، اس لئے زیادہ مفصل نہیں ہے، بالکل اسی طرح مولانا محمد جمال الدین صاحب نوری کو بھی شرح لکھنے کی ضرورت داعی ہوئی، جیسا کہ خود ہمارے دوست نے جنھوں نے یہ شرح ہمیں ارسال فرمائی ہے، اپنے کرم نامہ میں لکھا ہے۔

مولانائے ممدوح، کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں، کلام غالب کی شرح پر آپ کی توجہ، درحقیقت دورِ حاضر میں اردو زبان کی ایسی خدمت ہے جس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

یہ سچ ہے کہ مولوی حالی مرحوم ہی کی وہ پہلی کتاب "یادگارِ غالب" ہے جس نے جہاں کلام غالب کو مقبول بنا دیا، وہاں مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات، اور ان کی جدت و بلند خیالی کو اس طرح عیاں کیا ہے کہ، بقول مولوی ہاشمی صاحب "یہ کام ان سے بہتر کسی شارح نے انجام نہیں دیا" مگر ناظرین ذیل کی شرح سے خود اندازہ کرلیں گے کہ مولانا نوری کا قدم سب شارحین سے آگے ہے۔

ہم اپنے مکرم دوست مولوی ابو محمد عمر بن صلاح صاحب یافعی کے بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے مولانائے موصوف کے ایک ایسے کام کو، جسے اردو زبان پر احسان عظیم کہنا بیجا نہ ہوگا، عام ناظرین سے روشناس کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لی، اور ہم اسی سپاس گزاری کے ساتھ یہ تمنا ان کی خدمت میں پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ، مولوی حالی مرحوم نے "یادگارِ غالب" میں غالب کے حسب ذیل اشعار کو بے معنی بتلایا ہے:-

شمار سجہ، مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

نے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد لنگ گلستاں ہونا

شب خمار شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

کیا اچھا ہو، اگر مولانا ان کے حل کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ (ترقی)

عم نواز! سَلَامٌ عَلَیکَ وَقَلبِی لَدَیکَ۔

"گذشتہ سال رسالۂ اردو میں جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی (رکن دار الترجمہ) نے عنوان بالا پر تنقیدی نظر ڈالی تھی اور اس کے ضمن میں تمام شارحین کے نام گناتے ہوئے ہر ایک شارح کی نسبت کچھ نہ کچھ رائے دے کر نواب حیدر یار جنگ بہادر (نظم طباطبائی) کی شرح کو اپنی تنقید کا دنگل بنایا تھا جس کی جھلک آپ کے رسالۂ ترقی کے کچھ نمبروں میں بھی نظر آتی ہے۔

سند المحققین علامہ محمد جمال الدین صاحب نوری حیدرآبادی (پروفیسر عربی نظام کالج) مدظلہ نے بھی اپنی توجہ دیوان غالب کی شرح پر مبذول فرمائی تھی، علامۂ ممدوح کو بھی وہی ضرورتِ "شرح" پر داعی ہوئی، جو مولوی عبد العلی صاحب آسی مرحوم (مدراسی) پروفیسر نظام کالج کو داعی ہوئی تھی، ورنہ علامۂ ممدوح کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ "شرح" پر متوجہ ہوں۔

اس شرح میں جو طرز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کے مدنظر قدردانان کلام غالب کی خاطر سردست "ردیف الف" کی شرح میں سے کچھ حصہ ایک جلد کی طور پر طبع کرانے کا قصد ہے، مگر اس کے طبع کرانے کے قبل بعض علم دوست احباب کا عموماً یہ اصرار رہا کہ اس کے کچھ اجزا سے (کسی علمی و ادبی رسالہ کے ذریعہ) پبلک کو روشناس کرا دیا جائے اور اب خصوصاً جناب ہاشمی صاحب کی تنقید دیکھنے کے بعد تو تقاضوں کا تانتا بندھ گیا ہے کہ "شرح" کے کچھ حصہ کو کسی رسالہ میں اشاعت کی غرض سے بھیجدوں علاوہ اس کے رسالۂ ترقی کی روز افزوں ترقیاں قابل توجہ بن رہی ہیں اس لئے "آزردن دل دوستاں جہل است" سمجھ کر فی الحال "دو شعر کی شرح" ترقی میں اشاعت کی غرض سے مرسل ہے۔"

(عمر)

(۱)

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو کاؤ کی تکرار ہے اور کاؤ صیغۂ امر ہے کاویدن سے نکلا ہے اور مصدر یا حاصل مصدر کے معنی پر آیا ہے جیسے نوش نوش اور پیچ و تاب کہ امر کے صیغے ہیں نوشیدن پیچیدن اور تافتن سے نکلے ہیں اور معنی مصدری کے لئے برتاؤ میں آتے ہیں اس لحاظ سے کاؤ کاؤ کے اصلی معنے ہیں۔ کھودنا اور کریدنا اور یہاں مراد کاوش اور خلش ہے کاؤ کاؤ کا استعمال کھودنے یا کریدنے کے لئے ہی نہیں ہوتا، مجاز نے اپنے علاقوں سے مدد لی ہے اور کھود کھود کر جواہر معنے پیدا کئے ہیں، کہیں اس کا استعمال دفینے وغیرہ کی تلاش اور جستجو کے لئے ہوتا ہے، کیوں کہ وہ بھی ایک طرح کا کھودنا ہے یا کریدنا (عرفی)

بنوش نوش نہ بنید صبوحی ستاں ... بکاؤ کاؤ کلند طبیعت ہشیار

دوسرے مصرع میں معنے کے دو پہلو نکلتے ہیں، ایک پہلو پر حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے اور دوسرے پہلو پر مجاز کا انداز، کہیں اس کا استعمال نوک دار چیز کے چبھنے اور کھٹک کھٹک کر ایذا دینے کے لئے ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کھودنے یا کریدنے کے نشان نظر آتے ہیں (صائب)

از کاؤ کاوِ آں مژہ ام بے خبر ہنوز ... نگرفتہ خون من بزبان نیشتر ہنوز

(میر) سب کھا گئی جگر تری پلکوں کی کاؤ کاؤ ... ہم سینہ خستہ لوگوں سے بس آنکھ مت لگاؤ

اور کہیں اس کا استعمال زخم یا کھرنڈ وغیرہ کے چھیلنے اور کھرچنے کے لئے ہوتا ہے کہ اس کیفیت میں بھی کھودنے یا کریدنے کا اثر پایا جاتا ہے۔ تاثیر ؎

از کاو کاوِ ناخن مطرب دریں بہار ... جوشیدہ خون تازہ ز داغ کہن مرا

اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ مجاز کی قید سے کوئی آزاد نہیں ہے دفینے کی تلاش ہو یا زخم جگر کی خراش

جوئے شیر (قیصر روم کی ایک ناز پرور لڑکی تھی، جس کا چہرہ حسن کے آسمان پر دن کو آفتاب نیمروز تھا تو رات کو ماہ دو ہفتہ مریم نام تھا اور مسیحائی شیوہ پرویز نے بہرام چوبیں سے لڑکر جب شکست کھائی اور بھاگ کر قیصر کے پاس پناہ لی تو یہ پری جمال پرویز سے بیاہی گئی اور حسن کا رعب یا احسان کا دباؤ ڈال کر خسرو کو غلام بنالیا، شیریں نے جب یہ خبر سنی تو زندگی تلخ ہوگئی، سوت کی جلن تھی اور بروگ کی الجھن اس لئے کھانے پینے سے دل اچاٹ ہوگیا تھا اور کوئی غذا انگ نہیں لگتی تھی، صرف دودھ پی کر جیتی تھی اور مصیبت کے دن بھرتی تھی، قصر شیریں کلاغ بہشتی سے کم نہ تھا اورگرد کینز کے زہریلے درختوں نے لہلہا کر سبزہ بیگانہ کا رنگ دکھایا تھا اور جھنڈ کے جھنڈ قطار باندھ کر دور دور تک چلے گئے تھے، ان درختوں کے پتے کوئی جانور کھاتا تو ہلاک ہوجاتا اس لئے چرواہوں نے دو تین فرسنگ کے فاصلے پر ایک سبزہ زار چراگاہ کے لئے دیکھ لیا تھا، شیریں کی بھیڑیں اور بکریاں وہیں چرتی تھیں، لیکن دودھ کے لانے لے جانے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا، پرستاروں کو چھٹی کا دودھ یاد آتا تھا اور مصیبت کو دیکھ پتھر کا کلیجہ پانی ہوتا تھا اس لئے شیریں چاہتی تھی کہ سہولتیں پیدا ہوں اور دشواریاں ناپید، رات دن یا پرویز سے ملنے کی دھن تھی یا سہولتیں پیدا کرنے کی ادھیڑبن کہ ایک روز شاہ پور نے فرہاد کا ذکر چھیڑا، تعریف کے پل باندھے اور اپنے دوست کی سنگ تراشی کا وہ نقش دل پر بٹھایا کہ شیریں خوش ہوگئی اور فرہاد کو طلب کیا، شاہ پور ایک باکمال مصور تھا، اس نے اور فرہاد نے ایک ہی اُستاد کے دامن تعلیم میں تربیت پائی تھی اور محنت کے بازو سے اوج کمال پر پہنچے تھے، اسی شاہ پور نے کئی بار خسرو کی تصویر شیریں کو دکھائی تھی اور واسطۂ محبت ہوکر خسرو کی نظر میں آبرودار اور شیریں کے پاس بااعتبار ہوگیا تھا، غرض شاہ پور کی سفارش تھی یا کمال کا کرشمہ کہ فرہاد نے بار پایا اور شیریں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا (نظامی)۔

گلہ دوست د ، نامحتاج شیریم طلسمی کن کہ آساں شیر گیریم
زما تا گوسفنداں یک دو فرسنگ بباید کندجوئے محکم از سنگ
کہ چوپانانم آنجا شیر دوشند پرستارانم اینجا شیر نوشند

شیریں کی میٹھی میٹھی باتوں پر فرہاد مرگیا اور جمال صورت میں کمال معنی کا جلوہ دیکھ کر غش ہوگیا، دل کھو کر دولت عشق پائی، آسایش جاں کو فرمایش جاناں پر قربان کیا اور جنون محبت کے جوش میں وہ چابک دستی دکھائی کہ ایک مہینہ میں کالے پہاڑوں کو کاٹ کر نہر نکالی اور شیریں کی محل سرا تک پہنچائی۔ (نظامی)

بہ یک ماہ از میان سنگ خارا چو دریا کرد جوئے آشکارا
زجائے گوسفنداں تا در کاخ دو رویہ سنگہا زد شاخ در شاخ
چناں ترتیب کرد از سنگ جوئے کہ در درزش نمی گنجید موئے

یہ ہے ایک مختصر قصہ جوئے شیر کا اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فرہاد جوئے شیر لانے سے پہلے نہیں مرا ، اس کے بعد بھی زمانۂ دراز تک زندہ رہا ، دشت نوردی کی مصیبتیں اٹھائیں اور درد فراق کا مزا چکھا، آخر شیریں کی خبر مرگ اڑائی گئی اور کوہ بے ستون پر اس کا اور اس کی امیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔

تمہید اور مطلب

جدائی کی رات اور بے خوابی کی بلا پٹ جانے میں جھاڑ ہوتی ہے اور بھاری ہونے میں پہاڑ، شوق طرح طرح کے گل کترتا ہے، بیتابی کانٹوں پر لٹاتی ہے اور یاس آندھی بن کر دل بجھاتی ہے، اس مصیبت پر جب تنہائی کا اضافہ ہوتا ہے تو مصائب کا وزن اور بڑھ جاتا ہے، گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے اور چھاتی پر سانپ لوٹتے ہیں، نہ رات

کٹتی ہے نہ بلا سر سے ٹلتی، گویا سیاہی شب کے دھواں دھار بادل پہاڑ ہو کر جم جاتے ہیں اور آسمان کے چمکدار ستارے بے حرکت ہو کر قطب تارے کی جھلک دکھاتے ہیں، نہ یہ بادل پھٹتے ہیں نہ وہ ستارے اپنی جگہ سے ہٹتے۔ (امرؤ القیس ؎

فَیَا لَکَ مِنْ لَیلٍ کَاَنَّ نُجُومَہٗ بِاَمْرَاسِ کَتَّانٍ اِلیٰ صُمِّ جَنْدَلِ

اب اگر موت آجاتی ہے تو سمجھو کہ چین آجاتا ہے اور چھٹکارا ہو جاتا ہے، ورنہ سخت جانی کے ہاتھوں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، روح پر کاوشیں گذرتی ہیں اور جسم پر کاہشیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ درد جدائی ہے اور عالم تنہائی نہ چارہ سازی کے لئے کوئی چارہ ساز ہے نہ غم خواری کے لئے کوئی غم خوار، ورنہ کچھ نہ کچھ کام نکلتا، باتوں میں جی بہلتا اور آسانی سے شب فراق کٹ جاتی، غم کی گھٹا چھائی ہے اور مصیبت کی رات مجھ پر آئی ہے، جی گھبراتا ہے اور دم نہیں نکلتا کہ ان آفتوں سے نجات ملتی اور قبر میں پاؤں پھیلا کر سورہتا، موت پر جان جاتی ہے اور موت نہیں آتی، سخت جانی نے وہ ستم ڈھایا ہے کہ سختیوں کا تانتا بندھ گیا، کاوشوں پر کاوشیں اور کاہشوں پر کاہشیں چلی آتی ہیں اور سلسلہ نہیں ٹوٹتا، اس کے بیان میں قلم بے زبان ہے اور زبان بے دم، اس لئے ہجر کے زمانے میں جب تنہائی شریک حال ہو جاتی ہے تو اضطراب کی آگ میں جلنے اور سخت جانی کے ہاتھوں دم نہ نکلنے سے جیسی جیسی روحانی کاوشیں اور جسمانی کاہشیں مجھ پر گزر جاتی ہیں اسکا ماجرا کچھ نہ پوچھو، شام ہوتی ہے تو رات ایک پہاڑ ہو جاتی ہے، ہزار کاٹتا ہوں نہیں کٹتی اور کٹتی بھی ہے تو بڑی دشواری سے کٹتی ہے کہ درد جدائی چھاتی کا جم ہوتا ہے اور بلا کا غم، جب رات کا خاتمہ ہوتا ہے اور صبح اول کی طولانی سفیدی مشرق سے نمودار ہوتی ہے تو یہ سمجھو کہ کالا پہاڑ کاٹا گیا اور جوئے شیر لائی گئی، رات ایک کالا پہاڑ ہے اور طولانی سفیدی جوئے شیر، اس لئے رات کا کاٹنا اور صبح تک زندہ رہ کر طولانی سفیدی کا منہ دیکھنا

کاوے پہاڑ کا کاٹنا ہے اور جوئے شیر کا لانا۔ فرہاد کوہ کن بڑی محنت اٹھا کر جوئے شیر لایا تھا اور دودھ کا دریا بہایا تھا، میں بھی سخت مصیبتیں جھیل کر ہجر کی رات کاٹتا ہوں اور دودھ کا دریا آسمان پر بہاتا ہوں، جان کنی میں رات کٹتی ہے اور بے تابی میں صبح ہوتی ہے۔ شکیبی ؎۵

شبہائے ہجر را گزرانیدیم و زندہ ایم — مارا بہ سخت جانی خود ایں گماں نبود

یہ ہیں معنی اس شعر کے اور ایک شارح ؎ نے کاوکاو کو تجسس اور تلاش پر محمول کیا ہے اور شعر کے ایک نہیں دو معنی اس طرح بتائے ہیں:۔

(اول) ہجر یار میں میری سخت جانی اس تجسس میں ہے کہ کسی طرح شام سے صبح ہو مگر نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ ایسی ہی مصیبت ہے جیسے کوہ کن کو پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے میں ہوئی، سفیدی صبح کے لئے جوئے شیر کا استعارہ اور جوئے شیر لانے کے لئے کاوکاو بہت موزوں ہے۔ الخ

(دوم) فراق یار میں میری حالت نزع کی ہے، ہر چند چاہتا ہوں کہ جان نکلے مگر نہیں نکلتی، جب صبح ہوگی تو نجات ملے گی، جس طرح فرہاد جوئے شیر لایا تو اس کا کام تمام ہوا۔"

ایک اور شارح ؎ نے اس طرح شرح لکھی ہے "میں شب فراق میں صبح ہونے سے پیشتر مر جاؤں گا"۔ اب یہاں ایک نکتہ دل نشیں قابل ذکر ہے اور لایق توجہ جب رات تمام ہوتی ہے اور صبح کا آغاز ہوتا ہے تو مشرق سے ایک طولانی خط اور نورانی لکیر نمودار ہوتی ہے اور ساکنان زمین کو خبر دیتی ہے کہ سلطان انجم کی سواری دائرۂ افق کے پاس پہنچ گئی، اسی طولانی خط اور نورانی لکیر کو صبح کاذب کہتے ہیں، اس کے بعد پو پھٹتی ہے، نور کا تڑکا ہوتا ہے اور شمال و جنوب کی طرف سے روشنی یا سفیدی چوڑی ہو کر پھیلتی جاتی ہے، اس چوڑائی میں پھیلنے والی روشنی کو صبح صادق کہتے ہیں صبح کاذب

؎ شوکت میرٹھی ۱۲ — ؎ واجد حسین راسی ۱۲

ایک اور نام فجر مستطیل ہے اور صبح صادق کا فجر مستطیر۔ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا یَغُرَّنَّکُمُ الْفَجْرُ الْمُسْتَطِیْلُ فَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَطْلُعَ الْفَجْرُ الْمُسْتَطِیْرُ۔ صبح صادق کی روشنی کو شکل و صورت میں جوئے شیر سے کچھ لگاؤ نہیں جوئے شیر مستطیل تھی اور صبح صادق کی روشنی عریض ہو کر پھیلتی ہے، مستطیل نہیں ہوتی، اس لئے یہ عریض روشنی اس مستطیل نہر سے کوئی میل نہیں کھاتی اور اسی عریض روشنی کو فارسی زبان میں سپیدۂ صبح کہتے ہیں، صاحب برہان لکھتا ہے "سپیدہ بروزن سفیدہ پہنائی روشنائی صبح صادق راگویند" ہاں، جوئے شیر کا جوڑ صبح اول کی مستطیل سفیدی سے خوب ملتا ہے اور پوری مشابہت پیدا ہوتی ہے گویا آخر شب کو جب یہ مستطیل سفیدی نمودار ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالا پہاڑ کٹ گیا اور نہر شیر بہنے لگی، اب تشبیہ بھی کانٹے کی تول پوری اترتی ہے اور شاعر نازک خیال کے جوہر بھی کھلتے ہیں کہ خیال بندی میں کیا کمال کیا اور طبیعت کے زور پرواز نے کہاں سے کہاں پہنچایا، اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ مصنف نے فراق کی شب سیاہ کو کوہ اور صبح اول کی مستطیل سفیدی کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے، لیکن ایک شارح نے سخت جانی کو کوہ ٹھہرایا ہے اور سپیدۂ صبح کو جوئے شیر وہ لکھتا ہے "اس شعر میں شاعر نے اپنے تئیں کوہ کن اور اپنی سخت جانی شب ہجر کو کوہ اور سپیدہ صبح کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے" اب یہاں ایک اور نکتۂ باریک قابل بیان ہے اور لایق توجہ جب ایک شئے کو دوسری شئے سے تشبیہ دی جاتی ہے تو پہلی شئے کو مشبہ کہتے ہیں اور دوسری شئے کو مشبہ بہٖ مشبہ اور مشبہ بہٖ دونوں کہیں مفرد ہوتے ہیں جیسے گال اور گل کہیں مرکب ہوتے ہیں اور کہیں ایک مفرد ہوتا ہے اور دوسرا مرکب، جب مختلف اشیاء اور متبائن امور اکھٹے ہو جاتے ہیں تو ان کے مجموعے سے ایک ہیئت وحدانی پیدا ہوتی ہے، جس کے سامنے اختلاف ذاتی نظر سے گر جاتا ہے اور اشیائے مختلفہ اتحاد کا

۱؎ نظم طباطبائی ۱۱

رنگ نکال کرشئے واحد کا روپ دکھاتی ہیں، اسی ہئیت وحدانی پر تشبیہ مرکب کا دارو مدار ہے کہ جس مجموعے میں یہ پائی جاتی ہے وہ مرکب ہوتا ہے اور جس میں نہیں پائی جاتی وہ مفرد اسی لئے تشبیہ کے بیان میں مرکب کا اطلاق ہیئت مذکورہ کے سوا کسی اور شئے پر نہیں ہوتا اور اسی لئے صاحب مفتاح جہاں تشبیہ مرکب کا ذکر کرتے ہیں، وہاں صاف صاف یہ کہتے ہیں۔ اِنَّ کُلاًّ مِنَ الْمُشَبَّهِ وَالْمُشَبَّهِ بِهٖ هَیْئَةٌ مُنْتَزَعَةٌ اس سے معلوم ہوگیا کہ مشبہ یا مشبہ بہ وغیرہ جب مرکب ہوتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ہیئت وحدانی پائی جاتی ہے جو دراصل کئی مختلف اشیاء کی ایک ہیئت اجتماعی ہوتی ہے یا کیفیت انتزاعی۔ بشار شعر

كَأَنَّ مُثَارَ النَّقْعِ فَوْقَ رُؤُسِنَا وَأَسْيَافَنَا لَيْلٌ تَهَاوَى كَوَاكِبُهٗ

شعر کے معنی یہ ہیں کہ غبار اٹھ کر، جب ہمارے سروں پر چھا گیا اور ہماری تلواروں کے ساتھ مل کر گڈمڈ ہوگیا تو ایک ایسی شب سیاہ کا منظر نظر میں پھر گیا، جس میں شہاب ثاقب آسمان سے ٹوٹ کر پے در پے گرتے چلے جاتے ہیں، میدان جنگ میں جب تیز تلواریں میان سے نکلتی ہیں اور چمک کر علم ہوتی ہیں تو طرح طرح سے چلتی ہیں کبھی اوپر جاتی ہیں، کبھی نیچے آتی ہیں، کہیں داہنے بائیں تیزی سے نکل جاتی ہیں، کہیں آڑھی ترچھی گر کر بجلی کی تڑپ دکھاتی ہیں، غرض طرح طرح کا اضطراب ہوتا ہے اور بات بات میں انقلاب، چھانے والے غبار کی ظلمت چمکدار تلواروں کی کثرت اور اختلاف حرکات کی شدت پر جب نظر پڑتی ہے تو ان سب کے مجموعے سے ایک خاص کیفیت کا سماں بندھتا ہے، اسی طرح جب رات کی تاریکی عالم پر چھاتی ہے اور ستارے ٹوٹ کر آسمان سے پے در پے گرتے ہیں تو مستطیل ہو کر تلوار ہو جاتے ہیں اور میدان جنگ کا تماشا دکھاتے ہیں، کبھی ادھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں، کبھی مقابل ہو کر ٹکراتے ہیں، ہر جہت میں ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے اور ہر حرکت میں ایک نئی کیفیت، شب سیاہ

کی ظلمت ٹوٹ کر گرنے والے ستاروں کی صورت اور مختلف جہات میں مختلف حرکات کی سرعت پر جب نگاہ پڑتی ہے تو ان سب کے اجتماع سے ایک خاص ہئیت اجتماعی کا نقشہ نظر آتا ہے، اب یہاں دو اجتماعی ہئیتیں پیدا ہوگئیں، ایک وہ ہے جس کی تصویر پہلے اتاری گئی۔ دوسری وہ ہے جس کا نقشہ اب دکھایا گیا شاعر نے پہلی ہئیت اجتماعی کو دوسری کیفیت انتزاعی سے تشبیہ دی ہے اور مقصود یہ ہے کہ تیز تلواریں جب گرد و غبار میں چمکنے لگیں تو یہ کیفیت نظر آئی کہ رات گویا سر پر چھا گئی اور ستارے ٹوٹ کر آسمان سے گرنے لگے، اس بیان سے کئی مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ گرد و غبار کو رات سے اور ننگی تلواروں کو ٹوٹنے والے ستاروں سے الگ الگ تشبیہ نہیں دی ہے ورنہ مفرد کی تشبیہ مفرد سے ہو جاتی ہے اور کلام کی ترکیب سے سراغ لگتا ہے کہ مفرد کی تشبیہ مفرد سے اس جگہ صحیح نہیں ہوتی! **قول** تَهَاوىٰ كَوَاكِبُهٗ ترکیب کی رو سے جملۂ فعلیہ بن کر لَيْلٌ کی صفت ہوتا ہے اور صفت تابع موصوف ہوتی ہے، اس لئے کواکب کا ذکر تشبیہ میں تابع لیل ہو جاتا ہے اور استقلال کی شان میں جھٹے پڑ جاتے ہیں، اگر مفرد کی تشبیہ مفرد سے منظور ہوتی، تو لَيْلٌ وَكَوَاكِبُهٗ کہتا، دونوں کا ذکر جدا جدا کرتا اور استقلال کی شان دکھاتا، لیکن شاعر نے لیل اور کواکب کا ذکر جدا جدا نہیں کیا اور استقلال کی شان نہیں دکھائی، اس لئے مفرد کی تشبیہ مفرد سے یہاں صحیح نہیں ہوتی، دوسری بات یہ ہے کہ شعر مذکور میں تَهَاوىٰ صیغہ ماضی نہیں ہے، مضارع کا صیغہ ہے، اصل میں تَتَهَاوىٰ تھا، ایک تائے فوقانی گر گئی تَهَاوىٰ باقی رہ گیا، جیسے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ میں تَنَزَّلُ کہ اصل میں تَتَنَزَّلُ تھا ایک تائے فوقانی حذف ہوگئی تَنَزَّلُ قائم رہا اگر کوئی شخص تَهَاوىٰ کو صیغۂ ماضی ٹھیرائے، اور اپنی وہم پرستی سے باز نہ آئے تو مضمون کی خوبی اور کلام کی خوش اسلوبی میں کسی طرح سے خلل پڑتا ہے، استمرار تجددی پر پانی پھر جاتا ہے، واقعۂ ماضی کی

صورت پر حال کا رنگ ورد غن نہیں چڑھتا اور اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے، یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ غبار مذکور ایک ایسی رات سے مشابہ ہو گیا، جس میں تارے ٹوٹ کر آسمان سے گر چکے ہیں، اس لئے خالی رات ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور تشبیہ خاک میں مل جاتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں واؤ مَعَ کے معنی پر ہے، واؤ عاطفہ نہیں ہے ورنہ مفرد کی تشبیہ مفرد سے ہو جاتی ہے اور کلام کا زور گھٹ جاتا ہے۔ اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ بِتّشَارْ نے معرکۂ کارزار کی نہایت خوشنما تصویر کھینچی ہے اور ترکیب کا رنگ بھر کر ایک بے جان تصویر میں جان ڈالی۔ خاقانی سے

مار دیدی در گیا پیچاں کنوں در غار غم مار پیچیدہ در ساق گیا آسائے من

سانپ جب گیاہ میں آتا ہے اور بل کھا کر حلقہ باندھتا ہے تو ایک ہیئت اجتماعی پیدا ہوتی ہے، زنجیر جب پاؤں میں پڑتی ہے اور سانپ ہو کر ساق میں لپٹ جاتی ہے تو اس وقت بھی ایک ہیئت مجموعی نظر آتی ہے، پہلی ہیئت مجموعی کو مشبہ بہ ٹھیرایا ہے اور دوسری ہیئت مجموعی کو مشبہ دوسرے مصرع میں مار سے زنجیر مراد لی ہے اور ساق کی لاغری پر نظر ڈال کر گیاہ سے تشبیہ دی۔ فافہم سودا سے

آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے خط گلزار کے صفحہ پر طلائی جدول

اب اگر کسی کی چشم بصیرت روشنی سے بے نصیب نہ ہو تو صاف نظر آتا ہے کہ مصنف نے بھی ترکیب کا ابتنا مل کر حسن تشبیہ کا رنگ چمکایا ہے، کالے پہاڑوں کے کٹنے اور نہر شیر کے بہنے سے ایک خاص ہیئت اجتماعی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کالی رات کے کٹنے اور طولانی سفیدی کے نمودار ہونے میں ایک نئی کیفیت اجتماعی نظر آتی ہے، یہاں مشبہ بہ پہلی ہیئت ہے اور مشبہ دوسری کیفیت اس میں شک نہیں کہ جہاں ترکیب کا حسن دل فروز نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے، وہاں افراد کی بھی ایک خوشنما صورت کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے مشبہ کا ایک ایک جز مشبہ بہ کے ایک ایک جز سے آنکھ ملاتا ہے

مقابل ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور استقلال میں پورا اترتا ہے جیسے ؎

وَ کَاَنَّ اَجْرَامَ النُّجُوْمِ لَوَامِعًا دُرَرٌ نُثِرْنَ عَلٰی بِسَاطٍ اَزْرَقِ

یعنے نورانی ستارے جب نیلگوں آسمان پر چمکتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا لاکھوں آبدار موتی، کسی نیلے رنگ کے فرش پر بکھیر دئے گئے، یہاں بھی ہیئت مرکبہ کو ہیئت مرکبہ سے تشبیہ دی گئی ہے، نیلگوں آسمان پر نورانی ستاروں کے چمکنے سے جو ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ مشبہ ہے اور نیلے رنگ کے فرش پر آبدار موتیوں کے تتر بتر ہو جانے سے جو ایک انوکھی صورت نظر آتی ہے وہ مشبہ بہ، اب اگر آسمان کو نیلے فرش سے اور ستاروں کو آبدار موتیوں سے الگ الگ تشبیہ دی جاتی ہے اور ہیئت اجتماعی پیش نظر نہیں رکھی جاتی ہے تو بھی کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی، افراد کی صورت بن جاتی ہے اور تشبیہ کی خوبی ہاتھ سے نہیں جاتی، مگر کہاں افراد کا رتبہ اور کہاں ترکیب کا مرتبہ، اس کا حال اور ہے اس کا کمال اور، ترکیب سے جو ایک خوش نما منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے وہ افراد میں نصیب نہیں ہوتا، دل کو لے کر آنکھوں میں بیٹھ جاتا ہے اور آنکھوں میں چپ کر دل میں اتر جاتا ہے، اسی لئے علامۂ تفتازانی مطول میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ثُمَّ تَشْبِیْهُ الْمُرَکَّبِ بِالْمُرَکَّبِ قَدْ یَکُوْنُ بِحَیْثُ یَحْسُنُ تَشْبِیْهُ کُلِّ جُزْءٍ مِنْ اَجْزَاءِ اَحَدِ الطَّرَفَیْنِ بِمَا یُقَابِلُهٗ مِنَ الطَّرَفِ الْاٰخَرِ اس کے بعد کَقَوْلِهٖ کہہ کر شعر مذکور نقل کیا ہے اور یہ عبارت لکھی ہے۔ فَاِنَّ تَشْبِیْهَ النُّجُوْمِ بِالدُّرَرِ وَ تَشْبِیْهَ السَّمَاءِ بِبِسَاطٍ اَزْرَقَ تَشْبِیْهٌ حَسَنٌ لٰکِنْ اَیْنَ هُوَ مِنَ التَّشْبِیْهِ الَّذِیْ یُرِیْكَ الْهَیْئَةَ الَّتِیْ تَمْلَاءُ الْقُلُوْبَ سُرُوْرًا وَ عَجَبًا مِنْ طُلُوْعِ النُّجُوْمِ مُؤْتَلِقَةً مُفْتَرِقَةً فِیْ اَدِیْمِ السَّمَاءِ وَهِیَ زَرْقَاءُ زُرْقَتُهَا الصَّافِیَةُ

آں ہودج خلیفہ متوج بماہ زر (خاقانی) چوں شب کز آفتاب نہی تاج بر سرش

اگر خلیفہ کے سیاہ ہودج کو رات سے اور ہودج سیاہ کے چاند کو آفتاب سے الگ الگ

تشبیہ دی جاتی ہے تو ادائے حسن سے خالی نہیں ہوتی، مگر ذوق صحیح پکار کر صاف کہتا ہے کہ ترکیب میں جو مزہ آتا ہے وہ افراد میں نہیں آتا۔ ذوق ؎

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرسیا کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

غالب مرحوم نے مشبہ اور مشبہ بہ کے اجزا کا جدا جدا ذکر نہیں کیا۔ بیان کے آئینے میں استقلال کی صورت نہیں دکھائی، اسی لئے افراد کی صورت اگر بن سکتی ہے تو ایک تکلف کے بعد بن سکتی ہے اور اس ناگوار تکلف کے بعد بھی ترکیب میں جو ایک فریبار کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ افراد میں نہیں پیدا ہوتی، ترکیب کے جوڑ سے تشبیہ کا وزن بھاری ہو جاتا ہے اور حسن بیان کی آب و تاب چشمۂ نور ہو جاتی ہے یا تجلی طور۔

(۲)

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

گرد اردو زبان میں گرد کا اطلاق ترکیب کے بعد مجازاً ہیچ اور ناچیز پر بھی ہوتا ہے اس لئے جب یوں کہتے ہیں کہ وہ شے گرد ہوگئی تو یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ ہیچ ناچیز اور بے حقیقت ہوگئی شاہ نصیر ؎

اشک گلگوں سے بنے گر اپنے داماں کی طرح گرد ہو جائے گی باغ نورافشاں کی طرح

ذوق ؎

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانند گرد باد جب خاک اڑائی ہم نے تو وہ گرد ہو گیا

اس میں شک نہیں کہ گرد اور غبار کے معنی ایک ہی ہیں اور گرد و کدورت میں ایک طرح کا لگاؤ بھی ہے اور یہی سبب ہے کہ گرد سے کدورت کو تشبیہ دی جاتی ہے، صائب کہتا ہے ؎

بخود سازی بدل کن اے سیۂ دل خانہ سازی را کہ جز گرد کدورت نیست حاصل خاک بازی را

لیکن اردو زبان میں گرد ہو جانے سے غبار خاطر یا گرد کدورت کا مضمون نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے جب کوئی شئے پسند نہیں آتی یا کسی شئے سے گرد کدورت پیدا ہو جاتی ہے تو یوں نہیں کہتے کہ وہ شئے گرد ہو گئی، کسی شئے کا گرد ہو جانا اور شئے ہے اور گرد کدورت یا غبار خاطر اور شئے۔

تمہید اور مطلب

طرح طرح کی مصیبتیں جب کسی پر ٹوٹ پڑتی ہیں تو ریخ پر ریخ دے کر آسمان کا رنگ دکھاتی ہیں اور انقلاب کا عالم نیرنگ، انبساط کا رنگ اکھڑ جاتا ہے اور بہار عشرت پر خزاں آتی ہے دل پر غم چھاتا ہے اور شگفتگی پر اوس پڑ جاتی ہے، جگر جل بھن کر کباب ہوتا ہے اور تازگی خاک میں مل جاتی ہے نہ دل میں خوشی رہتی نہ کلیجے میں ٹھنڈک، رنج و مصیبت کے ہاتھوں دل و جگر خون ہو جاتے ہیں سینہ پر خون ہو جاتا ہے اور بہاؤ بڑھ کر دریائے جیحون۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ آگے مصیبت کی صورت نہیں دیکھی تھی عیش و نشاط کا عالم تھا اور لطف زندگی کا زمانہ، عشرت کے سامان مہیا تھے، رنگ محلوں میں رنگ رلیاں سوجھتی تھیں، دور جام چلتا تھا، انجام کا خیال نہ آتا تھا، خواب راحت میں عمر کٹتی تھی اور زندگی کا مزہ آتا تھا۔ اس کے بعد ایک دم سے ہوا بدل گئی اور خوش دلی کا ورق الٹ گیا، وہ بپتا مجھ پر پڑی کہ غم و اندوہ کے بادل گرجنے اور درد و الم کے پتھر برسنے لگے چوٹ پہ چوٹ کھائی اور صدمے پر صدمہ اٹھایا، اس لئے دل خون ہوگیا۔ جگر لہولہان ہوگیا، ناسور سے چشمے ابلنے لگے اور خون کا ایک دریا امنڈ آیا اور لہرا کر بہنے لگا، اس لئے اب یہ گت بن گئی ہے کہ دل سے لے کر جگر تک دریائے خون کا ساحل ہو گیا ہے، روز و شب خون جگر پیتا ہوں اور غم کھا کر جیتا ہوں، غرض جس رہ گزر میں اب غم کا جوش طوفان خیز اور لہو کا سمندر شور انگیز ہے، آگے اسی میں غضب کی دل کشا فضائیں اور روح افزا ہوائیں تھیں

غم سے فراغ تھا، دل باغ باغ تھا اور جگر بے داغ، گویا فصل بہار آئی تھی اور دل سے جگر تک تمام رہ گزر گلزار ہو گئی تھی، چمن کی شادابی اور گل کی سیرابی شہرۂ آفاق ہو کر ضرب المثل ہو گئی ہے، لیکن خوش حالی اور فارغ البالی نے وہ پھول باغ یہاں لگایا تھا، کہ سینۂ بے غم اور دل خرم کی شگفتگی نے لالہ زار میں آگ لگائی، گلستان ارم پر بجلی گرائی، ابر نوروز کی آبرو برباد ہو گئی تھی، ہنگامۂ بہار سرد تھا اور جلوۂ گل گرد، مقصد اصلی اگرچہ یہی ہے کہ جلوۂ گل ناچیز اور بے حقیقت ہو گیا تھا لیکن مصنف نے جلوۂ گل کی گرد رہ گزر میں اڑا کر ایک لطیف مضمون پیدا کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ فارسی میں رستہ کو رہ گزر کہتے ہیں۔ رضی نیشاپوری[1]

جگر چہ میدہی آں را کہ بر تواں چیدن زخاک رہ گزرت پارہ پارۂ جگرش

کوئی رستہ ظاہر ہے کہ گرد سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے یہ رہ گزر اور یہ رستہ بھی گرد سے تو خالی نہ تھا، لیکن جو گرد یہاں اُڑتی تھی وہ کوئی خاک دھول نہ تھی، جلوۂ گل تھا کہ گرد کے بدلے اُڑتا تھا اور غبار کی طرح بلند ہوتا تھا، گویا اس رستہ میں اڑنے والی گرد اور اٹھنے والا غبار جلوۂ گل تھا، جس رہ گزر میں گرد و غبار کے عوض جلوہ گل گرد و غبار ہو کر اڑتا ہو، اس کی دل کشا بہاروں کا کیا ٹھکانا، تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے، زبان ناطقہ لال ہو جاتی ہے اور قوت عاقلہ بے پر و بال، یہ ہیں معنے اس شعر کے اور ایک شارح لکھتا ہے:
"رہ گزر مذکور میں جو پیش تر نزاکت موفور کے سبب جلوۂ گل باعث گرد کدورت تھا، اب عاشقی میں دل و جگر کا یہ حال ہے، اس کے بعد شارح مذکور نے فصیحی کا یہ شعر لکھا ہے۔

آں دیدہ کہ از نسایۂ مژگاں گلہ دارد پامال دو صد قافلہ خون ست دریں رہ

ایک اور شارح[2] کا بیان ہے۔ "دل سے لے کر جگر تک جو اس وقت دریائے خون کا کنارہ بنا ہوا ہے، یعنے خون تک باقی نہیں رہا، کیوں کہ دریا کا کنارہ خشک ہوتا ہے، اس سے

---

[1] والہ مرحوم مدراسی۔ [2] شوکت مرحوم میرٹھی۔

پہلے یہ رہ گزر ایسا سبز اور شاداب تھا کہ جلوۂ گل بھی اس کے آگے گرد، یعنے بے حقیقت تھا، مطلب یہ ہے کہ اب میرے ہرے بھرے دل کو غم عشق نے پامال کر دیا"، اب یہاں دو تین نکتہ دل نشیں قابل ذکر ہیں اور لائق توجہ (نکتۂ اولیٰ) معدے میں ہضم اول ہوتا ہے، اور جگر میں ہضم ثانی۔ ہضم اول کو ہضم کیلوسی کہتے ہیں اور ہضم ثانی کو ہضم کیموسی، جب ہضم کیلوسی کے بعد ہضم کیموسی کی نوبت آتی ہے اور حرارت جگر اپنے کام میں سرگرمی دکھاتی ہے تو غذا کا ایک عمدہ حصہ خون بن کر تمام رگوں میں دوڑتا ہے، ایک بے حرکت اور تو بر تو رگ جگر سے دل تک چلی گئی ہے اور خون کے لئے رہ گزر ہو گئی ہے، اس رگ کو اطبا ورید شریانی کہتے ہیں اور خون اسی رستہ سے دل میں آتا ہے، اب حرارت غریزی خون پر اپنا رنگ جماتی ہے اور تصرف کے جوہر دکھاتی ہے، مادۂ قابل پر گہرا اثر پڑتا ہے اور خون سے ایک بخار لطیف پیدا ہوتا ہے، جسے روح حیوانی کہتے ہیں، یہ روح خون پر سوار ہوتی ہے اور شریانوں کے رستے تمام اعضا میں دوڑتی ہے، جب دماغ میں جا کر جوہر دماغ کے ساتھ ہم سنگ اور جگر میں آکر کیفیت جگر کے ساتھ ہم رنگ ہو جاتی ہے تو پہلی صورت میں روح نفسانی کہلاتی ہے اور دوسری صورت میں روح طبعی، اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ ورید اور شریانوں کی نالیاں، وہ رستے ہیں، جن میں خون کی آمد و رفت ہوتی ہے، دل سے جگر تک شریانوں کی پیچ در پیچ راہیں ہیں اور جگر سے دل تک ورید شریانی کا رستہ اسی نکتۂ دل نشین کے لحاظ سے مصنف مرحوم رہ گزر کا لفظ لائے ہیں اور اسم اشارہ اس کے ساتھ بڑھا کر چراغ دکھایا ہے کہ رہ گزر سے وہ مراد لی، جو دل سے جگر تک چلی گئی ہے، گویا اسم اشارہ ایک چراغ جلاتا ہے، رستے میں روشنی پھیلاتا ہے اور عروق شریانی کی پیچ در پیچ راہیں سمجھاتا ہے، اگرچہ غرض یہی ہے کہ غم و اندوہ کے ہاتھوں سینہ پر خون ہو گیا، لیکن مصنف نے کمال کیا ہے کہ عروق شریانی کی رعایت اور سیلان خون کی مناسبت کو نظر انداز نہیں کیا، نزاکت معنے کا طلسم باندھا ہے، رہ گزر کا لفظ لا کر ایک آئینہ اہل نظر کے سامنے رکھ دیا ہے

اور مسئلہ مذکور کی دلفریب صورت دکھائی ہے، اس کے ساتھ جلوۂ گل اور دریائے خون کی ہم رنگی کو بھی نہیں چھوڑا، اپنا مطلب یہاں بھی نکال لیا کہ نزاکت کے بوجھ میں سنگینی اور کلام کے حسن میں رنگینی پیدا ہوگئی، مقصود یہ ہے کہ پہلے بھی شریانی رگوں میں خون دوڑتا تھا اور خون میں سرخی تھی، اب بھی انہی رگوں میں خون دوڑتا ہے اور خون میں سرخی ہے مگر اس وقت اور رنگ تھا، اب اور عالم ہے، آگے وہ بہاریں تھیں کہ اسی سرخی کے سامنے جلوۂ گل ہیچ ہوگیا تھا، اب یہ خزاں آئی کہ اس خون کا حکم بدل گیا۔ حوادث کا انبوہ ہے اور خون کے لباس میں غم واندوہ، شراب لعل اور خون جگر کی ہم رنگی پر خواجہ حافظ اپنے مضمون کی بنیاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

آں بادہ کہ دلہا را از غم دہد آزادی پر خون جگر گردد چوں دور بما افتد

(نکتۂ ثانیہ) پہلے مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے دل و جگر کو ساحل ٹھیرایا اس لئے ظاہری نظر ٹھوکر کھا کر اس خیال پر گر پڑتی ہے کہ دل بھی خون نہیں ہوا، جگر بھی خون نہیں ہوا، خون سے خارج ہوکر دونوں الگ تھلگ کھڑے ہوگئے ہیں، ادھر یہ خشک ہوکر ساحل ہوگیا ہے، ادھر وہ خشک ہوکر ساحل ہوگیا یا اس خیال میں گر پڑتی ہے کہ پہلے دل و جگر میں خون تھا اور خون میں فراوانی تھی، کہ ایک دریا بہتا تھا، اب خون کا ایک قطرہ بھی دل و جگر میں نہیں رہا تو خشک ہوکر ساحل دریا ہوگئے ہیں، یہی سبب ہے کہ میرٹھی شارح کی نظر دل و جگر کی خشکی پر دوڑ گئی کہ ساحل دریا خشک ہوتا ہے اور شعرا خون دل کی کمی کا مضمون بھی باندھتے ہیں، تجلی لاہجانی ؎

نماند از گریۂ بسیار در دل آں قدر خونم کہ گر خواہم بر سم داد خواہاں بر جبیں مالم

لیکن مصنف نے دل و جگر کو اس لئے ساحل نہیں ٹھیرایا کہ دونوں خشک ہوگئے ہیں مصنف کی غرض یہ ہے۔ دل اور جگر اور شریانی رگیں ظروف ہیں اور خون مظروف، ظرف یہاں ساحل دریا ہے اور مظروف دریائے خون، اس لئے دل سے لے کر جگر تک خون میں تم

ہوکر دریائے خون کا ساحل ہوسکتا ہے اور کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی، یوں سمجھو کہ دریائے خون کا ایک کنارہ دل ہے اور دوسرا کنارہ جگر، اس کنارے سے اس کنارے تک، جہاں نظر جاتی ہے، ایک دریائے خون بہتا نظر آتا ہے، جس کی خونخوار موجیں ایک طرف تو دل پر جاکر ٹکراتی ہیں، دوسری طرف جگر کو خون میں نہلاتی ہیں، اس لئے دل بھی خون میں شور بور ہو گیا ہے، جگر بھی خون میں لت پت ہو گیا ہے، غرض دل و جگر دونو خون میں نہا کر خون ہو گئے ہیں، اس پہلو سے اس پہلو تک دریائے خون ہے، اور تمام سینہ پرخوں، یہ ہے مصنف کا مدعا، اور مزید توضیح کے لئے ایک امر قابل التفات ہے اور وہ یہ ہے کہ اظہار درد و مصیبت اور بیان رنج و محنت کے لئے رنگا رنگ محاورے فارسی زبان میں بندھے ہوئے ہیں جیسے:۔ خون در دل افتاد، خون در جگر افتاد، خون در دل افگند، خون در جگر گرفت دل پرخوں، سینۂ پرخوں وغیرہ خواجہ حافظ۔

بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید حافظ ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

چوں سرکشی ز حکم تو اندیشہ کردہ است عرفی خونش فگندہ بیم سنان تو در جگر

اگر نسیم سحر بر ختن گزار کند سلمان ز رشک مشک چہ خونہا کہ در جگر گیرد

ہر دلی کز محبت تو تہی ست ظہیر از جفائے زمانہ پرخوں باد

چہرۂ بدخواہت از اندہ چو آبی باد زرد انوری سینۂ بدگوئے پرخوں از تفکر چوں انار

اسی انداز کے محاورات پر مضمون کی بنیاد یہاں رکھی گئی ہے، اس لئے اگر صرف دل یا جگر یا سینے کی ہی پرخونی پر بیان کا انحصار ہوتا تو بھی مطلب نکل آتا، مگر یہ کیفیت پیدا نہ ہوتی، مبالغے کا رنگ پھیکا پڑتا اور بیان کی شان گھٹ جاتی، اس لئے مصنف نے دل سے لے کر جگر تک تمام اعضاء کو لپیٹ لیا، اس کے بعد پرخونی کے مضمون میں ادا کا پرداز اور بیان کا انداز کوئی معمولی نہیں رکھا، یہاں بھی مبالغے کا زور دکھایا ہے اور خون کا دریا بہا یا، گویا ادھر صدمے پہنچے، ادھر زخم آئے اور جھرنے سے پیدا ہو گئے، خون نکلنے لگا، چشمے ابلنے لگے، آخر یہ حال ہوا کہ دریائے خون کی طغیانی

ہو گئی اور طوفان غم کا فراوانی۔ خواجہ حافظ موج کا لفظ لا کر اسی دریائے خون کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

جائے آنست کہ خون موج زند در دل لعل زیں تغابن کہ خزف می شکند بازارش

(نکتۂ ثالثہ) ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ خون جگر سے دل میں آتا ہے اور دل سے جگر کی طرف جاتا ہے اس لئے روانی خون کے لئے دو جدا جدا رستے فطرۃً بن گئے ہیں، ایک دل سے جگر تک، دوسرا جگر سے دل تک یہ دونو رستے روانی خون کے لحاظ سے برابر ہیں، اور دریائے خون کے لئے ساحل ہو سکتے ہیں اس میں بھی خون کی دوڑ ہے اور اس میں بھی خون کی روانی، اس لئے کیوں کہ پہلے رستے کو دوسرے رستے پر کوئی ترجیح نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ خون کا جنم بھوم جگر ہے کہ یہاں پیدا ہوتا ہے تو تمام اعضاء میں دوڑتا ہے، اسی مقام پر خون کی تقسیم ہوتی ہے اور دل کو بھی ایک حصہ مل جاتا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ روانی خون کا آغاز جگر سے ہوتا ہے، اس لئے دل تا جگر کے بدلے۔ جگر تا دل اگر لاتے اور کسی ڈھب سے پہلے مصرع میں کھپاتے تو بہتر تھا کہ اس کے لئے وجوہ ترجیح موجود ہیں اور اس کے لئے مفقود، لیکن مصنف نے "دل تا جگر" کہا ہے اور اس کے دو سبب ہیں ایک یہ ہے کہ جگر سے نکلنے والی رگیں اوردہ کہلاتی ہیں اور دل سے نکلنے والی شرایئن۔ وریدوں میں خون زیادہ ہوتا ہے اور روح کم، اس لئے اگر وریدِ شریانی میں خون کا دریا بہنے لگے تو کثرت غم اور شدت الم پر مبالغہ آمیز دلالت نہیں ہوتی کہ خون ان رگوں میں زیادہ ہی ہوتا ہے، شریانی رگوں کا حال ایسا نہیں ہے، ان رگوں میں روح زیادہ ہوتی ہے اور خون کم اس لئے جب خون کا دریا یہاں بہتا ہے تو کثرت غم اور شدت الم کا نقش خوب دل پر بیٹھتا ہے اور مبالغہ کا شان کچھ اور ہو جاتی ہے گویا در پردہ یہ مطلب نکلتا ہے کہ غم واندوہ کے ہاتھوں ساری روح تحلیل ہو گئی، شریانی رگوں میں خون ہی خون رہ گیا، اور دریائے مواج بہنے لگا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو فساد اٹھتا ہے دل ہی سے اٹھتا ہے نہ دل ہوتا نہ یہ بلائیں آتیں اور کلیجہ کھاتیں۔ اسی دل سے فتنے کا آغاز ہوتا ہے اور عشق کا سرانجام، اس لئے بانی فساد کو ساحل مذکور کا مبداء ٹھہرایا کہ انکشاف حال ہوا اور بنائے فساد پر دال۔

معاشیات

(از جناب مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر کلیۂ جامعہ عثمانیہ)

قدرت نے انسان کے ساتھ چند ضروریات ایسی وابستہ کردی ہیں کہ بلا ان کو پورا کئے ہوئے ایک منٹ کے لئے بھی وہ چین سے بیٹھ نہیں سکتا، بلکہ بعض ضروریات اس قدر اہم ہیں کہ ان کی طرف سے غافل ہوکر کوئی فرد بشر اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتا، تہذیب یافتہ اقوام کی ضرورتوں سے قطع نظر غذا اور مکان ہی دو ایسی اہم اور اٹل ضرورتیں ہیں کہ وحشی سے وحشی تومیں بھی ان کو رفع کرنے کی دھن میں دن رات متفکر و متجسس رہتی ہیں۔ افراد و اقوام سب کے سب اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اپنی اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے وسائل مہیا کریں اور اپنی اپنی احتیاجات کو بہتر سے بہتر طریقوں سے رفع کریں، علم معیشت میں انہی احتیاجات اور ان کو پورا کرنے کے ذرائع سے بحث کی جاتی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ احتیاجات انسانی کو پورا کرنے کا سب سے بڑا اور بنیادی ذریعہ دولت ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان حصول دولت کے لئے اس قدر جانفشانی کرتا ہے، دولت ہی کی بدولت وہ ان احتیاجات کو پورا کرسکتے ہیں جو قدرت نے ہر فرد بشر کے ساتھ لاحق کردیئے ہیں ماہران معیشت نے آسانی کی غرض سے انسان کے ان تمام کاموں کو جو حصول و استعمال دولت سے متعلق ہوتے ہیں، معاشی جدوجہد کے نام سے تعبیر کیا ہے، لہذا ہم معاشیات کی تعریف یوں کرسکتے ہیں کہ معاشیات وہ علم ہے جو انسان کی تمام معاشی جدوجہد سے بحث کرتا ہے، معاشی جدوجہد سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو دولت سے متعلق ہوں اور دولت اس لئے طلب کی جاتی ہے کہ وہی احتیاجات انسانی کو رفع کرنے کا اساسی ذریعہ ہے۔

معاشیات ایک نہایت ہی نوعمر علم ہے، اس علم کی مجموعی زندگی بمشکل ڈیڑھ سو سال ہے

سب سے پہلا شخص جس نے معاشیات کو ایک مدون علم کی حیثیت سے کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے وہ اسکاٹ لینڈ کا ایک مشہور فلاسفر تھا جس کا نام آدم اسمتھ تھا، اس شخص کی معرکۃ الآرا کتاب دولت اقوام (Wealth of Nations ۱۷۷۶ء) میں شائع ہوئی، نہ صرف انگلستان و یورپ بلکہ تمام دنیا میں علم المعیشت پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے، اسی کتاب سے معاشیات کی ابتدا ہوتی ہے اس زمانہ کے خاص حالات کی وجہ سے یہ کتاب لوگوں میں کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ ہر شخص اس کے مطالعہ کا شوقین نظر آتا تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے خیالات اور ان کی عملی زندگی پر اس کا اثر نمایاں ہونے لگا حتی کہ بہت سے نوجوانوں نے جو علمی مشاغل سے دلچسپی رکھتے تھے، معاشیات کو اپنا خاص مضمون بنایا اور اس طرح اس علم کی رفتار ترقی اور بھی زیادہ تیز ہوگئی، چنانچہ آدم اسمتھ کے بعد مالتھس نے مسئلہ آبادی پر اپنا مشہور مضمون شائع کیا۔ پھر رکارڈو نے مختلف معاشی مضامین پر متعدد کتابیں لکھیں، انگلستان سے باہر امریکہ میں کیری اور فرانس میں بسٹیاٹ نے اس کی طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اس علم کا چرچا ہونے لگا اور جرمنی، آسٹریا اور اٹلی نے بھی بہت سے نامور معاشیین پیدا کئے، زمانۂ موجودہ میں اس علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ کثیر التعداد لوگ مغرب کی مادی ترقی کا راز معاشیات کی ترقی میں مضمر سمجھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم کا ایک ایسا اہم شعبہ، جس کو انسان کی عملی زندگی سے اس قدر قریبی تعلق ہو اور، جس کا انسان کی مادی فلاح و بہبود پر اس قدر گہرا اثر پڑتا ہو، کیا وجہ ہے کہ وہ ایک زمانۂ دراز تک پردۂ لاعلمی میں رہے اور جب ظاہر ہو تو اس پر جابجا اعتراضات کی بوچھار نازل ہو، اور لوگوں کی بے اعتنائی کا شکار رہتا ہے؟ کیونکہ جب آدم اسمتھ اور اس کی ساتھیوں نے اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کیا ہے تو بہت سے نیک طینت علما اس کی مخالفت میں نہایت مستعدی کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے کے لئے تیار ہو گئے، کارلائل اور اسکن جیسے سنجیدہ لوگوں نے علم المعیشت کو سخت سے سخت صلواتیں سنائیں اور اس کی افادی حیثیت کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی، آخر اس کے کیا اسباب تھے؟

سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ قرون اولیٰ کے علماء جسمانی احتیاجات کو نہایت حقارت آمیز نظر سے دیکھتے تھے، مادی مسرتوں کے لئے کوشش کرنا اور خواہشات جسمانی کو پورا کرنے کے لئے اہتمام کرنا ان کے نزدیک نہایت معیوب خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ سقراط کا مقولہ ہے کہ جس قدر انسان کی ضروریات کم ہوں اسی قدر وہ ایک خدائی صفت سے قریب تر ہوگا، ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات معاشیات جیسے علم کی ترقی کے لئے نہایت مایوس کن ہیں، معاشیات جو احتیاجات انسانی کو پورا کرنے کے ذرائع سے بحث کرتا ہے کیسے ان لوگوں کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتا ہے، جنھیں ہر مادی شے سے نفرت ہو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ قرون اولیٰ کے خیالات کے مطابق سوائے کھیتی باڑی کے ہر قسم کی محنت جسم و دماغ کے لئے ضرر رساں اور باعث ذلت خیال کی جاتی تھی اور نظم معاشرت میں دستکاروں کا طبقہ دوسرے تمام طبقوں سے ادنیٰ خیال کیا جاتا تھا، جو لوگ سلطنت کے نظم و نسق میں شریک رہتے یا فوجی نوکری کرتے تھے، ان کی تو کافی آؤ بھگت ہوتی تھی، لیکن جسمانی محنت کرکے روٹی کمانے والوں میں صرف زراعت پیشہ لوگوں کی وقعت ہوتی تھی، ان کے علاوہ جو لوگ دستکاری یا صنعتوں سے اپنا پیٹ پالتے تھے سوسائٹی میں ان کا کوئی رتبہ نہیں تھا اور ان کا طبقہ ادنیٰ ترین طبقہ سمجھا جاتا تھا، مگر معاشیات کا ایک بڑا حصہ اسی طبقہ کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے اسباب سے متعلق ہے، معاشیات کے مطابق مزدور پیشہ طبقے ترقی یافتہ ملک میں آبادی کا ایک نہایت ہی اہم عنصر خیال کئے جاتے ہیں، چنانچہ وہی مزدور جو کسی زمانہ میں ذلیل ترین خلائق سمجھے جاتے تھے، آج ان کا یہ زور ہے کہ وہ اپنے اپنے ممالک کی حکومتوں پر قابض ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس ترقی کا ایک بڑا سبب معاشیات کی ترقی ہے، مگر جن لوگوں کے نزدیک مزدوری کرکے پیٹ پالنا، ایک نہایت ہی ذلیل بات خیال کی جائے تو کیونکر ان میں معاشیات جیسے علم کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے

تیسرا سبب یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں حصول دولت کے دو بڑے ذرائع فتوحات اور محنت جبری خیال کئے جاتے تھے، طاقتور بادشاہ کمزور دشمنوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور جس قدر دولت دشمن کے ملک سے حاصل ہوتی تھی، وہ فتحمند فوج میں تقسیم ہوتی تھی اور اس طرح فاتح ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا تھا، دوسرا ذریعہ ازدیاد دولت کا یہ تھا کہ جنگ میں جس قدر قیدی گرفتار ہوتے تھے، انھیں مجبوراً اپنے فاتح مالکوں کی زمینوں پر

محنت کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح بہت سے لوگ زراعت کی خاطر ہی محنت سے بچ جاتے تھے لیکن فتوحات اور محنت جبری کے ذریعہ دولت حاصل کرنا معاشیات کے مقصد کے بالکل منافی ہے، معاشیات میں تو ان قوانین کی تلاش کی جاتی ہے، جن کی متابعت میں دولت پیدا کی جاتی ہے اور ایک ملک کی دولت کا دوسرے ملک کی دولت سے مبادلہ ہوتا ہے، جس بات کو قرون اولی کے لوگوں نے ازدیاد دولت کا ذریعہ بنا رکھا تھا وہ معاشیات کے نزدیک بجائے ازدیاد کے تخفیف دولت کا باعث ہے ظاہر ہے کہ پیدائش کا کام جس مستعدی کے ساتھ صلح و امن کے زمانے میں جاری رہ سکتا ہے وہ زمانہ جنگ میں اسی طور پر جاری نہیں رہ سکتا۔ غرض زمانۂ قدیم کے لوگوں کا یہ خیال کہ دولت فتوحات اور محنت جبری سے بڑھتی ہے، معاشیات کی ترقی میں سد راہ تھا۔

چوتھا سبب فطرت انسانی کا وہ خاصہ ہے، جس کی وجہ سے لوگ قریب کی چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ جو چیزیں ان سے بعید ہوتی ہیں اور جن سے انھیں دن رات سابقہ نہیں پڑتا، انھیں کی طرف ان کی طبیعتیں زیادہ مائل ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ جن باتوں سے معاشیات میں بحث کی جاتی ہے وہ اکثر وہی ہیں جو شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتی رہتی ہیں اور چونکہ معاشیات میں ہم انسان کی ضروریات زندگی اور ان کو پورا کرنے کی تدابیر سے بحث کرتے ہیں، اور یہ باتیں روزانہ ہمارے تجربہ میں آتی ہیں اس لئے جس قدر قوانین ان کے متعلق تیار کئے جاتے ہیں وہ ہماری نظروں میں ہیچ ہیں۔ برخلاف اس کے جو باتیں ہمارے روزانہ تجربہ کی نہیں ہوتیں، وہ انوکھی اور انسان کو متحیر کرنے والی ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے انسان کا استعجاب بڑھتا ہے، فطرتاً لوگ ان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علم نجوم نے دیگر تمام علوم سے پہلے انسان کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا، معیشت کے مباحث اس قسم کی دلچسپی نہیں پیدا کر سکتے، چونکہ اس میں ہر شخص کے عام تجربہ کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، کسی نے اس کو اس قابل نہیں سمجھا کہ جداگانہ طور پر خصوصیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جائے، البتہ فن اخلاق کی کتابوں میں معاشی خیالات پر سرسری نظر ڈال دی جاتی تھی۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ قرون اولی میں معاشی تعلقات نہ تو اس قدر کثیر تھے اور نہ اس قدر اہم

جس قدر کہ وہ موجودہ زمانے میں ہیں، اور جو کچھ تعلقات موجود بھی تھے، ان میں وہ پیچیدگیاں نہیں پائی جاتی تھیں، جو اس زمانے میں نظر آتی ہیں، نہ تقسیم عمل کا چرچا تھا نہ تجارت کی گرم بازاری تھی، بلکہ ہر خاندان اپنی زندگی کی تقریباً تمام ضروریات خود ہی مہیا کرلیتا تھا، ظاہر ہے کہ ان حالات میں معاشی تعلقات نہ تو تعداد میں بڑھ سکتے تھے اور نہ اس کی کچھ اہمیت لوگوں کو محسوس ہو سکتی تھی۔

معاشیات کی طرف سے بے اعتنائی کے جس قدر اسباب ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ کچھ ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ تقریباً ہر ایک ملک میں وہ معاشیات کی ترقی میں مانع رہے ہیں، جوں جوں یہ اسباب رفع ہوتے گئے، انگلستان میں اور دوسرے یوروپین ممالک میں معاشیات کا چرچا زیادہ ہونے لگا، لوگ اس کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے، سینکڑوں کتابیں ہر سال اس علم پر اور اس کے مختلف حصوں پر شائع ہونے لگیں، حتیٰ کہ آج متفقہ طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ معاشیات کی طرف سے غافل ہو کر نہ کوئی پسماندہ قوم شاہ راہ ترقی پر آسکتی ہے اور نہ کوئی ترقی یافتہ قوم اپنی ترقی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ ہندوستان میں معاشیات کی طرف توجہ نہ ہونے کے کیا خاص اسباب تھے۔

یورپ میں معاشیات کے آغاز و ترقی کا جو زمانہ رہا ہے اگر ہم اسی زمانے کی تاریخ ہند پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں ہندوستان کے سیاسیات کا مطلع نہایت ہی غبار آلود تھا، جب آدم اسمتھ کی کتاب چھپی ہے تو مغلوں کی سلطنت کا زوال شروع ہوئے پچاس سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی، ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، بدامنی ہر طرف بتدریج پھیل رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ غیر ممالک کے باشندوں کا تسلط روز بروز بڑھ رہا تھا، جو لوگ صرف چند سال پیشتر تاجروں کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے، اب وہ بڑی بڑی فوجیں رکھنے لگے اور رفتہ رفتہ ملک کے مختلف حصوں پر قابض ہونے لگے، چونکہ ان لوگوں کا ایک بہت بڑا مقصد اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا، لہذا جیسے جیسے ان کا اثر بڑھتا گیا، انھوں نے اپنے ملک کی مصنوعات کو ترقی دینے کے لئے ہر قسم کے اچھے برے ذرائع استعمال کئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی مصنوعات کے قدم ڈگمگانے لگے، اور اسی وقت سے ان کے زوال کا زمانہ شروع ہو گیا، یہ تنزل یوں تو ابتدا ہی

جاری ہی تھا کہ یکایک دخانی قوت کی ایجاد نے مصنوعات کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا، ہندوستانی مصنوعات جو پہلے ہی سے ناروا مظالم کا شکار ہوتے ہوتے اپنی فوقیت کو کم کر چکی تھیں، اب تو انھیں نئی نئی قسم کی مشینوں سے بنی ہوئی چیزوں کے مقابلہ میں اپنی جان بچانا دشوار ہو گیا، چنانچہ پچیس یا تیس سال کی قلیل مدت میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی تباہی اس قدر مکمل ہو گئی کہ آج دنیا بھر میں ہندوستان محض ایک زراعتی ملک سمجھا جاتا ہے اور صنعت و حرفت کا کوئی ذکر اس کے نام کے ساتھ نہیں آتا۔ اس تباہی کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کی دولتمندی کا خاتمہ ہو گیا، لاکھوں آدمیوں کی روزی کے ذرائع مارے گئے اور افلاس روز بروز ہر ایک طبقہ آبادی میں بڑھتا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی تمام زندگی محض تلاش معاش اور شکم پروری کی فکر میں گزرنے لگی، ظاہر ہے کہ ان حالات میں کیونکر لوگوں کو علوم و فنون کی طرف توجہ ہوتی، جس قوم کے افراد کو قوت لایموت کا حاصل کرنا ہی دشوار ہو، کیسے ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ علوم و فنون کی چھان بین میں اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے میں اپنا وقت صرف کریں، علوم و فنون کا خیال اسی وقت سجھائی دیتا ہے جبکہ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہو، جب شکم پروری ہی سے فرصت نہ ملے اور قلوب کو اطمینان ہی نصیب نہ ہو تو نئے علوم کا سیکھنا تو کجا، خود پرانے علوم کو برسر ترقی رکھنا دشوار ہو جاتا ہے، یہی حال بالکل ہندوستان کا ہے، گذشتہ ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اہل ہندوستان کے لئے اس قدر مصائب و آفات کا زمانہ رہا ہے کہ علوم و فنون کی طرف متوجہ ہونے کا انھیں کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، جب وہ خود اپنے پرانے علوم کو زندہ نہیں رکھ سکتے تھے تو کیونکر ان سے یہ ممکن تھا کہ معاشیات یا کسی اور نئے علم کو سیکھتے اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔

لیکن جس طرح ہر عروج کو زوال ہے، اسی طرح ہر زوال کی بھی ایک حد ہوتی ہے، خدا کو یہ منظور نہیں تھا کہ ایک ایسا وسیع ملک جو بجائے خود ایک براعظم سمجھا جاتا ہے، بالکل تباہ و برباد ہو جائے اور اس کی کروڑوں کی آبادی بالکل صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائے، یا ہمیشہ کے لئے محض غلامانہ زندگی بسر کرے، چنانچہ ہندوستان میں چند افراد ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کی حالت زار کو محسوس کیا، اور اپنی خداداد قابلیت و ذہانت سے مدد لے کر ایسی تدابیر سوچنے اور اختیار کرنے لگے، جن کے ذریعے سے اہل ملک میں بیداری پیدا ہو سکے، وہ اپنی پستی کو محسوس کر سکیں اور اپنے آپ کو اس حالت سے نکالنے کے لئے

کوشاں ہوں، یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہندؤں میں انڈین نیشنل کانگرس کا آغاز ہوا اور اس کے کئی سال بعد مسلمانوں نے اپنی ایک مسلم لیگ قائم کی اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے خاص طور پر اور تمام ملک کی بہتری کے لئے عام طور پر کوشش کرنی شروع کی، تعلیم گو کیسی ہی ناقص سہی رفتہ رفتہ پھیلنے لگی، متعدد لوگ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ممالک یورپ کو جانے لگے اور اس طرح انھیں اپنے وطن کے حالات کو ممالک غیر سے مقابلہ کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آنے لگا، خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان مجالس نے شروع ہی سے معاشیات کی اہمیت کو خوب محسوس کر لیا، اور کبھی اس کی طرف سے بے اعتنائی نہیں کی چنانچہ اگر ہم کانگرس کی تحریکات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو کسی نہ کسی معاشی مسئلہ پر حکومت کی توجہ منعطف کرانے کے لئے بغلبہ آرا منظور کی گئی ہیں، اور بھی زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ معاشیات کی انتہائی اہمیت کو محسوس کر کے ہندوستانیوں نے ایک علحدہ معاشی کانفرنس قائم کی ہے جہاں سے ایک رسالہ خاص ہندوستان کے معاشی حالات پر لوگوں کو بحث مباحثہ کا موقع دینے کے لئے شائع کیا جاتا ہے ریاست میسور میں بھی ایک معاشی کانفرنس قائم ہے جو بہت سے مفید کام کر رہی ہے، کیا اچھا ہو کہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ اشخاص بھی ان مثالوں سے سبق لے کر ایک معاشی کانفرنس کی بنا ڈالیں، جو باشندگان ریاست حیدرآباد کی مادی فلاح و بہبودی کے لئے کار ہائے نمایاں انجام دے۔[1]

اس کے علاوہ اب ہر ایک ہندوستانی یونیورسٹی کی یہ کوشش ہے کہ معاشیات کے لئے خاص طور پر ایک علحدہ ڈپارٹمنٹ قائم کیا جائے، اس تعلیم کا خاص طور پر اہتمام ہو، اور ملک کی معاشی تحقیقات کا کام سرعت کے ساتھ جاری ہو، معاشیات کے متعلمین سے بالخصوص ہمیں یہ توقع ہے کہ وہ معاشیات کا مطالعہ محض امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے نہ کریں گے، بلکہ اس کو اپنی آئندہ زندگی میں بھی کم و بیش جاری رکھیں گے تاکہ ملک میں، جو معاشی مسائل وقتاً فوقتاً درپیش ہوتے ہیں، انھیں وہ اچھی طور پر سمجھ سکیں اور اپنی کوئی ذاتی رائے قائم کر سکیں، ظاہر ہے کہ ملک کے نظم و نسق کا کام آئندہ انہی کے سپرد ہوگا، اس وقت وہ محسوس کریں گے کہ معاشیات کا جاننا اپنے فرائض کو بخوبی انجام دینے کے لئے کس قدر ضروری ہے۔

---

[1] حیدرآباد اکنومکل کانفرنس نے ایک حد تک اس شکایت کو رفع کر دیا ہے۔ (ترقی)

مقدمۂ دیوان جان صاحب

از جناب مصور الملک آغا حیدر حسن صاحب دہلوی (علیگ)

دنیا کی تمام زبانوں میں، اردو ہی وہ زبان ہے، جس میں ہم کو مونچھوں والی صنف سے علیحدہ، ایک خاص نہج کی بیگماتی زبان نظر آتی ہے،

امثال اور کہاوتیں، جو زبان کی جان ہیں، صنف نازک ہی کی تراوش طبع کی رہین منت ہیں۔ بیگماتی زبان کی لطافت سمجھئے یا دلآویزی کہ، صنف کرخت نے باوجود شان مردانہ اس کو صرف حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی، بلکہ اس میں وہ ایسی یادگاریں چھوڑ گئے کہ ان پہ ناواقف، عورت ہونے کا گمان کرتے ہیں۔

اس رنگ میں ہندوستان کے جو شعرا رنگین نظر آتے ہیں، ان میں خاص طور پر "جان صاحب"، بہت معروف ہیں، اس غریب مگر بے مثل شاعر کے کلام سے اخلاق کے پردہ میں، جو بے اعتنائی کی گئی، وہ حقیقت میں اس شاعر پر ایسا ظلم ہے، جو اردو کے ہمدردوں کے لئے کسی طرح جائز نہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ جان صاحب کا کلام عریاں اور بیحد عریاں ہے، مگر کیا ہمارے لئے صرف اس وجہ سے کہ ان کا کلام بعض جگہ عریاں ہے، ان کی اچھی باتوں سے بھی اعراض مناسب ہے؟

"خُذْ مَا صَفَا" والے انمول قول کا فلسفہ اگر پیش نظر رہتا، تو کیا بجائے جان صاحب کے کلام سے کسی اچھی بات کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا؟

جہاں تک ہم کو معلوم ہے آج تک جان صاحب کے دیوان پر کسی سلیم المذاق نے تنقیدی نظر ڈال کر اسے منظر عام پر نمایاں نہیں کیا، اسی لئے سب سے پہلے مولوی نظامی صاحب بدایونی اڈیٹر "ذوالقرنین" بدایوں بہ حیثیت شائع کنندۂ دیوان مستحق شکریہ ہیں، مگر اس سے بھی زیادہ مولوی صاحب موصوف کے

آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کو مقدمہ لکھنے کے لئے منتخب کر کے خود کو اور ان کو شکور کر دیا ہے۔

آغا حیدر حسن صاحب خاص دہلی کے باشندے ہیں، اور ان کے بزرگوں کو قلعے سے بہت کچھ تعلق رہا ہے، یوں تو، ان کے ادبی مشاغل، جہاں تک ہمارے علم میں ہیں، نہایت قابل قدر اور قیمتی ہیں۔ مگر دیوان جان صاحب پر ان کا مقدمہ لکھنا، اور خاص بیگماتی زبان میں لکھنا اور اس طرح لکھنا کہ جس سے خود جان صاحب کا کلام بھی خالی ہو، ان کا ایک بڑا کارنامہ اور قابلِ ستائش و مبارک باد ہے۔

پیرایۂ بیان، انداز ادا، کی والا دیری اور پاکیزگی کا تو کیا کہنا کہ بات بات میں نبات کا مزا آتا ہے، اگر سب سے زیادہ جو بات قابل قدر ہے، وہ قدیم معاشرت، رسم و رواج، اور اس وقت کی سیاسی، علمی، تمدنی تاریخ ہے، جو جان صاحب کی شرح کرتے ہوئے۔ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آج سے پہلے ہم نے اس کو اس انداز میں نہ دیکھا تھا، یوں بھی ایک ریختی کے شاعر کے کلام پر اس قسم کی زنانہ زبان میں تبصرہ زبان اردو کی تاریخ میں بالکل نئی بات ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ جان صاحب کے خیالات کا موازنہ یونانی شاعرہ "سیفو" کے خیالات سے کیا گیا ہے اور یورپ کے اکثر شعرا کنایتہً اس ضمن میں آ گئے ہیں۔

ہم آغا صاحب کی اس عنایت کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ دلچسپ مقدمہ چھاپنے کی ہمیں اجازت دی، اور امید کرتے ہیں کہ ترقی کے ساتھ ان کی یہ ہمدردی اسی طرح جاری رہے گی۔

(ترقی)

(۱)

ہز اکسلنسی نواب میر یوسف علی خاں بہادر (سالار جنگ)، مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ)، حافظ جلیل حسن صاحب جلیل (فصاحت جنگ) مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی (اختر یار جنگ) ناظم امور مذہبی، حضرت ولایت حسین خاں صاحب برجیس (شاگرد میر نفیس) مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر نظام کالج مستحق شکریہ ہیں، ہز اکسلنسی نواب سالار جنگ بہادر نے اپنے کتب خانہ سے استفادہ کی اجازت دی، نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر الصدور امور مذہبی نے مفید مشورہ دیا، اور اس ہیبت کو دور کیا ہو کہ عام طور سے دیوان جان صاحب کی طرف سے ریاکار نوجوانوں کے دلوں

بیٹھی ہوی ہے۔ نواب فصاحت جنگ بہادر نے، جان صاحب کے دوستوں کی زبانی سنی، چند روایات بیان فرمائیں، میرے ایک محترم شفیق نے جو اپنا نام کسی خاص مصلحت سے نہیں ظاہر کرانا چاہتے، باوجود اپنی مصروفیتوں کے "دی تاسی" کے فرانسیسی تذکرہ میں سے جان صاحب کا حال انگریزی میں ترجمہ کر دیا، نواب اختریار جنگ بہادر نے، جو دو ایک مشاعروں میں جان صاحب کو پڑھتے سنا تھا، اس کا چشم دید حال سنایا، اور اپنے کتب خانہ سے ایک نسخہ "دیوان جان صاحب" مطبوعہ مطبع "یلینی صاحب" مستعار دیا، حضرت برجیس صاحب نے، جو جان صاحب کے ہم عصر ہیں اور اکثر مشاعروں میں جان صاحب کو سنا ہے، سترہ بہتّرہ ہونے کے عذر کو پیش کر کے چند باتیں یاد پر زور ڈال جان صاحب کے متعلق بتائیں، اور مرزا حسین علی خاں کے انگریزی کتب خانہ کو میں نے اپنا سمجھ کر ان کی موجودگی، اور غیر موجودگی میں استعمال کیا، ان کا، انگریزی جدید ادب کے متعلق کتب خانہ ان کی خوش مذاقی کی دلیل ہے اور پڑھنے کے قابل کتابیں اس میں مل سکتی ہیں۔

(۲)

مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی مدیر "ذوالقرنین" بدایون نے "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کو مجھ پر صحیح کر دکھایا، بڑے بڑھاوے چڑھاوے کے خط لکھے، کہ میر یار علی جان صاحب کے دیوان پر مقدمہ لکھوں۔ حیران، کہ الٰہی کیا کروں، مقدمہ کو چاہیئے وقوف، جان صاحب کے نام سے تو ہر ایک آشنا، لیکن بڈھوں بڈھوں سے پوچھو، تو یہ کوئی نہ بتا سکے، کہ جان صاحب سے خود ملا، اور پڑھتے سنا، زیادہ سے زیادہ کوئی پینتیس چھتیس ہی برس، جان صاحب کو مرے ہوے ہوں گے۔ کہ ان کے متعلق، عجیب و غریب روائتیں مشہور ہوگئیں، کوئی کہتا ہے کہ، میرٹھ کے رہنے والے تھے، کسی نے کہا فرخ آباد کے، کوئی لکھنؤ کا بتاتا ہے۔ "دی تاسی"، تو ان کے کلام سے اتنا متاثر ہوا، کہ اس نے تو ان کو "میر امّن" کی بیٹی ہی بنا دیا، اور نواب عاشور علی خاں بہادر کی شاگردی کا جوا رکھ، بیچاری بچی کو، فارسی کی گلستاں، بوستاں اور بہار دانش، پڑھوا کے شعر شاعری کے ڈھچرے پر لا ڈالا، میر امّن کے حوالہ پر سارا زور باندھا، اسی فرانسیسی تذکرہ نے، یورپ میں بچارے "میر یار علی" کو اپنے

مردوں سے عورت مشہور کرادیا، کہ جب ہیولاک ایلس نے صنفیات پر، کتابیں لکھیں، تو ہم صنفی الفت میں غریب جان صاحب کو پیش کیا، اور ان ہوئی باتوں کا الزام، اس کے سر دھرا، مولوی نظامی صاحب نے بڑی پخ یہ لگادی، کہ مقدمہ بیگماتی زبان میں ہو، مجھے فکر ہوئی، کہ عورتوں کی بولی میں لکھا جائے تو پہلے فسانہ کی صورت، اختیار کی جائے، اور ایک عورت، اس میں ایسی لائی جائے، جو بڑی چترنگانی پڑھی لکھی، عالمہ، فاضلہ ہو اور وہ سب حال، جان صاحب کا بیان کرے، اپنی زبان اس کے منہ میں دوں، اور رتی رتی، پوچھ لوں، لیکن اس سے مجھے گھن آئی، آخر اللہ توکلی یوں ہی لکھنا شروع کردیا، خدا کرے سب کو بھائے، جو میری محنت سپھل ہو۔

(۳)

اللہ میاں میرے کیسے اچھے ہیں، کہ نبی جی کی امت میں پیدا کیا، اور کرشن جی کی محبت دل میں ڈالی، صدقے اپنے نبی جی کے، جس نے کسی سے محبت کرنے کو نہ ٹوکا، اور پڑھنے لکھنے کی وہ قدر کی، کہ "چین تک علم کی خاطر جانے کی صلاح دی" اللہ میاں کی سب چیزیں اچھی ہیں برا ہے تو اپنا آپا یہ اچھوں سے برا ہو جائے، اور بروں سے اچھا، کسی چیز کو برا کہیں، ہمارا کیا منہ، شاعروں کو کوئی اچھا کہتا ہے کوئی برا۔ اچھے ہوں یا برے، ان کے اعمال ان کے ساتھ، اس کا بھید تو اللہ ہی جانے لیکن بات تو یہ ضرور ہے، کہ ہوتے یہ بچارے بھولے ہیں، دنیا والے، واہ واہ ہی کر کے، ان نگوڑوں کا پیٹ بھر دیتے ہیں، بھوک لگتی ہے تو چلاتے ہیں زمانے کی شکایت کرتے ہیں، امیروں کی ڈیوڑھی کی، نیوتک کی مٹی بک بک کے چاٹ جاتے ہیں، کسی نے ذرا ڈھورا دے دیا، لے مگن ہو بیٹھ رہے۔ کھایا اڑایا، پھر آن موجود، بڑا ہو یا چھوٹا، پیٹ سب کے ساتھ لگا ہے، بیسیوں، یہی رونا روتے مرگئے، اور بوتھ پورا نہ ہوا، میر یار علی، جن کا تخلص "جان صاحب" ہے، ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے، جب کہ لکھنؤ میں عیش عشرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب کسی قوم کی تہذیب عروج پر پہنچ جاتی ہے، اور پھر ہوتا ہے، اس کا زوال شروع، تو مردوں میں رنگینی اور بانکپن، وضع داری، زیادہ آجاتی ہے، مرد عورت کون ایسا ملک، یا قوم ہے، جن میں نہ ہوتے ہوں۔ اور جہاں مردوں میں زیادہ حسن، اور عورتوں میں

زیادہ دلربائی، نہ پائی جاتی ہو۔ عورت کی بات چیت میں وہ نمائی، موہنی ہوتی ہے، کہ بڑے، بڑے سورما، عزانٹ، مردوُدں کو موہ لیتی ہے، لیکن چوٹی کا شرف، تو اللہ میاں نے اردو بولنے والیوں ہی کو دیا ہے۔ ان کی زبان، میٹھی، مثال انوکھی، خیال اچھوتے، مردوُں کی تو باہر[1] والوں میں کٹتی ہے، ان کی، نو بوان میں رس، بس جاتی ہے لیکن عورتیں پردے کے کوٹ میں، ایسی اللہ کی حفاظت میں ہیں، کہ ان تک برائیوں کی رسائی، نہیں۔ ان کی زبان باہر والوں کے حملے سے محفوظ رہتی ہے، اردو میں شاعری، سینکڑوں برس سے ہوتی آئی ہے لیکن عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں، ایک مردوے نے، اپنے آپ کو رنگین کر، پردے والیوں کی بہت سی باتیں چرا، مردوُدں میں آشکارا کیں، مرزا حیرت نے چراغ دہلی میں، اس کی ایجاد کا سہرا، میر محمدی مائل کے سر باندھا ہے، جس کو غلطی سے سوز لکھ گئے ہیں، انشا، تو بلا کا شوخ تھا ہی، اس نے بھی بہتری پھیرا اوڑائیں راحت، مرزا علی بیگ نازنین اور بیسیوں پل پڑے، اور جان صاحب، تو موا ہاتھ ہی دھو کے پیچھے پڑگیا، وہ وہ نکھان بکھانے اور ان کہنی کہہ گیا، کہ سنتے، تراہ تراہ پکارتے تھے لکھنو سے شہر میں، جہاں جہان کا آدمی بھرا پڑا تھا، اور کسی نہ کسی سرکار سے متوسل تھا، جان صاحب بدنصیب کی بُری ہی کٹی، یہ نہیں کہ میر یار علی جان صاحب، غیر مشہور رہو، کوئی نہ جانتا ہو، ۱۲۶۲ھ م ۱۸۴۵ء میں پہلا دیوان چھپ چکا تھا، سارے ہندوستان میں، شہرت ہو چکی تھی، لیکن سرکار دربار سے کوئی، راتب روزینہ مقرر نہ ہوا، علامہ گارڈن دی تاسی، جس نے اردو کے شاعروں کا تذکرہ اپنی زبان فرانسیسی میں لکھا ہے، اس نے تو بچارے جان صاحب سے، بھوپال اور اورنگ آباد کے پتھر ڈھوائے ہیں، لالہ سری رام نے ۱۲۶۴ھ م ۱۸۴۷ء اپنے خمخانۂ جاوید میں تلاش معاش کے لئے، دلی کھینچ بلوایا، اور پھر بھوپال بھجوایا، لیکن قسمت سب جگہ ساتھ رہی، ہر پھر کے پھر لکھنو، پہنچے۔ جہاں جائے بھوکا، وہیں پڑے سوکھا لکھنو کی شاہی، سیلاب پر چڑھی، تباہی آئی، لکھنو کا آخری، تاجدار، نواب واجد علی شاہ تھا، نواب کی رنگ رلیاں مشہور خاص و عام ہیں، نواب عجب تو ن کا ایسا شیدا تھا، کہ فنا فی النسا ہو کر رہ گیا، کہنے والے، کہتے ہیں کہ جب معزولی کا حکم آیا، تو نواب

---

[1] باہر والا گنوار۔ بدتمیز بدلی کی تفصیل ہے جو باہر پیدا ہوا ہو، وہ باہر والا ہے، یونانیوں کا باربیرین اور دلی والوں کا باہر والا ایک ہی

چھپر کھٹ میں زچہ بنا پڑا تھا، حکم دیکھ، دھارم دھار رونے لگا، ارے صاحبو! تین دن کی کچی زچہ پہ بھی، یہ ستم ٹوٹتے سنے ہیں، سلطنت کی تباہی، اور اپنے گھر کی بربادی نے، دکھتے دل سے یہ بول نکلوا ہی دئے، "ئیں تو دیتی ہوں پنجتن کی دوہائی، موری لوٹ لئی نکھلئو نگری" جو نواب، خود اس فن میں کامل ہو، وہ بچارے جان صاحب کی خبر نہ لے، اس کو کرموں کا کھوٹ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

جان صاحب کا پہلا دیوان، جو ۱۲۶۲ھ میں چھپا ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے، انقلاب سے پہلے جو لکھنو کی تہذیب و معاشرت تھی، اس پر کافی روشنی پڑتی ہے اس زمانہ میں یہ یہ دیسی کپڑا لکھنو میں پہنا جاتا تھا، پھولام، محمودی، شبنم، آب رواں، تن زیب، تانڈا، جامدانی، شربتی، شفق، قلندری، مومی چھینٹ، رادھا نگری، گلبدن، کمخواب، مشجر، چارخانہ، نینون، زمین سکھ، گاڑھا، اور گزی، ولایتی کپڑا بھی لوگ پہنے لگے تھے، جیسے گاچ، کامیٹ، لنکلاٹ، اور ململ راز لکھنو کے دو تین نواب، فرنگیت میں بہت بڑھے چڑھے تھے، نصیرالدین حیدر کو فرنگی سجاوٹ آرائش و زیبائش کا، بڑا زعم تھا، فرنگی کافر کرتی[1] پہنتا، حرم میں جو حصیں، ناسوتیں، سریتیں حرمیں اکثر فرنگنیں تھیں، جب سر کے سردھرے کا یہ حال ہو، تو رعیت تو جو نہ کھل کھیلے تھوڑے ہیں، جان صاحب، اپنے رسم و رواج، اور اپنی تہذیب و معاشرت کی، پائمالی دیکھ دیکھ کر، پیچ و تاب کھاتا، اور جوں جوں، فرنگی لکھنو میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے، دل ہی دل کو ٹکوں سے لوٹتا ایک جگہ تنک کے کہتا ہے :۔

کلو[2] نظر آنے لگے، اب لاکھوں ہی گورے در گور ہوا، لکھنو کمپو سے زیادہ

اکثر مسلمان رئیس، گھروں میں، فرنگنیں ڈالنے لگے، بھلا جان صاحب سے، اس للموئی ڈائین کی سوتیا ڈاہ، کب سہی جاتی، جل کے کہتے ہیں :۔

مجھ کو تو ڈالا گھر میں، فرنگن سے ہو مرید مسجد بنائی آپ نے، گرجا کے سامنے

جان صاحب، گل بدن ہنگی کے برکے پائچوں کا پائجامہ، گھتیلی جوتی، شربتی محمودی، تن زیب کا

---

[1] کافر کرتی = فرنگی لباس، سوٹ [2] کلو = بواؤ مجہول اسم عورت اور بواؤ معروف اسم مرد۔

انگرکھا پہنتے تھے، اور ٹانڈے کی جامدانی کی، تیج گوشیہ ٹوپی اوڑھتے، اس بچارے کو، یہ اونی ٹاٹ کی کا فرکرتی، کب خوش آتی، کیونکہ نواب کے ساتھ اس کے اکثر مصاحب فرنگی، چپکوان چست وردی پہننے لگے تھے، کسی نے سچ کہا ہے کہ:۔ "آدمی کو دیکھ آدمی ڈھنگ پکڑے، خربوزے کو دیکھ، خربوزہ رنگ پکڑے"۔

جان صاحب سے نہ دیکھا گیا کہ اچھی خاصی صورت بھلے مانسوں کی سی، ہوا بنالی، تو کہتے ہیں:۔

پہن کے کپڑے انگریزی میاں خوشرو نکلتے ہیں — نئے موتی محل سے، بن کے اب لو لو نکلتے ہیں

حویلیوں میں، جب لال منہ کی فرنگنیں گھسنے لگیں "اسیکھ پڑوسن مجھ سی ہو" تو ان کی دیکھا دیکھی اچھی بھلی بیویاں، محرم کرتیاں چھوڑ، جاکٹیں اور فرنگی تراش کی کرتیاں وغیرہ پہننے لگیں، بناؤ سنگار، مانگ پٹی میں بھی، فرنگیت کا عمل دخل ہوا، "کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا" جان صاحب کی فرنگی بیزاری نے اس لباس کے ملبوسوں کو، بی شادی بنا دکھا دیا، کہتے ہیں:۔

کپڑا انگریزی نہ میں پہنونگی، موتی خانم — ماں جو لولو ہو تو، کیا بیٹی بھی لولو ہو جائے

محل دو محلے، حویلیاں، بارہ دریاں، چھوڑ چھاڑ کے، الوخصلت لوگ، کوٹھوں، بنگلوں میں، فرنگیوں کی طرح جنگل ویرانوں میں جا رہنے لگے، نئی نئی فرنگی معاشرت جو اختیار کی تھی، تو فرنگیوں سے اس کے لوازمات سیکھنے کے لئے ان میں گھستے، اور اپنا قبلہ و کعبہ سمجھتے، بھلا جان صاحب کو یہ گورے نجات کے بورے، کالوں، اللہ کے پیاروں کے مقابلہ میں کب بھاتے، تو جو لوگ، چھاونیوں میں، نئی کوٹھیاں بنا کے رہنے لگے تھے، ان پہ چوٹ کرتے ہیں:۔

جا کے کیمپو میں بھی اک گورے کے یں پاس رہی — وہ نہ تھا اس میں مزا، جو کہ ملا کالوں سے

دیس پرستی کا یہ عالم تھا جو ان کے اکثر اشعار سے ظاہر ہو چکا۔ کہ کس قدر سودیشی کے جان صاحب حامی تھے، اس زمانے میں، جب کہ نہ مہاتما گاندھی جی تھے، اور نہ لالہ لاجپت مہاراج۔

ہندو مسلم اتحاد پر، جان صاحب کا یہ شعر دال ہے:۔

گو آبرو مزا کی ہے، گنگو سے زیادہ — اسلام ہے رغبت مجھے ہندو سے زیادہ

اب کہو کہ نفس واقعہ بیان کرتے ہوئے، پھر ہندو کی محبت کا دم بھر لیا۔ ان کو، نہ تو سر جینی نائیڈو نے سکھایا، اور نہ میاں محمد علی شوکت علی ہی سکھانے گئے اگر جان صاحب آج کو زندہ ہوتے تو قومیات میں ان کو اونچی کرسی ملتی کیونکہ وہ ابھی سے پہلے ہی عدم تعاون کے حامیوں کو نصیحت کر گئے، دیکھو خبردار، تم معافی مانگ کر، قومی تحریک کو خاک میں نہ ملانا۔

کیوں پاؤں پہ سر رکھتے ہو، تم ہاتھ نہ جوڑو کولھا، اجی کیا کاٹے گی، سرکار تمہارا

پھر غیرت دلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ " تھالی کے بیگن نہ بننا، کہ کبھی حُر اور کبھی استبداد دی' کبھی پہنی کھادی اور کبھی جی حضوری' مستقل مزاجی کی تعلیم دیتے ہیں :۔

جب اوکھلی میں سر دیا، دھمکوں سے کیا ہے ڈر سب کو خدا دے . جیسا دیا ہے جگر مجھے

ایسا نہ ہو کہ قید خانے، جرمانے اور قچیوں سے ڈر جاؤ، بہت سی جگہ، اپنے زمانے کی نذر و نیاز کا تذکرہ کیا ہے، جاگتی نوبت کا کونڈا، ایسے موقع پر کیا جاتا کہ جب کوئی اپنا پیارا کہیں چلا جاتا تو اس کے اصل خیر سے سلامتی کے ساتھ واپس آنے کی منت مانتے، اور رت جگا کر کے، کونڈا بھر کے نیاز دلاتے تھے، اسی کو جان صاحب کہتے ہیں :۔

آ ملا، بچھڑا سجن، مانا تھا میں نے بیگما ، سونہ جانا، جاگتی نوبت کل ہے کونڈا کیا،

سید جلال کے بھی کونڈے بھرے جاتے تھے، اس کا پتہ جان صاحب یوں دیتے ہیں :۔

ہمسائی مرے سر کی قسم، آئیو ضرور کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا

جب فال میں بدفالی ہوتی، تو بی راسا کے نام کا چھلہ دھو کے اٹھایا جاتا، اس سے شاید نیک فالی کا شگون لیتے ہوں گے، جان صاحب نے اسے اس طرح بتایا ہے :۔

نکلے ہے کھوٹ شیخ کی گر فال میں بوا چھلہ اٹھاؤ دھو کے بی راسا کے نام کا

جس کسی کی چیز چوری چلی جاتی، اور ملنے کی کوئی صورت نہ ہوتی، چرانے والا ہوتا پکا چور کہ کسی عنوان چیز نہ اگلتا، تو جس کی چیز چوری جاتی، وہ بروں کی جان پہ صبر کر کے اللہ کے گھر میں چرانے والے کا نام لے کر، اس کے نام کی اینٹ، الٹ کر رکھ دیتا، اور یہ عقیدہ رکھتا، کہ چرانے والے کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی، جان صاحب اپنی ہمسائی کی جان پر صبر کر کے، اپنی دوگانا سے کہتے ہیں :۔

رکھیں ہمسائی مرا مال چرا کے، گھر میں اینٹ الٹوں گی دوگانا، میں خدا کے گھر میں

(باقی آئندہ)

حجاز کے فرنگی سیّاح

(از جناب مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر مترجم حیدرآباد ہائیکورٹ)

بسلسلہ گزشتہ

(۲)

جوزف پٹس ساکن اکزیٹر

دوسرا یورپین سیاح جس نے مسلمانوں کے متبرک شہروں کی سیر کی، وہ جوزف پٹس ساکن اکزیٹر[1] ہے یہ سب سے پہلا انگریز ہے جو ۱۶۹۲ء میں مکہ تشریف گیا، پٹس ۱۶۷۸ء میں جب اس کی عمر پندرہ برس کی تھی، جہاز رانی سیکھنے اور مختلف شہروں کی سیر کرنے کی غرض سے اپنے والدین کے پاس سے بھاگ گیا تھا اور اپنے وطن کے قریب مقام توپ شام[2] میں ایک جہاز پر نوکر ہو گیا تھا، الجزائر[3] کے بحری قزاقوں نے اس جہاز کو لوٹ لیا، اور تمام جہاز رانوں کو قید کر کے غلامی میں بیچ دیا، پٹس کئی سال تک غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مغربی[4] قافلے کے ہمراہ اپنے مالک مسمی عمر کے ساتھ اسکندریہ و قاہرہ و سوئز کی راہ سے جدہ ہوتا ہوا، ماہ رمضان میں مکے پہنچا اور چار مہینے وہاں قیام کر کے اسی قافلے کے ساتھ الجزائر واپس چلا گیا بقول پٹس کے اس کا مالک جو ایک سالہ کا کپتان تھا بہت ہی ظالم، بدکار و قاتل تھا، گزشتہ گناہوں کے

---

[1] انگلستان کے صوبہ ڈیون شائر کا پایہ تخت ہے، دریائے اگز پر واقع ہے، کسی زمانہ میں اچھی تجارت گاہ تھی۔

[2] دریائے اگز سے چار میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے یہاں جہاز سازی کا کارخانہ ہے۔

[3] الجزائر افریقہ کے ملک الجیریا کا پایہ تخت ہے، یہ ملک کئی سو برس تک ترکوں کی سلطنت کا ایک جزو رہا ہے، اس کا کل رقبہ ۱۲۵۰۰۰ مربع میل ہے، ۱۸۳۰ء میں اس علاقہ کو فرانسیسیوں نے جیت لیا، الجزائر بحر روم کے کنارے واقع ہے اس کی مردم شماری تخمیناً دو لاکھ ہے، یہاں کا فرانسیسی پارلیمنٹ نہایت خوشنما عمارت ہے، جو ساٹھ ستر لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی ہے آبادی زیادہ عربوں اور یہودیوں کی ہے۔

[4] طرابلس والجیریا کے رہنے والے مغربی کہلاتے ہیں۔

کفارہ کے لئے اس نے اس عیسائی غلام کو مسلمان کرنے کا ارادہ کیا اور آخر بڑی سختی سے اس نے اسے کلمہ پڑھوایا[1] اس کے بعد باقاعدہ طور پر اس کے ختنہ کرائے گئے، پٹس بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اس نے اپنا عقیدہ وہی رکھا تھا، وہ چھپ چھپا کر کبھی کبھی انجیل پڑھا کرتا تھا اور تجدید و تحفظ مذہب عیسوی کے لئے سور کا گوشت کھا لیا کرتا تھا، مسلمانوں سے نفرت رکھتا تھا اور آنحضرت صلعم کی شان میں بے ادبی کیا کرتا تھا، پٹس کو اپنے ایک ہم وطن شخص کی طرف سے بڑا رنج تھا وہ اپنے وطن کو جا کر دوبارہ الجزائر واپس آگیا تھا، اور بغیر جبر و اکراہ کے نہایت خوشی کے ساتھ مسلمان ہو گیا تھا۔

پٹس کے مالک نے جس کو وہ اپنا دوسرا باپ لکھتا ہے، کے ہیچ کر اس کو غلامی سے آزاد کر دیا تھا، اور کچھ تنخواہ مقرر کر کے اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا، پٹس اگرچہ اپنے مالک کے پاس رہا کرتا تھا، مگر بھاگنے کی فکر سے غافل نہ تھا، ان ہی دنوں میں سلطان ٹرکی نے الجزائر سے کچھ جہاز طلب کئے تھے، مسٹر بیکر الجزائر کے انگریزی کونسل نے پٹس کو خفیہ طور پر کسی جہاز میں بٹھا دیا، اور ایک خط مسٹر شے سمرنا[2] کے انگریزی کونسل کے نام اس مضمون کا لکھ کر اس کو دے دیا کہ:۔

> "جوزف پٹس انگلستان کا باشندہ ہے، پہلے مسلمان ہو گیا تھا، اب پھر عیسائی ہو گیا ہے اور اپنے وطن جانا چاہتا ہے، مہربانی کر کے نہایت ہوشیاری سے اس کو انگلستان چلتا کر دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بھانڈا پھوٹ جائے ورنہ میری شامت آجائے گی، میرے ہاتھ پاؤں کاٹ کر میری لاش جلا دیں گے"[3]

---

[1] اس طرح کسی کو مسلمان کرنا مذہب اسلام کے احکام کے قطعی خلاف ہے، جیسا کہ ارشاد ہو چکا ہے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین یعنی دین میں زبردستی نہیں کرنی چاہئے

[2] سمرنا سلطنت ترکی کا ایشائے کوچک میں ایک مشہور بندرگاہ اور شہر ہے، یہ بحر اسود کے مغربی ساحل کی جانب ایک خوشنما خلیج کے سرے پر آباد ہے، اور ایشائے کوچک کے تمام شہروں میں بلحاظ خوشنمائی و اہمیت و آبادی وغیرہ اول نمبر ہے، ۱۹۲۲ء کی گزشتہ جنگ ٹرکی و یونان نے اس کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا ہے، اور اس کے نام سے تعارف کرانے کی کچھ زیادہ حاجت نہیں ہے، قبل جنگ سمرنا بڑی تجارت گاہ تھا، ۱۹۱۴ء کی یورپ کی جنگ عظیم کے بعد جو چھ سال تک ہوتی رہی، یورپ کی دول عظمی نے سمرنا یونان کو دے دیا تھا، آخر غازی مصطفی کمال پاشا نے بڑی خونریز جنگ کے بعد یونانیوں سے ۱۹۲۲ء میں واپس لیا، ترکوں کی تسخیر سمرنا سے قبل یونانیوں نے اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا، اب نئے سرے سے اس کی تعمیر ہو رہی ہے، قبل جنگ مذکور یہاں کی آبادی کوئی ڈھائی تین لاکھ تھی۔

[3] انگریزی کونسل کے اس بیان سے ترکوں کی اس قوت و اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے جو سترھویں صدی میں ان کو حاصل تھی، آج کیا حالت ہے۔ انا للہ!

اس مہم کی بدولت پٹس کو مختلف مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کی آٹھ مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہ سوخت ہو گئی
دوسری رقمیں جو اس کو واجب الوصول تھیں وہ الگ بھنگ کے بھاڑے میں گئیں اور ڈر کے مارے
دست آنے لگے وہ علیحدہ۔ اس کو خوف تھا کہ اگر کسی کو اس کا حال معلوم ہو گیا تو پکڑ کر الجزائر بھیج دیا
جائے گا اور وہاں گاڑی کے پیچھے الٹا لٹکا کر سارے شہر میں گھسیٹتے پھریں گے، اور پھر قتل کر کے یہودیوں
کے قبرستان میں گاڑ دیں گے، آخر کار اس نے دل میں ٹھان لی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو گھر ہی چلنا چاہئے
چنانچہ بعد قطع مسافت وہ سمرنا پہنچا، یہاں کارنوال[1] کے ایک انگریزی سوداگر سے جو الجزائر میں رہ
چکا تھا، اس کی ملاقات ہوئی، وہ اس کے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آیا، اور پانچ پونڈ کرایہ دیکر
اس کو ایک فرانسیسی جہاز میں جو لیگ ہارن[2] جانے والا تھا بٹھا دیا، جہاز روانہ ہونے سے قبل پٹس نے
ڈاڑھی کو استرے کی نذر کیا اور کوٹ پتلون پہن ہاتھ میں لے سیٹی بجاتا ہوا جہاز پر سوار ہو گیا
لیگ ہارن پہنچ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ عرصۂ دراز کے بعد غلامی کی تلخ زندگی سے نجات پاکر
اسے پھر مسیحی سرزمین دیکھی نصیب ہوئی، یہاں سے وہ اٹلی، ہالینڈ و جرمنی ہوتا ہوا انگلستان پہنچا۔

اس زمانہ میں شاہ انگلستان ولیم سوم اور شاہ فرانس کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی، پٹس جس دن
انگلستان کی سرحد میں داخل ہوا، اسی روز شاہی فوج میں شریک کرنے کے لئے اس کو پکڑ لیا گیا، اور اس طرح
الجزائر چھوڑنے کے بعد اس مہذب مسیحی سرزمین وطن ہی اس کو ایذا پہنچائی، بہتیری اس نے عاجزی و خوشامد
کی مگر کسی نے ایک نہ سنی اور دھکے دیتے ہوئے اسے کولچسٹر[3] کے قلعے میں لے گئے، اور ایک جہاز میں سوار
کرا کے اسے میدان جنگ میں بھیج دیا، وہاں خوش نصیبی سے کسی شخص کی سفارش پر وہ رہا کر دیا گیا، یہاں
سے چھوٹتے ہی وہ سر پر پاؤں رکھ کر سیدھا اگزیٹر بھاگ گیا، اسے اپنے فرقت زدہ والدین سے

---

[1] انگلستان کے جنوب و مغرب میں کارنوال ایک علاقہ ہے، یہاں کی تانبے اور ٹین کی کانیں بہت مشہور ہیں، کارنوال کے
قریب کئی بندرگاہیں جہاں سے معدنیات کی برآمد ہوتی ہے

[2] لیگ ہارن اٹلی کا ایک بندرگاہ ہے۔

[3] کولچسٹر انگلستان کا ایک شہر ہے، کسی زمانہ میں ان کی یہ بڑی تجارت گاہ تھی، اب یہ مقام موتی کی سیپیوں کی پرورش
اور ان کے شکار کے لئے مشہور ہے۔

ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر مکان پر پہنچ کر اس نے صرف اپنے باپ کو پایا، اس کی ماں ایک برس قبل مر چکی تھی، اس رنج کے مارے اس کی کمر ٹوٹ گئی، چونکہ پٹس پندرہ برس تک الجزائر میں رہ چکا تھا، اس وجہ سے اس کو عربی و ترکی زبانوں میں اچھی مہارت ہو گئی تھی اور اس نے اس کی لاعلمی وغیر تعلیم یافتہ ہونے کے عیب کو چھپا دیا تھا، وہ بہ نسبت برتھا کے مسلمانوں کے عقائد و مذہب سے زیادہ واقف تھا، اور جو کچھ اس نے بیان کیا ہے وہ زیادہ صراحت سے بیان کیا ہے مگر اکثر باتیں غلط بھی لکھ دی ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنا سفرنامہ حالت سفر میں نہیں لکھا تھا، بلکہ مکے سے واپس آکر بہت مدت بعد مرتب کیا تھا، مکے کے رمضان کا منظر اس نے خوب دکھایا ہے، اور بھی بعض واقعات تفصیل سے لکھے ہیں لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کے عقائد وغیرہ پر جو اس نے نافہمی سے حملے کئے ہیں وہ اس کے تعصب کے شاہد ہیں اور اس سے اس کی تحریر بے وقعت ہو گئی ہے۔

پٹس کا سفرنامہ ۱۷۰۴ء سے ۱۷۳۱ء تک پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ چونکہ یہ سب سے پہلا انگریز تھا جس نے حجاز کا سفر کیا، اس لئے اس کے حالات انگلستان میں نہایت شوق و دلچسپی سے پڑھے گئے۔ پٹس آخر عمر میں انگلستان کے ایک بڑے گرجے کا پادری مقرر ہو گیا اور اس طرح ..... پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اس کے وعظوں کا مجموعہ اب تک لندن کے عجائب خانہ میں موجود ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ مشہور مورخ مسٹر گبن[1] نے اپنی تاریخ عروج و زوال سلطنت روم میں اس کے سفرنامے کا کچھ ذکر نہیں کیا، واللہ اعلم اس کی نظر سے نہیں گزرا، یا بسبب اظہار تعصب اسے بے وقعت سمجھا۔

اب ہم پٹس کے سفرنامۂ حجاز سے بعض واقعات کا ذکر کر کے حسب ضرورت ان پر اظہار رائے

---

[1] ایڈورڈ گبن سب سے بڑا انگریزی مورخ ہے۔ یہ ۱۷۳۷ء میں پیدا ہوا تھا، اس کی تاریخ عروج و زوال سلطنت روم جو سات سال کی محنت شاقہ کے بعد اس نے تیار کی ۱۷۸۸ء میں شائع ہوئی تھی، اصول مورخی کے اعتبار سے یہ اعلیٰ درجے کی تصنیف مانی گئی ہے۔ اس کتاب کے باب (۵۰)، اور (۵۱) میں مذہب عیسوی پر سخت حملے کئے ہیں اور اسلام و بانی اسلام اور مسلمانوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ گبن کی وفات ۱۷۹۴ء میں بمقام لندن ہوئی۔

کرتے ہیں۔ طواف کعبہ[1] وسعی[2] کے ذکر میں پٹس حاجیوں کے جوش و خروش کے متعلق لکھتا ہے :-

جوں ہی کہ حاجیوں کی نظر پہلے پہل بیت اللہ پر پڑتی ہے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، میں بہ خیال اعتراض نہیں، بلکہ تعریف کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ یہ بیچارے اس قدر غیر معمولی عقیدت و خشوع و خضوع سے اوہام پرستی کی رسوم بجا لا رہے تھے اور خانۂ کعبہ کے جلال و جبروت سے مرعوب ہو کر ایسے تھرا رہے تھے، کہ ان کا جوش و خروش دیکھ کر اگرچہ وہ بت پرستانہ وجاہلانہ تھا، مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا، اور میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے "

پٹس کا حاجیوں کے جوش و خروش کو بت پرستانہ وجاہلانہ کہنا محض تعصب پر مبنی ہے، جس کو خدا نے ذرا سی بھی عقل دی ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ حاجیوں کی گریہ وزاری اپنے گناہوں پر اور ان کا لرزنا کانپنا خدا کے خوف سے ہوتا ہے نہ کہ اینٹ پتھر کی عمارت کے رعب سے، مسلمان مکین کے پوجنے والے ہیں، مکان (کعبے) کی پرستش نہیں کرتے۔

بیت اللہ کے متعلق پٹس لکھتا ہے :-

"بیت اللہ مسلمانوں کی خاص عبادت کی چیز ہے، یہی وہ بت ہے، جس کی مسلمان تعظیم کرتے ہیں مسلمان پورب پچھم، اتر، دکھن خواہ کہیں ہوں سب اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ بیت اللہ میں ہوتے ہیں، تو جس طرف جی چاہے، وہ اس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ لیتے ہیں "

---

[1] حاجی کعبہ کے گرد سات مرتبہ پھرتے ہیں، حجر اسود کے پاس سے طواف شروع کیا جاتا ہے اور وہیں ختم کیا جاتا ہے، ہر شوط یا چکر کے وقت ایک خاص دعا مانگی جاتی ہے، اس طرح ساتوں اشواط میں سات دعائیں پڑھتے ہیں جو طلب مغفرت و خوبی دین و دنیا پر مشتمل ہیں۔

[2] بیت اللہ کے قریب صفا و مروہ دو پہاڑیاں ہیں ان کے درمیان تیز قدمی سے چلنے کو سعی کہتے ہیں، یہ حضرت ہاجرہ والدۂ اسمٰعیل کی اس حالت اضطراب کی یادگار ہے، جب ان کا کمسن بچہ پیاس کے مارے یہاں زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور بے قرار ماں سراسیمہ پریشان پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھی کہ یکایک اللہ تعالے نے چاہ زمزم ظاہر کیا، جس کے پانی سے حضرت اسمٰعیل کی جان بچی، حاجی صفا سے شروع کرکے مروہ تک جو پچاس قدم کا فاصلہ ہے سات مرتبہ سعی کرتے ہیں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا ایک سعی ہوتی ہے

پٹس کے اس فقرے کا جواب ہم ایک محقق انگریز سیاح حجاز کپتان برٹن کے الفاظ میں دیتے ہیں، وہ پٹس کے مذکورۂ بالا اعتراض پر حاشیہ میں لکھتا ہے :۔

"اس سے بڑھ کر اندھے پنے کا متعصبانہ کوئی بیان نہیں ہو سکتا، مسلمان مکے کی طرف ویسے ہی نماز پڑھتے ہیں جیسے کہ عیسائی بیت المقدس کی طرف"۔

طواف کعبہ کے ذکر میں پٹس لکھتا ہے :۔

"عورتیں اور مرد دونوں طواف میں مصروف نظر آتے ہیں، لیکن عورتیں مردوں سے باہر طواف کرتی ہیں[1]۔ اور مرد بیت اللہ کے قریب رہتے ہیں، اتنے بڑے مجمع میں یہ ناممکن ہے کہ ہر شخص حجر اسود[2] کو چوم سکے، اس لئے صرف اس کی جانب اپنا ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کے منہ پر پھیر لینا کافی سمجھا جاتا ہے، جب تھوڑے آدمی طواف کرتے ہیں تو عورتوں کو بھی حجر اسود کے چومنے کا موقع مل جاتا ہے، مرد جب دیکھتے ہیں کہ عورتیں حجر کے پاس ہیں تو وہ اس کے قریب نہیں جاتے اور ان کو جی بھر کے دیکھ لینے اور چوم لینے دیتے ہیں، ایسے موقع پر عورتوں کے نزدیک جانا نہایت ہی مکروہ اور خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے"۔

اگرچہ پٹس نے الفاظ تعریف میں بہت ہی بخل سے کام لیا ہے اور صرف مکروہ و خلاف تہذیب کہہ کر فقرہ ختم کر دیا ہے، مگر غنیمت ہے کہ بجائے کسی اعتراض کے اسلامی اخلاق کی تعریف کر دی، از روئے انصاف اس کو چاہئے تھا کہ کسی ایسی یوروپین سوسائٹی سے جہاں عورت مرد بکثرت موجود ہوتے ہوں اس مجمع کے اخلاق کا مقابلہ کرتا۔

مکۂ معظمہ کے ذکر میں وہ لکھتا ہے :۔

"یہاں چند قسم کے میوے اور ترکاریاں بکتی ہیں، یعنی انگور، خربوزے، تربوز، ککڑیاں،

---

[1] کعبہ کے گرد چاروں طرف بطور حلقہ کے سنگ مرمر کا فرش ہے، جس کو مطاف یعنے طواف کرنے کی جگہ کہتے ہیں، اس میں مردوں کے لئے علٰحدہ اور عورتوں کے لئے علٰحدہ جگہ مقرر ہے اور دونوں جدا جدا طواف کرتے ہیں۔

[2] حجر اسود ایک سرخی مائل سیاہ پتھر بیضوی شکل کا دروازۂ کعبہ کے قریب دیوار میں چاندی کے حلقے میں نصب ہے یہ کوئی ۸ انچ لمبا اور ۷ انچ چوڑا ہے، اسی جگہ سے بیت اللہ کا طواف شروع کر کے یہیں ختم کرتے ہیں۔

کدو وغیرہ یہ چیزیں غالباً حبش سے لائی جاتی ہیں، جو مکے سے دو تین دن کے فاصلہ پر ایک
زرخیز مقام ہے"۔

حبش[1] نہ مکے سے دو تین دن کے فاصلہ پر ہے اور نہ وہاں سے یہ چیزیں لائی جاتی ہیں
بلکہ طائف[2] سے آتی ہیں۔

مکۂ معظمہ کی گرمی کی نسبت وہ لکھتا ہے :۔

"میں رات کو چادر پانی میں بھگو کر اوڑھ کے سو جاتا ہوں، جب آنکھ کھلتی ہے تو اسے سوکھا
پاتا ہوں، پھر بھگو لیتا ہوں، رات بھر میں دو تین مرتبہ ایسا کرنا پڑتا ہے"

کعبہ کی بلندی پٹس نے (۴۴) فٹ لکھی ہے یہ غلط ہے، اس کی اونچائی تخمیناً (۱۶) گز ہے
خانۂ کعبہ کے ذکر میں پٹس لکھتا ہے :۔

"کعبہ ڈیڑھ مہینے میں دو روز کھولا جاتا ہے، ایک دن مردوں کے لئے اور ایک روز عورتوں کے واسطے"

علی بے برک ہارٹ اور برٹن کے زمانہ میں جن کی سیاحت حجاز کا ذکر ہم نے علیحدہ علیحدہ کیا ہے
خانۂ کعبہ کا دروازہ سال میں تین دن کھولا جاتا تھا، حاجی ڈاکٹر نور حسین صاحب جنھوں نے ۱۳۲۲ھ
میں حج کیا ہے، اپنی کتاب رفیق الحجاج میں لکھتے ہیں کہ یہ دروازہ ایام حج میں روزانہ کھول دیتے
ہیں اور فی کس دو روپیہ چار آنہ وصول کرتے ہیں، مردوں اور عورتوں کے لئے جدا گانہ دن مقرر ہیں
ایک تجربہ کار حاجی کا بیان ہے کہ جب کوئی شخص کلید بردار کی مٹھی گرم کر دیتا ہے تو ہر وقت
داخلی ہو جاتی ہے۔ پٹس لکھتا ہے :۔

داخلی کعبہ کے وقت حجاج اس قدر رجوع الی اللہ ہو جاتے ہیں کہ بجز نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے

---

[1] ملک حبش افریقہ میں واقع ہے اور مکۂ معظمہ سے تقریباً ڈیڑھ مہینے کے راستہ پر ہے۔

[2] طائف مکۂ معظمہ سے کوئی تیس کوس ہے۔ حجاز میں اس سے بڑھ کر شاداب وزرخیز کوئی مقام نہیں، یہ نہایت سرسبز و سرد خطہ ہے
میوہ جات کے درخت بکثرت ہیں۔ مکے کے اکثر آسودہ آدمی گرمیوں کے دنوں میں وہاں چلے جاتے ہیں اور موسم گرما طائف کے
باغوں میں بسر کر کے واپس آتے ہیں۔ یہاں کے انار و انگور بہت اچھے ہوتے ہیں اور طائف کا چمڑا اور نعلین قدیم سے مشہور ہیں۔
حضرت جامیؒ فرماتے ہیں :۔

ادیم طائفی نعلین پا کن
شراک از رشتۂ جانہائے ما کن

کعبے کے اندر ادھر ادھر دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں ۔"

جبل عرفات[1] کے ذکر میں وہ لکھتا ہے :-

" ہزار ہا آدمیوں کا عاجزی و انکساری کا لباس پہنے ، ننگے سر چار پانچ گھنٹے تک ٹھنڈی سانس بھر بھر کے آنسوؤں سے منہ دھونا ، ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے درگاہ خدا میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنا اور سچے دل سے توبہ و استغفار کرنا ، فی الحقیقت دل پر ایک گہرا اثر کرنے والا منظر تھا ، جب ان بچارے اندھے (جاہل) مسلمانوں کے اس جوش کا مقابلہ بعض عیسائیوں کی غفلت سے کیا جاتا ہے تو نہایت ہی افسوس ہوتا ہے ، ڈر ہے کہ قیامت کے روز یہ مسلمان کہیں عیسائیوں کو ان کی غفلت پر طعنہ نہ دیں ۔"

افسوس ہے کہ تعصب آدمی کو اس قدر اندھا کر دیتا ہے کہ سوجھتا آدمی بھی اس کو اندھا نظر آتا ہے ، کیا مزے کی بات ہے کہ خدا سے ڈرنے والے اور اپنے گناہوں پر رونے والے مسلمان بھی پیش کو غافل عیسائیوں کے مقابلہ میں اندھے دکھائی دے رہے ہیں ۔

ہیں دیدۂ و دانستہ مری آنکھیں بند لوگو مرے دیدے کی صفائی دیکھو

ہم نے ایک پادری صاحب کو یہ کہتے سنا ہے کہ عیسائیوں کو اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ، خدا کے اکلوتے فرزند کی قربانی سے ان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا ۔ باپ بیٹے اور روح القدس پر صرف ایمان لے آنا کافی ہے ، روئے ان کی بلا اور اگرچہ توریت کی تعلیم توحید کے خلاف یہ عقیدہ ہے[2] مگر یہی سیدھا رستہ ہے ، جو اس سے بھٹکے اسے اندھا سمجھو ۔

(باقی آئندہ)

---

[1] عرفات کی تشریح پیشتر بھی کی جا چکی ہے ، اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد آدم و حوا نے یہاں ایک دوسرے کو پہچانا تھا ، یہاں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجی خطبہ سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں جو چار بجے سہ پہر شروع ہو کر مغرب ختم ہوتا ہے زوال کے بعد سے مغرب تک عرفات میں قیام کرنا حج کا بہت ضروری رکن ہے ۔ اس قیام کے بعد ہر شخص حاجی کے لقب سے پکارا جانے لگتا ہے ۔

[2] انجیل شریف میں حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں " یہ مت سمجھو کہ میں توریت کو منسوخ کرنے آیا ہوں ، نہیں ، زمین آسمان ٹل جائیں گے مگر توریت کا ایک شوشہ نہ ٹلے گا ۔" توریت مقدس توحید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے مگر یار لوگوں نے توحید اڑا کر تثلیث قائم کر دی ۔ زدیم بر سر رندان و ہر چہ بادا باد !!

نسخۂ انفعال

(از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم)

حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم کی دو نظمیں "بے فکری کا کرشمہ" اور "سچا دوست" اپنے طرز بیان کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں مقبول ہو چکی ہیں اور زبان اردو میں اس خاص طرز بیان کے اولیت کا سہرا آپ ہی کے سر باندھا جا چکا ہے، مندرجۂ ذیل نظم بھی اسی انداز کو لئے ہوئے ہے، اس قسم کی بول چال پہلے ناولوں سے شروع ہوئی تھی، اور انگریزی کی تتبع میں نظم عاری یا غیر مقفی اردو میں نظمیں لکھی جانے لگیں، مگر اس نظم "ایک نحوی اور ملاح کی مزیدار حکایت" میں سلاست زبان، اور فصاحت بیان کے قطع نظر قافیہ کی پابندی اور پھر ہر ایک مصرعہ بپابندی قافیہ لکھنا، یعنی ذوالمطالع میں ایسی رواں دواں نظم کا کہنا، خاص حضرت کیفی کا ہی حصہ تھا۔ (ترقی)

ہے نا عاقبت بینیوں کا مآل   ندامت، خجالت، حجاب، انفعال
سنا ہے، کہ اک نحوی با کمال   فقید النظیر و عدیم المثال
فصیح و بلیغ، ان کی تھی بول چال   غلط لفظ نکلے کوئی، کیا مجال
غلط کوئی کرتا، اگر قیل و قال   تو ہوتا انھیں، اس کا سننا محال
سفر ان کو، کرنا پڑا ایک سال   چڑھے ناؤ پر، لے کے مال و منال
کیا نا خدا نے، کچھ ان سے سوال   مگر، روزمرہ، نہ تھا اس پہ دال
یہ سن کر، ہوا ان کو بے حد ملال   (ہوا مارے غصے کے منہ لال لال)
کہا (مولوی جی نے) "اے بد خصال!   نہیں ہے تجھے، نحو کا کچھ خیال؟
بہت حیف ہے، اے تاسف مآل!   ہوئی عمر آدھی تری، پائمال"
ہوا اگرچہ، ملاح کا غیر حال   مگر ہو رہا چپ، بخوف جدال
ادھر سے تھی سختی، ادھر سے تھی ٹال   کہ بگڑی ہوا۔ اور کشتی کی چال
تلاطم سے، کشتی پہ آیا زوال   (ہوئی اب زباں مولوی جی کی لال)
کہا (نا خدا نے) کہ "اے نیک فال!   ہے حضرت کو، کچھ تیرنے میں کمال؟
نہ بچتی ہے کشتی نہ کشتی کا مال   کہ طوفاں سے ہے، جان بچنی محال"
کہا (مولوی نے بصد انفعال)   "میں نا آشنا ہوں مجھے تو سنبھال"
کہا پھر تو (ملاح نے) "کیوں جناب!   ہوئی عمر اقدس تو، ساری خراب"

غزلیات

۴۶

از جناب مولوی حکیم محمد بہبود علی صاحب صفیؔ حیدرآبادی

جناب صفیؔ حیدرآبادی ملک کے ان باکمال شاعروں میں ہیں، جن کا نام خصوصیت کے ساتھ گنایا جاسکتا ہے مگر کمال شعر نے انھیں کمال درجہ گوشہ نشین بنا دیا ہے، وہ بزم عام میں آنا نہیں چاہتے تھے لیکن ترقی کھینچ لایا۔ ترقی اپنے آغاز سے متمنی و کوشاں رہا کہ وہ ترقی کے ذریعہ ملک میں روشناس ہو جائیں، شکر ہے کہ ترقی اپنی لگاتار کوششوں میں آج کامیاب ہوا، اور امید ہے کہ وہ ہمیشہ ترقی کے ذریعہ ناظرین ترقی سے ملتے رہیں گے۔

جناب صفیؔ حضرت کیفیؔ حیدرآبادی مرحوم کے شاگرد ہیں، حضرت کیفیؔ ایک مسلم الثبوت استاد تھے، جن کی کسی تعریف و توصیف کی ضرورت نہیں، حضرت کیفیؔ کا مخصوص رنگ معاملہ بندی، واقعہ نگاری کے ساتھ زبان کی شیرینی، بیان کی رنگینی ہے، جناب صفیؔ کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم یہی خصوصیت پائی جاتی ہے جو تاثیر کلام کی جان ہے، مگر اس کے ساتھ ہم دبی ہوئی آواز میں جناب صفیؔ کی توجہ حضرت کیفیؔ کی قومی شاعری پر بھی مبذول کراتے ہیں گے۔

ترقی

جب کبھی تیری دید ہوتی ہے
ہم کو اس روز عید ہوتی ہے

جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے

اپنے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ
سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

تم لگاوٹ سے دیکھ لیتے ہو
آدمی کو امید ہوتی ہے

آپ اپنی کہیں میری سنیں
یوں ہی گفت و شنید ہوتی ہے؟!

آپ کے پاس بھی رہی نہ رہی
کیا وفا زرخرید ہوتی ہے

حضرت دل کی بات خاک سنو
میری مٹی پلید ہوتی ہے

بات کرنے کو کوئی نہیں ملتا
جب ضرورت شدید ہوتی ہے

اس کے وعدے پہ جی رہا ہے صفیؔ!
ہائے کیا شے امید ہوتی ہے

از جناب مولوی سید امین الحسن صاحب رضوی بسملؔ

لطف کے ساتھ مرے حق میں جفا بھی ہو گی
وہ بھی ہوں گے نگہِ ہوش ربا بھی ہو گی

دیکھئے کس کو میسر ہو حیات جاوید
بستر غم پہ مرے ساتھ قضا بھی ہو گی

وہ بھی محروم ازل اس سے بھی بدتر ہیں
میری قسمت کی طرح میری دعا بھی ہو گی

دل گرفتہ نہ ہو اے پیر مغاں اور ابھی
خیر کا کام ہے تائید خدا بھی ہو گی

دشمن ذوق نظر محرم اسرار نقاب
آپ کے ساتھ پس پردہ حیا بھی ہو گی

سبز کہسار گھٹا کالی الٰہی توبہ
ساقیا توبہ شکن آج فضا بھی ہو گی

آ گیا خیر سے پھر موسم دیوانہ نواز
درد بھی رنگ جمائے گا دوا بھی ہو گی

آپ کی زلف میں پھنسنے کو تو تیار ہے دل
پوچھتا یہ ہے بھلا قدر وفا بھی ہو گی

دے گا بسملؔ کو جو کونین کی نعمت یارب
نہ کمی تیرے خزانہ میں ذرا بھی ہو گی

خدّام اردو

ہم بہ تاسف معذرت خواہ ہیں کہ ناگزیر تاخیروں کی وجہ سے حسب ذیل معزز معاصرین کے متعلق ترقی کی ناچیز رائے ظاہر کرنے کا شرف اب تک نہ حاصل کرسکے

ہمایوں اردو کا نہایت عمدہ، فصیح اور دلفریب ماہانہ رسالہ، جو مرحوم علامہ جسٹس شاہدین ہمایوں کی یادگار میں ان کے لائق فرزند میاں بشیر احمد صاحب نے لاہور سے شائع کیا ہے، اس کی خوبیاں صرف ملاحظہ ہی پر موقوف ہیں دنیائے اردو میں اب تک دو تین ہی رسالے، اس آن بان کے نکلے ہیں اور جس بہی خواہ اردو نے 'ہمایوں' کی مستقل زیارت کا شرف نہیں حاصل کیا، اسے دعوائے ہمدردی اردو سے ہاتھ اٹھالینا چاہئے۔

'ہمایوں' کے بے شمار صوری و معنوی محاسن کے علاوہ چند اور باریک خصوصیتیں بھی، اس میں ہم کو نظر آئیں جن کا نہایت انبساط کے ساتھ ہم اظہار کرتے ہیں :-

(۱) اول تو یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ساتھ خدمت اردو کی جو امیدیں وابستہ تھیں، اور جو اب تک مایوسی کا منہ تک رہی تھیں وہ اب بر آتی ہوئی نظر آتی ہیں - میاں صاحب موصوف کے علاوہ شاید دو ہی ایک ہستیاں ایسی ہونگی جو تہذیب و تعلیم جدیدہ سے منور ہونے کے بعد اپنی مخصوص دلچسپیوں کو چھوڑ کر، اردو کی خدمت کر کے حقیقی روشن خیالی کا ثبوت دے رہی ہوں۔ اس طرف میاں صاحب کی توجہ اردو ادب کے لئے بڑے بڑے امکانات پیدا کر رہی ہے۔

(۲) یہ امر بھی قابل غور ہے کہ میاں صاحب موصوف، بجائے اس کے کہ دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کی طرح اپنے والد مرحوم کی یادگار میں کسی "اجنبی" کو چند ہزار روپیہ دے کر، بزعم خود اپنی شہرت و تحسین کے متلاشی ہوتے عین سلامتی طبع اور دانائی سے خدمت اردو کو مقدم سمجھا، کیا یہ مثال بوالہوس تعلیم یافتوں کے لئے باعث عبرت نہیں ہے؟

(۳) 'ہمایوں' نے ہمارے اس خیال کو بھی، جو مدت سے ہمارے دماغ پر اپنے پرتو ڈال رہا تھا مستحکم کر دیا، کہ اب قومی مباحث کے بغیر ہم اردو ادب کو دلچسپ نہیں بنا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب میں جو چاشنی پیش تر گل و بلبل، اور مے و ساقی وغیرہ سے پیدا کی جاتی تھی وہ اب بغیر مذاکرات سیاسیہ و قومیہ کے ممکن نہیں، معزز معاصر 'نگار' نے ہمارے اس خیال کو پہلے بھی تقویت دی تھی، اور 'ہمایوں' کے 'جہاں نما' نے اس کو پختہ کر دیا، موجودہ ادبی اور علمی رسائل تاوقتیکہ معتدل ادبی سیاست یا "سیاسی ادب" کی رنگینی سے کام نہ لیں گے ہمیشہ خشک و بے مزہ رہیں گے، یہ ایک مذاق صحیح کا انکشاف ہے جو ماحول ظاہر کا محتاج نہیں۔

(۴) مذکورہ خیال کے علاوہ "ہمایوں" نے ہمارے ایک ادبی عقیدہ کی بھی، نہایت مسرت انگیز ہمنوائی کی ہے۔ ہمارا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اردو ادب کی خدمت کے لئے، عربی اور فارسی مذاق بیحد ضروری ہے، جس کے بغیر ادبیت کا دعویٰ کرنا، بجز ادق بے بضاعت کے اور کچھ نہیں، یاد رکھنا چاہئے کہ، اردو ادب اسی وقت ترقی کر سکتا ہے، جب اس کے پرستار عربی و فارسی سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔ وہ گریجویٹ حضرات، جو بی، اے، ال، بی ہو جانے کے بعد "خادم اردو" ہونے کے بجائے "آقائے اردو" ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں، اور السنہ مشرقیہ کا مذاق نہیں رکھتے، اردو کے سب سے بڑے نادان دوست ثابت ہوتے ہیں۔ یہ امر خدمت اردو کے عنصری خصوصیات میں داخل ہے کہ پہلے عربی و فارسی میں کافی مہارت پیدا کرلی جائے شکر ہے کہ میاں صاحب موصوف کے مذاق سلیم نے ہماری داد دی، اور مولانا تاجور فاضل دیوبند کو اپنی امداد کے لئے منتخب کیا۔ اسی وجہ سے ہمایوں کی دلکشی و زیبائی، اور فصاحت و بلاغت میں جو چار چاند لگ گئے ہیں، وہ بآسانی تمیز کئے جا سکتے ہیں۔

(۵) جامعۂ عثمانیہ (دکن) سے جو دلچسپی اس موقر رسالے نے ظاہر کی ہے، وہ نہایت اہم ہے، بلکہ ہر ادبی رسالے کے لئے شمع ہدایت۔ اس صورت میں جب کہ "جامعۂ عثمانیہ" نے جو ایک اردو زبان کی یونیورسٹی ہے، ہندوستان کی پچھتر سالہ تعلیمی تاریخ کے لئے عظیم الشان سامان انقلاب مہیا کر دیا ہے، کیا ہر خادم اردو کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے مرکز کی طرف راجع رہے؟ ہم نہایت مسرت کے ساتھ "ہمایوں" کو اس اولیت و سبقت پر مبارکباد دیتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں، کہ ہر مدعی ادب اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش کرے گا، جس کی طرف ہمایوں نے نہایت بلیغ اشارہ کر دیا ہے، یعنی اردو یونیورسٹی سے اخلاقی، و مادی مربوطی۔

سالانہ قیمت (صہ) نمونہ ۸ر تقطیع غیر معمولی (۲۰×۳۰) مزنگ روڈ لاہور کے پتہ سے طلب فرمائیے۔

آئینہ | مرحوم ادیب، کے بعد غالباً یہ دوسری ادبی خدمت ہے، جو الہ آباد سے عیاں ہوئی ہے، ابوالمعانی مولوی سید حمید الدین احمد کڑوی اس اولوالعزمی پر قابل آفریں ہیں۔ یہ پہلی جلد کا پہلا نمبر (ماہ جون) ہم کو وصول ہوا ہے، حصہ نثر میں سید مسعود حسن صاحب اور متین صاحب کے مضامین، اور مدیر صاحب والا کا "صبح شباب"، اچھے ہیں نظم میں حضرت اکبر مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام، تضمین حضرت صدق بر کلام حافظ، اور "گریہ مہدی" خوب ہیں، حصۂ نسواں بھی دلچسپ ہے غرض کہ ہم ہر طرح سے اس کا خیر مقدم اور ناظرین ترقی سے اس کی ترقی کی سفارش کرتے ہیں۔

قیمت سالانہ صہ ششماہی ہے نمونہ ۱۲ ار - دفتر رسالہ آئینہ الہ آباد۔

(۴) مذکورہ خیال کے علاوہ "ہمایوں" نے ہمارے ایک ادبی عقیدہ کی بھی، نہایت مسرت انگیز ہمنوائی کی ہے۔ ہمارا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اردو ادب کی خدمت کے لئے، عربی اور فارسی مذاق بیحد ضروری ہے، جس کے بغیر ادبیت کا دعویٰ کرنا بجز ادعائے بے بضاعتی کے اور کچھ نہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اردو ادب اسی وقت ترقی کرسکتا ہے، جب اس کے پرستار عربی و فارسی سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔ وہ گریجویٹ حضرات، جو بی، اے، ال، بی ہوجانے کے بعد "خادم اردو" ہونے کے بجائے "آقائے اردو" ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں، اور السنہ مشرقیہ کا مذاق نہیں رکھتے، اردو کے سب سے بڑے نادان دوست ثابت ہوتے ہیں۔ یہ امر خدمت اردو کے عنصری خصوصیات میں داخل ہے کہ پہلے عربی و فارسی میں کافی مہارت پیدا کرلی جائے شکر ہے کہ میاں صاحب موصوف کے مذاق سلیم نے ہماری داد دی، اور مولانا تاجور فاضل دیوبند کو اپنی امداد کے لئے منتخب کیا۔ اسی وجہ سے ہمایوں کی دلکشی و زیبائی، اور فصاحت و بلاغت میں جو چار چاند لگ گئے ہیں، وہ بآسانی تمیز کئے جاسکتے ہیں۔

(۵) جامعۂ عثمانیہ (دکن) سے جو دلچسپی اس موقر رسالے نے ظاہر کی ہے، وہ نہایت اہم ہے، بلکہ ہر ادبی رسالے کے لئے شمع ہدایت۔ اس صورت میں جب کہ "جامعۂ عثمانیہ" نے جو ایک اردو زبان کی یونیورسٹی ہے، ہندوستان کی کچھتر سالہ تعلیمی تاریخ کے لئے عظیم الشان سامان انقلاب مہیا کردیا ہے، کیا ہر خادم اردو کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے مرکز کی طرف راجع رہے؟ ہم نہایت مسرت کے ساتھ "ہمایوں" کو اس اولیت و سبقت پر مبارکباد دیتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں، کہ ہر مدعی ادب اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش کرے گا، جس کی طرف ہمایوں نے نہایت بلیغ اشارہ کردیا ہے، یعنے اردو یونیورسٹی سے اخلاقی، و مادی مربوطی۔

سالانہ قیمت (صہ) نمونہ ۸ر تقطیع غیر معمولی (۳۰) مزنگ روڈ لاہور کے پتہ سے طلب فرمائیے۔

آئینہ | مرحوم ادیب، کے بعد غالباً یہ دوسری ادبی خدمت ہے، جو الہ آباد سے عیاں ہوئی ہے، ابوالمعانی مولوی سید وحید الدین احمد کڑوی اس اولوالعزمی پر قابل آفریں ہیں۔ یہ پہلی جلد کا پہلا نمبر (ماہ جون) ہم کو وصول ہوا ہے حصہ نثر میں سید مسعود حسن صاحب اور متین صاحب کے مضامین، اور مدیر صاحب والا کا "صبح شباب"، اچھے ہیں، نظم میں حضرت اکبر مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام تضمین حضرت صدق بر کلام حافظ، اور "گریہ مہدی" خوب ہیں، حصۂ نسواں بھی دلچسپ ہے غرض کہ ہم ہر طرح سے اس کا خیر مقدم اور ناظرین ترقی سے اس کی ترقی کی سفارش کرتے ہیں۔

قیمت سالانہ صہ ششماہی ہے/ نمونہ ۱۲ار۔ دفتر رسالہ آئینہ الہ آباد۔

جشن آصف نمبر (۲۳)

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابوالمکارم محمد انوار اللہ صدیقی

عام قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت ورنہ قیمتاً دیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچہ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچۂ ڈاک آنے پر واپس کر دئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ سرکار سے (عہ) عام خریداروں سے (عہ) ششماہی (۔عہ) نمونہ (۵/)

منیجر

جمال یار

حضرت نوری و شاد صوفی مدظلہم کے پرکیف مکاتیب کا مجموعہ جس کی نسبت ترقی (ابتداء ماہ شعبان ۱۳۴۲ھ) میں تنقید ہو چکی ہے۔ قیمت پانچ آنے

پتہ

(۱) شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد

(۲) دفتر رسالہ ترقی

(۳) سید شاہ ظہور عالم حسینی سجادہ نشین خلف حضرت مختار علی شاہ مرادوار خان چشتی چمن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ ـــــ بابتہ ماہ ذی حجۃ الحرام ۱۳۴۱ھ ـــــ نمبر ۱۰

فہرست مضامین

فی العزا

(از نواب ضیا یار جنگ بہادر، رکن عدالت العالیہ حیدرآباد دکن)

چوں نور نبیؐ شامل انوار حسین است — دیدار نبیؐ حاصل دیدار حسین است

مشکاۃ قضا روشن ازیں شمع تجلی ست — در کون و مکاں جلوۂ انوار حسین است

آنکس کہ ز اسرار تولا بود آگاہ — داند کہ دلا گلشن اسرار حسین است

ما تشنہ لباں سرخوش صہبائے دلائیم — در ساغر ما شربت دیدار حسین است

مائل بغروب است دم معرکہ خورشید — یا سر بزمیں گوشۂ دستار حسین است

یا رب چہ شد آں مہر کہ از خلق نہاں شد — ہر ذرہ بہ آفاق طلبگار حسین است

در لالہ و گل فرق غم تشنہ نتواں کرد — کیں خستہ دل ست آں جگر افگار حسین است

شبنم کہ ز نرگس چکد اندیشہ غلط نیست — کیں گریۂ مایوسی بیمار حسین است

اے گل ز سیہ پوشی بلبل مکن اعراض — بگذار کہ دیرینہ عزادار حسین است

روشن ز ہلال ست بما کیں فلک پیر — از حلقہ بگوشان وفادار حسین است

صیاد جفا پیشہ ضیا در قفسم کرد
کیں بلبل آشفتہ گلزار حسین است

شذرات

مجبوراً یورپ کو مسلمانوں سے صلح کرتے ہی بنی، صیاد مغرب کے پنجہ مادیت میں جو اسلامی سلطنتیں پھنسیں، ان کے مٹنے میں بہت دیر نہیں لگی، مگر ترک ہی ایسے گراں جان تھے، کہ شخصی حکومت، انقلاب، طوائف الملوکی، سازش اور سب سے بڑھ کر ڈپلومیسی کے وار سہے اور صحیح و سلامت باقی رہے، چنانچہ آج یورپ کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ مصطفیٰ کمال کی شمشیر اور عصمت کی تدبیر نے اس کی سازش اور ڈپلومیسی کے پرزے اڑا دیئے ہیں، زندہ باد مصطفیٰ الکمال، پائندہ باد ترکی۔

اگر ہمارے ادبی حلقے اور علم اردو کے علم بردار، آپس میں منافست نہ رکھتے ہوتے تو بہت اچھا متوقع تھا کہ انگورہ کی تحریک علمیہ میں فوری حصہ لیا جاتا، در اصل ادبی اور لسانی اتحاد ہی ہر قسم کے اتحاد کی جڑ ہے، مگر ہمارے افلاس اور عدم اشتراک کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مفید تحریک کو تجویز سے عمل میں آتے ہی آتے، فنا سے دوچار ہو جانا پڑتا ہے، اور ہر جد و جہد بے نتیجہ رہتی ہے، چنانچہ اس بے بہا تحریک کا جو حشر ہندوستان میں ہونے والا ہے، وہ ابھی سے معلوم ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اپنا تعلیمی دور ختم کر کے جامعہ سے قطع تعلق کر چکا، مگر ہم جو اب تک اس طرف توجہ کرنے سے قاصر رہے، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم کو اس گروہ کی عملی زندگی کے متعلق چند دریافت طلب امور پر غور و خوض کرنا تھا، یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری یونیورسٹی اجنبی یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں اس قدر بعید و بین تفاوت رکھتی ہے کہ اگر موخر الذکر کی "جامعیت" کی تعریف کا اطلاق ہمارے جامعہ پر کیا جائے تو کسی طرح صادق نہیں آسکتا پس یہی ضرور ہوا کہ زبان، خیالات، طرز تعلیم، مطمع نظر، شوق تالیف و تصنیف، ارتفاع قیود مہمل و غیر ضروری، وغیرہ کے امتیازات کے ساتھ ہمارے گریجویٹ نوجوانوں کو ممکنہ نقائص جامعہ کی اصلاح کا خیال رہنا، ایک فطری جذبہ ہو۔

ہماری عین تمنا یہ ہے کہ ہمارے جامعہ کے مایۂ ناز فرزند عملی دنیا میں خواہ کیسے ہی کیوں نہ ثابت ہوں، مگر ویسے نہ ہوں جیسے اجنبی یونیورسٹیوں نے اب تک تیار کئے ہیں، کہ جن کو تعلیم، نوکری، موت ان تینوں چیزوں کے چکر سے نجات ہی نہیں ملتی کہ تصنیف و تالیف یا قومیت و مذہب کی طرف توجہ کر سکیں، ہمارے طلبہ کے سامنے بہت بڑا عملی میدان موجود ہے، جس میں وہ نہایت فراغت، آسودگی اور دلچسپی سے گام زنی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ مطمع نظر اور غایت امنیات، جلب زر اور شوق غلامی کے ناپاک جذبات سے ملوث و متاثر نہ ہوا ہو، خدا کے فضل و کرم سے جو سہولتیں اور آسانیاں ہم کو **ظل عثمانی** کے طفیل یہاں نصیب ہیں، اور رہ سکتے

ہیں، وہ باہر قطعاً ناممکن ہیں، اور ہم نہایت اطمینان سے تصنیف و تالیف، قومی لٹریچر کی خدمت، فوائد جامعہ کی توسیع، نشر علوم و ہنر اور ہر قسم کی قومی و مذہبی خدمات بہ کامرانی انجام دے سکتے ہیں، اور یقیناً انجام دیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اگر ہماری آرزوئیں پوری ہو گئیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہمارے جامعہ کے نوجوان اقوام جدیدہ کے دوش بدوش چل کر دنیا کو دکھا دیں گے، کہ ہندوستان کے ایک دور افتادہ جنوبی گوشہ میں کیسے کیسے زبردست مصنفین، مورخین، اہل حکمت، سیاح، مکتشف، موجد اور عالم پیدا ہو گئے، اس وقت لفظ "دکنیت" بھی خاص اصطلاح ہو جائے گی، جس میں وہ برقی قوت پنہاں ہوگی جو اپنی ذرا سی کارفرمائی میں تمام ہندوستان کو ہلا سکے گی۔

ہم اپنی آرزوؤں کی طرف سے ناامید نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ جن نونہالوں کی ذات سے ہمارے ارمان وابستہ ہیں، انھوں نے دنیائے عمل میں جامعہ کے قدرتی مطالبات کی صدا پر جواب لبیک ادا کرنے میں قصور نہیں کیا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ کسی نمبر میں ہم مفصل طور پر بتلائیں گے کہ جامعہ کے مفاد کے لئے پرجوش کام کرنے والوں کے راستہ میں کس قسم کے مشکلات حائل ہیں، اور حامیان جامعہ ان کو رفع کرنے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

سٹی ہائی اسکول (حیدرآباد دکن) کے طلبائے قدیم یا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قواعد و ضوابط وغیرہ کی ایک کاپی موصول ہوئی ہے، جامعین ضوابط اور ناظمین جماعت کی یہ محنت قابل داد ہے کہ انھوں نے تمام قدیم طلباء کے نام و مقام موجود کو بہم پہنچایا، اور اپنی جماعت کی تنظیم و تشکیل کی، یہ اتحاد، اور قدیم طلباء کا اپنی اور اسکول کی یاد کو نہ بھلانا بہت بڑی وضعداری اور قابل تعریف خیال ہے، کیا اچھا ہو اگر ہماری اس قسم کی تمام انفرادی حرکات جبات کسی نہ کسی طرح ایک نقطۂ مرکزی کی طرف راجع رہیں، جو جامعۂ عثمانیہ کے سوا اور کوئی بشکل سے ذہن میں آسکتا ہے۔

ہر سلطنت کی بقاء و ترقی کے تین عناصر ہوا کرتے ہیں، بادشاہ، امراء، فوج، ہمارے ہاں اگر کمی تھی تو اسی کی کہ امراء کے لئے جو درحقیقت "عماد حکومت" ہوتے ہیں، علمی، و اخلاقی مذاکرات کا کوئی منتظم بندوبست نہ تھا۔ درانحالیکہ ہمارے ہمسائے اور روشن خیال معاصرین حکومت برابر اپنی گورنمنٹ کے اس پہلو کو کما حقہا قوی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ "نوبلز کالج" یا "تربیت گاہ امراء" کی بامتوقع اور نہایت مفید تجویز نے اہل ملک کے سامنے ظاہر ہو کر ہمارے مدبر اور علم پرور آقا کی کمال روشن ضمیری کی ایک تازہ برکت کا اعلان کر دیا۔ اب بہت بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ امراء کے صاحبزادوں کی تربیت و تعلیم کے لئے ایک ایسے ہی قابل اور تجربہ کار اہل علم کو منتخب کیا جائے جن کا علمی تبحر اور ادبی عبور "نوبلز کالج" کے نونہالان چمن سلطنت کی خوش تربیتی اور عالی دماغی کی پوری پوری ضمانت کر سکے۔ اس خصوص میں یقیناً السنہ مشرقیہ و مغربیہ کے لئے "نوبلز کالج" کو کمبرٹ "ڈگری یافتہ"؟

حضرات دستیاب ہو سکیں گے، مگر "اردو زبان و ادب" کی تعلیم و قابلیت ہی وہ شئے ہے، کہ باوجود ہماری وطنی، قومی، ملکی زبان ہونے کے بھی اس کے علما آج ہندوستان میں مفقود ہیں، اور جو موجود بھی ہیں ان کی بے نیازی اور استغنا انھیں از خود اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بہتر ہوگا کہ ارباب کار اردو کی طرف سے اپنی سہل انگاری کو دور کر کے اس امر پر غور کریں کہ کالج مذکور میں "اردو عالم" کی خدمات کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہیں، اس لئے کہ بنیادی چیز، جس پر آئندہ تمام اخلاقی و تعلیمی ترقی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور جس کے وجود سے جامعہ عثمانیہ کا وجود وابستہ ہے اردو ہی ہے، اس اہم فرض یعنے "اردو معلمی" کے لئے نہ صرف ہماری رائے میں، بلکہ جملہ ہمدردان اردو کے خیالات کے لحاظ سے بھی جو بہترین اور موزوں قابلیت انتخاب کی جا سکتی ہے وہ خوش قسمتی سے آج ہمارے درمیان ہی موجود ہے، یعنے آغا حیدر حسن صاحب دہلوی، جن کے صرف مضامین کی عزت کی ہندوستان کی ہر ادبی تحریک کو تلاش رہتی ہے، اور رسالہ تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے صاحب موصوف کے تجربۂ علمی و ادبی سے مستفید ہونے کا موقع نہ ڈھونڈا ہو۔

افسوس ہے کہ دیگر اہل علم کی طرح صاحب موصوف بھی مجسمہ استغنا و بے نیازی ہیں، اور تاوقتیکہ اردو ادب کی بے مائگی اور کس مپرسی پر صاحب موصوف کو توجہ نہ دلائی جائے، بہت بڑا اندیشہ ہے کہ کالج مذکور کہیں آپ کے زرین خدمات سے محروم نہ رہ جائے۔

نواب مسعود جنگ بہادر کے سے امام تعلیم کی موجودگی میں بھی، جن کی روشن خیالی اور قابلیت کی داد اس وقت ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہے اور جن کے وسیع تجربے اور بلیغ نظر نے ملک کی تمام قابل اور تجربہ کار شخصیتوں کو تکمیل تعلیم کے لئے منتخب کر لیا ہے، "نوبلز کالج" کی بہت بڑی بدنصیبی ہوگی اگر وہ آغا صاحب موصوف کی دیرینہ قابلیتوں سے فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ کر سکا جس کا موقع اب سے بہتر نہیں آ سکتا اور اگر اب ہماری آواز پر توجہ نہ کی گئی تو بہت بڑا خطرہ ہے کہ کہیں آغا صاحب موصوف کا استغنا کالج مذکور کو ایک ایسی قابل شخصیت سے محروم رکھے، جس کا ثانی اردو علم و ادب کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں کہیں نہیں مل سکتا۔

اگر گستاخی نہ ہو تو اس ضمن میں ہم ایک مخصوص امر کی طرف بھی اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے، "نوبلز کالج" ایک شاہزادوں اور امیرزادوں کا کالج ہوگا، اور جناب آغا صاحب موصوف بھی اس مرحوم خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جس کے افراد کے احکام پر ابھی چند روز ہوئے کہ سارے ہندوستان کی قسمت منحصر تھی، اور دلی جس کا مرکز تھا، دہلی مرحوم کی شاہنشاہی سے ہماری قلبی عقیدت کا مقتضا تو یہی ہے کہ اگر خوش نصیبی سے "نوبلز کالج" کو جناب آغا صاحب کی خدمات میسر ہو جائیں، تو اس پر ہر پہلو سے خوش طمانیت کا اظہار کریں، اس لئے کہ اگر ایک طرف ریاست حیدر آباد کے "نوبلز کالج" کو سلطنت دہلی کے ایک خاندان کا ایسا شخص مل رہا ہے تو دوسری جانب ادب اردو کی آبیاری بھی وہ ذات کر رہی ہے جس پر "قلعۂ معلی کی زبان" کو بھی صد ہزار فخر و ناز ہے۔

منجملہ دیگر" دکھنی" مسائل کے بہت بڑا اور اہم قومی مسئلہ استرداد برار کا ہے، والیان ریاست کے ساتھ جو سیاست مرعی رکھی گئی ہے، اس سے، نیز قبضہ برار کی نوعیت سے تو امید ہونی چاہئے کہ اگر ہم نے تمام جائز آئینی ذرائع سے متحدہ طور پر من حیث الجماعت کوشش کی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری وہ شئے ہم کو نہ مل سکے جو عارضی طور پر ہم سے لی گئی ہے، مگر شرط یہی ہے کہ آج کل کے تمام دوامی مساعی سے کام لیا جائے، جن میں سے چند (مثلاً) ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہے، جس کا مقصد ہی اپنے حق کو واپس لینا ہو، اسی طرح ایک جماعت بیرون دکن بھی قائم ہونی چاہئے، جس کی دو شاخیں ہوں، ایک ہند، دوسری بیرون ہند نیز اس مسئلہ کا مخصوص ارگن بھی ہونا چاہئے، جو ہفتہ وار شائع ہو، اور اس کا ایک اڈیشن انگریزی میں بھی طبع ہوا کرے۔ اسی طرح کے متعدد طریقوں سے ممالک محروسہ کی پبلک میں واپسی برار کے متعلق عام معلومات کی اشاعت ہونی چاہئے، کیونکہ اس قسم کی چیزوں میں ہمیشہ جماعتی آواز زیادہ وزن رکھا کرتی ہے، امید ہے کہ بہی خواہان ملک و مالک اس طرف متوجہ ہوں گے، انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس اہم مسئلہ پر آئندہ بھی روشنی ڈالیں گے۔

نہایت حوصلہ افزائی کے ساتھ ہم اپنے نئے معاصر "لسان الملک" ماہانہ کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہر چند حضرت ضامن کنتوری کے شاندار ادبی روایات جن توقعات کی ضامن ہو سکتی تھیں، بقول مدیر علی گڈھ میگزین "وہ لسان الملک سے پوری نہیں ہو سکیں"۔ بر ینہم جو کچھ ہے غنیمت ہے، ہم معاصر موصوف کی مرحمت تبادلہ کے مرہون ہیں، اور اپنی مفصل رائے کو آئندہ دو تین اشاعتوں کے مزید مشاہدہ پر محول رکھتے ہیں۔

گزشتہ چند ماہ کے عرصہ میں دارالسلطنت کو بعض بزرگوں کے ورود کا شرف حاصل ہوا، جن میں سے خواجہ ثناء اللہ صاحب اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی (جو حال ہی میں تشریف لے گئے ہیں) کے پرمغز وعظوں سے دارالسلطنت کی پبلک بہت مستفید ہوی۔ ہمارا ہمیشہ سے خیال ہے کہ تربیت کو تعلیم پر اور مذہب و اخلاق کو سیاست پر ترجیح ہونا چاہئے۔ معاشرتی نظام کی برہمی ہی شیرازۂ اخلاق کے منتشر ہو جانے کا بہت بڑا سبب ہے، اور اس اعتبار سے حضرات موصوفین کے وعظ و نصائح، دنیا بھر کے علمی لکچروں سے کہیں زیادہ مفید و انسب ہیں، اور متعدد کالجوں اور اسکولوں سے بہت بڑھ کر وسیع اور قومی کام کرسکتے ہیں۔

مِلَل ہنود کا فلسفہ

(از نواب سر، امین جنگ بہادر (مولوی احمد حسین) ایم۔ اے صدر المہام بارگاہ خسروی)

(۲)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو ترقی نمبر ۱ جلد ۱

ہنود کی مذہبی کتابوں میں زیادہ تر بحث ذات باری (پرمیشر) و حقیقت روح (آتمان) سے ہے، ذات باری کی بحث کے چند اصول و فروع کا خاکہ سابقہ آرٹیکل میں کھینچا گیا ہے جو رسالۂ ہذا کے ماہ شعبان کے نمبر میں شائع ہوا ہے، اسی کے سلسلہ میں اب حقیقت روح کے چند اصول و فروع کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کا بھی حسب سابق مقصد یہی ہے کہ محض تصریح و توضیح کی جائے، کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔

علمائے ہنود کے نزدیک دنیا یعنی عالم محسوسات کے دو جزو ہیں جزو اول مادہ ہے جو باعتبار جنس ایک ہے لیکن جمادات، نباتات، حیوانات و انسانات کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کو (عالم اجسام) کہتے ہیں۔ جزو ثانی روح ہے جو باعتبار جنس ایک ہے مگر مختلف حالتوں میں متفرق اجسام میں حل ہو کر ان کی نشو و نما کی باعث ہوتی ہے، اس کو (عالم ارواح) کہتے ہیں، کلکتہ میں سر جگدیش چندر بوس نے چند خاص آلات کے ذریعہ سے ثابت کر دیا کہ حیوانات و انسانات کے سوا جمادات و نباتات میں بھی ایک قسم کی روح موجود ہے، مگر اس وسیع مضمون کو مختصر و محدود کرنے کے لئے یہاں روئے سخن صرف انسان و روح انسان کی طرف ہے، سہولت کی غرض سے اس مضمون کا خلاصہ ایک شجرہ کے طور پر حسب ذیل بتایا جا سکتا ہے۔

دنیا ــ عالم محسوسات

مادہ (عالم اجسام) — (حلول) — روح (عالم ارواح)

قالب انسان — (حلول) — نفس انسان

اعمال صالح — اعمال طالح — نیت نیک — نیت بد

کرم = دھرم

(۱)
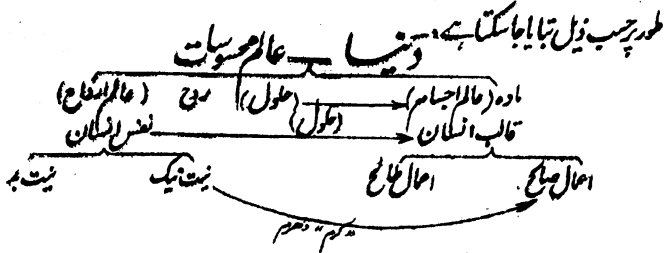
تناسخ ارواح عالم اجسام سے عالم ارواح بالکل جداگانہ ہے اگرچہ دونوں میں اکثر ارتباط واتحاد رہتا ہے، روحیں اپنے عالم سے اجسام میں آکر افراد انسان پیدا کرتی ہیں، ہر فرد بشر کی موت کے بعد اس کی روح علی العموم دوسرے جسم میں پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھی اپنے عالم میں واپس چلی جاتی ہے، روح کو جسم سے کس طرح ارتباط و اتحاد رہتا ہے وہ محض تشبیہات سے ہی بیان کیا جاسکتا ہے :۔

(الف) مادہ، مادہ کی شکل، اور روح، ان ہر سہ کے باہمی تعلق کی ایک تشبیہ وید کی کتاب چھاندگ میں ایک رشی نے اپنے فرزند کے سوال کے جواب میں بیان کی ہے، مادہ مانند پانی کے ہے جو جس شکل کے برتن میں رہے، اس کی شکل اختیار کرلیتا ہے، روح مانند نمک کے ہے جو پانی میں ڈال دینے سے اس میں ایسا گھل جاتا ہے کہ برتن کے تمام پانی کا مزہ یکساں کھاری رہتا ہے، گویا نمک کا ہر ذرہ پانی کے ہر ذرہ کے ساتھ پورے طور سے مل گیا ہے، جب ایک عرصہ کے بعد برتن سے پانی بخار ہو کر اڑ جاتا ہے، تو نمک جیسا پانی میں گھلنے کے قبل تھا ویسا ہی باقی رہ جاتا ہے، مادہ جب انسان کی شکل میں عیاں ہوتا ہے تو روح اس کے ہر عضو ہر حصۂ عضو، بلکہ اس کے ہر سالبہ میں یکساں ساری وطاری رہتی ہے، مگر جب مادہ شکل انسان کو بدلنے کی طرف مائل ہوتا ہے یعنے جب جسم مرتا ہے تو روح جیسی تھی ویسی ہی باقی رہ جاتی ہے۔

(ب) ایک اور تشبیہ یہ ہے کہ جسم مانند بانسری کے ہے، اور اس میں مانند بانسری بجانے والے کے سانس دخل وخارج ہوتی رہتی ہے، سانس ایک سرے سے داخل ہو کر دوسرے سرے سے خارج ہونے تک بانسری بولتی رہتی ہے، بعدہٗ خاموش ہو جاتی ہے، اسی طرح جس عرصہ تک روح جسم میں رواں رہتی ہے، جانور یا انسان جاگتا سوتا، کھاتا پیتا، بولتا چلتا رہتا ہے، مگر جس وقت روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے اس کی بول چال بالکل موقوف ہو جاتی ہے ؎

بالب دمساز خود گر جفتمے ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے (رومی)
ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا بینوا شد گرچہ دارد صد نوا

---

(۲)

مدارج ارواح جب تک روح زندان جسم میں مقید رہتی ہے، بمصداق کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ زندان سے رہا ہو کر اپنے عالم ارواح میں واپس چلے جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے، روح کی یہی کوشش آزادی ہے، جو جسم کے ان جملہ حرکات و سکنات کو عیاں کرتی ہے، جن کو ہم حیات و زندگی کے آثار سمجھتے ہیں، غرض علمائے ہنود نہ صرف روح کا وجود جسم سے جداگانہ مانتے ہیں، بلکہ اس کے حلول و اتحاد کے بھی قائل ہیں، ان کی رائے میں روح قدیم ہے حادث نہیں، کیونکہ اس کا مبدا و معاد ذات باری سے متعلق ہے، ہمہ اوست کہنے والے ویدانتیوں کے عقیدہ میں عالم ارواح ایک بحر ذخار ہے جس کے قطرے منفرد ارواح ہیں سے

حق بحر حقیقت ست و کونین درو (دارا شکوہ) چوں یخ بمیان آب و آب اندر یخ

اندر ہمہ اوست کہنے والے بھکتیوں کے عقیدہ میں عالم ارواح ایک بقعۂ نور ہے جس کی شعاعیں منفرد ارواح ہیں۔

یار لیلےٰ وش من غیر من و مجنوں نیست (دارا شکوہ) شمع از دائرۂ پرتو خود بیروں نیست

لیکن دونو فرقوں کا اتفاق ہے کہ جب منفرد ارواح اجسام میں آکر بشکل انساں پیدا یا ظاہر ہوتی ہیں (انفاس) کہلاتی ہیں، ہر نفس انسان کے تین درجے یا حالتیں ہیں، بھر، بھوار، سور گھد۔

(۱) روح کی حالت اسفل (بھر) نفس حیوانی ہے، جس کا خاصہ (کاما) شہوت ہے مثلاً بھوک پیاس وغیرہ جو جسم کے ضروریات نشو و نما کو رفع کرتی ہے، نفس حیوانی کو اہل تصوف کی اصطلاح میں نفس امارہ کہیں گے۔

(۲) روح کی حالت اوسط (بھوار) نفس خودی جس کا خاصہ (اہنکار) ہوا و ہوس یعنے ذاتی خواہش ہے، جو انسان کو اپنی (سکھ) راحت حاصل کرنے اور اپنے کو (دکھ) آفت سے بچانے کی کوشش میں رکھتی ہے۔

یہ وہی نفس ہے جس کو ہر انساں (منش) اپنی ذات سمجھتا ہے، اسی کو "ہمن" کے نام سے موسوم کرتا ہے، اپنے تمام اعضاء و افعال، اپنے تمام حالات و خصائل میں سے کسی کو بھی "مین" نہیں کہتا ہے

بلکہ ان سب کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے "یہ عضو میرا ہے، وہ فعل میرا تھا، میں ایسی حالت میں ہوں، میری خصلت ویسی تھی، گویا یہ سب اگرچہ اس کی ذات سے متعلق ہیں، لیکن اس کی ذات ان سب سے الگ ہے، اپنی ذات کے انھیں متعلقین سے کام لینے میں (نفسانیت) پیدا کرتا ہے، یعنے اپنی ذات کے واسطے جلب منفعت و دفع مضرت کے افکار و افعال میں مبتلا رہتا ہے جو فی الحقیقت اس کے نفس خودی کے اہنکار ہیں -

اہل تصوف نفس خودی کے ایک اہنکار کو نفس لوامہ کہتے ہیں، جب کہ وہ اپنے کئے سے پشیمان ہو کر اپنے آپ کو لعنت و ملامت کرتا ہے نفس خودی کی حالت لوامہ اس کو حالت علوی کی طرف مائل کرتی ہے -

(۳) روح کی حالت علوی (سورگھ) نفس ملکوتی ہے جس کا خاصہ (آتما) برات ہے یعنے تمام کاما و اہنکار جملہ شہوات حیوانی و خواہشات نفسانی سے بری یا الگ ہو جانا، اہل تصوف کی اصطلاح میں آتمان کو نفس مطمئنہ کہیں گے -

نفس حیوانی کو اپنے آپ کا شعور نہیں رہتا اور اگر رہتا بھی ہے تو اس قدر کم رہتا ہے جو بے شعوری کے مساوی ہوتا ہے، گویا ایک گدھا ہے جس کو اپنی ذات کی خبر ہی نہیں، اپنے پرائے کی تمیز ہی نہیں، فقط پیٹ بھرنے اور پیاس بجھانے کے واسطے مارا مارا پھرتا ہے، انسان بھی جس وقت کسی کام میں مبتلا ہو جاتا ہے، اپنی کسی شہوت کو پوری کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اس وقت اپنے آپ کو بھول جاتا ہے، اس کو اپنی ذات کا شعور نہیں رہتا، بخلاف اس کے نفس خودی کو اپنے آپ کا کامل شعور رہتا ہے وہ اپنے پرائے کی اچھی تمیز کر سکتا ہے، اسی ذاتی شعور کی وجہ سے وہ اہنکار نفسانیت - ذاتی ہوا و ہوس میں ایسا پھنسا رہتا ہے کہ اس کو خود اپنی خوشی و راحت کے سوا کسی دوسرے کے غم و اذیت کی پرواہ ہی نہیں رہتی اور اگر کبھی رہتی بھی ہے تو محض اپنی ذات کے سکھ کے واسطے رہتی ہے چنانچہ جو انسان اہنکار، نفسانیت، میں مبتلا رہتا ہے، وہ اگرچہ اپنے بال بچوں کی نگرانی حفاظت و پرورش کرتا ہے لیکن محض اپنی ذاتی غرض سے کرتا ہے، کیونکہ اگر وہ چین سے نہ رہیں تو خود اس کی

ذات کی راحت، سکھ میں فرق آتا ہے، یا اس کو کسی قسم کی اذیت ہوتی ہے، لیکن آتمان نفس ملکوتی ہر ایسی خود غرض، نفسانیت واہنکار سے بری رہتا ہے، اس کو پورے طور سے اپنے آپ کا شعور رہتا ہے اور اپنے پرائے کی تمیز نفس خودی سے بھی زیادہ یوں کرتا ہے کہ دوسروں کے راحت وآرام کو اپنی راحت وخوشی پر ترجیح دیتا ہے۔

ایک فرقۂ ہنود کا خیال ہے کہ آتمان نفس ملکوتی وہی ہے جو شہوات حیوانی (کاما) اور خواہشات نفسانی (اہنکار) کو بالکل ترک کر دے، بلکہ ان کو مار کر کالعدم کر دے، اسی غرض سے اس فرقہ کے بعض اشخاص تارک الدنیا (سنیاسی) ہو جاتے ہیں، شدید ریاضت اور نفس کشی کو بہترین عبادت سمجھتے ہیں، لیکن اور ایک فرقہ ایسی نفس کشی کو یعنے جسم کو ہر قسم کی آفت میں ڈال کر نفس کے کاما اہنکار بالکل ترک کالعدم کر دینے کو غیر ممکن سمجھتا ہے، اس کی رائے میں شہوات وخواہشات نیست و نابود نہیں ہو سکتے، انسان سے جو ہمیشہ مع الخطاء والنسیان ہے، فقط یہی ہو سکتا ہے کہ ہر امر میں اپنے ذاتی اغراض وخواہشات کو خدائے تعالیٰ کی جو نفس کل (پرآتمان) ہے، مرضی کے تابع کر دے، اس فرقہ کے اشخاص تارک الدنیا سنیاسی نہیں ہوتے بلکہ (بھکتی) یا مرد باخدا ہو کر اس کے خلایق کی بہبودی کے ہر طرح سے خواہاں وجویاں رہتے ہیں، بہرحال سنیاسی وبھکتی دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ نفس خودی دوسرے دو انفاس نفس حیوانی ونفس ملکوتی کے مابین بطور برزخ واقع ہوا ہے، کیونکہ اس میں ایک طرف خاصیات حیوانی دوسرے طرف خصوصیات ملکوتی دونوں پائے جاتے ہیں، آج کل کے سائنس کی رائے بھی یہی ہے

آدمی زادہ طرفہ معجون است	از فرشتہ سرشتہ وز حیوان
گر کند میل این شود کم ازین	ور کند قصد آن شود بہ ازآں

(۳)

ثمرۂ حیات وذریعۂ نجات اس تناسخ ارواح ومدارج انفاس کی ساری بحث کی غایت یہی ہے کہ مذہب کے دو اہم ترین امور کا تعین کیا جائے، ایک یہ کہ انسان کی حیات کا ثمرہ (کرم) کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ حیات کا بہترین ثمرہ پانے کا طریقہ (دھرم) کیا ہے؟

(۱) "کرم" یعنے ثمرۂ حیات - حین حیات یعنے جس عرصہ تک روح قالب میں مقید رہتی ہے دونوں کے باہمی ارتباط و اتحاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف قالب کی نشو و نما ہوتی ہے، دوسری طرف روح کی حالت بدلتی جاتی ہے، بتدریج درجۂ اسفل سے اوسط اور اوسط سے اعلیٰ کی طرف عروج پاتی ہے، یا برعکس اعلیٰ سے درجۂ اوسط یا اسفل کی طرف رجوع کرتی ہے، کسی انسان کی حیات کے آخر میں یعنے موت کے وقت جو حالت اس کے روح کی رہتی ہے، اس کو "ثمرۂ حیات" (کرم) کہتے ہیں، جیسے جیسے قالب میں روح کی حالت بدلتی جاتی ہے، ویسے ویسے وہ آرام پاتی ہے، یا آفتیں سہتی ہے، اور موت کے بعد دوسرے اچھے یا برے قالب میں پیدا ہوکر مزید آرام پاتی ہے یا مزید آفتیں جھیلتی ہے مثلاً اگر زید اپنی عمر بھر اپنی (کاما) شہوتوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے، تو اس کی روح نفس خودی کی اوسط حالت سے بتدریج نفس حیوانی کی اسفل حالت اختیار کرے گی، اور اسی وجہ سے زید خود اپنی زندگی میں کامل راحت نہیں پا سکے گا اس کی موت کے بعد اس کی روح کسی برے حیوان کے قالب میں پیدا ہوکر مزید آفتوں میں مبتلا رہے گی اگر خالد اپنے (اہنکار) خود غرضیوں کو ترک کرکے رفاہ عام کے کاموں کا دلدادہ رہے گا. تو اس کی روح نفس خودی کے اوسط قالب سے بتدریج ترقی کرکے نفس ملکوتی کی اعلیٰ حالت اختیار کرے گی، اور اسی وجہ سے خالد اپنی زندگی میں بھی چین سے رہ سکے گا، اور موت کے بعد اس کی روح کسی اچھے انسان کے قالب میں پیدا ہوکر خوش و خرم رہے گی، خاص خاص اشخاص جو اخیار و ابرار (رشی منی) ہوتے ہیں، ان کی روح جو نفس ملکوتی کی اعلیٰ حالت میں رہتی ہے، اس سے عروج کرکے ایسی اعلیٰ ترین حالت میں آجاتی ہے کہ ان کی موت کے بعد وہ کسی دوسرے قالب میں پیدا نہیں ہوتی، بلکہ عالم ارواح میں واپس چلی جاتی ہے، وہاں سے پرواز کرکے وصال الٰہی پاتی ہے ؎

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست (حافظ) روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم

غرض انسان کی حیات کا بدترین ثمرہ (کرم) یہ ہے کہ اس کی روح نفس حیوانی کی حالت میں بار بار حیوانوں کے بدترین قالب میں پیدا ہوکر حیوانوں کی سی زندگی طرح طرح کے رنج و محن میں بسر کرے، اور حیات کا بہترین ثمرہ (کرم) وہ ہے کہ روح نفس ملکوتی کی حالت میں بار بار اخیار و ابرار کے قالب میں پیدا ہوتی رہے اور

بالآخر عالم ارواح میں چلی جائے پھر عالم اجسام میں نہ آئے، بلکہ مزید ترقی کر کے وصال الٰہی سے مشرف ہوجائے۔

(۲) دھرم یعنے اچھا ثمرہ حیات حاصل کرنے کا طریقہ - اول تو عمل صالح ہے جو (کاما) شہوتوں سے جس قدر ہو سکے بچنا اور افراط و تفریط سے پرہیز کرنا ہے، ثانیاً نیک نیت جو (اہنکار) خود غرضیوں کو روکتی ہے، عمل صالح میں عبادت، ریاضت، سخاوت وغیرہ شریک ہیں اور نیک نیتی میں دوسروں کی بہبودی کو اپنے آرام و خوشی پر ترجیح دینا شامل ہے، لیکن بمصداق (الاعمال بالنیات) عمل و نیت توام ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، نیت جو نیک و بد ہوتی ہے، وہ نفس سے متعلق ہے، عمل جو صالح و طالح ہوتا ہے، اعضاء کے حرکات و سکنات پر مبنی ہے، پس عمل صالح وہی ہے جو نیک نیت سے وقوع میں آئے، انسان کی روح عمل صالح سے درجۂ اعلیٰ کو پہنچ سکتی ہے اور عمل طالح سے درجۂ اسفل کے مصیبتیں جھیلتی ہے -

لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت

شراب

از حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم

نام ایام بہاران است، ایام شراب ساقیا، فصل بہار آمد، بدہ جام شراب

تلخ، دشنام پریدیاں، بود آغاز مئے جان ستاں انداز معشوق است انجام شراب

چشم، بر مینائے مئے سائیم از فرط سرور بوسہ ہا چینیم، از رخسار گلفام شراب

مجمع یاران یکرنگ است و نکشین و تریں خلوت خاص است زاہد! محفل عام شراب

دشمن ارباب عقل و دل فریب جاں ستاں طرفہ معشوق است معشوق گل اندام شراب

"شرح جامی" را بجائے مئے رہن کن اے مولوی! پرس، از پیر مغانم شرح اقسام شراب

از دو چشم مست ساقی، شد ثبوت مستیش نشۂ کیفی نہ شد، محتاج الزام شراب

حجاز کے فرنگی سیاح

(از مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر مترجم حیدرآباد ہائی کورٹ)

گذشتہ سے پیوستہ

ایک اور مقام پر پٹس حاجیوں کی عقیدت کے ذکر میں لکھتا ہے :-

"تین دن کے قیام منٰی[1] میں تقریباً تمام حاجی یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ کم از کم دن بھر میں ایک مرتبہ مکے جاکر بیت اللہ کی زیارت کر آئیں وہ انتہائے تمنا و اشتیاق میں ہر روز منٰی سے مکے آتے ہیں، وفور شوق میں رستے بھر وہ بھاگتے ہوئے چلتے ہیں، اور جس وقت بیت اللہ پر ان کی نظر پڑتی ہے تو بے اختیار خوشی کے مارے زار زار رونے لگتے ہیں۔"

طواف الوداع[2] کے متعلق پٹس لکھتا ہے :-

"مکہ چھوڑنے سے قبل تمام کو حاجی بیت اللہ سے رخصت ہونے کے لئے جاتے ہیں اور باب السلام سے داخل ہوکر اس قدر طواف کرتے ہیں کہ تھک جاتے ہیں، اس آخری زیارت میں وہ بہت ہی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبے سے جدا ہونا ان کو نہایت ہی شاق گزر رہا ہے، پھر وہ زمزم کا پانی پیتے ہیں اور پچھلے پاؤں کچھ دور باب الوداع کی طرف چل کر دو رکعت نماز پڑھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ وہ دعا مانگتے ہیں، رخصت کے وقت کعبے کی طرف پیٹھ کرنا

---

[1] منٰی مکے سے ڈھائی کوس ہے، ۱۰، ۱۱، اور ۱۲ ذی الحجہ کو یہاں حاجیوں کا پڑاؤ رہتا ہے، اسی مقام پر قربانی کی جاتی ہے۔

[2] جب حج کے کل مناسک ختم ہو جاتے ہیں تو وطن کو واپس ہونے سے قبل طواف رخصت کیا جاتا ہے اس کو طواف الوداع کہتے ہیں، اس وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ بہت بڑی ہے اس کے الفاظ نہایت موثر اور رقت خیز ہوتے ہیں۔

چونکہ بے ادبی سمجھا جاتا ہے، اس لئے وہ الٹے پاؤں کسی آدمی کے سہارے چلتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ باب الوداع پر پہنچ جاتے ہیں واپسی میں وہ راستے بھر ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگتے، کعبے کی طرف حسرت و یاس سے نظر کرتے ہوئے، آٹھ آٹھ آنسو روتے اپنے قیامگاہوں کو لوٹتے ہیں۔"

ایک غیر مسلم کی زبان سے مسلمانوں کے اس جوش و خروش کا اعادہ دل میں ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے، خدا کا شکر ہے!

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است خم و خمخانہ بامہر و نشان است

حنفی مصلے[1] کے ذکر میں وہ لکھتا ہے:۔

"یہاں کوئی پچیس تیس آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھے تسبیح پڑھا کرتے ہیں، ان کے پاس دو تسبیحیں ایسے بڑے بڑے دانوں کی ہیں، جیسی کہ آدمی کی مٹھی، یہ لوگ نماز کے درمیان خالی وقت میں ان تسبیحوں پر کچھ پڑھا کرتے ہیں، ایک مرتبہ میں نے بھی اپنے تئیں ان میں سے تسبیح لے کر منکے ڈھلکانے شروع کئے، مجھے تو وہ بچوں کا کھیل معلوم ہوا، مگر دیکھنے والوں کی نظر میں اس وقت میں بڑا متقی و پرہیزگار معلوم ہو رہا تھا۔"

افسوس ہے کہ جو لوگ مذہبی کاموں کو کھیل بنا لیتے ہیں، ان پر غیر مذہب والے ایسے ہی قہقہے لگاتے ہیں یہ مکۂ معظمہ کے حالات میں ہٹس ایک نہایت ہی شرمناک اشارہ کرتا ہے:۔

"یہ شہر اگرچہ بہت ہی مقدس سمجھا جاتا ہے، تاہم بدکاری و بداعمالی کی بھی یہاں کمی نہیں ہے، فحش کے اعتبار سے وہ قاہرہ کا مقابلہ کرتا ہے اور چوری تو بیت اللہ میں بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔"

---

[1] بیت اللہ میں چار مصلے ہیں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، کعبے کی شمال کی جانب حنفی مصلے لکڑی اور پتھر کا ہوا دار کھلا ہوا دو منزلہ مکان ہے نیچے کی منزل میں امام حنفی جماعت کے ساتھ نماز پڑھاتا ہے اوپر کی منزل میں موذن و مبلغ رہتے ہیں، سوائے وقت فجر کے باقی سب اوقات میں حنفی نماز اول ہوتی ہے، مغرب کے وقت سب مل جل کر نماز پڑھ لیتے ہیں، صبح کی نماز اول شافعی طریق کی ہوتی ہے پھر دوسرے ائمہ کے طریق سے۔

ہماری نظر سے مسلمان حاجیوں کے بہت سے سفرنامے گزر چکے ہیں، مگر کسی نے مکہ معظمہ میں بدکاروں اور بداعمالوں کے وجود کا ذکر نہیں کیا، البتہ چوری کی وارداتوں کے اکثر شاکی ہیں، ممکن ہے کہ پاک نظر و پاک باز مسلمان حاجیوں کو بداعمالی کے ناگوار مشاہدات پیش نہ آئے ہوں اور مذکورۂ بالا اعتراف کو ہم پٹس کی بدنظری و بدبینی پر محمول کر دیں، لیکن نہایت رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر حاجیوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ میں بہت سے خلاف شرع امور ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے انسداد کے لئے وہاں سخت احتساب کی ضرورت ہے۔

پٹس مکہ معظمہ سے مدینۂ منورہ تک کے حالات سفر میں لکھتا ہے:۔

" ہمارے قافلے میں آئرلینڈ کا رہنے والا ایک نومسلم بھی تھا۔ وہ اس قدر کم سنی میں پکڑا گیا تھا، کہ وہ صرف مذہب عیسوی ہی نہیں بھول گیا تھا، بلکہ اس کو اپنی مادری زبان بھی یاد نہ رہی تھی، لطف یہ ہے کہ اس نے تیس برس اسپین و فرانس میں غلامی کی حالت میں گزارے تھے، مگر آخر میں چھوٹ کر وہ الجزائر پہنچا تھا، ترک اس کو بڑا جوشیلا اور پکا مسلمان سمجھتے تھے کہ باوجود عیسائیوں کی ترغیب و تحریص کے وہ مذہب اسلام سے منحرف نہیں ہوا تھا، میرے بعض پڑوسیوں نے جو اس سال الجزائر سے حج کے لئے آئے تھے، اس نومسلم سے کہا کہ اگر تم ہمارا کام کرتے چلو تو ہم اس سفر کے تمہارے کل اخراجات کے کفیل ہو جائیں گے، اس نے بخوشی قبول کر لیا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت وہ مکے پہنچا ہے تو اس نے بڑی خوشی کے ساتھ کہا کہ "اللہ تعالےٰ نے مجھے دنیا کی دوزخ یعنی فرانس و اسپین کی غلامی سے نجات بخشی اور جیتے جی بہشت یعنے مکے میں پہنچا دیا"۔ میں نے اس کی خوش اعتقادی کی تعریف کی، مگر اس کی حالت پر مجھے ترس آیا۔"

خدا کی قدرت ہے کہ وہ تیس برس تک عیسائیوں میں رہنے کے بعد مسلمان کا مسلمان واپس آیا اور پٹس پندرہ سال تک مسلمانوں میں رہنے کے بعد پھر عیسائی ہو گیا۔

مدینہ منورہ کے زائرین کے ذکر میں پٹس کہتا ہے، کہ مشرقی مجمع الجزائر ہند کے رہنے والے مدینے کی زیارت کو نہیں آتے، مدینہ ان کی راہ سے بہت دور پڑتا ہے، وہ صرف حج کر کے واپس چلے جاتے ہیں پٹس کا یہ خیال درست نہیں ہے، عموماً تمام دنیا کے حاجی مدینۂ منورہ کی حاضری فرض سمجھتے ہیں، البتہ وہابی اس کے پابند نہیں ہیں۔

روضۂ منورہ کی روشنی کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

"لوگ بیان کرتے ہیں کہ تین ہزار سے کم قندیلیں نہ ہوں گی مگر یہ غلط ہے، مجھے پوری طرح یقین ہے، کہ وہاں کوئی سو قندیلیں بھی نہ ہوں گی"

واللہ اعلم اس زمانہ میں زیادہ چراغ تھے یا نہ تھے، مگر اکثر قدیم سیاحوں نے قندیلوں اور چراغوں کی کثرت بیان کی ہے اور آج کل تو علاوہ برقی روشنی اور بیش بہا عجیب وغریب بلورین وزرین جھاڑ فانوسوں کے کوئی آٹھ نو سو قندیلیں روضۂ منورۂ و مسجد نبوی میں روشن ہوتی ہیں۔

برتما کی طرح اس نے بھی آنحضرتؐ کے مرقد مطہر کے معلق ہونے کی روایت کی تردید کی ہے وہ کہتا ہے:۔

"بعض لوگ یہ قصہ بیان کرتے ہیں کہ محمد (صلعم) کی قبر کسی سنگ مقناطیسی کی کشش کے سبب سے مسجد کی چھت میں معلق ہے، لیکن یقین مانو میں اس کو جھوٹ سمجھتا ہوں، جب میں نے پیتل کی جالی میں سے جھانکا تو معلوم ہوا کہ پردے جو مقبرے پر پڑے ہوئے ہیں، وہ چھت کی آدھی بلندی تک بھی نہیں پہنچتے، اس وجہ سے ناممکن ہے کہ آنحضرت کا مقبرہ معلق ہو سکے، میں نے مسلمانوں کو بھی اس کا ذکر کرتے نہیں سنا"

معلوم ہوتا ہے کہ اہل یورپ نے بطور اصول موضوعہ اس کہانی کو اسلامی روایت سمجھ رکھا تھا، ورنہ مسلمانوں کا تو یہ خیال کبھی رہا نہیں۔

مدینۂ منورہ سے واپسی مصر کے ذکر میں وہ لکھتا ہے:۔

"جب ہم قاہرہ سے پندرہ دن کے فاصلہ پر پہنچے تو بہت سے لوگ ہم کو ملے جو میوے اور مٹھائیاں اونٹوں پر لاد کر اپنے رشتہ دار حاجیوں اور دوستوں کو دینے کے لئے لائے تھے، جب قاہرہ سات روز کی راہ رہ گیا تو ہم کو سینکڑوں آدمی ملے جو اپنے دوستوں کی پیشوائی کے لئے آئے تھے، لیکن رات کا وقت تھا اور اندھیر چھایا ہوا تھا، اس لئے وہ اپنے اپنے آدمیوں کا نام لے کر پکارتے پھرتے تھے، جب قاہرہ تین منزل رہ گیا تو مصری لوگ دریائے نیل کا میٹھا پانی ہمارے پینے کے واسطے لائے[1]، اور جب قاہرہ ایک دن رات کا راستہ رہ گیا، تو ہزارہا آدمی ہمارے استقبال کے لئے آئے"

اللہ! اللہ!! اگلے زمانہ کے لوگ کس محبت و خلوص سے حاجیوں کا استقبال کیا کرتے تھے کہ پندرہ پندرہ دن کے دشوار گزار رستے طے کر کے ان کو تحفے پہنچاتے تھے، آج یہ عالم ہے کہ باوجود ہر قسم کی سہولت اور سفر کی آسانی کے خاص لوگ ہی اپنے رشتہ دار حاجیوں کی حیدرآباد سے بمبئی تک پیشوائی کرتے ہیں، ہے یہ کہ:۔

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسم کتابت ہو تو ہو

علی بے عرف بڈیا لا بلچ ڈومنگو

(۳)

تیسرا فرنگی سیاح حجاز جس نے اپنے مشاہدات سے اہل یورپ کو مستفید کیا وہ (اسپین کا باشندہ) علی بے تھا، اس کا اصلی نام بڈیا لا بلچ ڈومنگو تھا، اور وطن اسپین تھا جہاں ۱ اپریل ۱۷۶۶ء میں بمقام بارسلونا[2]

---

[1] سابق میں جب خشکی کی راہ سے مصری قافلہ حج کے لئے آتا جاتا تھا، تو مکے سے قاہرہ تک پہنچنے میں سینتیس[37] دن لگتے تھے، یہ راستہ نہایت سنگریزے چٹانوں اور ریگستان میں سے ہو کر گزرتا تھا، راستے بھر کہیں اچھا پانی نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لئے اہل مصر اپنے دوستوں کے لئے جو کھاری اور کڑوے پانی پیتے چلے آتے تھے، نیل کا میٹھا پانی لیجاتے تھے۔

[2] بارسلونا ملک اسپین کا بہت بڑا شہر اور نہایت خوشنما بندرگاہ ہے، یہ بحر روم کے کنارے واقع ہے اور بڑی تجارت گاہ ہے مختلف ممالک کو یہاں سے انواع و اقسام کا سامان تجارت جاتا ہے، اس کی آبادی تخمیناً چار لاکھ ہے۔

پیدا ہوا، اور شہر ویلنشیا میں اس نے عربی، ریاضی اور علم طبعیات کی تعلیم پائی، علی بے علوم متذکرہ میں اگرچہ پوری قابلیت حاصل نہ کرسکا تھا تاہم اس سے واقف ضرور تھا، زمانۂ طالب علمی میں اس کو عربی سے ایک خاص دلچسپی تھی، تحصیل علم کے بعد سرکاری ملازم ہوگیا، مگر ۱۷۹۳ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہوکر افریقیہ کے سفر کے ارادے سے میڈرڈ[1] گیا، شاہ اسپین نے اس کے ارادہ کو پسند کرکے امداد کا وعدہ کیا، جون ۱۸۰۳ء میں علی بے اسپین سے مصر روانہ ہوا، یہاں پہنچ کر اس خیال سے کہ اس کے سفر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، اس نے اپنا نام علی بے عباسی اختیار کیا اور شاہزادوں کا سا لباس پہن کر اپنے تئیں خاندان عباسیہ کا شہزادہ ظاہر کیا، علی بے شکل و شباہت میں مسلمانوں سے بہت ملتا تھا، اس کا میانہ قد، لمبا پتلا سر، سیاہ پتلی، لمبی ناک اور سیاہ ڈاڑھی، اس کے اسلام ظاہری کی کھلی ہوئی علامتیں تھیں، اس نے مسلمانوں کے عادات و اطوار و طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کرلی تھی، اور اپنی تدابیر کو مکمل کرنے کے لئے اس نے ختنہ بھی کرایا تھا، اس نے مسلمانوں کے مختلف شہروں کی سیر کی اور ہر جگہ اس کی بہت تعظیم و تکریم ہوئی، اس کی دانائی و قابلیت کا ایسا شہرہ ہوا کہ وہ والی فیض[2] یعنے سلطان مراکو[3] کے دربار میں بھی باریاب ہوا۔

برک ہارٹ جس نے اس سے کچھ دن بعد انھیں ممالک کی سیر کی تھی، اس کی نسبت لکھتا ہے وہ۔

> "ڈومنگو عرف علی بے اپنی مادری زبان اسپین کے علاوہ فرانسیسی اور اطالی زبانیں تو کچھ جانتا بھی تھا، مگر عربی وہ بہت بری طرح اور غلط بولتا تھا، تعجب ہے کہ نہیں معلوم علی بے میں پھر وہ کونسی خوبیاں تھیں، جن کے باعث اس کی شہرت ہوئی اور شاہی دربار میں بھی وہ باریاب ہوا"

برک ہارٹ کے مذکورہ بالا ریمارک پر اگرچہ اس قدر اضافہ اور کیا جاسکتا ہے کہ۔ ع

---

[1] میڈرڈ اسپین کا پایۂ تخت ہے آبادی یہاں کی قریباً پانچ لاکھ ہے۔

[2] فیض سلطنت مراکو کا پایۂ تخت ہے یہاں کی یونیورسٹی ایک ہزار سال سے زائد مدت سے قائم ہے جس میں افریقیہ کے مختلف حصوں سے طالب علم تعلیم پانے کے لئے آتے ہیں اور بالاوسط سات آٹھ سو طالب علم ہروقت رہتے ہیں، یہاں کی مسجد کردلی جسے مسجد مولا ادریس بھی کہتے ہیں نہایت خوشنما ہے، اس میں مدرسہ قایم ہے اور ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں تیس پینتیس ہزار کتابیں ہیں، فیض کی آبادی ڈیڑھ دو لاکھ ہے۔

[3] سلطنت مراکو مغربی افریقیہ کی ایک خودمختار اسلامی ریاست ہے، مگر اب یہاں فرانس کا اثر بڑھتا جارہا ہے۔

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

مگر بادشاہوں کے دربار میں باریاب ہو جانا کسی خاص قابلیت، زباں دانی اور خوبی پر منحصر نہیں ہے شاہی محلات اور بارگاہوں میں لائق و نالائق ہر قسم کے آدمی داخل ہو سکتے ہیں۔

علی بے مراکو میں دو برس مقیم رہا ۱۸۰۵ء میں یہاں سے روانہ ہوا اور تھوڑے تھوڑے دن طرابلس، مصر، اسکندریہ و قاہرہ میں قیام کرتا ہوا سوئز و جدہ کی راہ سے ۱۸۰۷ء میں مکے پہنچا، چونکہ اس زمانے میں حجاز وہابیوں[1] کے تسلط میں تھا اور زیارت کے لئے مدینۂ منورہ میں حاجیوں کا داخلہ انھوں نے ممنوع قرار دیا تھا، اس وجہ سے علی بے بعد اختتام حج اسی برس ماہ جولائی میں قاہرہ کو لوٹ گیا، یہاں سے

---

[1] وہابی مذہب کا بانی محمد بن عبد الوہاب سنہ ۱۶۹۱ء میں نجد میں پیدا ہوا تھا، اس نے مذہبی تعلیم اپنے باپ سے حنبلی طریق پر پائی اور کتب اہل سنت کا بغور مطالعہ کیا وہ تعظیم قبور اور استمداد قبور کو شرک قبر پرستی اور بت پرستی سے تعبیر کرتا تھا، اس نے ان رسوم کا قلع قمع کرنا چاہا بہت سے لوگ اس کے ہم خیال ہو گئے اور اس کے باپ عبد الوہاب کے نام کی وجہ سے یہ لوگ وہابی کے نام سے موسوم ہوئے، محمد کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک کے پھیلانے میں کوشاں رہے اور آخر اپنے مذہب کی اشاعت میں انھوں نے تلوار سے کام لیا، سلطنت ترکی کی کمزوری نے ان کے ارادہ کی تکمیل میں مدد کی، یہاں تک کہ ۲۷ اپریل ۱۸۰۳ء مطابق ۴ محرم ۱۲۱۸ھ کو سعود وہابی نے اپنا جھنڈا کعبہ میں جا بلند کیا اور مکے کو لوٹ کر وہاں کے تمام مزاروں کے گنبد ڈھا دئے، اردو کے مشہور شاعر انشاء نے جن کے زمانہ کا یہ واقعہ ہے اپنے ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا ہمارے کعبے کو وہابیوں نے لوٹ لیا

سعود کے متعلد وہی سنہ ۱۸۰۱ء میں قبر امام حسین علیہ السلام پر کربلائے معلیٰ میں کمال بیجائی اور مدینۂ منورہ فتح کر کے گنبد خضرا کی بھی اسی قسم کی بے ادبی کی اور مدینے جانے والے حاجیوں کو روک دیا۔ اس سے بظاہر انسداد قبر پرستی مقصد تھا مگر حقیقت میں ان کی غرض یہ تھی کہ ان کے خلاف عقیدہ رکھنے والے مدینہ میں جمع نہ ہونے پائیں۔ وہابیوں کی پے در پے فتوحات سے تمام عرب میں ان کا ڈنکا بجنے لگا سلطنت ترکی جو اس وقت اپنی اندرونی اصلاحات اور کفار فرنگ کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی، اس طرف متوجہ نہ ہو سکی آخر سنہ ۱۸۱۰ء میں وہابیوں کے خلاف مہم بھیجنے کی تیاری کی گئی اور ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا جو باب عالی کی طرف سے اس وقت مصر کا والی تھا، ایک فوج لے کر سوئز کی راہ سے مکے کی طرف بڑھا اور جہازوں کا ایک بیڑا ینبوع پہنچا۔ اور ترکی فوج نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا، پھر مختلف لڑائیوں کے بعد ترکوں نے وہابیوں کو فتح کر لیا، سب سے بڑی خونریز لڑائی طائف کے نزدیک بمقام بسیل ہوئی تھی، جہاں محمد علی پاشا فتح یا موت کی قسم کھا کر بیٹھا تھا، اور وہابیوں کو سخت شکست دی تھی، اس جنگ میں وہابی کے ایک ایک سر کے لئے پندرہ پندرہ روپئے انعام مقرر کیا گیا تھا اور شام ہونے سے قبل وہابیوں کے پانچ ہزار سر پاشا کے سامنے جمع ہو گئے تھے، مقتول وہابیوں کے سروں کا ایک مینار مدینہ منورہ میں بھی بنایا گیا ہے، جو قبۃ الرؤس کے نام سے مشہور ہے، کئی سال کی متواتر کوششوں کے بعد سنہ ۱۸۱۶ء میں عرب کی فتوحات محمد علی پاشا نے مکمل کر دیں اور حجاز سے وہابیوں کا استیصال ہو گیا، البتہ نجد میں ان کا علاقہ اب بھی باقی ہے اور وہاں ایک وہابی حکمراں ہے۔

چند روز بعد فلسطین شام، یافہ[1]، دمشق[2]، اور حلب[3] کی سیر کو روانہ ہوا، اور اپنا سفرنامہ مرتب کرنے کے لئے دو مہینے حلب میں قیام کیا۔ یہاں لوگوں کو اس پر عیسائی ہونے کا شبہ ہوا، مگر اس کی بے انتہا فیاضی، داد و دہش اور بڑے بڑے امیروں کے خطوط سے جو اس کے پاس موجود تھے، سب شکوک رفع ہو گئے اور وہ بال بال بچ گیا، اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ علی بے کا اپنے کو عباسی شہزادہ ظاہر کرنا، محض شیخی پر مبنی ہے اور اپنی مہم کو کامیاب ثابت کرنے اور سفرنامے کو دلچسپ بنانے کے لئے اس نے لکھ دیا، ورنہ جو شخص عربی النسل اور یادگار خلافت عباسیہ ہونے کا مدعی ہو اس کو اہل حلب عمولی مسلمان تک بھی نہ سمجھتے؟ حیرت کی بات ہے، میں اس مضمون کے دیباچہ میں لکھ چکا ہوں کہ یورپین سیاحوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر سفر حجاز میں عیسائی ہونے کا شبہ نہ ہوا ہو، جو لوگ بچ کر نکل آئے ہیں انہوں نے اپنی کامیابی کو بڑی طمطراق سے ظاہر کیا ہے، یہی حالت علی بے کی بھی معلوم ہوتی ہے، دوران سفر میں اس نے غالباً اپنے تئیں نو مسلم ظاہر کیا ہوگا اور حلب میں اس پر جب عیسائی ہونے کا شبہ ہوا تو وہ اس کی داد و دہش اور سفارشی خطوط سے رفع ہو گیا اور لوگوں کو یقین آ گیا ہوگا کہ یہ صدق دل سے مسلمان ہے، ورنہ آبائی مسلمان، عرب اور عباسی تینوں باتوں کا ثبوت ملنا سخت دشوار تھا، برکھارٹ لکھتا ہے کہ " سات برس بعد تک علاوہ حلب کے حمص[4] اور دمشق کے لوگوں میں اس کا چرچا تھا"۔

یہاں سے علی بے قسطنطنیہ پہنچا، وہاں اسپین کا سفیر اس کے ساتھ بہت خاطر و تواضع سے پیش آیا، مگر یہاں بھی لوگوں کو اس پر شبہ ہوا اور مجبوراً وہ جان بچا کر یہاں سے بھاگ گیا۔

---

[1] یافہ ملک شام کا مشہور شہر اور بندرگاہ ہے، ۱۷۹۹ء میں فرانس کے بادشاہ نپولین نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، ۱۸۳۲ء میں خدیو محمد علی پاشا نے واپس لے کر ترکی سلطنت میں شامل کیا، جب فرانسیسی یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے تو تمام ترکی قیدیوں کا قتل عام کر دیا اور تخمیناً پانسو بیماروں کو جو شفاخانوں میں تھے زہر دے دیا، یافہ کی آبادی پچاس ہزار ہے۔

[2] دمشق شام کا مشہور ترین شہر ہے، یہاں کا چپہ چپہ زیارتگاہ اور ایک ایک ذرہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک ورق ہے

[3] حلب شام کا بڑا شہر ہے یہاں کی اکثر مسجدیں اور مزارات قابل دید ہیں، خصوصاً حضرت ذکریا علیہ السلام کا مزار، شہر کے اطراف باغات کثرت ہیں، یہاں کا ریشمی کپڑا اور عبائیں بھی اچھی ہوتی ہیں، حلب کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے۔

[4] حمص شام کا نہایت قدیمی شہر ہے، باغوں کے بیچ میں آباد ہے، مردم شماری چالیس پینتالیس ہزار ہے۔

اسپین پہنچ کر علی بے سارا گوسا[1] کا ناظم مقرر ہوا پھر ۱۸۱۲ء میں قرطبہ[2] کا گورنر ہو گیا، مگر وہاں اس نے شاہ اسپین سے دغا کر کے نپولین شاہ فرانس سے سازش کر لی، آخر اس سازش کا بھید کھل گیا تو اس کو اسپین سے بھاگ کر فرانس میں پناہ لینی پڑی اور اس نے پیرس میں سکونت اختیار کر لی۔

علی بے کا سفرنامہ اولاً فرانسیسی زبان میں ۱۸۱۴ء میں "علی بے کا سفر افریقیہ و ایشیا" کے نام سے شائع ہوا تھا، پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر لندن میں چھپا اور علی بے نے خود وہاں جا کر اس کی تصحیح کی، اس کے بعد یورپ کی اور کئی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

۱۸۱۸ء میں علی بے نے پھر شام کا سفر کیا اور اس مرتبہ اپنا نام علی عثمان رکھا اور اپنے تئیں سلطنت فرانس کا پولیٹیکل ایجنٹ بتایا، مگر علی بے حلب تک پہنچنے پایا تھا کہ دفعتاً ۳۰ اگست ۱۸۱۸ء کو کسی نے زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ۱۸۱۴ء میں جب برکہارٹ نے شام کا سفر کیا ہے تو حلب وغیرہ میں اس کا ذکر سنا تھا، اب تھوڑی ہی مدت بعد کہ اس کی شکل میں غالباً کچھ زیادہ تغیر بھی نہیں ہوا ہو گا، اور وہاں کے آدمیوں کی نظروں میں ہنوز اس کی صورت تازہ ہو گی، لوگوں کو اس پر کامل شبہ ہو گیا، کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے علی بے کے نام سے آیا تھا، اور اب اپنے تئیں علی عثمان ظاہر کرتا ہے، بس اسی بات پر کسی نے اس کو زہر دے کر اپنا فرض کفایہ ادا کر دیا، مرض الموت میں جب حلب کے

---

[1] سارا گوسا اسپین کا ایک شہر ہے، زمانہ قدیم میں اس کی بہت شہرت تھی، حملہ اسپین کے وقت ۷۱۴ء میں مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا تھا، ۱۱۱۸ء میں عیسائیوں نے پانچ برس کے محاصرہ کے بعد واپس لے لیا، انیسویں صدی عیسوی کے ابتدا میں جب فرانسیسیوں نے اس پر حملہ کیا تھا تو اس وقت یہاں اہل اسپین نے بڑی سخت مدافعت کی تھی۔

[2] قرطبہ کئی سو برس تک سلطنت اسلامیہ اسپین کا دار الامارت رہ چکا ہے، عبدالرحمن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک نے ۷۵۶ء میں اس کو فتح کر کے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، محلات و مساجد و باغات کی کثرت سے یورپ کے بہترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا تھا، ۱۲۳۶ء میں عیسائیوں نے اسے مسلمانوں سے واپس لے لیا، اس کے بعد اسپین کی سلطنت اسلامیہ کا دار الحکومت غرناطہ قرار پایا، یہاں تک کہ سلطان محمد بن الاحمر کے زمانہ اور ۱۴۹۲ء میں قسطلیہ (کسٹائل) کے بادشاہ فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ آئزبلا نے پورا ملک اسپین فتح کر کے اس اسلامی سلطنت کا نام و نشان مٹا دیا، دس لاکھ مسلمان قتل کئے گئے ہزاروں کو زندہ جلا دیا، لاکھوں کو عیسائی بنا لیا اور تین لاکھ مسلمانوں کو جلاوطن کر دیا حتیٰ کہ اس عظیم الشان سلطنت میں جہاں (۷۸۰) برس مسلمان حکمران رہے، اور جہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے وہاں اسلام کا اب کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے، سینکڑوں معابد مقابر و مساجد اور خانقاہیں مسمار کر دی گئیں یا گرجوں اور عیسائی کنیسوں میں تبدیل کر دی گئیں، کہیں کہیں اب کسی عمارت کا نام باقی رہ گیا ہے اگرچہ علی العموم وہاں عیسائی مذہب ہے مگر اکثر جگہ اہل اسلام کے پردے کی رسم جاری ہے اور عیسائی عورتیں بھی بغیر برقعہ کے گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔

حاکم نے تحقیقات کی اور علی بے کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے مختلف کاغذات برآمد ہوئے، جن سے اس کی حقیقت کھل گئی، علی بے کے دوسرے سفر سے اہل یورپ کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے، البتہ پہلے سفر کے حالات جو اس نے تحریر کئے، اہل یورپ نے ان کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا، گربرک ہارٹ لکھتا ہے:۔

"مکہ معظمہ کے حالات جو علی بے نے تحریر کئے ہیں، ان کے بعض حصے غلط ہیں اور دوسری معلومات بھی کچھ ادھوری ہیں۔"

برٹن کی رائے ہے کہ "علی بے کی تحریر دو وجہ سے قابل قدر نہیں، اول یہ کہ ایام سفر میں اس نے اپنے تئیں شہزادہ ظاہر کیا، جس کے باعث وہ بہت سی ضروری باتوں سے محروم رہا، ہر جگہ آنے جانے اور معمولی اشخاص سے ملنے میں اس کی کسر شان تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے بطور فرانسیسی جاسوس کے سفر کیا تھا، تاہم اس کی کتاب میں مختلف دلچسپ واقعات درج ہیں، مگر مبالغہ کی چاشنی سب میں ہے۔"

مرتب کنندگان چیمبرز انسائکلوپیڈیا تحریر کرتے ہیں:۔

"علی بے پہلا عیسائی ہے جو اس مقدس شہر (مکہ) میں داخل ہوا اور نہ اشاعت اسلام سے اس وقت تک کسی کو یہ فخر حاصل نہیں ہوا تھا۔"

مذکورۂ بالا ریمارک بالکل غلط ہے، علی بے سے قبل لوئس برٹما اور جوزف پٹس دو عیسائی اور بھی مکہ معظمہ پہنچ چکے ہیں اور وہاں کے حالات اپنے سفرناموں میں انھوں نے قلمبند کئے ہیں۔

افسوس ہے کہ علی بے کا سفرنامہ باوجود سخت تلاش اور جدوجہد کے مجھے کہیں نہ ملا، ہندوستان اور ولایت سب جگہ سے مایوسی ہوئی، گزشتہ موسم گرما میں خاص اس کی تلاش کے لئے میں نے بمبئی کا سفر بھی کیا، اور وہاں کے کتب فروشوں وغیرہ سے پوچھا، اور سرکاری وخانگی کتب خانوں میں بھی تلاش کیا، مگر ناکامی ہوئی، اگر اس کا سفرنامہ دیکھنے میں آجاتا تو جس طرح دوسرے سیاحوں کے تحریرات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، اس کو بھی پرکھا جاتا۔

تاریخ قصرِ والاجاہی

(از مولنا عبد اللہ العمادی رکن دار الترجمہ حیدرآباد دکن)

یہ کتاب مولوی محمد حسین مرحوم کی تالیف ہے، جو والاجاہ بہادر صوبہ دار کرناٹک کے دربار میں میر منشی تھے، (تذکرہ گلزار اعظم میں ان کے حالات ثبت ہیں، اور خود یہ تاریخ شاہد ہے کہ وہ ایک ثقہ صادق القول مورخ تھے) سادہ و بے تکلف فارسی زبان کی یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، جس کے قلمی نسخے کی دو حجیم طویل جلدیں خاص مولف کے خاندان سے مجھے دستیاب ہوئیں، آخر میں کچھ اوراق رہ گئے ہیں، مگر جس قدر بچ گئی ہے نادرہ روزگار ہے، آثار سلف سے نسل حاضر کا اعراض دیکھتے ہوئے عجب نہیں کہ دنیا میں اس تاریخ کا اب یہی ایک نسخہ باقی رہ گیا ہو، کرناٹک کی تاریخ میں اس سے پہلے اور بھی کتابیں تالیف ہو چکی تھیں، انور نامہ، قشر بدالنوم، تزک والاجاہی، یہ سب معتبر کتابیں ہیں اور خود مولف نے ان کے حوالے بھی دئیے ہیں، ان پر انتقاد بھی کئے ہیں، مگر اس کتاب کی نسبت اسی قدر کہنا کافی نہیں، اصلی خصوصیت کچھ اور ہی ہے۔

مولف نے دربار والاجاہی کے روزانہ اہم واقعات قلم بند کئے ہیں، جن میں بیشتر خود اس کے مشاہدات ہیں مختلف انگریزی علاقوں کے گورنر، اور خاص بنگال کے گورنر جنرل، لارڈ کلایو، لارڈ ہسٹنگز، لارڈ کارنوالس وغیرہم، صوبہ دار کرناٹک کے حضور میں معروضے بھیجتے ہیں، انگریزی سفیر آداب دربار کو قدم قدم پر ملحوظ رکھتے ہوئے بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں، مجرا و آداب بجا لاتے ہیں، نذریں پیش کرتے ہیں، معروضہ گزرانتے ہیں، جس کے جواب میں دربار والاجاہی سے فرمان نافذ ہوتا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی اعانت میں تمام دولت وقف کر رکھی ہے، اور خود اسی میں مگن ہیں کہ گورنر انھیں خدایگاں لکھتا ہے، اور اپنے آپ کو ان کا فدوی خاص کہتا ہے، مولف نے ایک ایک کر کے ان تحریروں کے خلاصے دئے ہیں، جن سے اقبال دولت ہند کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہو سکتا ہے، اور یہ ایسا باب ہے جس کے بام و در کو آج کل

کی نام نہاد تاریخیں دریابرد کرتی جاتی ہیں۔

خاندان صوبداری کرناٹک، اصل میں دولت علیۂ آصفیہ ہی کا دست گرفتہ تھا، اس کے مورث انورالدین خان شہید تھے جو دہلی سے حضرت نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر کے ساتھ دکن آئے تھے، اور سرکار عالی ہی کے حکم سے کرناٹک کے صوبدار مقرر ہوئے تھے، پہلے پہل ۱۱۵۶ھ میں حضرت نواب مغفرت مآب نے جب ان کو فرخندہ بنیاد حیدرآباد کی نظامت سے سرفراز فرمایا ہے، تو ان دنوں اسی بلدہ کا محلۂ بیگم پورہ نیا نیا آباد ہوا تھا، جس کی بانی محل مبارک آصف جاہی تھیں اور اس محلہ کا انتظام انھیں کے وابستگان دولت و اقبال سے متعلق تھا تاریخ (قصر والاجاہی) میں ہے،

"انورالدین خان بہادر بہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد رسیدہ بہ توقیر زراعت و تکثیر محاصل و نظام مہام و انتظام امور انام پرداخت، و تنبیہ متمرداں و توقیر حق پرستاں و منع مناہی و رواج حکم الٰہی شعار خود ساخت، تا آنکہ خواست کہ در بیگم پورہ آباد کردۂ ما در نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ تنفیذ احکام شرعی نماید، کارکنان انجا بہ اتباع ہوائے نفسانی و اغوائے شیطانی سر از موافقتش باز زدند و بہ استمداد و امتناع احکام شرعیۂ مروجۂ آن خیر خواہ اسلام پیش آمدند، انگاہ بہ بیگم مسطورہ پیام فرستاد کہ بذات خود در منع مکروہات معمورۂ مذکورہ متوجہ شود، او جواب داد کہ در معمورۂ متعلقہ، اجرائی اوامر و نواہی کردن ایشاں را نمی سزد، و بر آں آبادی خارج دائرۂ حکومت ایشاں دم تصرف و تسلط زدن اصلا نمی زیبد۔

ازیں معنی خلاف شریعت غرا طبع حق گرای او بجوش شد و پورہ مزبورہ را ذلقۂ تجارت ساختند نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ از وقوع چنیں حادثہ پیام متعرضانہ صادر فرمود، و او جواب بدیں عنوان گزارش نمود کہ در رعایت امور دینی و حفاظت حدود شرعی پاس خاطر فقیر و امیر و حفظ مراتب شاہ و گدا خلاف حکم رب غفور است"۔

و بیگم نیز بکمال دل بستگی و آزردگی شکایت ایں جسر و احصار آں مروج احکام دین بحضور نواب آصف جاہ کہ در ملک کرناٹک محاصرۂ قلعۂ ترچنا پلی داشت، برنگاشت، و جوابش بہ ایں مضمون صادر گشت کہ:

"دینداری وصلاح شعاری وخداامینی وحق گزینی انورالدین خان بہادر مقتضی آن نیست که در معاملاتش کسے راجائے تعرض باشد، اگر شمارا باد موافقت نیفتہ ترک سکونت حیدرآباد واختیار اقامت اورنگ آباد بہ عمل آید۔"

سبحان اللہ وبحمدہ، واللہ اکبر، شریعت کی تعظیم اور امر بالمعروف کی بزرگداشت کس درجہ عام تھی؟ ایسے ہی روشن روایات ہیں جو اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ وسلطانہ کو اپنے نامور بزرگوں سے وراثت میں ملے ہیں، ایک مرتبہ دربار عید اضحیٰ میں ایک نظم پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کی "یہ خزف ریزے حضور کے قدموں پر نثار ہیں" حضور کو علم تھا کہ مداحانہ باد فروشی وبا خوانی سے اس کو سروکار نہیں، یہ صرف توحید مقدس کا مرثیہ خواں ہے اور زوال دولت اسلامی پر عبرت دلاتا ہے، ارشاد ہوا "اس میں اللہ و رسولؐ کا نام ہوگا، اسے قدموں سے کیا مناسبت؟" یہ فرمایا اور پاس ناموس شریعت کے جلال وجبروت سے چہرۂ مبارک برافروختہ ہوگیا، اعز اللہ بہ الدین، واذل بہ الکفرۃ المشرکین، امین امین اللھم امین

اس روشن خصوصیت کے بعد اب نکتہ شناسی کا ایک معاشری لطیفہ ملاحظہ ہو۔

انورالدین خان شہید نے ابتداءً عالمگیر پادشاہ کے دربار تربیت میں پرورش پائی تھی، اور تسبیح خانۂ شاہی کی داروغگی پر سرفراز تھے، بادشاہ کا روزانہ معمول تھا کہ عصر و مغرب کے درمیان تسبیح خانے میں سرگرم عبادت رہتے، کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہ ہوتی، اور ان اوقات میں کسی سے کلام نہ کرتے، حضر ہیں، سفر میں، میدان جنگ میں، معرکۂ رزم میں، کوئی کیسی ہی حالت کیوں نہ پیش آئے، اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا۔

پادشاہ اسی دکن میں ہیں، مرہٹوں سے جنگ چھڑی ہے، روزانہ معرکے گرم رہتے ہیں، غنیم کی پیشقدمی روکنے کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی جاچکی ہے جس کے متعلق ہنوز کوئی خبر نہیں ملی ہے، عصر و مغرب کا درمیانی وقت ہے، بادشاہ حسب معمول تسبیح خانے میں ہیں جہاں صدر اعظم تک کے قدم نہیں پہنچ سکتے، اسی عالم میں باب حکومت کو اطلاع ملتی ہے کہ مرہٹوں کی ناگہانی یورش سے شاہی فوج کی جمعیت درہم برہم ہوگئی، اطلاع تو پہنچ گئی مگر بادشاہ کے بدوں حکم کوئی انتظام نہیں ہوسکتا، کوئی روک تھام نہیں ہوسکتی، اور بادشاہ سے حکم لینے کا یہ وقت نہیں، مولف نے اس موقع کی تصویر دکھائی ہے،

"جملۃ الملک اسد خان وزیر سلطان، کیفیت تزلزل مجاہدان از اخبار واقعہ نگار دریافتہ جہت گزارش سرگزشت لشکر بحضور خاقانی شتافت، چوں بادشاہ در تسبیح خانہ مشغول اذکار و اشغال بود، دخل باریابی نہ یافت، ناچار داروغہ تسبیح خانہ یعنی نواب انوالدین خان را کہ بمقام معہود خویش نشستہ بود واسطہ عرض مدعا نمود، او قریب پردہ استادہ عرض کرد، بادشاہ بمقتضائے آں کہ مابین عصر و مغرب میان وظیفہ زبان بہ سخن نمی کشاد، قریں عرض لشکر لفظ بسم اللہ الرحمن الرحیم، واللہ اکبر را بر کرسی بیان جلوہ داد۔

انورالدین خان بہ وزیر حکم رسانید کہ رحمان خان و رحیم خان دو رسالہ دار خاص چوکی را با رسالۂ اکبری متعینہ حضور بہ اعانت لشکر باید فرستاد، وزیر ہم بریں حکم عمل فرمود، و ایں رسالہ ہا بہ لشکر دراماندہ پیوستہ اعانت نمود، چنانچہ بر دشمناں ہزیمتہا افتاد و بہ غازیاں غنیمتہا رو داد۔

بادشاہ از وظائف معمولی و نماز عشا فارغ شدہ ہمگی ارکان دولت را از بار عام مفاخرت بخشید و حقیقت مذکور را بہ پایۂ استفسار رسانید ....

انورالدین خان عرض کرد .... ہرگاہ از زبان مبارک بسم اللہ الرحمن الرحیم و اللہ اکبر شنیدم .... از لفظ رحمن بہ رحمن خان و از لفظ رحیم بہ رحیم خاں و از لفظ اکبر بہ رسالۂ اکبری متعینۂ حضور مفسر گردیدم و بدیں نحو حکم اشرف اقدس را بہ وزیر صائب تدبیر رسانیدم۔"

انورالدین خاں کی ترقی کا پیش خیمہ یہی ادا شناسی تھی۔

انورالدین خان شہید کے فرزند محمد علی خان تھے، جن کو نواب نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ شہید نے کرناٹک کا صوبہ دار مقرر کیا تھا اور "والاجاہ" کا خطاب دیا تھا، انھیں والاجاہ کی مدد سے احاطہ مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم جمے تھے، لارڈ کلایو جب بنگالہ پر مسلط ہو چکے، بکسر میں نواب شجاع الدولہ کو شکست دے چکے تو ۱۰ شوال ۱۱۷۸ھ کو دربار دکن کے نام ایک تہدید نامہ بھیجا جس کے چند فقرے اس کتاب سے ہم بھی نقل کرتے ہیں:

"یقین شناسد کہ افواج انگریز چوں امواج دہشت انگیز از ملک بنگالہ و منبی (بمبئی)
و چینا پٹن متراکم و متلاطم آمدہ ہم چو محیط دریا مرکز مملکت والا را آں چناں احاطہ نمایند
کہ یک وجب زمین ہم در تصرف صاحب نباشد۔

چنانچہ دریں روز ہا شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ را کہ در سطوت و صولت فائق تر
از نواب نظام الملک آصف جاہ بود، و در سال گزشتہ از راہ عاقبت نیندیشی در ملک بنگالہ
آمدہ پے روی مخالفاں می نمود، مغلوب کردیم، و بجنگ عظیم پیش آمدہ داغ ہزیمت
بر ناصیہ حالش نہادیم، و افواج منصورہ بنارس و الہ آباد و حیار د لکھنؤ را کہ بلا انفصال
معمور و مساکن و ممالک معمور بود، در حیطہ تسخیر کشیدند، و حوالہ پادشاہ (شاہ عالم بہادر)
گردانیدند، پادشاہ از طرف خود نجیب خاں (نجیب الدولہ بانی نجیب آباد) را آں ملک عطا فرمودند
یقین کہ ایں حادثہ بزرگ کہ قبل از ایام قلیل بوقوع آمدہ، مسموع شدہ باشد۔

.... مخلص کہ عازم بنگالہ گردیدہ، با فوج پنج ہزار فرنگی ولایتی و
دوازدہ ہزار سپاہی ایں ملک و دہ ہزار سواران جرار کہ نوکراں انگریز ہستند باشند کومی رسم"

یہ شاعرانہ تہدید نامہ لارڈ کلایو نے حضرت نواب میر نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی کی جناب میں بھیجا تھا،
جس کے نکات شعریہ کا جو اثر پڑا، مولف ہی کے لفظوں میں اسے بھی سن لیجئے:۔

"چوں قاصداں کہ بست و چہارم شوال از بندر چینا پٹن روانہ شدہ بست و ششم ماہ مذکور
فائز لشکر نواب میر نظام علی خاں گردیدہ ایں نامہ را بہ نواب موصوف رسانیدند، نواب
ہیچ جواب نگفت، و اصلا بحال نامہ بر ان نظر التفات نگماشت، و ایشاں را بیک
لقمہ طعام ہم ننواخت، تا آں کہ آں مقیدان عالم غربت بہ بے نوائی و پریشان حالی
تمام تا ہفتدہ روز در انتظار حصول جواب گزرانیدہ تا آخر دوازدہم ماہ ذی القعدہ
(۱۱۷۸ھ) وقت سواری خاص فریاد "الجواب" بر آوردند، نواب خشمگیں شدہ
آں نامہ را واپس نمود و حکم اخراج شاں از دائرہ گاہ لشکر خود فرمود"

ایک مقام پر مجلس شورائے دربار آصف جاہی کا تذکرہ کیا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے:۔

"بعد تقدیم بزم کنگاش و تصمیم ارادہ پرخاش، بہ حیدر علی خان نوشت کہ دریں ولا انگریز تجارت پیشہ بوساطت صوبہ دار کرناٹک، سر سرداری و ہوس ملک داری در سر داشتہ بے کانہ رایت تسلط دراں نواح برافراشتہ است، ما می خواہیم کہ بہ اتفاق شما ملک از دست رفتہ را باز بدست آریم۔"

کمپنی کی فوج کا جو عالم تھا اور دولاجاہ کی سپاہ جس طرح اس کی پشت و پناہ بنی تھی، اس کی کیفیت بیان کی ہے

"لشکر انگریز کہ از تاخت و تاراج سواران حیدر علی خاں خوفناک بود، از تائید دلاوران فوج اسلام جان یافت۔"

ہندوستانیوں کے ساتھ کمپنی کے سپاہیوں کا ان دنوں کیا برتاؤ تھا؟ لکھا ہے:۔

"فرنگیان فوج کمپنی کہ جابجا دریں ملک منتشر بودند، بہ ایذا رسانی رعایا و برایا کہ آبادانی ملک و معموری بلاد ازیں ست، جرأتے تمام بہم رسانیدہ، ہرچہ از ماکولات و مشروبات می یافتند ازیں بجبر و تعدی می گرفتند، واز ماکیاں و گوسفندان انچہ بدست می افتاد ملک خود دانستہ از لقمہائے حرام رودہائے شکم پر می ساختند، و جہت حمل اثقال و احمال و سرانجام مہام خود ہا رعایائے بے چارہ را بہ سخرہ می گرفتند۔"

معابد و مساجد کے احترام کی تفصیل دی ہے:۔

"کپتان متعین جنگل پیٹ بر مسجد قدیم ہشتاد سالہ بنا کردۂ میر حملہ مکانے احداث نمودہ ہم چنیں کپتان گرکتپالہ پے روی آں نمودہ مسجد آنجا را شکستہ بجائش بنائے خانہ سکونت خویش طرح انداخت، منہیاں اخبار بسمع اشرف واقدس رسانیدند، آں عرض و ناموس اسلامیاں بہ سزائے کردار شاں شتافتہ آں ہر دو خانۂ نو احداث را بگوے انہدام غلطانید، و مسجد شکستہ را تعمیر و دیگرے را ترصیص کنانید۔"

عوام اہل ہند پر کمپنی کے تسلط کا کیا اثر پڑتا تھا؟ اس کا بھی نقشہ کھینچا ہے:۔

"انگریزان ویونام تین بروہات حوالی پلچری مسلط گشتہ از جبر و اخذ گوسفندان و گاوان رعایا ابنان معدہا تنگ می ساختند، و ہم چنان نہ رنگیان تعینہ قلعہ جنگل پیٹ، و کرکنیا پلی، دوندواسی، و ترپاسور، و کنجی، و کاویری پاک، و ارکات و تمری، و تیاگ کدہ، و چیت پیت، از انعام و بہائم رعایائے تہی پایہ بہ امتلائے شکم می پرداختند، و آتش جور و جفا در کاشانۂ حال آن ستم کشان ہنگامۂ فرانسیسیان، کہ تا چہاردہ سال در پنجۂ ظلم فریقین اسیر گشتہ، سرمایہائے زندگانی و مواشی قلیہ رانی در باختہ، بعد رفع آن ہرج و مرج عظیم چون موران دانہ کش بگرد آوری اندک اندک از اسباب معیشت پرداختہ بودند، تازگی انداختند، و اگر مالکان زرے بر سبیل رشوت می دادند، بند از جانوران اسیر می کشادند والا بہ فریاد و فغان ہیچ کس التفات نمی کردند، و یغمار ا تمغا دانستہ بمغاک حلق و قعر معدہ فرو می بردند۔"

الی غیر ذالک مما یوجب الاطناب۔

اول نظر ہی میں کسی بات کو صحیح یا غلط مان لینا بے اصولی ہے، تاریخ کے طالب العلم کا فرض یہ ہے کہ ہر بات کی تحقیقات کرے اور مخالف و موالف ہر قسم کی شہادتوں سے واقعات کی تنقیح میں مدد لے، اس بنا، پر یہ کتاب اس قابل ہے کہ معرض تحقیق میں آئے، شائع کی جائے، اور علمی جماعت کی نگاہ تنقید اس پر محاکمہ فرمائے، واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

(مولانا محمد جلال الدین صاحب نوری پروفیسر عربی نظام کالج حیدرآباد کا ایک فارسی قطعہ و قصیدہ)

گزشتہ نمبر سے ترقی اور اس کے پڑھنے والوں کو مولانا ممدوح کے رشحات قلم سے بہرہ اندوز ہونے کا فخر حاصل ہے۔

عید اضحیٰ کی تقریب میں جو شاہی دعوت ترتیب دی گئی تھی، اس میں مولانائے ممدوح یاد فرمائے گئے تھے، اس موقع پر بارگاہ خسروی میں مولانا نے جو قطعہ اور قصیدہ گذراننے کی عزت حاصل کی وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ترقی عقیدے کی عینک لگا کے دیکھنے والا نہیں، اس کو طرفداری اور جانب داری سے کوئی واسطہ رہا ہے نہ رہے گا، یہ کسی کی تعریف و توصیف کے بے محل پل باندھنے کو اپنے فرائض کا کوئی جزء بھی نہیں سمجھتا، دنیا اہل کمال و اہل علم سے خالی نہیں آنکھ رکھنے والے دیکھیں، پڑھنے والے دل رکھ کر پڑھیں، سننے والے کان دھر کر سنیں، فارسی اور ایک ہندی کی فارسی!

ایرانیوں نے تو ہندوستان سے صرف دو آدمی کی فارسی پسند کی تھی۔ ایک خسروؒ اور دوسرے فیضی۔ مگر جیسا یادگار غالب میں مرزا نوشہ کا قول لکھا ہے " میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" اب لے دے کر صرف حضرت امیر خسروؒ ہی باقی رہے۔

کسی غیر زبان میں تصنیف و تالیف اس وقت تک مقبول و مستند نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے بولنے والے یہ نہ سمجھیں کہ یہ ہمارے ہی کسی بھائی بند کا لکھا ہے، عجم کی عربی پوچ ہے اگر اسے عرب نہ مانیں، اور ہند کی فارسی ہیچ ہے اگر ایرانی اپنی زبان نہ جانیں۔

اس کے قطع نظر نظم میں جو مجبوریاں شاعر کو درپیش ہوتی ہیں وہ ایک نثار مصنف کو ہرگز ہرگز

نہیں ہوسکتیں ترقی کھلم کھلا کہے گا کہ ذیل کا قصیدہ بے شک اپنا جواب آپ ہے کم سے کم اس قصیدے کی ایک ادنیٰ خوبی جس کو ترصیع کہتے ہیں، قابل دید ہی نہیں، لائق ہزار تحسین و آفریں ہے کہ اس سے کوئی مطلع تک بھی خالی نہیں، اور یہ جدت یا پابندی حضرت مصنف کی ذات کے لئے خاص ہے کمال تو یہ ہے کہ ترصیع کی خاطر کوئی لفظ بھرتی کا نہ ہوا آخر تک بندش کی وہی چستی باقی رہے جو مطلع میں ہو، اور اب اگر فارسی اصطلاحوں اور رسموں وغیرہ سے ناواقف لوگ اس کے بیان کو گنجلک یا اس کی زبان مغلق سمجھیں، تو اس کا ذمہ دار کوئی نہیں۔ (ترقی)

قطعہ

مالک ملک دکن عثمان علیخاں بادشہ ہست خاک پائے او لعل کلاہ سروری
شاہ کیواں فر کہ اندر کارگاہ کائنات دائم از بخت بلندش فال گیرد مشتری
در پناہ سایۂ عدل رعیت پرورش چشم خفاش ست و نور آفتاب خاوری
اختر اقبال شہ آنجا کہ پرتو افگند غول بدبختی فروشد جلوۂ نیک اختری
داد فضل بیحسابش رونق علم و ہنر بردہ جود و گنج زیرشس آب زر جعفری
ای بعمر خضر اندانی کہ عہد دولتت خط باطل میکشد بر دولت اسکندری
جشن سور و عید قربان بادمیموں سال و مہ تا درخشد مہر و مہ بر آسمان چنبری

قصیدہ

حسن تو اے رشک بتان، ناموس آذر شکند عشق تو اے جان جہاں، پشت سمندر شکند
سنبل تباب از بوئے تو، بلبل خراب از بوئے تو با آفتاب روئے تو، رنگ گل تر شکند
موئے تو راز کاف دنون، گویا بعقل ذوفنون بوئے تو از شور جنوں، مغز قلندر شکند
مرجاں لب خنداں تو، ہر جاں بلاگرداں تو اے گوہر دنداں تو، دنداں گوہر شکند
زیر سپہر چنبری، از مہر و مہ بالا تری اے درد دل حور و پری، حسن تو خنجر شکند
خد تو رنگ زعفراں، بند بروئے ارغواں قد تو اے سرو رواں، قد صنوبر شکند

گلگشت رضواں کوئے تو، گلشن رخ نیکوئے تو ‏— گیسوئے عنبر بوئے تو، بازار عنبر بشکند

گر آتش عشق تو بر، سنگیں دلے بند داثر — دریائے غم لولوئے تر، چوں ابر آذر بشکند

خوبان آتش رو خجل، ترکان آتش خو جل — رفتارت اے آرام دل، صفہائے محشر بشکند

سر بشکند سودائے تو، مردافگند صہبائے تو — اے نرگس بینائے تو، مینائے عبہر بشکند

چشم تو گر یک چشم زد، بر زاہد خود بیں فتد — بر تارک مستی ابد، رندانہ ساغر بشکند

شیریں لباں فرہاد تو، فرہاد کش بیداد تو — اے جور و استبداد تو، غوغائے بیور بشکند

گر قطب گیرد یک زماں، در منزل عشقت مکاں — زنار بندد بر میاں، ہم خنجر محور بشکند

شمع رخت خنداں چو گل، حیراں حسنت عقل کل — عشقت بیک پیمانہ مل، صد جام کوثر بشکند

نوری سپہر نہ طبق، اینجا اگر خواند سبق — یک بارہ برگردد ورق، ایں مہرہ زر بشکند

خورشید رویان زمیں، چوں کوسہ داں بر نشیں — بدستی آں مہ جبیں، گر کاسہ بر سر بشکند

آں ماہروئے حورو‌ش، بر ہم زن روم و حبش — کش گیسوان مارفش، سر پنجہ خور بشکند

مطلع

امروز ادائے حلف او، پیمان دیگر بشکند — بر گوئے بر خوں زلف او، چوگان دیگر بشکند

آں مہر سیما کز شرف، مہ گر شود با او طرف — لولی بناگہ چنگ و دف، بر ہفت شوہر بشکند

نور بصر خاک درش، آب بقا لعل ترش — نعش قتیل خنجرش، نقش سہ دختر بشکند

چوں کسمہ بر رخ بشکند، بنیاد ایماں بر کند — وز حرف تلخش گر زند، ذوق تو شکر بشکند

قم عیسی و لب مریمش، جاں بخش روح القدس دمش — راقص بیک جام غمش، زہر صدا اژدر بشکند

گل چہرہ سیمیں غبب، مشکیں خط یاقوت لب — بازار حسنش روز و شب، نرخ مہ و خور بشکند

محراب ہاروت ابروش، ناہید اسیر گیسوش — دستان چشم جادوش، دست فسوں گر بشکند

آنرا کہ از رنگ کہی، بخشد غمش زرد ہی — فقرش کلاہ گہ گہی، چوں طرف افسر بشکند

سیل گراں از چشم تر، گردد رواں در بحر و بر — فصاد ہجرش بر جگر، آندم کہ نشتر بشکند

بیخ تعلق بر کنم، تا بر درش رخت افگنم — من عہد خود را نشکنم، او عہد خود گر بشکند

بیمم دہد گردون دوں، کاینجا ہدر سازند خوں — امید خوں بخت زبوں، در جان مضطر بشکند

آشفتہ دل چوں سنبلم، شوریدہ سر چوں بلبلم — مانند آں شاخ گلم، کش باد صرصر بشکند

عشق است اعمیٰ اکبرش، جانست زخم خنجرش — خوابم دو چشم کافرش، در دیدہ تر بشکند

نوری ویں کنج قفس، دود غم ست از پیش و پس ۔۔۔ زنیم برہ سوزد نفس، وآنگہ بعجز بشکند
برفرق من تیغ دودم، ہر دم زند بخت دژم ۔۔۔ چوں در دلم پیکان غم، چرخ ستمگر بشکند
یکساں نماند طور چرخ، اے دل حذر بس از دور چرخ ۔۔۔ آنجا کہ دست جور چرخ، انصاف داور بشکند
آں داور انجم سپہ، عثمان علیخاں بادشہ ۔۔۔ کز فرہی طرف کلہ، بر ماہ انور بشکند

مطلع

جائیکہ آب خنجرش، سودائے آذر بشکند ۔۔۔ کار از رماح اسمرش، بر موت احمر بشکند
گہ دولتش دیں پرورد، گہ صولتش جاں بشکرد ۔۔۔ ایں رخ سوئے خیر آورد، وآں خیبر شر بشکند
بازندہ میغ دولتش، برندہ تیغ صولتش ۔۔۔ پر ہمائے شوکتش، فر مظفر بشکند
بہرام نوک خنجرش، خورشید طرف افسرش ۔۔۔ نہ چرخ را سنگ درش، روئے مجدر بشکند
بر روئے سہ مشک ختن، ریزد بکلک نوشتن ۔۔۔ تا بر رخ ملک دکن، جعد معنبر بشکند
دستش طراز جود بست، الحق لب جود بست ۔۔۔ آندر کہ حرماں نو دبست، انعامش آں در بشکند
دنیا ز زر مردود داد، بخل از جہاں مطرود داد ۔۔۔ قدر دو معدن جود او، در ہفت کشور بشکند
لطف ست و قہرش در صفات، آندم کہ زائد حادثات ۔۔۔ ایں مردہ را بخشد حیات، آں جیش بیمر بشکند
باسش گہ کیں آوری، داند سمندر پروری ۔۔۔ بذلش گہ زرگستری، رنگ رخ زر بشکند
خورشید غرق نعمتش، گردوں غلام ہمتش ۔۔۔ گردن کشاں را حکمتش، گردن بکیفر بشکند
علمش چو افرازد علم، ظلمت رود سوئے عدم ۔۔۔ حلمش گزارد گر قدم، نہ پایہ منبر بشکند

ق
روزیکہ از گرد سپہ، گرد درخ گردوں سیہ ۔۔۔ وز طعن و ضرب رزمگہ، برگادہ اختر بشکند
ہنگامۂ خصم دژم، تیغش چناں پاشد زہم ۔۔۔ کافواج انجم صبحدم، خورشید خاور بشکند
ماہ ست در قید رقش، واہ ست شاہ مشترقش ۔۔۔ جذر اصم از منطقش، قند مکرر بشکند
نظم برین شعر ترش، روح القدس گوہر خرش ۔۔۔ شعری بعرض جوہرش، چوں لعل و گوہر بشکند
ہر کو انگلی بر سر زند، کز مدحتش سر بر زند ۔۔۔ از تار جاں مسطر زند، نوز غنچہ دفتر بشکند
خلق لطیفش چوں اجل، گر میکشد خصم دغل ۔۔۔ بنگر کہ چوں مغز جعل، بوئے معطر بشکند
شخصش کہ با دا بیعرض، از نوع بود انجا غرض ۔۔۔ فضلش بجنس یک عرض، فصل و دو جوہر بشکند
گیرد ز بیم او از نے، بیروں رود مستی زمے ۔۔۔ آنجا کہ باد حلم وے، گلزار منکر بشکند
اے ماہ اوج سروری، وے مہر برج مہتری ۔۔۔ سہمت بدست مشتری، قوس موتر بشکند

گوہر فشاند فضل تو، آتش نشاند نیل تو
روبہ ہمین عدل تو، از زور غضنفر بشکند

مطلع

عدل تو دائم گر چنیں، دست ستمگر بشکند
خوں گریہ چرخ بریں، بس لعل و گوہر بشکند

از ہیبت افتد در ترک، وآنگہ نفس گردد خنک
روزے کہ شہباز فلک، بال کبوتر بشکند

اردی نماید ماہ دے، گلہا دماند بوئے مے
آوازۂ کاؤس وکے، عہد تو یکسر بشکند

بر فتنۂ آخر زماں، رہ گر نہ بندی از اماں
سیلش پل ہفت آسماں بر ماہ و اختر بشکند

آوازۂ الامر لک، آویزۂ گوشش ملک
نیروے دشمن را فلک، در بحر و در بر بشکند

ہم دشمناں مہمان تو، ہم دوستاں بر خوان تو
چوب ادب حسان تو، بر معن و جعفر بشکند

بحر سخا را گوہری، کان عطا را جوہری
خیم تو نعمت گستری، بیم تو لشکر بشکند

بیضا ضیائے رائے تو، روشن ید بیضائے تو
صد بیضہ خاک پائے تو، در تاج سنجر بشکند

عزم تو چوں خنجر کشد، یاجوج دوں کیفر کشد
حزم تو بارو گر کشد، سد سکندر بشکند

فتح مبیں سرہنگ تو، بر پیل چرخ اورنگ تو
اے فرۂ فرہنگ تو، فر دو پیکر بشکند

گرز و بخشی زال را، گردانی آنجا حال را
سیمرغ زریں بال را، موسیچہ شہپر بشکند

تیغ قضا شمشیر تو، شیر فلک نخچیر تو
پیوست آں گر تیر تو، آہوئے لاغر بشکند

روزی مدارا اینجا عجب، گر غرۂ ماہ رجب
بر عارض خور زلف شب، خم و خم اندر بشکند

تا آفتاب از قعر چہ، بندد امید تاج و گہ
تا چنبر سہ سال و مہ، چرخ مدور بشکند

نعل فرس جرم مہش، چرخ متعرنش نخر گہش
وز جلوۂ خاک رہش، مہر منور بشکند

ہم شاد بہرش دوستاں، ہم ہندوش ہندوستاں
تا گل گلہ در بوستاں، بر چرخ اخضر بشکند

افسار اسپش روز کیں، باد افسر خاقان چین
آیات فتحش ہمچنیں، رایات قیصر بشکند

تا آسمان چنبری، گیرد رہ تیر آوری
تا در کمان مشتری، تیر پری پر بشکند

دوزد بہ تیر تیز پر، خصم ترا جوشن ببر
خصمی کہ بر سر سر بسر، بی گرز مغفر بشکند

فال از رخت بر جبیں را، نور از دست ادریس را
تا نخوت ابلیس را، طین مخمر بشکند

تا آتش تر بارہا، گلشن کند رخسارہا
تا حسن ایماں خارہا، در چشم کافر بشکند

دور فلک خنجر شود، بخت عدد خنجر شود
قرباں برت سنجر شود، فر تو ہر فر بشکند

مقدمہ دیوان جان صاحب

از جناب مصور لطافت آغا حیدر حسن صاحب دہلوی (علیگ)

گذشتہ سے پیوستہ

جس مکان کی کڑیاں، چڑ چڑ کرتیں، وہ مکان منحوس سمجھا جاتا، اس کی نحوست دور کرنے کو دہی کے چھینٹے کڑیوں پر دئے جاتے، اور راور ٹوٹکے کئے جاتے، اور خیال کیا جاتا کہ کڑیوں کا چڑچڑانا، منادی یا کسی رہنے والے کی مرگ ناگہانی کو بتاتا ہے، اس لئے اس حصہ مکان کی بود و باش، ترک کر دیتے تھے، جان صاحب نے بھی ڈر کر وہاں سے اٹھنے کو کہا ہے:۔

کوٹھے پہ رہو آکے، یہ دالان کرو ترک بی بولنا منحوس ہے اس چھت کی کڑی کا

اسی طرح دولہا، دلہن کے سہرے کی لڑی کے ٹوٹنے کو بدشگنی سمجھتے، اور اس سے سہاگ کو دیرپا نہ جانتے:۔

ہو خیر دلہن، دلہا کی ماتھا مرا ٹھنکا اچھا نہیں یہ ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا

راگنیوں کے وقت بے وقت الاپنے پر بھی، بڑا عقیدہ تھا، جان صاحب کو چونکہ موسیقی سے ایک طبعی مناسبت تھی، جس کو دبی زبان میں، اس طرح قبولے ہیں:۔

ہے شوق گانے بجانے کا جان صاحب کو، جو گھر میں ان کے یہ چنگ و رباب رہتا ہے
بے بھاس کے بے وقت گانے کو، منع کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بے وقت الاپنے سے لڑائی ہو جاتی ہے، اس لئے جتاتے ہیں:۔

جان صاحب کہیں نہ قصہ ہو، گاتی بے وقت ہے بے بھاس خواص

آبخورے سے، سر پہ پانی ڈالنا برا سمجھا جاتا تھا، اور خیال تھا، ایسا کرنے سے بال اتر جاتے ہیں،

اور بال خورہ ہو جاتا ہے، جان صاحب بھی نصیحت کرتے ہیں :-

نہ آبخورے سے ڈلواؤ سر پہ پانی تم اسی سے اے بوا ہو جاتا بال خورہ ہے

اکثر گھرانوں اور خاندانوں میں، بعض چیزوں کی مارسے دبلے ہو جانے کا اندیشہ کیا جاتا، یا کسی روگ کے کھڑے ہو جانے کا خوف ہوتا، مثلاً اگر کسی کے جھاڑو لگ جاتی تو وہم کرتے کہ سوکھے کی بیماری لگ جائے گی، اس لئے جھاڑو کی تیلیوں کے سرے، توڑ کر تھتکار دیتے، اگر یہی جھاڑو کتے بلی کے لگ جاتی، تو وہم کرتے کہ انھیں کھانسی ہو جائے گی، اس لئے اس کے توڑ کو تیلیاں توڑ تھتکار دیتے، ہری ٹہنی سے بھی نہ مارتے اور وہم کرتے تھے، پھنکنی سے مارتے تو، خیال کیا جاتا کہ آدمی موٹا ہو جاتا ہے، کفگیر سے اگر مارتے، تو جانتے کہ پٹنے والے کو ہوکا ہو جائے گا، اس قسم کے توہمات میں، دنوں اور وقتوں کو بھی دخل تھا، اس لئے جان صاحب کو ہول اٹھا، اور وہ پکار اٹھے :-

منگل کا دن ہے صاحب ہو جائے گی وہ دبلی بچی کو میری دیکھو، مارو نہ تم ٹھیڑی

ایک جگہ زناخی کو سمجھایا گیا ہے :-

نہ کر رات کو کنگی لہر میں تو اپنی زناخی! بہت دل پریشان ہوگا

وہ بچہ جو پاؤں کے بل پیدا ہوتا تھا، اسے پائل کہتے تھے، اور ٹونے ٹوٹکے میں اس سے لوگ بہت کچھ مدد لیتے تھے، کمر میں چپ آجاتی، تو یہ ٹوٹکا[1] "ایک برایک" سمجھا جاتا کہ پائل کی ٹھوکر لگوائی جائے، اس لئے جان صاحب کہتے ہیں :-

پائل ہے دگانہ، ذرا ٹھوکر تو لگا جا چک آئی ہے، اٹھا نہیں جاتا ہے کرے

جب بچہ کسی سے اپر آتا، کسی طرح اس کا ہٹر کا دور نہ ہوتا، تو قبر کی مٹی چٹاتے، تاکہ وہ ہل جائے اور گئے کا ہٹر کا نہ کرے، جان صاحب نے اس کو اس طرح بتایا ہے :-

بے طرح بچی ہے، کندن سے ہلی اے صاحب! قبر کی مٹی چٹانا اسے اکسیر ہوئی

بلی اگر کسی کا راستہ کاٹ جاتی، تو خیال کرتے، کہ جہاں جانا ہوگا وہاں بدمزگی پیدا ہوگی اس لئے اگر کوئی گھر میں داخل ہوتے ہی جھگڑا نکالتا تو کہتے کہ بلی تو لانگ کے نہیں آئے، جان صاحب

[1] سریع الاثر، مجرب ۱۲

لکھنؤ کی زبان میں اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

غرّا و نہ اے شیر خان! لو ہوش کے ناخون
تم آئے ہو بلی تو نہیں نانگھ کے گھر سے

یہاں دلی والوں کی لانگ کی بجائے "نانگھ برتی ہے، اکثر الفاظ ایسے ہیں، جو دلی والوں کے خلاف محاورہ ہیں، مثلاً دھڑکا بجائے خوف کے مرادف ہونے کے، دھڑکن کے معنوں میں استعمال کیا ہے مچھی، جس کو دلی والے بہی اور باہر والے مٹھو کہتے ہیں، بوسے کے معنوں میں لی ہے ....

سہ پہری بجائے سہ پہر کے، ڈولی کا کرایہ جس کے لئے دلی پیاری میں کوئی مفرد لفظ موجودہ زمانے میں استعمال نہیں ہوتا، جان صاحب کے یہاں اس کے لئے کہاری موجود ہے، لیکن دلی میں کہار کی جورو کو کہاری کہتے ہیں، ڈولی کے کرایہ کو نہیں، اسی طرح "قرق بٹھانا" "دھونس بٹھانے" کی بجائے برت گئے ہیں، اور "قرق کرنا" حکومت کرنے کے معنوں میں لیا ہے، "چاندی کا پہرا" نیک قدم اور "سونے کا پہرا" سبز قدم کے بدلے استعمال کیا ہے، "بادکا گھوڑا" ہوا کے گھوڑے کی جگہ باندھا ہے، سختی کرنے کی بجائے "کوڑا کرتا" لگایا ہے، عقل کام میں لانے کے بدلے "عقل کام فرمانا" کام میں لائے ہیں "کٹے لگ جانا" نیگ لگ جانے کی جگہ لگا گئے ہیں، "ستم جوتنا" غضب ڈھانے" یا ستم توڑنے کے موقع پر کہہ گئے ہیں، مرچی، مرچ کی جمع استعمال کی ہے، مثلاً کہتے ہیں:۔

اس پہ تو کرتی ہے یہ چرب زبانی باندی مرچی منگوائی ہیں کیا خوب اری بازار سے

دلی جانی میں اس کی جگہ مرچیں استعمال کرتے ہیں، لیکن حیرت ہے حیدر آباد میں مرچ کی جمع مرچی اب تک بجنسہ مروج ہے[۱]، شاید گارون دی تاسی نے جو اپنے تذکرہ میں جان صاحب کو اورنگ آباد تک پہنچا دیا ہے، تو شاید یہ دکنی مرچی یہیں سے باندھ کر بیچارا لکھنؤ لے گیا ہو، دکن کی سیر کا ایک ان کے شعر سے بھی پتہ چلتا ہے، لیکن کچھ ایسا مبہم میں کہہ گئے ہیں، کہ وہ چیستان اور معمہ ہو کے رہ گیا:۔

پتلیاں بھانمتی آنکھیں ہیں یہ حیدر آباد ایک عالم کا دکھاتی ہیں تماشا دونوں

---

[۱] مرچی حیدر آباد میں مفرد ہے، اس کی جمع مرچیاں ہیں، اور اہل لکھنؤ مرچ کی جمع مرچیں استعمال کرتے ہیں۔"

پتلیوں کا بھان متی ہونا او آنکھوں کا حیدر آباد، کچھ عجیب سی بات ہے، اگر بھان متی اس سفلی جادو کے معنوں میں لیا جائے جس کا رواج سارے دکن میں عام ہے، جس کی مدد سے پتلا بنا کر انسان کو گھر بیٹھے جو چاہے کر دیتے ہیں، تو بھی کچھ مطلب حل نہ ہوا، غرض بہت سے الفاظ اور محاورات ایسے ہیں کہ دلی والوں کے لئے بالکل انوکھے اور اجنبی ہیں، جیسے رومال ہونا، انگھوں کر، تور، ٹھورو غیرہ جو انھوں نے اپنے مندرجۂ ذیل اشعار میں برتے ہیں :-

دکھ نئے میں نے بھرے بھابی کو کھپال نہ ہوا		میرے سر ڈھکنے سے بھیا کو بھی رومال ہوا
بی بی کا دانہ کھائے گی انگھوں کر ضرور		بنو اگر نہیں ہے نہانے کی احتیاج
رنگیں کی ریختی ہے سخن میرا ریختہ		فیتے کو فوق کیوں نہ ہوا ہے باجی تور پر
دلوایا شب برات میں مردوں کا فاتحہ		لوٹے گھڑے پہ بدھنی پہ مٹکے ٹھور پر

دلی میں فاتحہ مونث ہے مذکر نہیں، خصوصاً عورتیں فاتحہ دلوائی کہتی ہیں، سوائے تور کے باقی الفاظ پوربی معلوم ہوتے ہیں، جو اہل لکھنؤ کی بولی کا ایک بڑا جزو ہیں، ٹھور شاید ٹھکرے، ابخورے کے معنوں میں لیا ہو، اگر ان اختلافات کا جو دلی والوں اور اہل لکھنؤ کی زبان میں ہے، دیوان جان صاحب میں سے اقتباس کیا جائے، تو ایک علیحدہ مستقل مضمون ہو سکتا ہے، لکھنؤ میں چونکہ کمینی کا بالفاظ اہل لکھنؤ سونے کا قدم بہت پہلے آچکا تھا، فرنگستان کے ہزاروں آوارہ گرد، فقیر، بھوکے، ننگے، یہاں کی دولت کے فسانے اور نوابوں کی داد و دہش سن کے آن مرے تھے، اور فرنگی جلاہے اپنے ساتھ لم دراز، لنکلاٹ، کام لیٹ، اور گاچ کے تھان، اور گمٹے کے گٹھے لے آئے تھے، اپنے مال کو ٹانڈے کی جامدانی، اور بنارس کے کمخواب، گلبدن کے مقابلے میں دھول دے کے کھپاتے تھے، ان لٹیروں کی گدامی بولی سے یہاں کی زبان نہ بچ سکی، جان صاحب نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا :-

جان صاحب نہ موا اس پہ اسد خان نے کیا		ایک رفل شیر بچہ پا ایک نیمچہ خالی

انھوں نے اس کے جواب میں تیر برسائے :-

رہے نہ آنکھوں کے ترکش میں تیر پلکوں کے		بوا بھوؤں کی کمان کا، کمان نہیں باقی

جب ہار گلے کا ہار ہوئی تو تبدیل لباس کی ٹھانی، محرم کا زمانہ، لال اشیواز جوائی تو جل کے کہتی ہیں:۔

منگوائی گون سبز تھی، وہ لائے ہین سرخ قطامہ بنوں، پہنوں محرم میں پہن سرخ [1]

آخر التجا کی گئی :۔

سو رہو کمرے میں اب منہ پر دوپٹہ تان کر اس میں بہتر ہے کہا میرا کریں، منظور آپ

ایک جگہ سوکن کے جلنے بھننے پر کہا ہے :۔

سوت چھپا میری انگاروں پہ ہے لوٹ رہی کیا میرے ہاتھ سوا لاکھ کا ہے بل آیا

اب ذرا کمپنی میں ان کمپنی والوں کی عدالت اور گپتی لوٹ کے جوہر کھولے ہیں :۔

انگریزی رہے قیامت تک دے نہ ایک دن کہیں خسارہ لوٹ

جان صاحب لوٹ کو لوٹ سمجھتے تھے، انگریزی بمعنی انگریزی حکومت، اور اس کے قیامت تک کے قیام کی دعا اس لوٹ کے خسارے کے دھڑکے کے ساتھ کس بلا کی شوخی لئے ہوے ہے، اب عدل کی طرف رجوع کرتے ہیں، پہلے جو کوڑی نہیں، تو اپنا سامنہ لے کر لوٹتے ہیں :۔

پہلے ہی چاہئیں اسٹام کے کاغذ کو روپے ہو کے نادار چلے کرنے ہیں فریاد عبث

اس میں "پہلے ہی چاہئیں" نے تاجر حکمرانوں کے ہاں جنس عدل وانصاف کی آڑت کے گھٹر بڑی بولی والوں کے حوالے کرنے اور اس کی عام خرید و فروخت کو خوب بھرے بازار دکھایا ہے، نہ رہا گیا تو ایک جڑ ہی دی :۔

اپنا گھر بھرنے کا اس وقت کے حاکم کو ہے دھیان ملک چھن جاتی ہے، اب ملتی ہے، جاگیر کسے

اپنی گدامی لفظوں کے چسکے میں ایک جگہ اپنے کوچے سے بھٹک گئے ہیں، اور بڑی پاکیزہ تشبیہ و استعارے اٹھا کے لائے ہیں، جو اس سے پیشتر کسی کو میسر نہ آئے تھے :۔

شل ارگن کے ہے اس طفل مغنی کا گلا نور کی تانیں ہیں، کیوں کر نہ ہو تحریر پسند

طفل مغنی اور پھر ارگن، خیر آرگن ہو، بل ہو، کمان ہو، یا رفل ان سے مفر نا ممکن، اسٹامپ کی مجبوری

---

[1] یہاں پہن حاصل مصدر پہننا کا لباس کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۱۲

لوٹ کا لالچ یہ بھی معاف ہوئے لیکن حجرے اور بارہ دری کو نج کے کرے میں جو اٹھوائی کھٹولی لے کر دیں اور شیشواز کو دیا سلائی دکھا گون سے جو گوتا کریں یا بدھیا بن کر اٹھائیں تو یہ کس خدا نے بتایا تھا لیکن زمانے نے جان صاحب سے یہ سب کچھ اٹھوایا، مرتا کیا نہ کرتا، اس زمانے میں لکھنؤ کی ہوا ہی بگڑی ہوئی تھی، بدرنگی دیکھ دیکھ کے جھرتے تھے :۔

نیئے تلنگے اب وہ محل چھاندنے لگے　　ہوتا فرشتہ خاں کا جہاں سے گذر نہیں

یہ سب بدعنوانیاں دیکھا کئے، لکھنؤ جیسے شہر میں ان کی جیسی قدر ہونی چاہئے تھی نہ ہوئی، پیسے کی کشش اور پیٹ کی مارنے مارے ہی رکھا، اپنی پریشانی میں کہتے ہیں :۔

جو فکر ہوتی ہے روٹی کی شعر لکھتے ہیں　　برا بھلا یونہی اے جان ہے لکھا جاتا

نہیں یہ تو غلط کہا ہے، کیوں کہ بھوکا گلام خوب لڑتا ہے، اور بھوکی شامہ خوب چہکتی ہے، اس روٹی کی ہے ہے نے جان صاحب کو بھی بہت کچھ نئی سجھائی ہے، کہتے ہیں :۔

حلوائی کی دوکان کی پھبتی نہ کیوں کہوں　　دن رات آسمان مٹھائی کا تھال ہے

ہے چاند اندرسا تو ستارے ہیں گولیاں　　شاخیں کرن ہیں اور یہ سورج سہال ہے

اس کا مقابلہ "مے تھیو آرنلڈ" کی "جپ سی" سے کرو، جس کو خالی پیٹ میں رات کے وقت چاند کلچہ نظر آتا تھا، پھر دیکھو ہمارا جان صاحب بازی لے گیا، یا للمو اٹاپو کا رہنے والا؟

بوا یہ آٹھ میدے کی بنائی تافتائیں ہیں　　جو کوئی چاند سورج کی طرف کرتی اشارا ہے

روا ہے گر کہوں رزاق کی سنی فلک کو میں　　بوا میدے کا پیڑا دیکھ لو ہر ایک تارا ہے

زناخی چاند پہلی کا تو روٹی کا کنارا ہے

چودھویں کی چاندنی رات ہو اور چند اماموں سر پر آ گئے ہوں، اور بی ہوائی دیدہ مہتاب جنھیں نہ جن کا ڈر ہو نہ بھوت کا، اکیلی مہتابی پر چڑھی ہوں کہ پرچھائیں بھی ساتھ نہ ہو، پیروں تلے چھپ گئی ہو اس ساری کیفیت کو کس شوخی سے ادا کیا ہے :۔

کوٹھے پہ چڑھی رات کو مہتاب اکیلی　　سایہ بھی مرا بھاگ گیا ایسی نٹھد ہے

بے ساختگی اور بھولپن ذرا ملاحظہ ہو:۔

دیکھی جو اپنی چوٹی کی پرچھائیں رات کو رسی سمجھ کے بھاگی میں ایک چیخ مار کے

اپنی ہی چوٹی تک کی پرچھائیں سے جھکنا اور اس کو سانپ سمجھ کے رم کرنا کیا کچھ کم حلاوت بخش ہے، اور پھر رسی نے جو باریکی معنوں کی وسعت نے پیدا کر دی ہے، اس کی ابھن الگ اور درازی الگ رہی، اور اس تشبیہ کی پھنساوٹ ملاحظہ ہو:۔

کٹوری گاچ کی پہنے ہو پھر گویاں کہوں پھبتی اناروں پر لگایا آن کر مکڑی نے جالا ہے

صنائع بدائع اور لفظی و معنوی رعایات کا استعمال پرانی لکیر کے فقیر شاعروں کے ہاں واہ واہ حاصل کرنے کا سب سے سہل لٹکا تھا، اس لئے جان صاحب کا سارا کلام اول سے آخر تک اس کی نذر ہوا، اب ایک محاورہ ہے "جوہر کھلنا" اس کو شعر میں کھپانے کے لئے جو جو لوازمات مہیا کئے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

سب سنتے تھے سیفو کو جس وقت کھلے جوہر ایک اس کی حماقت پر فولاد بہت رویا

جوہر کی رعایت اور سیف کی مناسبت سے سیفو نامی عورت کا لانا، اور فولاد کو اس کی حماقت پر رلانا، یہ سارا تمبا اسی بلا کے لئے مول لیا ہے مشکل ہی سے کوئی شعر اس قسم کی رعایات لفظی و معنوی سے معرا ہوگا۔

جان صاحب نے اپنے کلام میں جو نام مردوں اور عورتوں کے لکھے ہیں، وہ ایسے ہیں، جو خانگیوں کسبیوں، امیروں کے گھر پڑی عورتوں، خواصوں، نوکروں، لونڈیوں، غلاموں اور ادنی طبقے والوں میں عام ہیں، جیسے مہتاب، خضرو، موتی خانم، ستارا جان، میرن، کلو، چنپا، لولو، بچھیا وغیرہ عورتوں کے اور چاند خاں، مہتاب خاں، گنگو، اسد خاں، فولاد وغیرہ مردوں کے، امیر زادیوں، بیگموں، رئیسوں، نوابوں کے نام سارے دیوان میں کہیں نہیں آتے، یہ جان صاحب کی شرافت تھی کہ انھوں نے بڑوں کے نام تک کی اتنی حرمت کی، اب چونکہ نام ادنیٰ طبقے کے تھے، اس لئے ان کے لئے بولی بھی انہی کی لازم رکھی گئی اور اسی طبقے کے خیالات کی ترجمانی کی گئی، اس طرح جان صاحب نے ایک سیرت نگار کی تعمق نظر اور وسعت معلومات کا پورا پورا ثبوت دے کر اپنے صاحب کمال ہونے کی سند حاصل کر لی ہے......

مولوی سید احمد صاحب مرحوم مولف فرہنگ آصفیہ نے اپنی فرہنگ میں "ج" کی تقطیع میں

جب جان صاحب کو لیا ہے، تو یہ لکھ کر "جان صاحب نے ریختی گوئی میں اپنی اوقات عزیز کو رائگاں کھویا" بیچارے کے سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیا ہے، لیکن مولوی صاحب نے بے منصفی سے یہ رائے قائم کی ہے، حالانکہ انھوں نے اپنی تالیف میں سدہا الفاظ کی سند جان صاحب سے پکڑی ہے، اور بیسیوں لفظ ایسے ہیں، جو ان کی لغت تک میں نہیں ملتے۔ جان صاحب نے اپنی شاعری کی بدولت بہت سے لفظ اور محاورے محفوظ کر دیے، جو زمانہ کی دست برد سے اپنے سینکڑوں دوسرے بھائی لفظوں کی طرح نیست و نابود ہو جاتے، اور یہ بڑا احسان جان صاحب کا اردو زبان پر ہے ....،

چے، ڈال، واؤ کی ردیف میں جو کہا ہے، ایک ایک گالی پانچ پانچ من کی دے ڈالی ہے کہ جو نہ رکھی جائے نہ اٹھائی جائے، اس ساری کی ساری کو مولف کی مولویت نے نکلوا دیا ہے، جوانی کی ناپائیداری پر جو رام بھوگ سنائے ہیں، وہ پرشاد کے طور پیش ہیں، نقل کفر کفر نباشد:-

بے مروت کوئی ایسی نہیں دنیا میں ..... پھر نہیں آتی ہے یہ جاکے جوانی چڈو

اپنے ہم وطنوں کو خوش کرنے کے لئے میر یار علی نے ہر طرح کے جتن کر ڈالے جس کا سارا پیرا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ نان پارے کے ہاں سے روٹی کا سہارا ہو گیا، جس کا جان صاحب نے اس طرح گن مانا ہے:

خدا دیتا ہے ٹکڑا، نان نفقے کا سہارا ہے وہ راجہ مجھ پہ مرتا ہے کہ جس کا نان پارا ہے

جان صاحب کی قناعت ملاحظہ ہو، اپنی روکھی سوکھی پہ اکتفا کی اور ہمہ نعمت سمجھ کر اسی پر گزران کی، کسی کی چکنی چپڑی دیکھ کے اپنی نیت نہ ڈانواں ڈول کی:-

اس کو قربان کروں اپنے گزی گاڑھے پر میری جوتی سے میسر ہے اگر تاش تمہیں

دیکھو جان صاحب نے گاڑھا گاندھی جی کی حرص میں نہیں پسند کیا، اور نہ اس میں کوئی اور مقصود مخفی نظر آتا ہے۔ (باقی آیندہ)

ایطاء

(الف، عین، صاد)

حیدرآباد دکن سے جناب مولوی سید محمد ضامن صاحب ضامن کنتوری نے ایک ماہوار رسالہ موسوم "لسان الملک" جاری کیا ہے، اس کا پہلا نمبر ماہ جولائی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا، مجھے کوئی تنقید کرنی منظور نہیں، یہ کام معاصرین کا ہے، مجھے صرف یہ گفتگو کرنی ہے کہ لسان الملک کے صفحہ (۳۶) پر جناب امجد حیدرآبادی کی دو "رباعیاں" درج ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:-

ہر شخص، نیا روپ دکھاجاتا ہے ہر شخص، نیا رنگ سنا جاتا ہے
دنیا کی تماشہ گاہ میں ہر انساں فرض اپنا، ادا کرکے چلاجاتا ہے

اس پر یہ فٹ نوٹ لکھا ہے کہ:-

"اس رباعی کے قافیہ میں ایطا ہے، مگر آج کل کے شعرا اس کا لحاظ کم رکھتے ہیں"

رسم کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فٹ نوٹ (غالباً) فاضل مدیر نے لکھا ہے، اس کی نسبت کچھ کہنے سے پہلے سلسلہ سخن کی غرض سے مختصر طور پر "ایطاء" کی تعریف سنا دی جاتی ہے۔

صاحب حدائق البلاغت لکھتے ہیں:-

"ایطا و آنرا در فارسی شائگاں گویند وایطا تکرار کلمہ است در قوافی بیک معنی، اما اگر ہمہ جا بمعنی دیگر آرند، ایطائش گویند بل صنعت تجنیس است وایطا بر دو قسم است، خفی و جلی، ایطائے خفی آنست کہ تکرار در او ظاہر نباشد مثل دانا و بینا و حیران و سرگرداں، و بیا و میا و مانند آں۔ وایطائے جلی آنست کہ تکرار در او ظاہر باشد مثل دردمند و حاجتمند، وستمگر، و افسوں گر

وشل الف ونون جمع درلفظ یاراں، ودوستاں، وشل یا ونون درلفظ سیمیں وزریں، وغمگین، وشرگیں وشل ہا درگلہا وباغہا واشباہ آں۔ وشل کرد، ونکرد، دبکن، ومکن، وترا، ومرا ونظائر آں۔ وایطائے جلی اقبح وافحش عیوب است ودریک بیت اصلا جواز ندارد، مگر آنکہ بفاصلۂ پانزدہ بیت در قصیدہ وقطعہ وغزل بیارند۔ قال السکّاکی:-

وَعَیْبُ الْاِیْطَاءِ بِتَقَارُبِ الْمَسَافَۃِ بَیْنَ بَیْتَیِ الْاِیْطَاءِ اَمَّا اِذَا طَالَتِ الْقَصِیْدَۃُ وَتَبَاعَدَتِ الْمَسَافَۃُ فَقَلَّمَا یُعَابُ۔

صاحب حدائق البلاغۃ کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایطائے خفی کو کسی شمار وقطار میں نہیں لاتے، ایطائے جلی کو عیوب اقبح وافحش جاننے کے باوجود بعض قیود وشروط کے ساتھ جواز کا فتویٰ دیتے اور اپنے قول کی مزید تائید سکاکی کے قول سے کرتے ہیں، گو یہاں نفس ایطاء سے چنداں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس رباعی کے قافیوں میں ایطا قرار دینا محل نظر ہے، کیونکہ جو فعل متعدی ہو جاتا ہے، وہ اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا، اس کی کچھ اور ہی شکل ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ رلاتی، جلاتی۔ جلاتا، بجھاتا۔ پڑھانی، سنانی۔ رلادیا، دکھادیا بجھاتا ہے، جلاتا ہے وغیرہ یہ تمام الفاظ، مسلم الثبوت فصحا کے کلام میں اکثر باہم قافیہ واقع ہوئے ہیں، لیکن ان کو قافیہ کی صحت طریق تعدیہ وغیرہ نے بخشی ہے، ورنہ ان کی لازمی یا متعدی کی علامت دنا نکال دینے کے بعد صلاحیت قافیہ باقی نہیں رہتی۔

امثال

جب وادیٔ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے ناسخ ہر ایک بگولا پئے تعظیم اٹھا ہے

ہستی کو، شل نقش کف پا مٹا چکے آتش عاشق، نقاب شاہد مقصد اٹھا چکے

اور جو یہ راز نہانی نہ کھلا مومن جیتے جی، جی ہی میں ارمان رہا

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے داغ دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

تہنیت، رعد نے چلا کے سنائی کیسی امیر مینائی ہاں میں ہاں، کوند کے بجلی نے ملائی کیسی

پہلو میں کس کو، بزم میں اس نے بٹھا لیا جلال لکھنوی کیوں اے اجل! ہمیں نہ جہاں سے اٹھا لیا

آتشکدہ، پریوں نے بنا کر نسیم پھینکا اسے پھول سا اٹھا کر

نئی روشنی کے دکھا دینے والے شمس العلما حالی چراغ ہدیٰ کے بجھا دینے والے

مسدس حالی، اور اس کے ضمیمہ میں تو ایسے بیسیوں شعر ملیں گے!

اس سے بخوبی ثابت ہے کہ ان حضرات نے، ان قوافی میں مطلق ایطا نہیں سمجھا جن کو طریق تعدیہ وغیرہ نے باہم قافیہ بنا دیا ہے۔

مولوی سلیم الدین صاحب تسلیم مرحوم نارنولی نے شمس العلما حالی کے مسدس کی تردید میں ایک "مسدس" لکھا ہے، اس میں حالی کے ایک بند کے قافیہ شاداں اور خواہاں، میں ایطا بتاتے ہوئے خود طریق تعدیہ وغیرہ کے قوافی استعمال کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

انھوں نے، اسی بحر میں یوں لکھا ہے کہ میں نے کئی بار فتویٰ دیا ہے

ان حضرات کی نسبت بیگانگیِ فن کا الزام لگانا ایک صریح ناانصافی ہے، اگر کوئی ان قوافی کے استعمال میں احتیاط کرے تو یہ احتیاط اس کی ذات کے لئے مقصور ہوگی، دوسرے کو، اس کی پابندی لازم نہیں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فاضل مدیر کی مثنوی "شہید وفا" (ترجمہ لارڈ ٹینی سن) اسی پرچہ میں چھپی ہے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

بوسیدہ کہیں سے جال اُٹھالائے صفحہ (۵۹) کشتی، کوئی پانی سے ہٹالائے

اس میں بھی وہی مفروضہ ایطا، نکل آتا ہے؟ مگر اس پر، کوئی نوٹ نہیں لکھا گیا، اس کو جانے دیجیے!

اسی پرچہ میں ایک اور نظم "الانسان باللسان" چھپی ہے، اس میں بھی یہ ایک شعر ہے: ؎

جو سخن ہو مثل گوہر تو، ہر ایک ہوگا خواہاں صفحہ (۴۱) یہ جواہر ایسے ہوں گے، کہ زمانہ ہوگا حیراں

دیکھئے! الف و نون کی تکرار کے باوجود بے تکلف قافیہ کر لیا گیا ہے، اس پر بھی فاضل مدیر کو، کوئی نوٹ لکھنے کی ضرورت داعی نہیں ہوئی، اسی سلسلہ میں فاضل مدیر کی ایک رباعی بھی سن لیجیے۔

داغ دل بے تاب، دکھایا نہ گیا حرف مطلب زباں پہ لایا نہ گیا
خود داری عشق! کوئی نسبت ہے بھلا رونے کے سوا، اور کچھ آیا نہ گیا

اس میں (خدانخواستہ)...... کیوں ہونے چلا تھا؟

سر اقبال، کی مشہور مثنوی "رموز بیخودی" جس کا ترجمہ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج نے انگریزی میں کیا ہے اس کے یہ چند شعر ہیں، سے

چوں زخلوت خویش را بیروں کشد پائے در ہنگامۂ جلوت نہد
عشق، صید از زور بازو افگند عقل مکار است و دامے می نہد
تا قوی از حکمت ایشیا شود ناتواں، باج از توانایاں خورد

ان قافیوں کو دیکھئے! کشد کا قافیہ نہد۔ اور شود کا قافیہ خورد کیا ہے اور ہر جگہ "دال" مضارع کی ہے علامت مضارع (د) گرا دینے کے بعد کش، نہہ، افگن، شو، خور، رہ جاتے ہیں جو باہم قافیہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے

تدویر (دور) تذکیر (ذکر) تزویر (زور) تسطیر (سطر) تکفیر (فکر) تصویر (صورت) تغیر (غیر) تعلیم (علم) تفہیم (فہم) جن کے مادے بالترتیب قوسین میں لکھ دئے گئے ہیں، ان تمام الفاظ کو فقط باب تفعیل کی ترکیب نے قافیہ کے قابل بنا دیا۔

قاتل، قائل میں محض وزن فاعل نے قابلیت قافیہ پیدا کر دی ہے، ورنہ قتل و قول، قافیہ صحیح نہیں اسی طرح وزن مفعول پر مشہور، مشکور، مذکور، منظور، مقتول، مقبول، اور رحمت، محنت وغیرہ قوافی کو بھی ذوق سان نے جواز استعمال کا فتویٰ دے رکھا ہے، استعمال زبان سے بڑی مجبوری ہے۔

حضرت جامی علیہ الرحمۃ معروف و مجہول کے قافیہ کو درست نہیں بتاتے لیکن خود کہتے ہیں:۔

من، نہ تنہا خواہم ایں خوبان شہر آشوب را کیست؟ در شہر آنکہ خواہاں نیست روئے خوب را

اس وقت، میں نے یہ چند مثالیں جو یاد آئیں وہ لکھ دیں، اگر تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو صفحے کے صفحے مثالوں سے بھر دئے جا سکتے ہیں، متقدمین سے لے کر متاخرین تک شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کے کلام میں یہ قوافی نہ ہوں، اور جب کہ از آدم تا ایں دم دنیائے شاعری میں یہ بدعت چلی آرہی ہے، تو بیچارے امجد نے کیا گناہ کیا؟

حیاتِ تمدن

حصۂ اول

عہد سلف

(از جناب مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مولوی فاضل)

بہ سلسلۂ گزشتہ

"رائے رایاں" خطاب دیا گیا، اس طرح وہ اسلامی تاریخ کا پہلا "رائے رایاں" ہے۔ دیوگیر اور اس کے متعلق پورے سابقہ علاقہ کی حکومت بحال رکھی گئی، قصبۂ نوساری واقع گجرات بادشاہ کے طرف سے جاگیر عطا ہوئی اور باعزاز تمام رشتہ داروں اور بچوں کے ساتھ بغیر کسی کے ضمانت میں رکھ لینے کے جیسے کہ اس کے مابعد زمانہ میں بھی دستور تھا، واپس جانے کی اجازت عطا ہوئی یہی علائی الطاف خسروانہ تھے جس نے رام دیو کو بھی مدت العمر تخت علائی کا وفادار دوست بنا دیا۔ یہ شائستہ ترین فتوحات دکن کا یادگار واقعہ رہے گا۔

کافور کا دوسرا حملہ ۹ ۷۰ھ دیوگیر کے وفادار ریاست بن جانے کے بعد اب مزید قدم آگے بڑھانے کا موقع آیا۔ چنانچہ ۷۰۹ھ میں کافور ورنگل پر بھیجا گیا، کافور کو اس مہم کے متعلق جو ہدایت دی گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مہم لوٹ مار کی غرض سے نہ تھی، بلکہ کل ہندوستان میں ایک اعلیٰ حکومت تسلیم کرانے کے لئے، ہدایت یہ ہے کہ اگر لدّر دیو (رُدّر) ورنگل کا راجہ پیش کش گزرانے اور سالانہ خراج کا ذمہ دار ہو جائے تو مہم کی کارروائی طے شدہ سمجھی جائے، ورنگل اور مملکت تلنگانہ کے فتح کرنے کی ضرورت نہیں، حسب سابق خواجہ حاجی اب بھی چیف آف دی اسٹاف تھا، اور کافور کو ہدایت تھی کہ تمام انتظامات میں اس کی رائے پر عمل پیرا ہو۔ رائے رایان رام دیو راجہ دیوگیر نے اس مہم میں حق رفاقت ادا کیا۔ جب دیوگیر سے

اسلامی فوجیں آگے بڑھ کر ان مقامات میں جانے لگیں، جہاں اب تک کسی مسلمان فاتح نے قدم نہیں رکھا تھا تو رام دیو چند منزلوں تک خود ساتھ آیا اور اپنے علاقہ کے بہت سے سوار و پیدل حفاظت لشکر اور راستہ بتانے کے لئے ساتھ دئے، رسد رسانی کا بندوبست کیا، براہ اندور (نظام آباد) جہاں سے کہ حد تلنگانہ کا آغاز تھا، کافور بلا مزاحمت ورنگل جا پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا، دہلی سے ورنگل تک مسلسل ڈپہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا، جس کی تفصیل ضیاء برنی نے دی ہے (صفحہ ۳۳۱)۔

ورنگل کے دو حصار تھے، ایک اندرونی، پتھر کا جس میں راجہ خود تھا، دوسرا اس سے باہر مٹی کا جس میں فوج تھی۔ سنگ مغربی[1] دونوں طرف سے چلتے رہے محاصرین نے سیڑھیاں لگائیں، کمند پھینکے اور آخر باہمت محاصرین جرات کر کے بیرونی مٹی کے حصار کے برجوں پر پہنچ گئے اور اس طرح شہر کو اپنے قابو میں کر لیا، رُدر دیو نے دیکھا کہ اب سنگی حصار کی بھی نوبت آتی ہے، تو اس نے فوراً صلح کر لی۔ بہت سا زر و جواہر، ہاتھی، گھوڑے گزرانے اور سالانہ پیش کش کا بھی اقرار نامہ لکھدیا، اس نوبت پر یہ مہم ختم ہو گئی۔

کافور کا تیسرا حملہ کرناٹک پر ۷۱۰ھ ہندوستان کی آخری سرحد تک پہنچنے کے لئے اب کرناٹک باقی رہ گیا تھا، مہم ورنگل کے دوران میں جب چند روز تک ڈپہ بند ہو گیا تو جانشین حضرت خواجہ معین الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کی بشارت علاؤالدین کے سمند شوق کو تازیانے کا کام دے رہی تھی چنانچہ دوسرے ہی سال کافور بدستور حاجی خلیفہ کے ساتھ دھور سمدر (دوار سمدر) اور معبر (کارمنڈل) کی جانب بھیجا گیا۔ یہ سفر بھی بدستور دیوگیر پر سے ہوا، اس وقت یار وفادار رام دیو دنیا سے اٹھ چکا تھا اور اس کا بیٹا اس کی جگہ راج کر رہا تھا، جس کی وفاداری مشتبہ تھی، لہذا بنظر احتیاط جالنہ کے قریب ایک سردار فوج متعین کیا گیا اور اسلامی فوجیں اب اپنی ہی رہ نمائی اور بندوبست سے آگے بڑھیں، کنڑے علاقہ پر سے گزرتی ہوئیں تین مہینہ کے عرصہ میں بنا در دریائے عمان (سواحل ہند) وا قعے

---

[1] سنگ مغربی "سنگ مغربی" جو ضیاء برنی نے لکھا ہے اس سے کیا مراد ہے تحقیق طلب ہے لغت کی کتابوں میں کوئی داخلہ نہیں ملا، محمد تغلق نے جب ۷۲۱ھ میں ورنگل پر دوبارہ حملہ کیا تو اس وقت بھی سنگ مغربی اور عزارہ کا استعمال بیان کیا گیا ہے، عزارہ تو غالباً عرادہ ہے جس سے چھوٹی منجنیق مراد ہوتی تھی (عجائب الاسفار) سنگ مغربی سے خاص قسم کا گندک وغیرہ سے تیار شدہ مواد معلوم ہوتا ہے، جو منجنیق کے ذریعہ سے پھینکا جاتا تھا، منجنیق کا استعمال توپوں کے پہلے اس دور میں جاری تھا، فرشتہ نے سرکوب لکھا ہے،

بلاد دکن میں جا پہنچیں، بلال دیو راجہ کرناٹک (علاقہ میسور) گرفتار ہوا، اور پیش کش کی ادائی قبول کرنے پر رہا کر دیا گیا۔

مسجد علائی | سیت بند رامیشور (راس کماری) نقطۂ اختتام ہند) کے پاس پہنچ کر ایک مسجد بنائی گئی اور اس طرح کافور نامور آرین ہیرو رام چندر جی کے نقش قدم پر جا پہنچا، اس مقام پر پھر یہ یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا کہ ساحل ہند سپہ سالار فوج کے حکم سے بنائی ہوئی مسجد کے صدیوں پیشتر سے بھی مالک بن دینار وغیرہ کی مسجدوں سے اذان کی آواز سن رہا تھا اور آج بھی سواحل ہند کی نہایت قدیم ہی مسجدیں اور اسلامی کثیر آبادی گواہ عادل ہے کہ اسلام براہ پنجاب فوجی تزک و احتشام کے ساتھ آخر نقطۂ ہند پر پہنچنے کے صدیوں پیشتر پرامن ذریعہ سے جہازوں کے راستہ سے سواحل ہند پر بطور مستقل اپنا گھر بنا چکا تھا اور جو لازوال روحانی اثر اس نے سواحل پر قائم کر دیا، وہ درحقیقت نامور محترم رام چندر جی کی بھلائی ہوئی تعلیم کو پھر فرزندان ہند کے قلوب میں تازہ کرنے والا تھا، ابن بطوطہ جس نے اس فتح دکن کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سواحل ہند کی سیاحت کی تھی، ان سواحل کو اس اسلامی زبردست ہمہ گیر اثر سے معمور پایا ہے، جو کئی صدیوں پیشتر سے سواحل ہند سے لے کر چین تک قائم ہو چکا تھا، اور جس کے سامنے اس فوج کشی کا اثر ایک پانی کے بلبلہ سے زیادہ نہیں۔

کارومنڈل | یہاں سے کافور معبر (کارومنڈل) کی طرف پلٹا، جہاں دو راجہ چولے اور پانڈے علیحدہ علیحدہ راج کر رہے تھے اور ان کو بھی مغلوب کیا، غرض اس مہم سے اس قدر پیش کش کافور نے دہلی کے محل ہزارستون (کوشک سیری) میں علاء الدین کے روبرو گزرانی جو فتح دہلی کے بعد سے اس وقت تک کبھی کسی شاہ دہلی کے روبرو پیش نہیں کی گئی تھی۔

کافور کا چوتھا حملہ ۷۱۲ھ | سوسائٹی کی مزمن خود پرستی اور ہوسناکی کی بدولت کافور بھی علاء الدین کی طرح خضر خاں ولی عہد سلطنت اور اس کی ماں کے اقتدار سے ڈرتا تھا اور چاہتا تھا، کہ موقع پاکر دربار سے دور ٹل جائے، چنانچہ جب رام دیو کے بیٹے نے علائی اعلیٰ اقتدار سے سرتابی کی تو وہ خود درخواست کر کے دیوگیر آگیا، یہاں پہنچ کر اس نے باغی راجہ کو قتل کر کے مرہٹواری کے اکثر علاقوں کو گلبرگہ، مدگل، رائچور،

تھے نیز بعض علاقہ ہائے تلنگانہ و کرناٹک کو شامل کر کے براہ راست علائی سلطنت کا ایک اہم صوبہ بنا دیا جس کا صدر مقام دیوگیر تھا اور جس کا وہ پہلا صوبہ دار تھا یہ اسلام کی ہمہ گیری اور نبی عربی علیہ السلام کی مبارک تعلیم مساوات ہے جس کی بدولت ایک مجہول النسب خواجہ سرا بھی اس قابل بن سکا کہ وہ دکن میں سب سے پہلا مسلم صوبہ دار بن کر اسلامی سلطنت کے زیر سایہ شیرازۂ انتظام قائم کرے جو مدتوں سے یہاں شکستہ ہو رہا تھا۔

علاء الدین اور کافور کی موت اب وہ وقت آ رہا تھا کہ سنتہ اللہ علاء الدین کو جلال الدین کے قتل کا بدلہ دے۔ علاء الدین مرض استسقاء میں مبتلا ہوا اور اس نے کافور اور الپ خاں صوبہ دار گجرات دونوں کو اپنے پاس دہلی میں طلب کیا، اس غرض سے کہ کسی کمسن شاہزادے کو برائے نام بادشاہ بنا کر وہ خود حکومت کا مزہ لوٹے کافور نے علاء الدین کو ولی عہد خضر خان اور دوسرے شاہزادوں سے بدظن کر دیا، چنانچہ اس کی فریب آمیز باتوں سے دھوکہ کھا کر ترکوں کے سلطان سلیمان قانونی یا زار پیٹر سے ایک درجہ کم جنھوں نے اپنی پیاری اولاد کے قتل کر دینے میں کمی نہیں کی، علاء الدین نے ولی عہد اور دوسرے شاہزادوں کو قلعۂ گوالیار میں محبوس کرا دیا، الپ خاں جیسا نامور سپہ سالار (ولی عہد کا ماموں) اور اس کا بھائی نظام الدین قتل کر دئے گئے اس رکاکت کی بدولت بدنظمی پیدا ہونی شروع ہو گئی چنانچہ دکن میں بھی رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے اکثر تھانے اٹھا دئے کہ اسی اثنا میں ۶ شوال ۷۱۶ھ کو ۲۱ سال کی عجیب و غریب پرسطوت سلطنت کے بعد یہ نامور ہیرو گویا نامراد دنیا سے چل بسا اور کہا جاتا ہے کہ کافور نے اس کو زہر دے دیا (فرشتہ) کافور نے جو اس وقت سیاہ و سفید کا مختار بن رہا تھا، ایک پانچ چھ سال کے شاہزادے کو تخت پر بٹھا کر اور ولی عہد وغیرہ کو اندھا کر کے خود سلطنت شروع کی، کافور نے مہمات دکن میں جو کچھ شہرت حاصل کی تھی، وہ در اصل علاء الدین کی عجیب و غریب بکتہ ترسا قابلیت کے زیر اثر تھی اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ علاء الدین کے چہلم کے اندر اندر ہی ۳۵ روز کے بعد وہ محل سرائے شاہی کی فوج محافظ کے دو جوانوں کے ہاتھ سے مار ڈالا گیا، اور اس کی تمام بوالہوسی سپرد خاک ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

خدمت ادب

"تنقید" بھی منجملہ فرائض امانت ہے، اور نہایت اہم اور اس قدر خطرناک فرض ہے کہ غریب مدیر پر عائد کیا گیا ہے، مگر اس کے لئے جس ادبی وسیع النظری، اور عالی ظرفی کی ضرورت ہے، اس سے ہم محروم ہیں اور غالباً ہمیشہ محروم ہی رہیں گے، اس لئے کہ بیچارے اردو ادب کا گلا مجتہدین و ملحدین نے ایسا گھونٹا ہے کہ اس کی حیثیت کو بالکل معکوس اور مسخ کر دیا ہے پس کیا ضرور ہے کہ ایک بدنام چیز کا نام لے کر ہم بھی ہجناً اردو کو مسخ کرنے میں شامل ہو جائیں، بہتر یہی ہے کہ ہر ادبی وجود کو متعارف کرتے وقت بجائے لفظ "تنقید" کے "خدمت ادب" کا عنوان قائم کیا جائے اور اسی کو آخر تک ملحوظ رکھا جائے۔

انتخاب زرین ۔ یہ ہماری زبان کے بانیوں اور مشہور شعرائے ماضی وحال کے چیدہ اور پرلطف کلاموں کا مجموعہ ہے، جس کو سر سید مرحوم بانئی علی گڈھ کالج کے ہونہار پوتے اور ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدیر ناظم تعلیمات سید راس مسعود الملقب بہ نواب مسعود جنگ بہادر کے مذاق سلیم اور طبع دقاق نے جمع کیا ہے، کتاب متعدد حیثیتوں سے پرلطف و بامعنی ہے، اول تو اس میں مشاہیر ادبائے اردو کا منتخب و مشہور کلام مع ان کی مختصر سوانح عمریوں کے درج ہے، جو اپنی نوعیت میں، ایک نہایت ہی مفید اور جدید چیز ہے، دوسرے اس کی جامع وہ ذات ہے، جو ہماری نئی نسل کی تعلیمی ناخدا ہے، اور ہر چند یہ اس کی پہلی تالیف ہے تاہم بہت حوصلہ افزا، اور اس لحاظ سے نہایت معنی خیز ہے کہ اب ہمارے اعلیٰ طبقوں اور ذمہ دار حلقوں کو بھی اپنے ادبی فرائض کا احساس ہوتا جاتا ہے، جو تاسیس جامعہ عثمانیہ سے پیشتر تک مفقود تھا، اہل نظر کے نزدیک یہ عظیم خوشخبری اس "دور" ادبی انقلاب میں پنہاں ہے، وہ محتاج اظہار نہیں، تیسری خصوصیت اس کی خوشنما چھوٹی تقطیع اور عمدہ لکھائی چھپائی، جس کے لئے نظامی پریس بدایون قابل مبارکباد ہے، ہمدردان اردو ضرور اس کو دیکھیں، اور بہرہ اندوز ہوں۔

کتاب مجلد ہے، سرخ جلد اور مطلا بلاک ہے، نظامی پریس سے طلب کیجئے۔

دیوان غالب شرح ۔ یہ بھی نظامی پریس میں اس کے قابل اور ماہر مالک کی زیر نگرانی طبع ہوا ہے، طرز ترتیب یہ ہے کہ صفحہ کی بالائی جانب اشعار ہیں، اور زیریں جانب مشکل اشعار کی شرحیں ہیں، غیر مطبوعہ اور غیر مشرحہ اشعار کی طبع کا بھی التزام کیا گیا ہے، شرحوں کی جامعیت اور بلاغت قابل صد داد ہے، شروع میں ڈاکٹر سید محمود صاحب کا، جو پٹنہ کے ایک مشہور فدائے قوم ہیں، پر مغز دیباچہ ہے، اس عمدہ کاغذ، لکھائی، چھپائی اور ایسی خوشنمائی کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر کلام غالب شرح اب تک طبع نہیں ہوا، یا اسی نسخہ کا پانچواں ایڈیشن ہے، گزشتہ چاروں ایڈیشن نہایت سرعت سے نکل چکے ہیں، نظامی پریس اس طرح جو عمدہ اور قیمتی خدمات اردو ادب کے انجام دے رہا ہے تو قابل صد تشکر ہے، اور اردو پر یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے، کتاب نظامی پریس بدایوں (یو، پی) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

رسید و تبادلہ ۔ دفتر میں معزز معاصرین "نگار" "علی گڈھ میگزین" "جامعہ" "تحریک" "جادو" وغیرہ وصول ہوئے ہیں۔

آداب مرشد ۔ یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مریدوں اور بیعت کنندوں کو مرشد کے سچے آداب سکھانے کے لئے مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی نے جو متعدد دلچسپ مفید کتب کے مولف ہیں تالیف کیا ہے، اردو میں اس موضوع پر ایسی جامعیت و استناد کے ساتھ غالباً کوئی کتاب موجود نہیں ہے، اور اس کی ترتیب کے لئے عابدی صاحب کو جیسی کچھ کد و کاوش کرنی پڑی ہوگی وہ صرف کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے، اکثر سادہ لوح مریدین جوش جہالت میں اپنے مرشد کو خدا و رسول اور اصحاب ائمہ کبار سے بھی بڑھا دیتے ہیں یہ رسالہ ایسے ہی عاقبت نااندیشوں کے لئے شمع ہدایت ہے، طباعت و کتابت اور کاغذ نہایت نفیس ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۸ر

جشنِ آصفیہ نمبر ([illegible])

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابو المکارم محمد انوار اللہ صدیقی

عام قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ ہلالی میں ایک بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوگا۔

(۲) عدم وصولی پرچہ کی اطلاع ہر ماہ ہلالی کی پندرہ تاریخ تک آنے پر دوبارہ مفت روانہ کیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ڈاک کا خرچ بذمہ طالب جواب۔

(۴) جو مضامین کسی وجہ سے ناقابل طبع متصور ہوں وہ خرچ ڈاک آنے پر واپس کر دئے جائیں گے۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ دیا جائے۔

(۶) مضامین اور رقم بنام مدیر اور بقیہ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ کی جائے۔

(۷) قیمت مع محصول ڈاک پیشگی سالانہ سرکار سے ۱ ؎ ۔ عام خریداروں سے ؎ ششماہی ا ؎ ، نمونہ (۸) ۔

منیجر

جمال یار

حضرت نوری رشاد صوفی مدظلہم کے پرکیف مکاتیب کا مجموعہ جس کی نسبت تحریک رابطہ ماہ شعبان [illegible] میں تاکید ہو چکی ہے۔ ۔ قیمت پانچ آنے۔

پتہ

(۱) شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد

(۲) دفتر رسالہ ترقی۔

(۳) سید شاہ ظہور عالم حسینی سجادہ نشین خلف حضرت مختار علی شاہ [illegible] خان بیچہ چشتی چمن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ ——— بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری ——— نمبر ۱۱

فہرست مضامین

شذرات

ہندوستانی قوم کے لئے خوشی کا موقع ہے کہ پنجاب کی طرح اب (اگرچہ کسی قدر تاخیر سے) بنگال و بہار نے بھی اردو کے متعلق اپنے فرض کو محسوس کیا ہے' یوں تو اردو ادب کے مذاکرات کی وہاں کچھ ایسی کمی بھی نہیں رہی ہے' حضرات شاد عظیم آبادی' وحشت کلکتوی' امداد امام اثر عظیم آبادی وغیرہ نے اردو کی' خاص کر اردو نظم کی بہت قابل قدر خدمتیں انجام دیں' اور دے رہے ہیں حضرت علی محمد صاحب شاد تو شاید ایک ہی فرد ہیں جن کو بنگال و بہار نے اب تک پیدا کیا ہے' اور جنھوں نے ان صوبوں میں نہایت خوش اسلوبی جانکاہی' اور عرصہ دراز کی مشق و محاورت کے ساتھ اردو کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے' لیکن حال ہی میں "ڈھاکہ" کے رسالہ "جادو" نے ....

خوش خبری دی ہے کہ وہاں بھی ایک انجمن بنام "ترقی اردو" کی بنیاد ڈالی گئی ہے' جو غالباً "ینگ بنگال پارٹی" کے نوخیز ادبی ولولوں کے پیمانۂ لبریز کی پہلی چھلک ہے۔

ہم کو اس کی تفصیلات ہنوز موصول نہیں ہوئیں مگر اس کے استقلال و بقا کے دل سے متمنی ہیں' اور ہماری سب سے بڑی امید یہی ہے کہ ہندوستان کا ہر صوبہ اگر اپنے نوجوانوں میں اردو ادب یا قومی خدمت کا کچھ بھی درد پیدا کر چکا ہے تو بہت جلد اس قسم کی انجمنیں وقوع میں آئیں گی' اور یوں اردو کی حقیقی خدمت انجام دیں گی۔

معزز معاصر "لسان الملک" سے معلوم ہوا کہ ایک علمی و ادبی مجلس بنام "تقدم العلوم" کا قیام (غالباً ملک کے موجودہ علمی حلقوں سے مشورہ لینے کے بعد؟) عمل میں آیا ہے' ہم معاصر موصوف کی اس ہمت پر جو اس نے معزز ارکان کے مجتمع کرنے میں کی ہے' اس کو مبارک باد دیتے اور اپنے تشکر و طمانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اپنے خاص ذرائع سے مجلس مذکور کے دائرۂ عمل اور غایت و مقصود وغیرہ کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچانے اور اس کی حقیقی اہمیت کا اندازہ کرنے کے بعد اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کریں گے۔

رسالے اور اخبارات میں پبلک کا سیاسی اور علمی نطق ہوا کرتے ہیں جن کو اگر ان کے اس فرض نطق آفرینی سے

محروم کردیا جائے تو ان کا وجود بالکل ردی ہے، پس کیا یہ غفلت موجب حیرت نہیں ہے کہ ملک کا پریس خصوصاً ادبی رسالے ملک کی سب سے بڑی اور اہم درسگاہ کے حالات سے محروم رکھے جائیں، ہم کو نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ اعتراف ہے کہ "جامعہ عثمانیہ" کے ارباب کار نے ہم کو تو اس قابل نہیں سمجھا کہ ہمارے جامعہ کے مفصل حالات و نتائج سے ہم کو اور ہمارے ذریعے پبلک کو باخبر کریں لیکن اجنبی اشخاص کو برابر رپوٹیں وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔

استرداد برار کا مسئلہ اپنی نوعیت کا شاید واحد اور پہلا ہی مسئلہ ہے کہ برطانوی ہند کے قیام کے بعد سے والیان ریاست کے مدبر ترین ہیرو کی بیدار مغزی کے طفیل کار پردازان برطانیہ کے ہاتھوں تک پہنچا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے منصفانہ فیصلہ پر اس وقت ہندوستان کے کیسے کیسے عظیم الشان مسائل کا حل منحصر ہے، با ایں ہمہ نہ صرف ان حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی جا رہی ہے کہ جن کی آزادی کی تعریف ہی غلامی کے اندر مضمر ہے، بلکہ وہ نفوس بھی اپنے حسد و بغض کے گندے جذبات کے اظہار کا موقع پا گئے ہیں، جن کی ایک ایک رگ نمک حلالی سے سرشار ہو جانی چاہئے تھی، اور یہ صرف پہلا ہی موقع نہیں ہے کہ ہم نے بصد تحسر و تاسف سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر

خبیث راچو تعہد کنی و بنوازی   بدولت تو گنہ می کند بانبازی

کو بار بار پڑھا ہو بلکہ بیشتر بھی بارہا اس شعر کے مصداق صحیح پیدا ہو چکے ہیں، خیر نگران حضرات کو یہ بھی خوب تعین کر لینا چاہئے کہ "سرزمین دکن تا وقتیکہ اپنے مدبر شاہنشاہ کے زیر قیادت اس مسئلہ کو بمعدلت برطانیہ سے طے نہ کرالیں گے برار سے اپنا تاریخی، نسلی، جغرافیائی، اور ملکی تعلق ہرگز منقطع نہیں کر سکتے۔"

مادہ پرست اقوام کو قدرت کے زبردست قوا کا اب تک ایسا مکمل، اور جامع تجربہ نہیں ہوا تھا جیسا کہ جاپان کی تباہی نے کرا دیا، کل سفید اقوام جن کے لئے سب کچھ سائنس ہی میں رکھا ہوا تھا، انگشت بہ دنداں ہیں کہ کیونکر محض دو گھنٹے میں صدیوں کی تعمیر زمین کے برابر ہوگئی، باوجودیکہ سائنس کے جملہ ہتیار وہی ہے وہ مسلح تھا، ریل، جہاز، طیارے، فائر بریگیڈ، تار لاسلکی سب ہی کچھ موجود تھا مگر خدائے قہار کے جبروت و جلال کے آگے یہ چیزیں کیا ہستی رکھتی تھیں، اور اگر کسی مغالطہ کی بنا پر رکھتی بھی تھیں تو اب آئندہ نہ رکھ سکیں گی، پلوں کے ٹوٹنے سے ریل کی امداد فضول ثابت ہوئی طوفان باد نے طیاروں کو ناکارہ کر دیا، ستونوں کے گر جانے سے سلسلہ تار منقطع ہو گیا، سمندر کے

دھنس جانے اور شق ہو جانے سے لاسلکی غیر مرتب ہو گئی، کارخانوں میں تصادم کی وجہ سے آگ لگ گئی اور وہاں سے بڑھکر مکانات تک پہنچی اور شعلوں کی بے پناہ لپیٹ نے بستیوں کو زمین کے برابر کر دیا، آبرسانی کا انتظام درہم برہم ہو جانے سے فائر بریگیڈ بیکار تھا، اس لئے بے شمار مکانات جل کر خاکستر ہو گئے، طوفان نے جہازوں کو بھی تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر بہا دیا، جزیرے غائب بھی ہوئے اور پیدا بھی ہو گئے، ۳ لاکھ باشندے مرگئے اور اس سے دگنے زخمی ہوئے اور ہنوز اس زندہ قبرستان کے سڑنے گلنے سے طاعون کے پھیلنے کا اندیشہ باقی ہے جس سے آیندہ نہیں معلوم کتنی جانوں کا اتلاف ہوتا ہے، تمام ملک میں سخت شورش اور بدامنی پھیل رہی ہے، قیدی قیدخانوں کو توڑ کر نکل بھاگے، کل نظام تمدن و معاشرت درہم برہم ہے، جل جلالہ و تعالیٰ شانہ۔

بیرونِ دکن کی مسموم سیاسی آب و ہوا میں سانس لینے والوں میں جہاں اور کئی مذموم صفات پیدا ہو گئے ہیں، وہاں "سیاسی گپ بازی" کا فن بھی معراج کمال پر پہنچ گیا ہے، ریاست نابھا کے واقعات کے رونما ہونے سے منافقین سیاست کو نظر آگیا کہ سیاسی گپ بازی کے لئے بہت وسیع میدان ہاتھ آگیا ہے، چنانچہ فوراً ہی ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے متعلق بھی نابھا انجام ہونے کی خبریں اڑانا ضروری سمجھا گیا، اور اس "کار خیر" میں بھی یہ اصول ملحوظ رکھا گیا کہ ابتدا اس ریاست ابد مدت سے کی جائے جو اس وقت ہند بلکہ بیرون میں بھی تدبر، تعلیمی اور انتظامی اعتبار سے جملہ والیان ریاست کی سرتاج اور قائد تسلیم کی جا چکی ہے۔

قارئین کرام تو غالباً اس منحوس گپ سے خود ہی واقف ہوں گے جس کو ہم دہرانا نہیں چاہتے اور جس کا بانی غالباً اخبار "نیشن" لاہور ہے، جس سے دوسرے اخبارات نے اس گپ کو نقل کیا ہے مگر مقام حیرت ہے کہ موقع دیکھ کر ریاست ابد مدت کے ایک غیر مسلم نمک خوار (نہال سنگھ) نے بھی نیش زنی کی اور اپنی شرافت اور ذات کا اعلان کر دیا، اس ضمن میں "شدھی" کی گپ بھی فراموش نہ کی جانی چاہئے، اور ناظرین کرام اس کو بھی ملحوظ رکھیں کہ اخبار "نیشن" سکھوں کا ذاتی اخبار ہے، جو پہلے ہی نابھا کی قسمت کی بنا پر نعل در آتش ہو رہے ہیں۔

ہم معزز معاصر "لسان الملک" کے تشکر کے ممنون ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ وہ ہم کو معاصرانہ "فرائض" میں کبھی چشم پوشی پائے گا، از انجملہ مدیر علیگڈھ میگزین کا حوالہ ہے، جس کی تفصیل دیکھنے کی زحمت خود اس نے گوارا کی حالانکہ ہمارے مسلمہ حسن ظن کے سامنے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، م

"ہم موصوف کے روایات سے مایوس ہرگز نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ یہ فتنہ کوئی دن قیامت خیز ہو جائے گا" البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کلمہ "ہمارے روایات" میں "ہمارے" کا مرجع کیا ہے؟ غالباً "لسان الملک" مگر اس کے روایات

(تو ہنوز عالم طفولیت میں ہیں، امید ہے کہ ناظرین کرام اس گتھی کو سلجھا لیں گے۔

(۲)
نطشے کا فلسفۂ معاشرت

(از مولوی سید رفیع الدین احمد صاحب بی، اے، بی، ٹی، وائس پرنسپل نارمل اسکول حیدرآباد)

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟ گفتا مے کہ تلخ تر او نکوتر است (اقبال)

(گزشتہ مضمون میں ہم نے نطشے کے فلسفہ معاشرت سے بحث کرکے اشرافیت، اشتراکیت جمہوریت اور نظام جماعات کے متعلق اس کے معتقدات کا اظہار کیا تھا مضمون زیر بحث میں ہم قیام جماعات کے اساسی محرکات یعنے جذبات ترحم، ہمدردی، ایثار وغیرہ کے متعلق اس کے آراء کا اقتباس ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس حصہ کو اس کے عام فلسفۂ معاشرت سے علیحدہ کرنے کی ایک خاص وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان چیزوں کے متعلق نطشے کے خیالات اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ تاوقتیکہ ان سے مفصل بحث نہ کی جائے، اور شرح و بسط کے ساتھ اس کے دلائل کو پیش نہ کیا جائے، غلط فہمی کا بہت کچھ احتمال رہ جاتا ہے۔)

گر نوا خواہی ز پیش او گریز در نئے کلکش غریو تندر است

یوں تو نطشے کے فلسفہ کا ہر حصہ اس قدر عجیب و غریب خیالات سے بھرا پڑا ہے کہ ہمارا ذہن پرانی پرسکون روش کو چھوڑ کر اس خطرناک وادی میں قدم رکھنے سے گھبراتا ہے لیکن اس کے تمام فلسفہ میں مسائل اخلاقیات کے بعد اگر کوئی اور چیز لوگوں کو متنفر کرتی ہے تو وہ رحم، ایثار وغیرہ کے متعلق اس کے خیالات ہیں۔ ہر زمانہ کے اخلاقیین اور معاشرین ان جذبات پر جماعتوں کی تاسیس کرتے آئے ہیں، ان کی تعریف کرتے رہے ہیں اور اپنے ابنائے زمانہ کے دلوں میں انہی جذبات کو بیدار کرنے کی زبانی اور عملی کوشش کرتے رہے ہیں۔ آج کون شخص ایسا ہے جو رحم اور ہمدردی کو مضرت رساں خیال کرے اور بے رحمی کی مبالغہ آمیز تلقینوں میں اور ایثار کے

منافی آرزو اور مخالف اقتدار مواعظ میں تدریجی انحطاط کی صورتیں مضمر نظر آئیں۔ جس وقت نطشے نے ان چیزوں کے متعلق اپنے خیالات کو ظاہر کیا تو اس وقت بھی یہی کیفیت تھی بلکہ شاید آج سے کہیں زیادہ تھی۔ ضعیف افراد جن کے دست و بازو صرف رحم کی تلقین کی بدولت دوسروں کے زور و قوت سے فیض پا سکتے تھے، ان چیزوں کی تاب نہ لا سکے۔ قدامت پسندوں کو تو خیر اس کے رویہ میں حسب معمول متعارف نقطۂ خیال کی تقلیب دکھائی دی اور اس وجہ سے وہ انھیں پسند نہ آ سکا، لیکن بعض اصحاب الرائے مفکرین اور مدبرین بھی اس کے مخالف ہو گئے۔ شوپنہائر کے قنوطی فلسفۂ زندگی کے مقابلہ میں نطشے کی "نوائے تلخ" مذاق پر بار معلوم ہوتی تھی اور سچ بھی یہ ہے کہ جو خون قناعت ایثار وغیرہ کی "سست رگی" کی بدولت سرد پڑ گیا ہو، اس میں آرزو، تمنا، جد و جہد، سخت کوشی کی گرمی پہنچانا آسان کام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ نطشے مطعون ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کی تلقین مخالف مذہب، مخالف عقل، اور مخالف حیات سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے قومی شاعر اور مستقبل کے نقاب بردار اقبال نے شاید نطشے ہی کی زبان سے شکایت کی ہے:-

عصر من دانندۂ اسرار نیست	یوسف من بہر ایں بازار نیست
ناامید استم زیاران قدیم	طور من سوزد کہ می آید کلیم

نطشے رحم کا مخالف نہیں ہے تمام مدنی الطبع فرقوں میں رحم اور ایثار صیانت حیات اور بقائے معاشرت کی اہم ترین شرطیں تسلیم کی جاتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ایک خاص حد کے اندر یہ جذبات ناگزیر بھی ہیں۔ لیکن اگر اسی مسئلہ کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالو تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات کے ماتحت یہی چیزیں فنائے شخصیت، اور انحطاط انفرادی و ملی کا بھی باعث ہو سکتی ہیں۔ انہی اقسام رحم اور ایثار کا نطشے مخالف ہے۔ ایک شخص جو احتیاج زندگی کی طرف سے فارغ البال ہو، دوسرے محتاجوں کو اپنے سرمایہ میں شریک کر سکتا ہے۔ اس رحم کو نطشے برا نہیں کہتا، بلکہ اس کی رائے میں تو یہ شخص سچے رحم کا سچا نمونہ ہے۔ اسی طرح سے ایک ذی اقتدار

شخص اپنے حصہ میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے۔ لیکن جب ہمارا مخیر الطبع دوست خود اپنے مایحتاج کے لئے دوسروں کا دست نگر ہو اور پھر بھی ایک ایسے شخص کو اپنے مختصر سرمایہ میں شریک کرے جو ناکارہ، مجہول اور پست ہے، تو نطشے اس فیاضی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ اس نام نہاد رحم کی شدت سے مخالفت کرتا ہے، اس کو مصنوعی اور پست کن رحم کہتا ہے اور اپنے مخاطبین کو اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

وہ صرف "معروضی" رحم کو سراسر مخالف حیات و اقتدار کہتا ہے

جن لوگوں نے جذبات انسانی، اور بالخصوص مدنی جذبات کا ذرا بھی مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان سب کی دو شکلیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ جس طرح سے فیاضی کی ایک شکل "موضوعی" ہوتی ہے۔ یعنے فیاضی کرنے والے کے نقطۂ خیال سے، اور دوسری "معروضی" یعنے فیاضی سے مستفیض ہونے والے کے اعتبار سے، اسی طرح سے رحم، ہمدردی، ایثار وغیرہ کی دو ایسی ہی حالتیں ہوتی ہیں۔ اگر جذبۂ ترحم ہی کی لو، تو تم دیکھو گے کہ ایک رحم تو وہ ہے جس کا ہر مفلس، محتاج، بھوکا اور معذور شخص جویا رہتا ہے اور یہ اس لئے کہ کشمکش حیات میں اس کی کامیابی کا تمامتر انحصار اسی پر ہے کہ دوسروں میں اپنے متعلق اس جذبہ کو پیدا کرے۔ رحم کی یہ حیثیت معروضی ہے۔ لیکن ایک اور حالت بھی رحم کی ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ کسی محتاج کے گڑگڑانے یا کسی معذور کے داستان غم بیان کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ رحم کرنے والا خالصتًہ اپنی آسودگی، سیرابی اور عام ثروت کے جوش سے، والہانہ اور فطری طور پر دوسروں کا معین ہو۔ یہ رحم کی موضوعی حالت کہلائے گی۔ معروضی رحم کا نطشے سخت مخالف ہے وہ اس کی حیثیت کو اخلاقی نہیں بلکہ افادی سمجھتا ہے۔ اس پردہ میں اس کو ناکارہ افراد کی افزائش کی کوششیں اور ذی اقتدار ہستیوں کے زوال کے اسباب مضمر نظر آتے ہیں۔ موضوعی رحم کو وہ صحیح معنوں میں اصلی اور اخلاقی رحم سمجھتا ہے۔ دریا جب لبریز ہوتا ہے تو اس کا پانی آس پاس کو بغیر کسی خارجی کوشش کے سیراب کرتا ہے۔ اسی طرح سے ذی اقتدار یا ذی ثروت ہستیاں محض اپنے وفور اقتدار یا جوش

پھر بھی کیا بعض مواقع ایسے پیش نہیں آتے کہ جہاں رحم کو انصاف یا کسی اور مفاد کی قربان گاہ پر ٹھنڈے دل سے نذر کر دینا پڑتا ہے؟ کیا بعض اوقات مقتدر اور ذمہ دار ہستیاں اس پر مجبور نہیں ہوتیں کہ آئندہ اور عام مفاد کی خاطر کچھ لوگوں کو ان کی آسائشوں سے محروم کر دیں، اور تھوڑی دیر کے لئے بالِ ہمدردی اور بے جا رحم سے دست بردار ہو کر خود کو اور دوسروں کو بے تامل مصاف کارزار میں سینہ سپر کر دیں؟ یاد ہو گا کہ گزشتہ مضمون میں ہم متعدد مرتبہ بتا چکے ہیں کہ نطشے کے مخاطبین خاص اور اعلیٰ افراد ہیں، جن میں قیادت، تحکم، اقتدار کی صلاحتیں موجود ہوتی ہیں۔ اب ان لوگوں کی حالت پر ذرا دیر کے لئے غور کرو۔ مقنن، قاید، سپہ سالار، حاکم عدالت اور ایسی ہی دوسری ذمہ دار ہستیاں اکثر و بیشتر اس پر مجبور ہوتی ہیں کہ متعدد افراد کو بالقصد و ارادہ ایذا پہنچائیں اور انھیں یہ سب کچھ قلب کی طمانیت، اور ضمیر کی صفائی کے ساتھ کرنا ہوتا ہے، میدان جنگ میں سپہ سالار جب یہ دیکھتا ہے کہ فتح اور کامیابی کے لئے قربانیاں ناگزیر ہیں، تو وہ سینکڑوں مجروحوں اور زخمیوں کو سسکتا چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، اور عام مفاد کے لئے اسے اپنے ضمیر کی صدائے مخالفت، اور نفس لوامہ کی چٹکیوں کو بالکل نظر انداز کر دینا ہوتا ہے۔ کیا ایسے لوگوں کو "شقی القلب" "جابر" یا کرُّ کہا جا سکتا ہے؟ یہ لوگ رحم کی صفت سے عاری نہیں ہوتے لیکن غلامانہ رحم کی بجائے جو کسی مفاد عظیم کو جزوی تکالیف کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے، ان کے دلوں میں شریفانہ شقاوت اور سختی ہوتی ہے۔ اس شقاوت کی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور اس کی محبت زیادہ دور اندیشانہ ہوتی ہے۔ ہر شخص اس قسم کی شقاوت کا مجاز نہیں "خار مغیلاں" کی "سرزنش" سے ڈر کر "شوق کعبہ" سے دست بردار ہونے والے اگر اس قسم کی سختی اور شقاوت کریں تو دنیا کا فرض ہے کہ انھیں اس سے روک دے۔ اس کے اہل تو کچھ وہی لوگ ہوتے ہیں، جو دوسروں کی حفاظت اور بقا کے ذمہ دار صاحب اقتدار، اور قوم و ملت کے آئندہ عروج کے پیامبر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمدردی صرف ان کو سزاوار ہے جو خود صاحب اقتدار ہیں۔ اسی طرح سے جبر و شقاوت صرف انہی لوگوں کے لئے مباح ہے جو سینہ سپر ہو کر دوسروں کو شاہراہ ترقی پر لے جاتے ہیں نطشے کہتا ہے:۔

"میں خود کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قربان کر دوں گا، اور اپنے ہمسایوں کو بھی خالقین کا

قول یہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن ہر خالق جابر بھی ہوتا ہے"۔ اقبال اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے:۔

عفو بے جا سردی خون حیات سکتۂ در بیت موزون حیات

رحم کی طرح نطشے استیثار کو سب کے لئے جائز نہیں سمجھتا

رحم اور ہمدردی کے متعلق نطشے کے خیالات تم دیکھ چکے اور انصاف سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی چیز مخالف مذہب یا مخالف عقل نہیں ہے۔ اپنے ابنائے وقت کی "سست عناصری" کو دیکھ کر اس کا دل اپنے زمانہ کے اخلاقی معیارات سے متنفر ہو گیا، اس نے دیکھا کہ قوم روز بروز تباہ اور پست ہوتی جا رہی ہے، اور اس پستی کے اسباب کی تلاش میں وہ مصروف ہوا۔ اس کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ ضعف و پستی کے اصلی اسباب لوگوں کی کم زوری اور بزدلی ہیں اور ان کو طرح طرح کے خوشنما لباسوں میں ملبوس کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قناعت کے پردہ میں اپنی نااہلیت کو حق بجانب ٹھیرایا جاتا ہے۔ اپنی کم زور اور ناکارہ ہستیوں کو قایم رکھنے کے لئے غلامانہ رحم کی تلقین کی جاتی ہے اور دوسروں کی محنت کے ثمرات سے متمتع ہونے کے لئے ایثار کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور فنا اور زوال کو سرمایہ آخرت اور زور و اقتدار کو عذاب اخروی کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ ان حالات نے اسے چونکا دیا، اور سرد خون میں حیات کی گرمی پہنچانے کے لئے اس نے اپنا پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا، اور اپنی اس نصیحت کے صلہ میں حسب دستور زمانہ مطعون بنایا گیا۔

نطشے کے مخالفین کا سب سے زبردست اعتراض اس کی تلقینوں پر یہ ہے کہ ان میں شروع سے آخر تک خود غرضی کی تلقین ہے، دوسروں کے مفاد کو پامال کیا جاتا ہے، اور خاص افراد کے بقا اور قیام کی نصیحت کی جاتی ہے۔ دوسرے اعتراضوں کی طرح یہ اعتراض بھی سمجھ کر لوگوں کی جودت طبع کا ثبوت ہے جو یا تو اس کے پیغام کو سمجھ نہ سکے، یا پھر سمجھ کر اس تلخ دوا کو قبول نہ کر سکے۔ اشتراکیت، جمہوریت، مساوات، رحم، ہمدردی کی طرح استیثار اور ایثار کے متعلق نطشے کے خیالات حسب معمول واضح اور صاف ہیں۔ جس طرح ہر شخص کو اس کا حق نہیں۔ کہ ہمدردی اور رحم کا دعویدار بنے، اسی طرح سے ہر کس و ناکس اس کا مجاز نہیں ہے کہ اپنے ذاتی اغراض کو پیش نظر رکھے، اور استیثار سے

کام ہے' اس کا قول ہے کہ:۔

"ہر شخص کو خود غرض بننے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جہاں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کی خود غرضی قوم و ملت کے لئے مستحسن کہی جا سکتی ہے' وہاں کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کی خود غرضانہ جد و جہد ہیئت اجتماعیہ کے لئے بدترین خطرہ ثابت ہو سکتی ہے' اور اسے ہر ممکن طریقہ سے ہٹانا ہر شخص کا فرض ہے"

نطشے کن لوگوں کے استیثار کو جائز سمجھتا ہے؟

نطشے کا مذکورہ بالا قول پڑھ کر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود غرضی اگر قبیح ہے' تو کن لوگوں کے لئے' اور اگر جائز ہے تو وہ کن صورتوں میں' اور کن افراد کے لئے؟ اگر تم نطشے کے مجوزہ نظام جماعات کو' جس سے ہم گزشتہ مضمون میں بحث کر چکے ہیں اپنے ذہن کے سامنے لاؤ' انسان اعلیٰ کی جو تعریف اس نے کی ہے اور ناکارہ اور مجہول افراد کی جو تصریح وہ کر چکا ہے' اس پر غور کرو' تو اس سوال کا جواب آسانی سے مل جائے گا۔ استیثار سے یہ مراد ہے کہ اپنے مقاصد اور اغراض کو مرجح سمجھا جائے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ذلیل اور ناکارہ افراد اگر استیثار سے کام لیں تو ان کا منشا یہ ہوگا کہ ان کے ہی جیسے ناکارہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور ان کی افزائش ہو۔ ذرا دیر کے لئے فرض کر لو کہ ایسے لوگوں کو استیثار اور خود غرضی کا حق دے دیا گیا ہے' اس کا لازمی نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ اعلیٰ شخصیتیں دنیا سے رخصت ہو جائیں' اعلیٰ صفات مفقود ہو جائیں اور عام طور پر انسانیت کا خاتمہ ہو جائے۔ پس ان لوگوں کو جو ذہنی اور جسمانی اعتبار سے طبقہ اوسط سے بھی گرے ہوئے ہوں استیثار کا مجاز ٹھیرانا' دنیا کی انتہائی بدبختی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ جب یہ دعویٰ کریں کہ "ہم لوگ استیثار سے کام لینا چاہتے ہیں' اور اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں" تو اس وقت دنیا کو چاہئے کہ حقارت آمیز خاموشی سے ان کے دعوؤں کو سنے۔ جب یہ لوگ یہ استدلال پیش کریں کہ "ہم کو دنیا میں رہنے' بڑھنے اور ترقی کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ ذی اقتدار اور اعلیٰ افراد کو" تو اس وقت دنیا کا فرض ہے کہ ان کی طرف سے کمال بے توجہی برتے۔ یہ لوگ جس طرح استیثار کے اہل نہیں اسی طرح ان کا ایثار بھی دنیا کی ترقی کے لئے بہت کچھ خطرناک ہے۔ اگر میرے پاس صحت بخش غذا کا کافی ذخیرہ موجود ہو' اور میں ایثار سے کام لوں' یعنی دوسروں کو اس میں شرکت کی دعوت دوں

تو کیا میرا یہ فعل دنیا کی نظروں میں ایثار ہوگا، اور کیا لوگ مجھے اس صفت سے متصف گردانیں گے؟ اسی طرح سے ناکارہ اور پست افراد کا ایثار سے کام لینا، دنیا کو پست اور ذلیل بنانا، اور ایک نیک اور مفید صفت انسانی کو بدنام کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

مذکورۂ بالا گروہ کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جس کے لئے استیثار کرنا اور اپنے مفاد کو دوسروں کے مفاد پر ترجیح دینا قبیح نہیں بلکہ ہر طرح سے جائز اور مستحسن کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا وجود ہماری دنیا کو زیادہ حسین، زیادہ انبساط انگیز، زیادہ تندرست، اور روحانی اور جسمانی اعتبار سے زیادہ مستحکم بنا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کا استیثار ایک اخلاقی فرض ہے، اور ان کا ایثار ان کے استیثار کے ماتحت ہونا چاہئے۔ ایسے ایثار سے کام لینا جو ان لوگوں کے بقا اور اقتدار کے منافی ہے، ان کے لئے بمنزلہ گناہ کے ہونا چاہئے۔ نطشے کہتا ہے:۔

"خود غرضی اور استیثار کی قیمت کا اندازہ ہمیشہ استیثار کرنے والے کی شخصیت کی مناسبت سے ہونا چاہئے ممکن ہے کہ یہ بہت قابل قدر ہو۔ نیز ممکن ہے کہ یہ بہت قابل نفرت ہو۔ ہر فرد کے متعلق دیکھا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ترقی کا نمائندہ ہے یا اس طبقہ حیات سے اس کا تعلق ہے جو مائل بہ انحطاط ہے اگر یہ معلوم ہو جائے تو ہمارے پاس اس فرد کے استیثار اور خود غرضی کے ناپنے کا ایک اچھا معیار موجود ہوتا ہے، اگر وہ اس گروہ میں سے ہے جو حیات کی ترقی اور بلندی کا نمونہ ہے تو یقیناً اس کی قیمت بہت کچھ زیادہ ہے، اور چونکہ اس کی ذات کی ترقی کے ساتھ حیات اجتماعیہ کی ترقی بھی بہت کچھ وابستہ ہے اس لئے اس کا استیثار اگر غیر معتدل اور مبالغہ آمیز بھی، تب بھی کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ شخص زوال پذیر طبقہ حیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی ذات انحطاط، ذلت اور مرض کی مظہر ہے تب اس کی قیمت بہت کم ہے، اور انتہائی انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ اسے بہتر اور ترقی یافتہ طبقے سے کم از کم مفاد حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اس کی حیثیت ذلہ خوار سے کچھ زیادہ نہیں"۔

اس اقتباس کو شروع سے آخر تک دوبارہ پڑھ جاؤ اور اس پر غور کرو کیا کوئی بات بھی

اس میں ایسی ہے جو غلط کہی جا سکے، اور جس سے نطشے کی تلقین کا خود غرضانہ ہونا ظاہر ہوتا ہو؟ اس قدر صاف اور واضح دلائل کی غلط تعبیر کرنا معترضین کی انتہائی سوءظنی کا ثبوت ہے۔ نطشے کے مخاطب اعلیٰ افراد ہیں۔ ان لوگوں کو وہ استیثار کی تلقین کرتا ہے، اور ایثار خصوصاً مبالغہ آمیز ایثار سے بچنے کی نصیحت کرتا ہے۔ کیا کوئی بات اس نصیحت میں خلاف صداقت وحقیقت ہے؟ اپنی حالت پر غور کرو اگر کسی جائز جد وجہد میں تم اپنے مدمقابل پر فتح پانے کے قریب ہو، اور معاً "ایثار" کے غلبہ میں آکر تم اپنی مساعی سے دست بردار ہو جاؤ، تو کیا ایسا کرنا تمھاری بہبودی کا باعث ہو گا؟ حیات کے بہترین لمحوں میں جب تمہارے قوائے عقلیہ اپنے عروج کی حالت پر ہوں، تمہارا ذہن حاضر ہو، یکے بعد دیگرے آئندہ کے متعلق منصوبے تمہارے دماغ کے سامنے آرہے ہوں، ایک سے ایک بہتر تدبیر تمہارے پیش نظر ہو، اور تم "ایثار" کے خیال سے مغلوب ہو جاؤ تو کیا تمہارے منصوبوں میں پہلے کی سی پختگی، تمہاری تدبیروں میں پہلے کی سی اصابت باقی رہے گی؟ ایسے مواقع پر "ایثار" کی تلقین انسانی قوت فاعلہ کو لازمی طور پر پست کر دیتی ہے۔ بلندیٔ فکر، علو ہمتی، جودت طبع، تیزیٔ نظر، ان سب کا بحر ذخار جا پتی رو میں تم کیا کچھ اعلیٰ اور لایق ستائش کام نہ کرا چھوڑتا ہے، ایثار کی دیوار سے ٹکرا کر اپنا پہلا زور اگر تمام نہیں، تو بہت کچھ کھو دیتا ہے اور اسی ایثار سے نطشے اعلیٰ انسانوں کو باز رکھتا ہے۔ خاص خاص صورتوں میں وہ اس سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کی تلقین خاص خاص افراد سے متعلق ہوتی ہے لیکن دنیا کے روبرو اس کو ہر ایثار کا مخالف بنا کر پیش کرنا، اور لوگوں کو یہ باور کرانا کہ وہ ہر شخص کو ایثار سے پرہیز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے اور اس کے معترضین نے اس حربہ کے استعمال میں بہت کچھ مستعدی دکھائی ہے۔ غالب نے سچ کہا ہے:-

ع نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

مذکورۂ بالا حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر تم ذیل کے اقتباسات پڑھو۔ تو شاید تم میں تحیر اور غضب کی وہ کیفیت نہ پیدا ہو، جو نطشے کے مخالفین میں اس کی ہر تحریر سے بہت آسانی کے ساتھ پیدا

ہو جاتی ہے۔ ان اقتباسات کو اگر غور و فکر سے پڑھا جائے تو نطشے کے معیارات حیات کا اچھا خاصہ اور منصفانہ اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کی تلقین کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی تلقینوں کا محرک اس کا جذبہ شورش انگیزی تھا یا حالات زمانہ کی اصلاح مقصود تھی:

(۱) کیا میری نصیحت یہ ہے کہ تم اپنے ہمسایہ سے محبت کرو؟ نہیں! میں تو تم کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے ہمسایہ سے بھاگو اور اس سے محبت کرو جو بہت مستبعد ہے (یعنی زمانہ مستقبل کے بہترین انسان "انسان اعلیٰ" رقم)

(۲) ہمسایوں کی محبت سے بدرجہا بلند پایہ وہ محبت ہے جو تم کو بعید ترین انسان یعنی انسان مستقبل سے ہو۔

(۳) تم جو اپنے ہمسایہ سے محبت کرتے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ آگے چل کر اس کا نقصان کس کو برداشت کرنا ہوتا ہے؟ تمہاری اولاد اور تمہاری اولادوں کی اولاد کو!!

(۴) تم کو اپنے اخلاف کی سرزمین سے الفت کرنی چاہیئے اور تمہاری نئی امارت یہی ہونی چاہیئے وہ سرزمین جو بعید ترین سمندروں میں ناپتہ موجود ہے! میں تمہارے بادبانوں (جہازوں!) کو حکم دیتا ہوں کہ اسی سرزمین کی طرف تم

(۵) اپنے باپوں کے حقوق پدری سے سبکدوش ہونے کا ذریعہ تمہارے پاس تمہاری اپنی اولادیں ہیں صرف اس طرح تم اپنے پورے ماضی کو بہتر بنا سکتے ہو۔ میں یہ نیا معیار تمہارے لئے قائم کرتا ہوں"۔

ہمارا قومی شاعر اقبال اس بعید ترین انسان کی آرزو میں کس قدر بیتابی سے کہتا ہے:۔

نغمہ من از جہان دیگر است[1] ایں جرس را کاروان دیگر است
انتظار صبح خیزاں می کشم اے خوشا زرتشتیان آتشم
بے نیاز از گوش امروز آمدم من صدائے شاعر فردا ستم
نغمہ ام ز اندازہ تار است بیش من نہ ترسم از شکست عود خویش
ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت ہمچو فکر من در معنی نہ سفت

یا "نائب حق" (نطشے کے انسان اعلیٰ) کے انتظار میں یوں رطب اللسان ہے:۔

خفتہ در خاکستر امروز ما شعلۂ فردائے عالم سوز ما
غنچۂ ما گلستان در دامن است چشم ما از صبح فردا روشن است
اے سوار اشہب دوراں بیا اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
خیز و قانون اخوت ساز دہ جام صہبائے محبت باز دہ
نوع انساں مزرع و تو حاصلی کاروان زندگی را منزلی
از وجود تو سرافرازیم ما پس بہ سوز ایں جہاں سازیم ما

[1] یہ متفرق اشعار مثنوی اسرار خودی کے مختلف مقامات سے اپنے مطالب کی یکسانیت کے لحاظ سے نقل کئے گئے ہیں۔

احوال اسم و اصلاح رسم خط

(از جناب مولوی سید نوازش علی صاحب لمعہ)

ہم جناب لمعہ صاحب کے متشکر ہیں کہ مضمون ہذا انہوں نے خاص کاوش اور سنجیدگی سے لکھا ہے۔ ترقی زبان اردو کے لئے اس قسم کے مباحث و اذکار کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارے وہ معزز معاصرین و احباب جن کو لمعہ صاحب کے سابقہ مضامین کی تلخی اور عدم متانت کا ناگوار مظنہ اب تک نہ بھولا ہو۔ امید ہے کہ یہ مضمون ان کے لئے کسی قدر سامان تلافی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ (ترقی)

رسالہ اردو جلد سوم حصہ دہم بابتہ اپریل ۱۹۲۳ء میں صفحہ ۲۳ پر احوال اسم کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا گیا جس میں اسما کے متعلق کچھ قواعد بیان کئے گئے ہیں اور اسی طرح صفحہ ۱۷ میں اصلاح رسم خط کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اصل مضمون کے مفید یا غیر مفید اور مستحسن یا غیر مستحسن ہونے کا فیصلہ اہل علم کی رائے پر منحصر ہے۔ اس کے متعلق مجھ کو یہاں کسی رائے کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے لیکن اس میں جو قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں وہ مکرر غور کے محتاج پائے جاتے ہیں مثلاً احوال اسم کے بیان میں دوسری گردان کے تحت صفحہ ۲۴ پر فائدہ دوم میں یہ لکھا گیا ہے۔ کہ "(اں) پر ختم ہونے والے لفظوں میں آے کی جگہ (ایں) بڑھایا جائے جیسے دہواں سے دہویں دسواں سے دسویں لیکن وہ لفظ اس زمرے میں داخل نہیں جن کا نون صرف شعر میں غنہ پڑھا جاسکتا ہے اور نثر میں ہمیشہ ظاہر جیسے ع سارے جہاں سے بہتر ہندوستاں ہمارا" انتہی میں کہتا ہوں کہ یہ قاعدہ جامع نہیں ہے اس لئے کہ بعض اسم ایسے بھی ہیں کہ ان کے آخر نون غنہ شعر کے سبب سے نہیں ہے اور پھر بھی کسی حالت میں ان کے آخر دہویں اور دسویں کی طرح (ی ں) نہیں لاسکتے مثلاً میاں (جو کسی کو از راہ شفقت یا تعظیم اس لفظ سے بلاتے ہیں) یہ لفظ حالت

میں میاں ہی رہے گا اس کو کسی حالت میں میین نہ کہیں گے اسی طرح ماں یا اماں بمعنی مادر۔ اور اس قاعدے میں یہ بات بھی اصلاح طلب ہے کہ (اے کی جگہ ایں بڑھایا جائے) جو کہا گیا ہے یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ آئے یا آیں کسی لفظ کے آخر بھی نہیں بڑھایا جاتا ہے بلکہ صرف ی یا ئی ان بڑھائے جاتے ہیں جیسا کہ اسی گرداں کی ابتدا میں بکرا سے بکرے تحریر فرمایا ہے۔ اور یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر تھی یعنے ی یا ئی ان بڑھانے سے قبل اس اسم کے آخر کا ایک حرف یا دو حرف ساقط کردیئے جائیں گے مثلاً بکرا سے بکرے اور پردہ سے پردے اور دعوی سے دعوے اور دہواں سے دہویں کہنے میں پہلے لفظ کے آخر سے الف اور دوسرے لفظ کے آخر سے ہ اور تیسرے لفظ کے آخر سے الف مقصورہ اور چوتھے کے آخر سے الف و نون غنہ ساقط کردیئے گئے ہیں۔ یا اگر مضمون نگار صاحب اس میں کسی حرف کی تبدیل خیال فرماتے ہوں تو اس کو ظاہر کردینا چاہئے۔

(۲) صفحہ ۲۴۴ پر مونث کی پہلی گردان میں یہ لکھا گیا ہے کہ "مونث اسموں کی گردانیں یہ ہیں۔ مثلاً ناک سے ناکیں ناکوں" اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "اس گردان میں وہ تمام مونث اسم داخل ہیں جو ی یا یا پر نہیں ختم ہوتے" انتہی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قاعدہ بھی جامع نہیں ہے اس لئے کہ بعض اسمائے مونث ایسے بھی ہیں جو کہ ی یا یا پر ختم نہیں ہوتے اور پھر اس قاعدے سے خارج ہیں یعنے ان کے آخری ن یا واو نون بڑھانے سے پہلے ان میں سے ایک حرف کم کردیا جاتا ہے مثلاً جوں (بمعنی قمل و سپش) اس کو کسی حالت میں جوئیں جوئوں نہیں کہتے۔

اسی طرح مذکر کی پہلی گردان صفحہ ۲۴۹ میں ہاتھ کی حالت بدلنے سے آخر کی ہ گر جاتی ہے جیسے ہاتوں اس لئے وہاں بھی اس بات کو بیان کردینا ضرور ہے مثال میں بیل بیلوں لکھ کر اس کے تحت ہاتھ لکھنا صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح رسم الخط کے متعلق جو اجتہاد کیا گیا ہے وہ صواب پر مبنی ہے یا خطا پر اس کا فیصلہ بھی اہل فہم جس طرح چاہیں فرمائیں اس کے متعلق بھی مجھ کو کچھ عرض کرنا نہیں ہے چاہیں چھوٹے ساہب چھوٹی سین اور چھوٹی ہ سے لکھیں یا بڑے صاحب بڑی سین بڑی ح سے لکھیں مجھ کو اس میں بھی کسی رائے کا اظہار کرنا مقصود نہیں ہے لیکن اس کے ضمن میں جو باتیں مکرر غور کی محتاج ہیں اس سے آگاہ کرنا مناسب خیال

کرتا ہوں کوئی صاحب اس کو اعتراض نہ خیال فرمائیں مثلاً صفحہ ۲۷۶ پر آخری سطر میں (یوں ہی اور یونہی) کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ بولنے میں یونہیں بھی کہتے ہیں، اس کا بیان کرنا بھی ضرور تھا (ذوق)

میں ہجر میں مرنے کے قرین ہو ہی چکا تھا تم وقت پر آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا حکم ازلی ذوق یونہیں ہو ہی چکا تھا

اسی طرح تہیں ہیں کا ذکر بھی ضروری تھا۔ (میر تقی)

باندھے کمر سحر گہ آیا ہے میرے کیں پر جو حادثہ فلک سے نازل ہوا زمیں پر

آخر کو ہے خدا بھی تو اے میاں جہاں میں بندے کے کام کیا کچھ موقوف ہیں تہیں پر

پیغام جو کچھ آنے کو ہے آج کہیں سے کہتی ہے مرے دل کی تڑپ سن لو ہیں سے

گہ لب پہ تبسم ہے کبھی چیں ہے جبیں پر غصہ بھی ہیں پر ہے عنایت بھی ہمیں پر

تمہیں میں تو تم ہی کہنے کی گنجایش بھی ہے لیکن ہیں ایسا لفظ ہے کہ کوئی اس کو ہم ہی کہتا ہے، نہ لکھتا ہے اس میں تو لفظ "ہی" بالکل غائب ہے۔ اس کے عوض صرف ی ن بڑھا دیتے ہیں۔

صفحہ ۲۸۱ سطر ۱۱ میں رفعداد لکھا گیا ہے یہ لفظ بھی مکرر صحت طلب ہے یہ کس زبان کا لفظ ہے اس کی اصل کیا ہے کچھ ظاہر نہیں ہوتا اور اسی صفحہ کی آخری سطر میں فارغ بال کی اصل فارغ البال بتائی گئی ہے یہ ترکیب بھی نئی ہے عربی میں اس طرح کہیں نہیں آیا ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی عربی میں بت جن معنوں کے لئے ہے ان میں سے یہاں کوئی معنی چسپاں نہیں ہوتے۔

فارغ بال فارسی ترکیب ہے یعنے دو اسم مل کر اسم فاعل ترکیبی ہو گیا ہے جیسے سنگ دل اگر فارغ بال کو بہ ترکیب عربی فارغ البال کہیں گے جیسے قسیّ القلب تو فارسی کا پورا ترجمہ ہو جائے گا۔

فرغ کا صلہ من الٰی اور لام کے ساتھ آتا ہے جیسے فرغ منہ فرغ الیہ اور فرغ لہ موقع اور محل کے لحاظ سے کہیں گے۔ صفحہ ۲۸۳ کی ساتویں سطر میں حالاں کہ اور حالانکہ لکھا گیا ہے۔ لیکن حالاں کوئی مستقل لفظ نہیں ہے اس کی اصل حال آنکہ ہے جو کثرت استعمال سے حالانکہ ہو گیا ہے۔ چناں کہ پر اس کا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸۰ کی تیسری سطر میں گم آباد کا مخفف گمبد لکھا گیا ہے جب لفظ گنبد میں میم ہی نہیں ہے
تو پھر اس کی اصل گم آباد کس طرح مان سکتے ہیں کسی لغت میں گنبد کو گمبد نہیں لکھا ہے اور پھر گم آباد
کے کچھ معنی بھی تو نہیں ہو سکتے۔ صفحہ ۲۸۵ میں تاے منون کا جو قاعدہ لکھا گیا ہے وہاں نویں سطر
میں یہ لکھا گیا ہے کہ "تاے منون ماقبل متحرک رسم خط ہاے مختفی کے ساتھ ہو اور ماقبل غیر متحرک کا الف
کے ساتھ جیسے وکالتہً اور وقتاً" یہ قاعدہ بھی صحیح نہیں ہے اگر یہ صحیح ہو تو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو بحالت تنوین
کس طرح لکھیں گے۔ یہاں ۃ کا ماقبل غیر متحرک تو ہے لیکن بحالت تنوین الف کے ساتھ لکھ ہی نہیں سکتے
اصل قاعدہ یہ ہے کہ جو (ۃ) زاید اور بحالت وقف ۃ ہو جاتی ہے اس پر صرف علامت تنوین لکھی
جاتی ہے اور جو (ت) اصلی ہوتی ہے اور حالت وقف میں (ہ) نہیں ہوتی ہے اس کے آخر علامتہ تنوین
کے ساتھ الف بھی لکھا جاتا ہے۔ اسی صفحہ میں الفاظ متحد الصوت و متحد الصورۃ کے تحت فصیل
او سفیل لکھا گیا ہے حالانکہ اول تو سفیل کوئی لفظ ہی نہیں ہے اور پھر فصیل کے ساتھ یہ لفظ
متحد الصوت کس طرح ہو سکتا ہے ایک میں ف مقدم ہے اور ایک میں س مقدم ہے اگر ایسا نہیں ہے
تو قفل و قلفت وغیرہ بیسوں لفظ شریک ہونے کے قابل ہیں۔ اور اس عنوان سے صوتہ جو تاے
مدورہ سے لکھا گیا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ صوت میں ت اصلی ہے جو لام کلمہ کی جگہ واقع ہوئی ہے
اس کا ماضی صاتَ اور مضارع یصوتُ ہے یہ ت اصلی ہونے کے سبب سے ماضی اور مضارع میں
باقی رہی تاے مدورہ کبھی اصلی نہیں ہو سکتی۔ عربی میں ہر لفظ کی اصل ف ع ل سے دیکھی جاتی ہے
پس تاے اصلی کو تاے زاید شمار کرنا بہت بڑی غلطی ہے اس کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔
صفحہ ۲۸۶ میں ذات بہ معنی درد لکھا ہے جو لغت میں کہیں نہیں ہے شاید ذات الجنب ذات الصدر
کو دیکھ کر یہ قیاس قائم کیا گیا ہے لیکن ان الفاظ میں بھی ذات بہ معنی درد نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے
تو ذات البین اور ذات عرق، ذات البروج، ذات الشمال، ذات الیمین، ذات العماد، ذات الکرسی
وغیرہ کے کیا معنی ہوں گے؟ اگر ذات بہ معنی درد کوئی جدید اصطلاح بنائی گئی ہو تو اس کو ظاہر کر دینا
چاہیے لَا مُنَاقَشَةَ فِي الْاِصْطِلَاح بشرطیکہ اہل علم اس کو تسلیم کر لیں۔

شہادت کبریٰ

(از جنابہ زبیدہ ہاشمی صاحبہ)

شہادت بھی ایک قسم کی قربانی ہے۔ جو مذہبی یا ملکی امور کی حمایت میں ظاہر ہوتی ہے دنیا کی تاریخ میں ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جو مذہب یا ملک و قوم کے لئے واقع ہوئی ہیں۔ لیکن شہادت حضرت جناب سید الشہداء کی نظیر نہیں ملتی، آپ کی شہادت اپنی آپ نظیر ہے۔ جو اپنے خصوصیات کے باعث نہ صرف مذہب اسلام میں بلکہ دنیا بھر میں سب سے پہلی اور سب سے آخری شہادت ہے۔ بنی اسرائیل میں حضرت یحییٰ کا قتل تاریخ کے بڑے بڑے واقعات میں سے ہے۔ اور اسی طرح جو سلوک حضرت مسیح کے ساتھ کیا گیا وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ اور مذہب اسلام میں بھی حضرت امام حسینؑ کے پہلے جو شہادتیں واقع ہوئیں گو وہ اپنی حیثیت سے قابل رنج اور تاریخ کے اہم واقعات سے ہیں۔ مگر شہادت حضرت امام حسینؑ ان سب سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

دین اسلام نے دنیا میں اس لئے قدم رکھا کہ اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھی عن المنکر کے زرین اصول کو قائم کرے۔ مگر یزید نے امر بالمعروف کا سدباب کر دیا تھا حق و صداقت مفقود ہو چکی تھی، دنیا میں خدا کی طرف سے جو خدمت امت مرحومہ کو قیام حق و انسداد گمراہی کی عطا کی گئی تھی، وہ پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے حضرت امام حسین علیہ السلام نے دعوت الحق کے لئے تلوار کھینچی، مساوات جمہوریت کے لئے شہید ہوئے۔

آپ نے راہ حق کی حمایت کے لئے سر فروشی کی، پس آپ ہی کی شہادت اپنی مخصوص خصوصیات کے باعث شہادت کبریٰ ہے۔

ایک خصوصیت آپ کی شہادت کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، قبل از قبل آپ کی شہادت کی خبر دے چکے تھے اور اپنے محبوب ترین نواسے کے قتل سے جو رنج و غم ایک شفیق نانا کو ہو سکتا تھا وہ آپ کو ہو چکا تھا۔ چنانچہ عبد بن حمید اور طبرانی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضرت

ام سلمہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے مکان میں آرام فرما رہے تھے اسی اثنا میں حسین تشریف لائے میں ان کو گود میں لئے ہوئے تھی کہ آنحضرت کو بیدار نہ کریں پھر کسی کام میں مشغول ہوئی اسی عرصہ میں حسین اندر تشریف لے گئے۔ اور آنحضرت کے شکم مبارک پر بیٹھ گئے۔ ناگاہ میں نے آنحضرت کے گریہ کی آواز سنی اور خدمت اقدس میں حاضر ہو کر وجہ گریہ دریافت کی آپ نے فرمایا مجھے جبرئیل نے خبر دی کہ میرا لڑکا عنقریب قتل کیا جائے گا"۔

امام احمد اور ابن ابی شیبہ اور ابو یعلیٰ نے سعد بن منصور سے روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں جنگ صفین کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا جب فرات کے کنارے پہنچے تو آپ نے کچھ دیر توقف کیا میں نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا ایک دن میں آنحضرت کے پاس تھا، آپ کے چشم مبارک سے آنسو جاری ہوئے میں نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ مجھے خبر دی گئی کہ حسین فرات کے کنارے قتل کیا جائیگا" حضرت حسین کی شہادت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے شخصیت اور استبدادیت کے خلاف جمہوریت کے لئے تلوار اٹھائی فسق و فجور ظلم و زیادتی کے مقابل انصاف اور صداقت کے لئے جان فروشی کی ضلالت اور گمراہی کے سد باب اور ہدایت اور صراط مستقیم کے لئے تلوار کھینچی بدعت اور نفسانی جذبات کے خلاف حقانیت اور امر بالمعروف کے لئے شہید ہوئے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ اُس زمانے میں تھے جبکہ اسلام کا نشو و نما تازہ تھا، ہر شخص کے دل میں ہر چیز سے زیادہ اپنے مذہب کی حمیت تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت کے باعث آپ کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی، باوجود اس حالت کے رسول اللہ کے نواسے پر ظلم وستم کا ہونا خصوص جبکہ وہ لوگ دنیا میں موجود تھے جو اپنی آنکھوں سے رسول اللہ کو پیار و محبت کرتے دیکھ چکے تھے اور وہ لوگ باقی تھے جنھوں نے آپ کو رسول اللہ کے کاندھے پر سوار دیکھا تھا، وہ لوگ زندہ تھے جنھوں نے سنا تھا کہ حسین کی محبت رسول اللہ کی محبت ہے، باوجود ان تمام باتوں کے یکس قدر عجیب تھا کہ آپ پر ظلم وستم توڑے گئے۔ اہل و عیال کی معیت بھی ایک خصوصیت ہے مختلف سن و سال کی عورتیں ننھے ننھے بچے جن کو ہر مذہب اور ہر قوم نے قابل رحم سمجھا ہے بھوکے پیاسے ہیں، گرمی کا موسم وہ بھی عراق عرب کی گرمی، ریگستان کا مقام پھر سارا کا سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا سوا ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہیں رہا۔ باوجود اس صداقت کی حمایت کرنا اور مرنے کے لئے تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے، بتاؤ آج دنیا کی تاریخ میں کون شہادت اس مرتبہ اور رتبہ کو پہنچتی ہے؟ کیا شہادت کبریٰ اور حادثہ عظمیٰ اس سے کوئی اہم ہو سکتا ہے؟

خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم بھی ہمیشہ اسلام پر قربان ہونے کے لئے موقع کے جویاں رہیں اور اسلام پر فدا ہو کر جس کے کہلاتے ہیں اُن کے تعاون اُنھیں کی سنت سے

مقدمہ دیوان جان صاحب

از مصور لطافت آغا حیدر حسن صاحب دہلوی (علیگ)

ایشیا میں بادشاہ ظل اللہ سمجھا جاتا ہے، اور ہندوؤں میں تو ایک فرقہ ایسا تھا کہ وہ بادشاہ کے درشن بغیر ان جل نہ چھوتا، بادشاہ کی ایک جھلک نحوست، بدنصیبی کو دور کرنے والی خیال کی جاتی، یہی عقیدت بادشاہ کے خاندان والوں اور سرکار دربار سے تھی، چنانچہ اس کا پتہ جان صاحب نے جو دربار کے داخلے پر فخر کیا ہے اس سے کچھ کچھ چلتا ہے۔

جان صاحب کا اجی ہو گیا کچھ اور دماغ جب سے جانے لگے دربار میں شہزادوں کے

دوسری جگہ ولیعہد کی یاد فرمائی پر پھولوں نہیں سماتے، شادوں شاد اور نہالوں نہال ہو کے کہتے ہیں۔

جان صاحب میرا دل شاد نہ کیونکر ہو جائے ہے ولی عہد بہادر نے کیا یاد مجھے

حاکم کے حکم احکام کی بجا آوری ہندوستان کے خمیر میں ہے۔ جان صاحب نے کیا ترت پھرت اس کی متابعت میں دکھائی ہے۔

ایسی ہی ایک ریختی کہ جان صاحب اور بھی حکم آیا ہے مرے نواب کی سرکار سے

لیکن نہ یہ دربار ہی سازگار ہوئی، نہ ولیعہد بہادر کی یاد فرمائی کام آئی۔ دھاؤ دھاؤ جو کرموں کا لکھا ہے سو پاؤ۔ اس ناقدری سے تنگ آکر بیچارا گالی گلوج پر اتر آیا، شہر آشوب میں سب کی خوب ہی جی کھول کر دھجیاں اڑائی ہیں، البتہ بادشاہ کو بچا گئے ہیں، سارا حیدا لمحکمہ اخبار پہ رکھا ہے کہ وہ بادشاہ کو ان بدعنوانیوں کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتا، اس کو یوں ادا کیا ہے، اور قصیدے کا ساز و راس ہیں پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔

بادشاہ میرا نمازی متقی پرہیزگار اے دوگانہ رحم دل عادل سخی اور دیندار

سچ خبر پہنچے نہ جب حضرت کو لوگو زینہار کیا کریں وہ یہ خطا اخبار کی ہے آشکار

کم ہے ہم پر جتنی ہو ہر شے کی شدت آج کل

اسی شہر آشوب میں گلہ کار اطلاع دینے والے کے لیے استعمال کیا ہے "کار کی ترکیب جو سادہ کار وغیرہ میں مروج ہے، "گلہ کار" میں لکھنو والوں کی شبیہ کاری ہے۔

جب کسی نے کچھ دیا دلایا نہیں، تو بیچارا جان صاحب جلے پھپھولے پھوڑنے لگا، اور گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالنے لگا:

بھڑوے بے حنفیوں کے آگے جان صاحب انجھ   قدر کچھ کرتے نہیں ہیں، ریختی کہنا عبث

اپنے قدردانوں کا گلہ کس سادگی اور بے کسی سے کیا ہے:۔

جو قدردان اپنے تھے اے جان چل بسے   جب تو ہمارا ان دنوں یہ حال ہو گیا

زمانے کی ناموافقت سے جو پراگندہ دلی اور پریشاں خاطری ہوئی ہے، اس نے کچھ سٹھیا سا دیا ہے، اس حالت کو کیسے سیدھے سبھاؤ ادا کیا ہے۔

جان صاحب نہ رہی جب کہ کسی بات کی قدر   جو ہنر یاد مجھے تھے وہ ہنر بھول گئے

اس موقع پر اس شعر کا موازنہ خوب ہو گا۔

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

یہاں تو صرف ہنسی ہی رکی، منہ تمنا کے الگ بیٹھ رہی، لیکن جو ہنر یاد تھے وہ جب بھول جائیں تو کیسے گذر رہو، اس تنگدستی اور حالت یاس میں کیا عالمگیر نظریہ کمال کا بیان کیا ہے، اور کس طرح دو لفظوں میں:۔

جان صاحب رہا وہ تنگ سدا   جس کو حاصل کوئی کمال ہوا

بعض عقیدت مندوں کی الہامی کتاب میں ایک مضمون ہے جس میں تخیل مادیت نے گہری گہری جڑیں جما کے مواصلت کی روحانی خوشی کو کافور کیا ہے، اور بجائے اس کے کہ دوست کی آمد میں تن من دھن کسی کی سدھ نہ رہتی، بوریے بدھنے کی فکر دامنگیر ہوئی" معتقد سربسجود ہوں فرماتے ہیں

ہے خبر گرم ان کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس مادی احساس نے مالی مشکلات کی صورت اختیار کر کے یار کے آنے کی ساری خوشی کو ملیامیٹ کر دیا

اور آخر بحر کے جکندروں میں ڈالا حالانکہ اس شعر میں اپنی بے سروسامانی کا اعادہ اور حالت یاس میں
اس کا اظہار مقصود ہے، جان صاحب کے ہاں اس کی کیفیت بالکل متضاد ہے، آنے والے کو خود گرز ہے
جاتو رہے ہیں اس مست مولا دولا کے ہاں، دیکھئے کوئی کھٹیا وٹیا پڑ رہنے کو بھی ملتی ہے، کہتے ہیں۔

میں کیا جان صاحب کے گھر سونے جاؤں   سوا خاک کے چار پائی نہ ہوگی

بل بے وقوف یار اور اللہ رے بے سروسامانی میر یار علی، دیدہ مقدس کی ہمسری تو جان صاحب کا
کلام کر نہیں سکتا، حسن عقیدت الہامی مہر لگوائے، تو شرع تورے والے زبان گدی کے پیچھے سے
کھینچ نکالیں، آتنی ہمت نہیں جو کم از کم گرنتھ صاحب ہی کا مماثل قرار دیا جائے۔

اکثر لوگ ان کے کلام پر اعتراض کر بیٹھتے تھے، کس خوبی سے ان کی غلطی پر انہیں آگاہ کیا ہے۔
کہ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور کی چھلنی نکھارتے ہیں اپنا ٹینٹ سوجھتا نہیں۔

کرتے بہت ہیں غیر کے کہنے پر اعتراض   اپنا کلام سوجھتا ہے جان، کم غلط

جان صاحب کے کلام میں اخلاقی نصیحتیں بھی ہیں، پر کو کنواں کھود تو آپ ہی ڈوب ڈوب مرو،
خضر اور پانی کا جو چولی دامن کا ساتھ ہے اس کہاوت میں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی
نظم میں کھپایا ہے۔

ہے مثل آپ ہی گرتا ہے وہ اس میں خضرو   کھودتا اور کی خاطر جو کنواں رہتا ہے

دنیا کی برائیوں پر چشم پوشی کرنے اور یہاں کی خرابیوں کو دیکھنے سے مواخذہ میں گرفتار ہونے
کے خوف سے تمنا کی ہے، کہ دنیا کی کوئی بدی نظر نہ آئے، تاکہ معصوم صفت اٹھ جاؤں۔

آنکھ مندی اُٹھ جاؤں باجی تو گنا ہوسے بچوں   کھول کر آنکھیں جو دیکھا وہی دنیا خواب ہے

دو جورؤوں والے کے لئے لئے ہیں۔

خصم دو جورؤوں کا لے بوا جو سر کا پان ہے   بدی جس سے کرے گا سامنا ہوے گا ذلت کا

برائی سے بھلائی کو فروغ ہے، اور نیکی کی قدر بدی کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

اگر دوزخ نہ ہوتی فکر کرتا کون جنت کی   ہے رتبہ سوم کی خست سے حاتم کی سخاوت کا

اس میں دوزخ کے ڈر سے جنت کی فکر غور طلب ہے، پارساؤں کی پارسائی پر پانی پھیر دیا ہے گنڈے تعویذ سے استغنا ظاہر کیا ہے اور ان پر اعتقاد رکھنے کو منع کیا ہے۔

یہ قول ہے مردوں کا خدا پر رہے اے جان تعویذ کا قائل ہو نہ بوٹی نہ جڑی کا

تعویذ گنڈے تقدیر کے لکھے کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔

جو کہ تقدیر کا لکھا تھا ہوا وہ باجی کام آیا کوئی گنڈا نہ کسی کا تعویذ

راضی برضا رہنا اور ٹونے ٹوٹکوں کو نہ گردانا، اس مطلب کو بتانے کے لئے جادو ٹونوں اور پری کی رعایت سے اس طرح نظم کیا ہے۔

سنو باجی پری خانم خدا پر اپنے شاکر ہوں نہ ٹونوں کو سمجھتی ہوں کسی کے میں نہ جادو کو

گئے گذرے وقت میں بھی یہاں وہ روپیہ کی ریل پیل تھی کہ اُٹھائے نہ اٹھتا اور خرچ کئے نہ خرچ ہوتا۔ ذرا سا بہانہ میل جول رشتے کنبے والوں کو اکٹھا کرنے کا ڈھونڈا جاتا، جب کوئی اپنے بال بچوں کا کاج نہ ہوتا۔ اور ارمان ابلے پڑتا۔ تو گڈے گڑیوں ہی کا بیاہ رچا بیٹھتے جانوروں کے پالنے کا بھی اس زمانے میں بیویوں کو بہت شوق تھا، لال، طوطیاں، نرگس، اگن، پدی، شامہ، وئیر، طوطا، مینا اپنی پیاری پیاری بولیوں کے لئے پالے جاتے، بلیاں بھی بیویاں پالتیں اور ان کے بیاہ آپس میں کرتیں، ان کے بچے ہوتے تو چھٹی، چھلے کئے جاتے، گلہری کے بچے پالتیں، اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتیں، اور انھیں ہلالیتیں، ان کے گلوں میں چھوٹے چھوٹے کارچوبی پٹے، قیتون کی ڈوری پڑی، اس کا سرا مرم کی چڑیا سے بندھا، یا کیری کی زنجیر میں پڑا، گلہری کا بچہ کبھی کھوے میں بیٹھا کبھی شانے پہ چڑھا، شادی بیاہ میں بھی وہ دم کے ساتھ رہتا، دسترخوان پہ ساتھ بیٹھ کر کھاتا، جو گل میاں جب آپس میں ملتیں تو شادی بیاہ کا اشغلہ اٹھتا، وہیں آپس میں اس کا نسبت ناتا طے کراتیں اور بڑی دھوم دھام سے شادی کرتیں، غرض اس قسم کے سدھا سر فانہ کھیل دلّی لکھنو کی ارمان بھپٹیاں کھیل کے اپنے ارمان نکالتیں، امیروں کے چونچلے تھے، غریبوں کے اس میں پیٹ پلتے تھے۔ جان صاحب نے

ایک خیلا جان بیلا کو جو ہلا اٹھتا ہے اسے یوں ظاہر کیا ہے۔

کروں گی دھوم سے شادی ہو انسبت تو ٹھہری ہے گھہرا ہے مرا اور منجھلی بھابی کی گھہری ہے

سیج کی ساجھی کسی کو نہیں سہائی، ہندوستان کی عورت کے خمیر میں سوکن کا جلاپا ہے، قصے کہانیاں، ہولیاں، ٹھمریاں، سوتیا ڈاہ سے بھری پڑی ہیں، جان صاحب نے سوکن کو پار لگا دیا ہے لیکن وہ بلا کی کھٹک ہے کہ جو دور ہوے پہ بھی دو ثرہ ہوئی

مر گئی سوت مگر غم نہیں بھولا مجھ کو جان صاحب نہ کبھی دل سے یہ کانٹا نکلا

جان صاحب کے کلام کی جیسی قدر ہونی چاہیئے تھی، ان کے زمانہ میں ان کے حسب دلخواہ نہ ہوئی، جان صاحب نے ہندی اور پنجابی میں بھی کہا ہے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں، لیکن جدت طرازی اس میں بھی کی ہے۔ قصیدے کو عورت بنائی، قصیدی کہا ہے، خمسے کی خمسی کی، لیکن خود مرد بننے کا شوق آخر دم تک رہا۔ ہر مقطع میں اپنے کو مرد ہی رکھتا ہے، اور عورتوں سے خطاب کرایا ہے۔

اے جان خوب کہتا ہے تو ہر زمین میں تیرے ہی شعر سب کے ہوے دل پذیر ہیں

استاد امانت نے جان صاحب کے توڑ پر دو گرگے عصمت اور ہدایت تیار کئے تھے، ان سے اکثر دو دو چونچیں ہو جاتیں، یہاں شاید جان صاحب نے انہی پر کانٹا مارا ہے، یا کسی اور ہمعصر حریف پر چوٹ ہے۔

تمام عمر نہ آوے گی ریختی اس سے لکھے وہ ریختی اے جان اس کا منہ کیا ہے،

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں جان صاحب کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اُس کا کلام نوجوانوں میں مقبول ہے" اور یہ فقرہ گویا جان صاحب کے دعوے کی دلیل ہے، کیونکہ جان صاحب کو خود اس کا علم ہے اور خود کہتے ہیں۔

قدر کیا نامرد جانیں، مرد وے جو مرد ہیں جان صاحب شاد ہوتے ہیں وہی سن کر مجھے

عام شعرا جس طرح ردیف قافیہ سے تنگ نہ ہوتے تھے، اور وزن بحر سے نہ نکلتے تھے، اور اس پر

مٹے ہوئے تھے، ریختی گو شعرا نے اس بوجھ کے علاوہ اپنے پر اور قیود عاید کر لیں، ریختی میں اضافت اور عطف کو حرام کر لیا، فارسی ترکیبیں جن میں اضافت اور عطف سے گریز محال تھی، ریختی اشعار میں لانی اہل کمال کی بے کمالی پہ دال تھی۔ اسی لئے اس قسم کی ترکیبیں اچھوتی کا ٹوکا بنی ہیں اور ریختی گو شعرا نے ان کو چھونے سے کانوں پہ ہاتھ دھرا، شاعری میں اگر اس قسم کی کوئی طرح دی جاتی، تو ریختی گو بہت کنیاتے، جان صاحب نے بھی اس پر بہت تاؤ کھایا ہے۔

رنگ رنڈی کا بنے ایسی نہ کی کوئی زمیں   مردووں نے اپنے ہی مطلب کی ہاں، ہانکی طرح

فارسی کے قافیوں سے ریختی کو کام کیا   جان صاحب ادہئی کیا کہتی بھلا، یاں کی طرح

تنگ دستی اور ناقدری کے باعث برداشتہ خاطر رہتے تھے، آخر کہتے ہیں:۔

اے جان لکھنؤ سے نکل جاؤں گی میں اب   اوقات مجھ نجستی کی ہوتی بسر نہیں

پہلا دیوان انھوں نے لکھنؤ ہی میں مرتب کیا ہے، جب یہاں رہتے رہتے بیزار ہوگئے تو دلی چلے آئے، یہاں دال نہ گلی تو بھوپال چلے گئے، وہاں بھی کوئی پالنہار میسر نہ آیا، تو اورنگ آباد کی طرف رخ کیا، یاں کیا کوئی تخت پہ بٹھا دیتا ہے جہاں گئے قسمت ساتھ رہی، پھر پھرا کے پھر لکھنؤ چلے آئے، گارسن دی تاسی اور لالہ سری رام نے اپنے اپنے تذکروں میں اس کا حال لکھا ہے، مرزا قادر بخش نے اپنے تذکرہ گلشن سخن میں، جس کو بعض صہبائی سے منسوب کرتے ہیں کہ صاحب عالم نے ستر روپے دے کر صہبائی سے لکھوالیا تھا، جان صاحب کے دلی آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا، ہاں جان صاحب کی تعریف بہت کی ہے، شاید جان صاحب سے ملاقات بھی ہوئی ہو، کیونکہ مرزا صاحب بنارس میں رہا کرتے تھے، اور اکثر لکھنؤ میں آنا جانا رہتا تھا، جان صاحب اب لکھنؤ میں جم کے بیٹھے، اور غدر کے کوئی پانچ چھ برس بعد ان کا دوسرا دیوان چھپا، اس میں پہلے کی نسبت پختہ کلامی زیادہ ہے، پہلا دیوان دل سے اتر گیا ہے، خود ہی کہتے ہیں:۔

پہلا دیوان سب غلط میرا   اس میں ظاہر ہیں چار عیب

(باقی)

انسانی تہذیب کی ترقی

(از مولوی محمد نجم الغنی صاحب قریشی، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ)

ہم باادب جناب مضمون نگار صاحب سے اس تحریف واضافہ کے لئے معافی چاہتے ہیں۔ ان کا عنوان ہے "تہذیب کی ترقی" مگر چونکہ موجودہ اور متعارف تہذیب اپنا مفہوم بالکل معکوس کر چکی ہے اس لئے بنظر اظہار حقیقت لفظ "انسانی" کا اضافہ مناسب سمجھا گیا۔ (ترقی)

قدرت کے اٹل قانون نے اجناس عالم کے لباس میں درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔ حجر وشجر سے حیوان اور حیوان سے لے کر انسان تک کی شکل میں اسی ہستی کا ظہور ہوا ہے جس کا شہنشاہ آفتاب کے گرد طواف میں مصروف رہتا امکان سے یقین اور یقین سے بداہت کا روز روشن پیش کرتا ہے۔ یہ ہستی کے حیرت انگیز مظاہر اپنی شکل وصورت، افعال وخواص کی چگونگی کے علاوہ اپنی باطنی قوت کی وجہ سے اپنے امتیاز ذاتی کا ایسا عجیب وغریب تماشا پیش کرتے ہیں جن سے اہل بصیرت کبھی سیر نہیں ہو سکتے۔ اس کارگاہ ہستی کے عمل کا بیش بہا نتیجہ انسان ہے۔ ایک نسبت سے حیوانی سلطنت کا بادشاہ اور دوسری نسبت سے ملکوتی حکومت کا سردار ہے اور ان دونوں نسبتوں میں ایسا قوی رشتہ ہے کہ ایک نسبت کی اصلاح دوسری نسبت کی اصلاح پر منحصر ہے۔ چنانچہ اب ہم اس کی پہلی نسبت پر غور کرتے ہیں۔

اگر جانوروں یا پرندوں کے سلسلہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے سے اپنا عندیہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ اپنے محسوسات کا اظہار کرنا چاہیں تو آوازوں کے ذریعہ سے اپنا دکھ سکھ، امید وبیم کی حالت ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں مثل انسانوں کے وہ باقاعدہ بات چیت کر کے اپنے دل کے حالات نہیں کہہ سکتے۔ اللہ عزوجل نے مخلوق کو اپنی حسب منشا بنایا ہے۔ جانورں

یا پرندوں کو اس قسم کی قدرت عطا نہیں کی ہے کہ وہ اپنی حالت کو بڑھا سکیں، ترقی کرسکیں، یا ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی سمجھ میں بھی حقیقت میں فرق رکھا ہے۔ ایک چڑیا اپنا گھونسلا بہ نسبت دوسری قسم کی چڑیا کے بہت اچھا اور نہایت صفائی سے بنا سکتی ہے۔ ایک چوپایہ دوسرے چوپایہ سے زیادہ کھیل تماشوں کا کام سیکھ سکتا ہے اور چونکہ اُن کو بات چیت کرنے کی قدرت عطا نہیں کی گئی ہے اس لئے وہ اپنے ہم جنسوں سے اپنے معلومات کا اظہار نہیں کرسکتے، جو کچھ وہ جانتے ہیں، وہ انہی تک محدود رہتا ہے۔ اسی طرح ہر پرندا اور ہر چوپایہ کی نسل میں ابتدائے دنیا سے وہی عادتیں اور وہی خصلتیں چلی آتی ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے اسی طرح رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے جانوروں کو بہت تھوڑی سی عقل عطا کی گئی ہے اور وہ بھی محدود۔ اور اس محدود عقل سے وہ صرف اپنے لئے تلاش معاش، آرام اور حفاظت کا کام کرسکتے ہیں اور یہ باتیں بھی صرف اسی حد تک کرسکتے ہیں جہاں تک کہ ان کی گذشتہ نسل ابتدائے آفرینش سے کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن وہ اپنی آنے والی نسل سے کسی قسم کی ترقی کے متعلق تبادلۂ خیالات نہیں کرسکتے اور نہ گذشتہ نسل سے کسی قسم کا سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ بیا اور اسی قسم کی دوسری چڑیاں اپنا گھونسلا اس قسم کا بناتی ہیں کہ اس کے اوپر چھت ہونے کی وجہ سے وہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتی ہیں، اس قسم کے نمونہ کا گھونسلا کبھی اُن چڑیوں نے نہیں بنایا ہے جو کھلی جگہ میں ابتدائے آفرینش سے بناتی چلی آرہی ہیں۔

جانوروں اور پرندوں کے ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قدرتی طور سے وہ اپنے ماں باپ کی پرورش میں بہت تھوڑے عرصہ تک رہتے ہیں، چند ہفتوں میں چڑیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے اس قابل ہوجاتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی پرورش سے آزاد ہوجائیں۔ قدرت نے چڑیوں پر اس قلیل عرصہ کے لئے اُن کی پرورش کا سلسلہ اس لئے قائم کردیا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی حفاظت کرسکیں اور خود تلاش کرکے کھا پی سکیں، لیکن جب بچے اس قابل ہوجاتے ہیں تو اُن کے ماں باپ کی مدد کا سلسلہ قطعی منقطع ہوجاتا ہے اور غالباً ایک ہی

ہفتہ میں بچے اپنے ماں باپ سے بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ، گائے اور گھوڑے کے بچے چند روز تک اپنے ماں باپ کے پاس رہتے ہیں، اور انہی کی حفاظت میں کھاتے پیتے ہیں۔ اس عرصہ میں مائیں اُن کی دیکھ بھال کرتی ہیں، اور اپنا دودھ پلاتی ہیں، لیکن جس وقت بچے اس قابل ہو جاتے ہیں، کہ وہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں، اور خود کھا پی سکیں، تو پھر وہ اپنی ماؤں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے ماں باپ سے وہ روابط، جو پہلے اُن کے ساتھ تھے ہمیشہ کے لئے جاتے رہتے ہیں۔

اس طرح جانوروں کا ہر مختلف طبقہ قدرت کے عام قانون کے مطابق، بالکل اُسی طرح سے رہتا ہے جس طرح اُس کی گذشتہ نسل رہ چکی ہے۔ موجودہ جانوروں کی نسل نہ کسی قسم کی ترقی کر رہی ہے اور نہ کر سکتی ہے، جو باتیں وہ جانتی ہے، اس کو بھول بھی نہیں سکتی، بلکہ اسی حالت پر رہے گی جس حالت پر اُن کی گذشتہ نسل تھی، اور آنے والی نسل بھی اسی حالت میں رہے گی۔

انسان کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، اللہ عزوجل نے انسان کو اپنا ہم شبیہ بنایا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ خالق ارض وسما کی بھی کوئی ظاہری شکل وصورت ہے جس سے انسان شباہت رکھتا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی ذات جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے ایک ایسی ذات ہے، جو وہم وقیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ اور اُسی کے نور کے پرتو کا نام روح ہے جب تک آدمی زندہ رہتا ہے اسی روح کی بدولت وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ مرنے کے بعد روح اس کے جسم سے نکل کر روحانی دنیا میں چلی جاتی ہے اور جو کچھ اُس نے دنیا میں کیا ہے اُس کی پرسش روح ہی سے ہوتی ہے، جب کہ انسان کو اچھائی اور برائی کی تمیز عطا کی گئی ہے اور یہ قدرت کی اُن قوتوں سے ملتی جلتی ہے، جن قوتوں کو ہم فرشتے کہتے ہیں، تو پھر ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ انسان کو ایسی مخلوق کے طبقہ میں رکھا جاتا، جو اپنے افعال کی ذمہ دار نہیں ہے، اور جن کی عقل وتمیز اور سمجھ محدود رکھی گئی ہے اپنی حالت کا نہ اندازہ کر سکتے ہیں، اور نہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنی حالت کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں انسان کے جسم کے تمام اعضا روح سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اگر اُن کو بجا طور پر استعمال کیا جائے تو اُن کی قوت ہر گھڑی ترقی کرتی رہتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انسانوں کے گروہ اور قومیں باہمی

اتحاد و محبت کی لڑی میں منسلک ہو جاتی ہیں اور ان میں ترقی کرنے کی وہی قوت ہوتی ہے۔ اگر زمانہ موافقت
کرے تو رفتہ رفتہ انسانوں کے برہنہ وحشی گروہ طاقتور اور مہذب ہو جاتے ہیں۔ انسان کو دن بہ دن
ترقی کرنے کی استعداد قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اس کی استعداد کی بنا پر ہم کو اشرف المخلوقات
ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے اور یہ صرف انسانوں ہی کا حصہ ہے۔ اچھا آؤ اس کو ذرا اور غور سے دیکھیں
کیونکہ اس میں وہ حقیقت پوشیدہ ہے جس سے تعجب بھی ظاہر ہوتا ہے اور عظمت بھی۔

اگرچہ کہ انسان کو قدرت کی طرف سے وہی غیر فانی روح عطا کی گئی ہے جس کے متعلق اوپر
لکھا جا چکا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو ہر اچھے کام کو اختیار کرنے اور ہر برے کام کو نہ کرنے، ہر کام میں فیصلہ
کرنے اور رد کرنے، ہر بات کا سبب ڈھونڈنے اور اس کے انجام پر غور کرنے کی قدرت دی گئی ہے۔
ان باتوں پر غور کر کے اور سبب دریافت کر کے وہ کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اگر اس نتیجہ کو بات چیت کے
ذریعہ وہ اپنے ہم جنسوں پر ظاہر نہ کر سکتا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان کے معلومات کی
ترقی صرف اس کے مشاہدات اور صرف اسی کے دلائل تک محدود رہتی، لیکن قوت گویائی کے عطیہ سے
ہر شخص اس قابل ہوتا ہے کہ جو کچھ ترقی کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوں، دوسروں پر ظاہر کر دے
اور اس طرح یہ خیالات جو ایک شخص کے دل میں پیدا ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ محدود نہیں رہ جاتے
بلکہ ایک اچھی خاصی جماعت کو ان خیالات کا علم ہو جاتا ہے اور انہی خیالات میں آئندہ معلومات
اور انکشافات سے عموماً حسب ضرورت اور حسب موقع ترقی ہوتی رہتی ہے اور اسی کی بدولت
وسیع معلومات کے آدمی اور موجد پیدا ہو جاتے ہیں۔ قوت گویائی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے
ذریعہ سے ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہر چیز بتا سکتے ہیں اور یہی قوت گویائی ایک ایسی نعمت ہے
جس کی وجہ سے انسان جانوروں سے اس قدر شاندار امتیاز رکھتا ہے جو اس کو حاصل ہے۔

(باقی آئندہ)

حجاز کے فرنگی سیّاح

(از مولوی سیّد علی شبیر صاحب شبیر مترجم حیدرآباد ہائی کورٹ)

(۴)

عربی سیاحوں کا بادشاہ شیخ ابراہیم ابن عبداللہ عرف جان لوئس برکہارٹ

اب ہم اُس فرنگی سیاح کا ذکر کرتے ہیں جس کو اہل یورپ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ اس کا فرضی نام شیخ ابراہیم ابن عبداللہ اور اصلی نام "جان لوئس برکہارٹ" تھا۔ یہ ۲۴ نومبر ۱۷۸۴ء کو شہر لوسین[۱] واقع سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ معمولی تعلیم کے بعد وہ دو برس تک لیزگ[۲] یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ پھر گوٹنگن[۳] میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں کیمبرج[۴] یونیورسٹی میں علم کیمیا۔ علم معدنیات، علم ادویہ وجراحی اور علم ہیئت حاصل کیا، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی میں بھی اس قدر استعداد حاصل کرلی کہ حسب ضرورت لکھ پڑھ لیتا تھا۔ برکھارٹ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا اس وجہ سے حصول علم کے بعد ۱۸۰۶ء میں وہ آفریکین ایسوسی ایشن کے روح رواں ممبر سر جوزف بنکس کے نام سفارشی خط لے کر لندن آیا۔ یہ کمیٹی افریقہ کے حالات دریافت کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی۔ برکھارٹ اس کمیٹی میں ملازم ہوگیا اور اپنے تئیں ہر قسم کی تکالیف کا عادی بنالیا۔ بھوک، پیاس، گرمی، سردی اُسے بہت کم مضرت پہنچا سکتی تھی۔ اس نے ختنہ کرالی تھی۔ داڑھی چھوڑدی تھی اور دوسری عادتیں بھی مسلمانو

---

[۱] لوسین ملک سوئٹزرلینڈ کا ایک خوشنما شہر ہے یہاں مختلف علوم و فنون کے مدرسے ہیں

[۲] الیزگ جرمنی کا بڑا تجارتی شہر ہے۔ برلن سے کوئی ۸۸ میل جانب مغرب واقع ہے۔ یہ اشاعت کتب کا بڑا مرکز ہے یہاں کی یونیورسٹی کا جرمن کی یونیورسٹیوں میں چوتھا نمبر ہے اور کوئی پانسو برس سے قائم ہے۔

[۳] گوٹنگن جرمن کا ایک شہر ہے یہاں کی یونیورسٹی کسی زمانہ میں مشہور ترین یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی تھی۔

[۴] کیمبرج انگلستان کا مشہور شہر ہے۔ لندن سے کوئی ۵۸ میل شمال و مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی بہت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے۔ اکثر ہندوستانی طالب علم ولایت جاکر اسی یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں کیمبرج کوئی چھ سو برس سے مرکز علوم و فنون چلا آرہا ہے۔

کی سعی اختیار کر لی تھیں ۱۸۰۹ء میں کمیٹی مذکور نے برکھارٹ کو حکم دیا کہ ملک شام جائے اور وہاں عربی لب و لہجہ اور مسلمانوں کے رسم و رواج و مسائل و عقاید سے اچھی طرح واقف ہو کر قاہرہ ہوتا ہوا فیضان[1] پہنچے۔ وہاں سے صحرائے اعظم[2] طے کر کے سوڈان[3] جائے اور دریائے نائجر[4] کا منبع دریافت کرے۔

چنانچہ برکھارٹ اس حکم کی بنا پر ۱۴ فروری ۱۸۰۹ء کو انگلستان سے روانہ ہو کر اپریل میں مالٹا[5] پہنچا یہاں سے ۲۰ اکتوبر کو حلب[6] روانہ ہوا اور وہاں پہنچنے کے بعد اپنا نام شیخ ابراہیم ابن عبداللہ رکھ لیا۔

برکھارٹ شام میں دو برس رہا اس درمیاں میں اس نے یہاں کے بہت سے دلچسپ و قابل دید مقامات دمشق[7] لبنان[8] قلمیرہ[9] وغیرہ کی سیر کی۔ عربی زبان میں خوب مہارت پیدا کر لی اور اسلامی عقاید و مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا۔

---

[1] افریقہ میں طرابلس کے قریب فیضان ایک عربی ریاست ہے اس کا پایہ تخت مرزوق ہے۔ [2] افریقہ کا ریگستان جو دنیا میں سب سے بڑا صحرا ہے۔ اس کا رقبہ ہندوستان سے دگنا ہے۔ اس کا تمام علاقہ خشک ریتیلا بیابان ہے کہیں کہیں سرسبز نخلستان ہیں۔ مختلف راستوں سے کاروان صحرائے اعظم کو طے کرتے ہیں۔ اس کے بیشتر حصہ کا فرانس دعوے دار ہے۔ [3] سوڈان مصر سے ملا ہوا ایک ملک ہے جس پر آج کل انگریزوں کا قبضہ ہے۔ ۱۸۸۴ء میں یہاں ایک بزرگ سید احمد نامی نے مہدویت کا دعویٰ کر کے انگریزوں سے خوب جہاد کیا تھا۔ مہدی کی وفات کے کچھ برس بعد مصر کے ہائی کمشنر کچنر نے ان کی ہڈیاں قبر سے نکال کر دریائے نیل میں ڈال دیں۔ اور اس طرح اپنی قومی روایتی تہذیب کا ثبوت دیا۔ [4] نائجر افریقہ کا مشہور دریا ہے۔ [5] مالٹا اٹلی سے ملحق بحر روم میں انگریزوں کا مشہور بندرگاہ ہے جہاں بحر روم کا انگریزی بیڑا رہتا ہے۔ [6] شمالی ملک شام کا مشہور شہر ہے۔ اس کی مختصر کیفیت پیشتر لکھی جا چکی ہے۔ [7] دمشق ملک شام کا مشہور شہر ہے اور دنیا کے سب سے زیادہ قدیم شہروں میں سے ہے اکثر سیاحوں نے اس کو مشرق کی جنت لکھا ہے یہاں کے اکثر مساجد و مقابر زیارت گاہ ہیں۔ دمشق کا مختصر ذکر اس سے قبل حاشیہ میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ [8] لبنان ملک شام میں دمشق و بیروت کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے اور شام میں سب سے زیادہ بلند مقام ہے یہ لفظ لبن سے مشتق ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں چونکہ لبنان کے پہاڑوں پر چونے کے سفید پتھر بکثرت ہوتے ہیں اور نیز لبنان کی اکثر چوٹیاں تمام سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں اس وجہ سے اس علاقہ کا نام لبنان ہو گیا ہے۔ جبل لبنان کی طرف عیسائی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے اور کل آبادی یہودی و مسلمان ملا کر تخمیناً چار لاکھ ہے ۱۸۶۰ء میں یہاں کے عیسائی اور یہودیوں نے بغاوت کر کے بڑا ہنگامہ برپا کیا تھا اس وقت سلاطین یورپ نے سلطنت عثمانیہ سے ایک معاہدہ کیا کہ لبنان کا گورنر ترکی رعایا سے کوئی عیسائی نامزد ہوا کرے اور تقریباً یہ صوبہ خود مختار ہو گیا۔ حلبی آئینہ جو تمام دنیا میں جاتا ہے وہ دراصل لبنان کے پہاڑوں کی برف ہے جو کھیتوں میں دبا دینے سے منجمد ہو کر سالہا سال میں پتھر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ [9] دمشق سے شمال و مشرق کی جانب کوئی ستر میل کے فاصلہ پر ریگستان شام میں اس پرانے شہر قلمیرہ کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس شہر کی توسیع و تزئین کی تھی جس کا ذکر کتاب سلاطین یعنی صحیفہ حضرت سلیمان میں موجود ہے۔ کسی زمانہ میں اس کا رقبہ تین چار میل تھا۔ آج کل ایک اجڑا گاؤں ہے جس میں سو دو سو جھونپڑیاں غریب عربوں کی ہیں۔ یورپین سیاح یہاں کے کھنڈروں کو چشم عبرت سے دیکھ کر بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں۔

برکھارٹ کے سفرنامہ شام کے مرتب کرنے والے کرنیل لیک اور سر ولیم وسلے نے اس کی عربی دانی کی بڑی تعریف کی ہے۔ کرنیل لیک لکھتا ہے "اس کی زبان بالکل عربوں کی سی تھی اور قرآن و اسلامی مسائل پر کامل عبور تھا۔ ایک مرتبہ وہ دفعتہً بہت سخت امتحان میں پڑ گیا تھا اور لوگوں کو اس کے اصلی مسلمان ہونے میں شبہ ہوا تھا جس پر دو بڑے زبردست مولویوں نے قرآن شریف و مسائل وغیرہ میں اس کا امتحان لیا مگر وہ اس آزمایش میں پورا اُترا اور اُن مولویوں پر ثابت ہو گیا کہ یہ سچا مسلمان ہی نہیں، بلکہ ایک جید عالم و فقیہہ بھی ہے" اسی طرح ایک اور جگہ کرنیل لیک لکھتا ہے "برکھارٹ عربی میں بڑا قابل تھا، دین اسلام کے تمام اصول و فروع و عقاید و مسائل سے بخوبی واقف تھا، اس کی زبان ایسی فصیح تھی کہ بالکل عرب کا اصلی باشندہ معلوم ہوتا تھا، تمام ایام حج اس نے مکے میں گزارے۔ اور مسلمانوں کی بہت سی عبادتوں اور تقریبوں میں شریک رہا مگر کسی کو اس پر مطلق شبہ نہ ہوا بلکہ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ گذری کہ وہ پہلے عیسائی تھا اور اب مسلمان ہو گیا ہے"

بیان مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ برکھارٹ کے سفرنامۂ عرب کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عربی عبارت اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا اس کی صراحت ہم آگے چل کر کریں گے تاہم حجاز میں عام لوگوں کو اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا اور ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کی عربی دانی و عربی وضع قطع سے اُس کو عرب کا اصلی باشندہ سمجھے ہوں اور شاید اس کا ثبوت اس کے سفرنامہ شام اور سفرنامۂ نوبہ میں مل سکے مگر جو لوگ اس سے بیشتر سے واقف تھے، ان کو اس کے نومسلم ہونے میں بھی شک تھا جیسا کہ اس کے سفرنامہ عرب سے ظاہر ہے، یعنے جب محمد علی پاشا بانی خاندان خدیو یہ مصر نے جو اس زمانہ میں وہابیوں کی شورش فرو کرنے کے لئے حجاز گئے ہوے تھے، برکھارٹ کو جدہ سے طائف طلب کیا تو والی جدہ کو حکم دیا کہ مکہ معظمہ کے باہر باہر کے راستے سے اس کو طائف پہنچا دے حالانکہ مکہ معظمہ کے اندر سے ہوتے ہوے طائف تک سیدھی سڑک جاتی ہے مگر محض اس شبہ سے کہ برکھارٹ عیسائی ہے اس کو حدود مکہ کے اندر گھسنے نہ دیا۔ اور جب برکھارٹ طائف پہنچا ہے اور اس کی اطلاع محمد علی پاشا کو ہوئی تو پاشا نے بر سر دربار کہا کہ "محض ڈاڑھی بڑھانے سے آدمی پکا مسلمان نہیں ہو سکتا"

علاوہ ازیں پاشا نے صادق افندی قاضی مکہ کو حکم بھی دیا تھا کہ برکھارٹ کا مافی الضمیر معلوم کر کہ یہ ہے کتنے پانی میں"۔ برکھارٹ لکھتا ہے کہ قاضی صادق افندی مجھ سے بدگمان تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ قسطنطنیہ پہنچ کر محمد علی پاشا کو باب عالی میں اس جرم کا مرتکب ٹھہرائے کہ اُس نے مکہ معظمہ میں ایک نصرانی کو داخل ہونے دیا' یہ ایسا جرم تھا جس سے بریت ناممکن تھی۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے" بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ محمد علی پاشا قاہرہ پہنچ کر مسٹر سالٹ اور مسٹر لی انگریزی کونسل اور کئی اور انگریزی مسافروں سے یہ ذکر کیا کہ میں برکھارٹ سے حجاز میں پوری طرح واقف ہو گیا تھا کہ وہ عیسائی ہے مگر انگریزوں سے چونکہ میری دوستی ہے اس وجہ سے میں نے اس پر رحم کیا اور چشم پوشی کی تاکہ جس طرح ہو سکے قاضی مکہ کو دھوکا دے کر وہاں سے نکل جائے" اس بیان سے ظاہر ہے کہ محمد علی پاشا نے عمداً برکھارٹ سے اغماض کیا یا اُس کے ظاہری اقرار اسلام کو کافی سمجھ کر اُس کے سفر میں رکاوٹیں پیدا نہ کیں۔ خیر اب ہم پھر وہی سلسلہ شروع کرتے ہیں' حلب سے فیضان جانے کے لئے برکھارٹ قاہرہ روانہ ہوا استمبر ۱۸۱۲ء کو قاہرہ پہنچ کر کچھ دن قافلے کے انتظار میں ٹھہرا رہا۔ مگر قریب میں چونکہ کوئی قافلہ فیضان جانے والا نہ تھا اس لئے وہ دریائے نیل کے راستے سے شہر محاس واقع ملک نوبہ چلا گیا۔ یہاں اس نے یہ ارادہ کیا کہ اگر مکہ جا کر حاجی کا لقب حاصل کر لیا جائے تو کمپنی کے مفید مطلب بہت سی معلومات ہاتھ لگ جائے گی۔ چنانچہ محاس سے وہ ایک غریب شامی کا بھیس بنا کر صحرائے نوبہ سے شنیدی[1] ہوتا ہوا سواکن[2] پہنچا اور یہاں سے جہاز میں روانہ ہو کر ۱۸ جولائی ۱۸۱۴ء کو جدہ داخل ہوا' وہاں سے حسب الطلب محمد علی پاشا خدیو مصر جو ان دنوں طائف میں مقیم تھے' طائف[3] گیا اور وہاں کچھ دن قیام کے بعد مکے آیا اور مناسک حج ادا کر کے ۲۵ نومبر ۱۸۱۴ء کو عرفات پہنچا۔ حج ختم ہو جانے کے بعد برکھارٹ مہینے ڈیڑھ مہینے تک مکہ معظمہ میں اور رہا پھر ۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء کو

---

[1] شنیدی ملک نوبہ کا ایک مشہور شہر ہے جو دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے کسی زمانہ میں بردہ فروشی کی یہ بڑی منڈی تھی شنیدی کے قریب قدیم مصریوں کے بت البقرا دیہ کے مندر کے کھنڈر اور متعدد اہرام ہیں۔

[2] سواکن بحر احمر کے ساحل پر علاقہ نوبہ کا ایک مشہور بندرگاہ ہے۔

[3] طائف کا مختصر ذکر اس سے قبل حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے۔

مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ اب تک اہل یورپ کو اس شہر کے حالات بہت کم معلوم ہوئے تھے۔ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر برکھارٹ بہت سخت بیمار ہو گیا اور کئی مہینے تک وہاں ٹھہرا رہا پھر تندرست ہو کر براہ ینبوع[1] طور[2] روانہ ہوا اور وہاں سے جون ۱۸۱۵ء کو جزیرہ نمائے سینائی[3] ہوتا ہوا سوئز کی راہ سے قاہرہ لوٹ گیا۔

برکھارٹ نو مہینے عرب میں رہا۔ اس عرصہ میں اگرچہ وہ طرح طرح کی فکروں اور پریشانیوں میں مبتلا رہا اور قسم قسم کی تکلیفیں اٹھائیں مگر قاہرہ پہنچ کر اس نے پھر اپنی مقررہ مہم کی دل میں ٹھان لی۔ اتفاقاً کئی سال سے کوئی قافلہ قاہرہ سے فیضان نہیں گیا تھا، برکھارٹ اس انتظار میں یہاں ٹھہرا رہا کہ اگر کوئی پھر ادھر قافلہ فیضان جائے تو اس کے ساتھ ہولے، اور اسی کے ہمراہ قاہرہ لوٹ آئے۔ ماہ دسمبر ۱۸۱۶ء میں مغربیوں[4] کا ایک قافلہ قاہرہ و فیضان ہوتا ہوا مغربی افریقیہ کو جانے والا تھا مگر برکھارٹ کو اس ملک کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ماہ اکتوبر میں بعارضہ پیچش وہ علیل ہوا اور ۱۵ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو قاہرہ میں انتقال کیا۔ اس کی موت کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنی موت سے مرا اور ترکوں نے بوجہ اس کے علم و تقدس کے بڑی دھوم سے اس کا جنازہ اٹھایا اور باب البقر[5] سے باہر مسلمانوں کے بڑے قبرستان میں اس کو دفن کیا۔ دوسری روایت وہ ہے جو برٹن کو معلوم ہوئی اور بقول برٹن جس کی شہرت برکھارٹ کی وفات کے چالیس

---

[1] ینبوع بحر احمر کا ایک مشہور بندرگاہ ہے یہاں سے ہمیشہ حاجیوں کے قافلے مدینہ منورہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں سے مدینہ منورہ (۶۶) کوس ہے۔

[2] طور ساحل بحر احمر پر ایک بندرگاہ ہے یہاں سے بتدریج بلندی چلی گئی ہے جو کوہ طور یا جبل طور سینائی چوٹی پر ختم ہوتی ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے (۷۴۹۸) فٹ ہے۔ کوہ طور کو حضرت موسیٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج صراحت نہیں۔ قصبۂ طور کی آبادی تخمیناً سات آٹھ ہزار ہے اور زیادہ تر عیسائی آباد ہیں جو جہازیوں کو غلہ وغیرہ فروخت کرتے ہیں۔

[3] جزیرہ نمائے سینائی یا کوہ سینا بحر احمر کے متصل و سوئز کے قریب ایک پہاڑی مقام یا مختلف پہاڑوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی دو مشہور چوٹیاں ہیں ایک جبل قیطران دوسری جبل موسیٰ ان کی بلندی سطح سمندر سے علی الترتیب (۸۵۹۳) اور (۷۴۹۸) فٹ ہے۔ جبل موسیٰ کے سامنے ایک چھوٹا سا مسطح میدان ہے جسے الراحہ کہتے ہیں اور عموماً اسی کو جبل سینا کہتے ہیں اور مشہور ہے کہ حسب روایت توریت شریف بنی اسرائیل نے اسی مقام پر ڈیرے ڈالے تھے جبل موسیٰ کے دامن میں وادی شعیب واقع ہے۔ یہاں ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے جس میں کلیسائے یونان کے تیس چالیس راہب سکونت رکھتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی بعض زیارت گاہیں یہاں موجود ہیں جو رب ارنی اور لن ترانی کی داستانیں سناتی ہیں۔ جزیرہ نمائے سینائی کی مردم شماری پندرہ بیس ہزار ہے۔ زیادہ تر عرب آباد ہیں۔

[4] طرابلس و الجزائر واقع افریقیہ کے رہنے والے مغربی کہلاتے ہیں۔

[5] باب البقر شہر قاہرہ کا ایک دروازہ سوئز کی راہ پر ہے۔ قافلہ حجاج و محمل مصری کی روانگی اسی دروازہ سے ہوتی ہے۔

برس بعد تک عام طور پر قاہرہ کے گلی کوچوں میں تھی، وہ لکھتا ہے کہ برکہارٹ قاہرہ کی جامع ازہر[1] میں تجوید سیکھا تا تھا، یہاں لوگوں کو اس کے مسلمان ہونے میں شک ہوا اور اس کی تلاشی لی، شامت اعمال کہ اس نے تعصب و کمینہ پن سے کلمہ اپنے تلوے پر لکھ لیا تھا جو نہی کہ مسجد کے امام کی نظر اس پر پڑی آپ سے باہر ہو گیا، اسی دم تلوار سونت لی اور ایک ہی ہاتھ میں دو کر دئیے!

میری رائے میں یہ پچھلی روایت صحیح نہیں ہے، برکہارٹ جیسے ذی علم و جہاں دیدہ سے ایسی غلطی ممکن نہیں، اس کی طبیعت میں نہ ایسا جاہلانہ تعصب تھا اور نہ وہ ایسی بیہودہ حرکت کر سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی اور صاحب ہوں، اور امتداد زمانہ نے برکہارٹ ہی کو قتیل تعصب ٹھہرا دیا ہو۔ ایک معتبر شخص مصری سیاحوں کی زبانی مجھ سے روایت کرتے تھے کہ اہل مصر کا خیال ہے کہ برکہارٹ صدق دل سے مسلمان ہو گیا تھا اور لوگ اس کے علم و فضل کے لحاظ سے اس کو شیخ برکات کہنے لگے تھے، مصر کے اکثر علما اس کے حالات و واقعات سے مطلع ہیں، یہ روایت بھی اس پہلی روایت کی تائید کرتی ہے جو برکہارٹ کی موت کے متعلق اوپر لکھی جا چکی ہے۔

برکہارٹ نے کل تیس بتیس برس کی عمر پائی اور اس مختصر عمر میں اس نے وہ وہ کام کئے کہ سو برس والا بھی مشکل سے کرے گا۔

اس کی ناگہانی موت سے عموماً اہل یورپ کو اور خصوصاً انگریزوں کو بہت ہی صدمہ ہوا، برکہارٹ اپنی تمام تحریریں اور حالات سفر وقتاً فوقتاً انگلستان روانہ کرتا رہتا تھا، اس کی خط و کتابت ہمیشہ اس کمیٹی سے جس کا یہ ملازم تھا جاری رہتی تھی، اس وجہ سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے ملفوظات ضائع نہیں ہوئے۔ سیاحت و تحقیقات برکہارٹ کی طبیعت کا جزو تھی، اس کی آنکھوں اور اس کے کانوں سے بمشکل کوئی چیز بچ سکتی تھی، جہاں جہاں وہ پھرا وہاں کے رسم و رواج، معاشرت، قانون، مذہب، تجارت، درآمد برآمد اشیا، صنعت و حرفت، پیداوار، زراعت، زبان، تاریخ و جغرافیہ کے

[1] دولت فاطمیہ مصر کے سلطان المعز لدین اللہ کے سپہ سالار جوہر نے ۳۵۹ھ میں اس مسجد کو تعمیر کرایا تھا پھر دوسرے سلاطین نے اپنے عہد میں اس کے لئے جائدادیں وقف کیں۔ جامع ازہر دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے۔ اس مسجد کا رقبہ تقریباً نو ہزار مربع گز ہے ہر اسلامی ملک کے طلبہ کے لئے اس میں دارالاقامے بنے ہوئے ہیں۔ تخمیناً نو دس ہزار طالب علم اس میں تعلیم پاتے ہیں اور کوئی تین سو شیخ ہیں

لق بہت سچے حالات تحریر کیے ہیں اور تمام واقعات کو نہایت درستی و تحقیق سے دلچسپ پیرایہ میں
ا ہے، چنانچہ سفرنامۂ عرب میں بھی اس نے ملک حجاز اور مکہ و مدینہ کے بہت مفصل حالات درج کیے
خصوصاً جدہ و مکہ کے حالات جس تفصیل سے برکھارٹ نے لکھے ہیں آج تک کسی مسلمان یا عیسائی
ح نے نہیں لکھے، حجاز کی تجارت و صنعت و حرفت و درآمد برآمد کی کیفیت اس وضاحت سے
ن کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کسی شخص کو اپنے وطن کی تجارت کے متعلق بھی شاید ہی اتنی معلومات
ہی کہ برکھارٹ نے ایک غیر ملک کی نسبت حاصل کی، اب تک اہل یورپ کو حجاز کے حالات
ت کم معلوم تھے، برکھارٹ نے تمام حالات و واقعات کو آئینہ کر دیا، اور اس کے سفرنامے کے بعد
قدر کتابیں اور سفرنامے حجاز کے متعلق لکھے گئے ان سب کا ماخذ سفرنامہ برکھارٹ ہے۔ برٹن بھی
کا تتبع و ریزہ چین ہے، جا بجا اس نے برکھارٹ کی قابلیت و تحقیقات و جستجو کی تعریف کی ہے،
الات و واقعات بلا کم و کاست برکھارٹ کے سفرنامے سے اس نے اپنے سفرنامے میں نقل کیے ہیں
ہ یہ کہ برکھارٹ کا سفرنامہ دیکھنے کے بعد ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا دل و دماغ و ذہن و حافظہ
تلاش و تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا تھا، ایک بڑی خوبی اس کے سفرنامے میں یہ ہے کہ ورق
رق اور صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا لکھنے والا کوئی عیسائی ہے یا
ن، مذہبی تعصب کی مثال شاذ و نادر ہی اس کے سفرنامہ میں ملتی ہے، البتہ قومی تعصب جو
یورپ کو ایشیا والوں کے ساتھ ہے اس کا تھوڑا حصہ برکھارٹ کو بھی فطرتاً ملا تھا اور اس وجہ سے
ادھ جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد منیف و قبر شریف
ت بحوالہ سید سمہودی مورخ مدینہ اس نے جو خامہ فرسائی کی ہے اور یہ تحریر کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ
م ایک صندوق میں دفن ہیں" اور حالات مدفن شریف کے متعلق سید سمہودی کی دو مختلف
ں کی تحریر کو ان کی متضاد بیانی سے تعبیر کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عربی عبارت کا مطلب
ح نہیں سمجھ سکتا تھا، یا یہ کہ اس کے سفرنامے میں جو اس کے انتقال کے بارہ برس بعد طبع ہوا ہے،
مرتب کرنے والوں نے کچھ تحریف کر دی ہے جس سے اگرچہ نکتہ چیں عیسائیوں کو ایک شگوفہ ہاتھ

آ گیا مگر برکھارٹ کی عربی دانی کو بٹہ لگ گیا۔ چونکہ برکھارٹ کا یہ یارک محض بطور تذکرہ واقع ہوا ہے اس لئے ہم اس کے متعلق یہاں زیادہ تحریر نہیں کرتے البتہ برٹن کے حالات میں جس نے برکھارٹ کے ریمارک مذکور پر ایک پاڑ باندھی ہے اور اس کو ایک دلیل قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کو فرضی قبر ظاہر کیا ہے ہم بالتفصیل بحث کریں گے۔ برکھارٹ کی تصنیفات سفرنامہ شام، سفرنامہ نوبہ، سفرنامہ عرب میں وہابیوں اور بدویوں کے حالات اور عربی ضرب الامثال ہیں۔ برکھارٹ کا سفرنامہ عرب ۱۸۲۹ء میں ہنری کالبرن ساکن لندن محلہ نیو برلنگٹن اسٹریٹ نے انگریزی میں دو جلدوں میں شائع کیا تھا پھر اس کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا۔

اب سے کوئی ستئیس برس قبل جب نومبر ۱۹۰۰ء میں اس درویش کا مضمون فرنگی حجاج حیدرآباد کے مشہور رسالہ افسر میں شائع ہوا تھا، اس میں منجملہ دوسرے سیاحوں کے برکھارٹ کا مجمل تذکرہ بھی درج کیا گیا تھا اسی وقت سے مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس مشہور و معروف سیاح کے سفرنامہ عرب کا ترجمہ انگریزی سے زبان اردو میں کر ڈالوں اور اس محقق ہمہ داں و ہمہ گیر سیاح کا جسے اہل یورپ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہتے ہیں اہل ہند سے تعارف کرا دوں۔ میرا یہ خیال ارادہ و شوق کی حد سے نکل کر تمنا کے درجہ تک پہنچ گیا تھا مگر بعض وجوہ نے ارادہ کی تکمیل نہ ہونے دی، آخر ۱۹۱۴ء میں میری یہ آرزو پوری ہوئی اور حیرت انگیز عجلت کے ساتھ ترجمہ ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس ترجمہ کے کچھ صفحات حیدرآباد کے علمی رسالہ "افادہ" میں تین چار مہینے تک شائع ہوتے رہے تھے مگر رسالہ مذکور کی بے وقت موت سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، یہ ترجمہ بالکل مکمل موجود ہے، اگر شبیر و آل شبیر کو خدا نے اس کے طبع کرانے کی توفیق عنایت کی تو سبحان اللہ ورنہ زندگی میں میرے تطلب کو اور مرنے کے بعد میری روح کو تسکین دینے کے لئے یہ خیال کافی ہے کہ میں نے اپنے خبط کی تکمیل کر لی اور میری مراد حاصل ہو گئی۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس کے سفرنامے سے بعض بعض واقعات اخذ کر کے آئندہ نمبر میں ہدیہ ناظرین کئے جائیں گے۔

حیات تمدن

حصۂ اول

عہد سلف

(از جناب مولوی محمد مرتضیٰ صاحب)

گزشتہ سے پیوستہ

اسی سے دونوں کی قابلیتوں اور اوصاف کا فرق ظاہر ہوتا ہے اگر علاء الدین نہ ہوتا تو کافور سے دنیا خبر بھی نہ ہوتی، جو کچھ کافور نے کیا وہ علاء الدین جیسے عالی دماغ بیدار مغز کی ہمہ گیر نگرانی اور اصلی کارفرمائی کا نتیجہ تھا اس لئے فتوحات دکن کا اصل کریڈٹ علاء الدین ہی کے لئے محفوظ ہے۔ ضیاء برنی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے "عجب بختے واقبالے نباشد کہ سلطان علاء الدین درون چہار دیوار کوشک خود نشستہ بود وغلامے مجبوبے ناقصے گوش پارہ دربار زارہا گشتہ اقلیم ہا و دیارہا فتح کند" (ص ۳۶۷)

قطب الدین کا زمانہ قطب الدین جو اب اپنی خوش قسمتی سے بادشاہ ہوا وہ غیر معمولی دل و دماغ نہ رکھتا تھا جس کی ضرورت شخصی سلطنتوں کے حسن انتظام کے لئے لابد ہے۔ بہر حال اس نے اپنے جلوس کے ساتھ دیوگیر کا رخ کیا کیونکہ ہرپال دیو نے دیگر دکنی راجاؤں کی مدد سے پھر کچھ اپنی حکومت کا نقشہ جمایا تھا اور شاہی ملازم جابجا سے ہٹا دیئے گئے، دیوگیر کا جو صوبہ دکن کا صدر مقام تھا محاصرہ کر رکھا تھا، شاہی فوج کے آتے ہی باغیوں کے قدم اکھڑ گئے، ہرپال دیو کا خاتمہ ہو گیا اب دکن میں بھی امراء کو جاگیریں دی گئیں، اپنے نامو عالی دماغ باپ کی بے غور و فکر تقلید میں اپنے گجراتی النسل خسرو خاں کو جسے اس نے بوالہوسی سے کافور کی جگہ دی تھی "چتر" اور "دورباش" لوازم کے ساتھ، معبر کارومنڈل بھیج کر خود دہلی واپس چلا گیا فوج کی آمد آمد سن کر راجا محفوظ مقاموں میں چلے گئے تھے لہذا ایسی بھاری دولت ہاتھ نہ لگی البتہ وہاں (کارومنڈل) ایک نہایت دولتمند تاجر خواجہ تقی نام رہ گیا تھا (ہم لکھ آئے ہیں کہ کل ساحل ہند پر اس وقت عرب ہی تجارت کے مالک تھے، تاریخ وصاف نے مدرا کے راجہ کا نام سندر پانڈے اور وزیر کا نام تقی الدین عبدالرحمن لکھا ہے وہ یہی خواجہ تقی معلوم ہوتا ہے) اس خیال سے کہ اسلامی فوج اس سے تعرض نہ کرے گی لیکن خسرو

نے اس کو مروا ڈالا اور اس کی دولت ضبط کر کے اپنی کارگزاری کے ثبوت میں قطب الدین کے روبرو پیش کی معبر سے خسرو تلنگانہ گیا وہاں کے راجہ سے پیش کش حاصل کر کے کتلی پہنچا جہاں ۶ درم کا الماس اس کے ہاتھ لگا پھر وہ معبر واپس گیا اور چاہتا تھا کہ خود مختار بن جائے لیکن امراے اسٹاف نے اس کی بات نہ مانی مجبوراً معبر کا مفتوحہ علاقہ معتبر امراء کے سپرد کر کے وہ دہلی واپس گیا جہاں اس بدباطن نے اس ضعیف الراے بوالہوس آقا کی جس کے گردن پر (۴) بھائیوں کے خون ناحق کا مظلمہ سوار تھا، ۴ سال کی حکومت کے بعد جان ہی لیکر چھوڑی[1] اور خود تخت دہلی پر قدم رکھا، حسب تصریح ضیا برنی جس طرح بلبن کے ناخلف جانشین کیقباد سے جلال الدین خلجی نے عصاے حکومت لے لیا تھا اسی طرح پھر ایک اور نیک نفس پاک باطن ترکی[2] بہادر سپہ سالار غازی غیاث الدین تغلق صوبہ دار پنجاب نے جس نے اپنی ذاتی بہادری سے بتدریج سپہ سالاری کے درجہ تک ترقی پائی تھی اور غیر مسلم مغلوں سے ۲۹ بار لڑائی کر کے ان کی یورشوں کا دروازہ بند اور اس طرح غازی کا خطاب راے عامہ سے حاصل کیا تھا ۱۳۲۰ء میں خود امراے سلطنت کی پر زور خواہش کی بنا پر باتفاق آرا اس تخت دہلی پر قدم رکھا، جو اس کی مبارک باد کے لئے چشم براہ تھا۔

تخت کی تبدیلی اصول قابلیت کے لحاظ سے ہوتی تھی، ایک عالی دماغ حکومت کے لئے منتخب کیا جاتا اور سوسائٹی کے عام رفتار کے لحاظ سے اس کے اولاد مستحق تخت قرار پاتی لیکن جب جانشین نااہل ہوتے ناگزیر تبدیل شاہ عمل میں آتی، اس انقلاب شاہ سے عام اصول انتظام مملکت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، جب مستحق تخت حکمراں ہوتے تو نظم مملکت کی کل ٹھیک چلنے لگتی، تمدنی بہار آتی، جب جانشین نااہل ہوتے تو کل بگڑ جاتی اور بالآخر دوسرا بادشاہ خود مطلوب قوم ہو جاتا۔

---

[1] قطب الدین کے زمانہ میں ہی تھانہ (بمبئی کے قریب) جو اس وقت اس علاقہ کی حکومت کا صدر مقام تھا اسلامی عملداری میں شامل ہوا جس پر سب سے پہلے فوج کشی حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوئی تھی ۱۲ عجائب الاسفار صفحہ ۱۶۰۔

[2] تغلق کے متعلق مولوی محمد حسین صاحب کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اصل میں ترک قوم سے تھا مگر ہندی میل اس میں تھا صفحہ ۸۳ عجائب الاسفار۔

محمد تغلق کا حملہ تلنگانہ پر ۱۲۱۔ھ

بس پھر علائی روتازہ ہوگئی' رُدّر دیو نے اس اثنا میں خراج پیش کرنے سے سرتابی کی تھی' نیز صوبہ دیو گیر میں بدنظمی پیدا ہوگئی تھی جس کی اصلاح کے لئے غیاث الدین تغلق نے اپنے نامور بیٹے الغ خاں ولیعہد کو جو علائی دور میں نمایاں کام کرچکا تھا بہت بڑی فوج اور اسی پرانے علائی اسٹاف کے ساتھ دکن بھیجا' رُدّر دیو نے قلعہ ورنگل کی فصیل و برج اس عرصہ میں درست کرلئے تھے' ورنگل کے حصار گلی کا محاصرہ کیا گیا جس میں مغربی[1] اور عزارہ کا استعمال کیا گیا' قریب تھا کہ قلعہ فتح ہوجائے چنانچہ رُدّر دیو نے مصالحت کی طرح ڈالی جس طرح علاؤالدین کے زمانہ میں' لیکن الغ خاں نے اس کو منظور نہ کیا۔ اس اثنا میں جب ڈاک چند روز تک بند ہوگیا تو لشکر میں بادشاہ کے موت کی افواہیں اڑنے لگیں' بیماری بھی پھیل گئی' چند امرا علٰحدہ ہوگئے' محصورین موقع دیکھ کر باہر نکلے اور حملہ کردیا' الغ خاں بھاگ کر دیو گیر چلا آیا' علٰحدہ ہوجانے والے امرا کو غیاث الدین تغلق جیسے نیک نفس نے خوفناک طریقے سے موت کی سزائیں دیں' چار مہینے کے بعد غیاث الدین نے پھر مزید تیاری کے ساتھ دوبارہ محمد تغلق کو تلافی مافات کے لئے بھیجا' اب کے بار بیدر کو فتح کرکے ورنگل کا محاصرہ کیا گیا' چنانچہ وہ فتح ہوگیا اور اس کا اسلامی نام سلطان پور رکھا گیا' رُدّر دیو مع اپنے خاندان' خزانہ و فیل خانہ کے خواجہ حاجی کی معیت میں دہلی بھیجا گیا' جو فتوحات دکن کا اصلی اڈمنسٹریٹر تھا' الغ خاں ورنگل سے جاج نگر گیا۔

محمد تغلق شاہ دہلی ۱۲۵ھ دیو گیر بجائے دہلی دار السلطنۃ ہند

غازی تغلق اپنے ولیعہد کے نو تعمیر محل کے نیچے دب کر مرجانے کے بعد الغ خاں نے بلا کسی منازع کے محمد تغلق کے لقب سے تخت دہلی پر قدم رکھا' کرناٹک کا بعض حصہ تو سرکاری ہوگیا تھا' بعض میں باج گزار راجا بحال رکھے گئے' ہندوستان کی اسلامی حکومت کی اس وسعت نے جو لپشاور سے لے کر راس کماری تک پھیل گئی تھی محمد تغلق کو جس نے دیوگیر اور ورنگل بچشم خود دیکھے تھے' یہ سوجھایا کہ دہلی کا پائے تخت رہنا اس وقت تک موزوں تھا جب تک کہ صرف

---

[1] مغربی کے متعلق نوٹ ورنگل کے پہلے محاصرہ کے ضمن میں لکھ چکا ہوں' عزارہ دراصل عرادہ معلوم ہوتا ہے جو فارسی لٹریچر میں بکثرت مستعمل ہے اور جس سے چھوٹی منجنیق مراد ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے قلعہ پر پتھر پھینکے جاتے ہیں' ابن بطوطہ نے جو اعادہ لکھا ہے اس سے بھی مراد عرادہ ہے۔ ۱۲ عجائب الاسفار صفحہ ۱۴۱۔

شمالی ہند میں اسلامی عملداری تھی، اب جب کہ جنوبی ہند بھی اسلامی عملداری میں داخل ہو گیا ہے، تو دہلی کے عوض دیوگیر (بنام دولت آباد) دارالسلطنۃ بننے کے قابل ہے، جو تقریباً وسط ہند ہے[1]، اس خیال کی تحریک اس طرح ہوئی کہ بہاؤالدین گستاسب محمد تغلق کے بھانجے (   ) نے جو ساغر (ساگر) اور دولت آباد کا صوبہ دار تھا محمد تغلق کی ماتحتی ناپسند کر کے خود مختاری کا جھنڈا بلند کر دیا، اور جب شاہی فوج کو بمقام دیوگیر دو دفعہ شکست دینے کے بعد بالآخر ناکام رہا اور کنبیلہ واقع کرناٹک (یہ راج اس مقام پر تھا جہاں اس کے قریب ہی زمانہ میں بیجانگر کا نیا راج قایم ہوا عجائب الاسفار صفحہ ۱۵۶) کے راجا کے یاں پناہ لی[2] تو محمد تغلق بذات خود دیوگیر آیا، کنبیلہ کا راجا گرفتار ہوا، اور جب گستاسب وہاں سے بھاگ کر بلال دیو (راجہ میسور) کے پاس گیا، تو اس نے محمد تغلق کے ڈر سے اس کو گرفتار کر کے بھیجدیا، گستاسپ کا پوست چھیلا گیا، غرض محمد تغلق نے دیوگیر کو دولت آباد کے نام سے دارالسلطنۃ قرار دے دیا، اس مقصد کے لئے اس نے کثیر رقم صرف کی، دہلی سے دولت آباد تک نہایت عمدہ سڑک تیار ہوئی، دو رویہ درخت، ہر منزل پر سرائے، ابن بطوطہ جس نے اس سڑک پر دہلی سے دولت آباد کا سفر کیا لکھتا ہے "دولت آباد دہلی سے ۴۰ منزل ہے، تمام راستہ پر بیساں بید مجنوں اور قسم قسم کے درخت دو رویہ لگے ہوے ہیں، چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جا رہا ہے، ہر ایک کوس میں تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی ہیں، ہر چوکی پر ہر چیز جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے ملتی ہے گویا وہ بازار میں جا رہا ہے، اسی طرح سے یہ سڑک تلنگانہ اور معبر کے ملک تک چلی گئی ہے" (عجائب الاسفار صفحہ ۷۳) ابن بطوطہ نے جو حالت درختوں کی بیان کی ہے، اس کے لحاظ سے مجھے یہ قیاس کرنے میں تامل نہیں ہے کہ سڑکوں کی تعمیر بھی علاؤالدین کا کارنامہ ہے، جس طرح اس کے اور کارنامے مابعد اشخاص کی طرف منسوب ہو گئے ہیں، اس طرح یہ کارنامہ بھی دوسروں کی طرف منسوب ہو گیا۔ . . . . . . (باقی آیندہ)

---

[1] محمد تغلق کے سامنے ہی شیرازہ حکومت منتشر ہو گیا۔ آیندہ چل کر دوسری بار جب پھر اسلامی مغلیہ امپائر کے حدود بھی اسی قدر وسیع ہو گئے تو یہی ماجرا نظر آتا ہے کہ عالمگیر بھی سواد دولت آباد میں عمر بسر کر دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد تغلق کی رائے محض ابلہانہ نہ تھی ایک حد تک اس میں واقعیت کا پہلو تھا لیکن دارالسلطنۃ سے اہم چیز خود بادشاہ کا کیرکٹر ہے۔

[2] پیشتر حجاج بن یوسف نیز منصور کے زمانہ میں عربوں حتے کہ سادات نے بھی عرب و عراق سے بھاگ کر ہند و راجاؤں کے پاس پناہ لی تھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ۱۲

محشرِ خیال

(از مولوی سید عمر ابو طالب صاحب شمس پرسنل مددگار صدر المہام صاحب فنانس)

میں اے خیال کیسے بتاؤں کہ کیا ہے تو ہے سب کو تو پسند عجب دلربا ہے تو
لاریب زندگی کا بڑا آسرا ہے تو جو کچھ یہ کہہ رہا ہوں میں اس سے سوا ہے تو

ہے دل فریب ناز تو دلکش تری ادا
دنیا ہے ساری تجھ پہ دل و جان سے فدا

تنہائی کا رفیق ہے اور غمگسار ہے بے یار کا زمانہ میں اک تو ہی یار ہے
تسکین جاں، سکون دل بے قرار ہے تیری نوائے خوش سے فرو انتشار ہے

تو باعث تسلیٔ عشاق تفتہ جاں
تو دستگیر مضطر و ہمدرد بیکساں

معشوق کی جفا ہو کہ عاشق کی ہو وفا زاہد کا زہد ہو کہ ریاکار کی ریا
شاہوں کا حکم ہو کہ فقیروں کی ہو صدا ان سب میں دیکھئے تو ہے تو ہی چھپا ہوا

پاتے ہر ایک شے میں ہیں موجود تجھ کو ہم
نغمہ ہو شادمانی کا یا نوحۂ الم

ہے برق سے سوا تری رفتار اے خیال تیری ہی شان ہر جگہ ہے حال ہو کہ قال
ہمسر ترا بنے یہ کسی کی کہاں مجال اب تک کسی کے فہم میں آئی نہ تیری چال

حیران ہے ہوا تری پرواز دیکھ کر
بجلی خجل ہے تیری تگ و تاز دیکھ کر

ایجاد و اختراع کا تجھ سے وجود ہے سائنس کی زمانہ میں تجھ سے نمود ہے
ظاہر تجھی سے حالت چرخ کبود ہے معمور اکتشاف سے تیرا سرود ہے

احسان ہے تیرا عالم امکاں پہ سربسر
ہوتا نہ کوئی کام بھی، ہوتا نہ تو اگر

تیرے ہی دم قدم سے منور ہوا دماغ — تیرے طفیل ہی سے جس کو بھی ہے فراغ
ملتا ہے ڈھونڈھنے سے ترا بس یہی سراغ — ہے ظلمت جہاں میں تو جلتا ہوا چراغ

زیبا ہے گر کہیں، تجھے صورت گر عمل
تیرے ہی دست فیض سے ہے بکلیوں کو کل؟

تجھ پر ہر ایک کام کا دار و مدار ہے — شرمندہ کرم ترا، کل کاروبار ہے
تیرا وجود تقویت جان زار ہے — تو لطف زندگی ہے، مسرت کا ہار ہے

ہاں اے خیال چھوڑ نہ تو ساتھ نفس کا
تیرے بغیر خاک ملے زیست کا مزا

غزلیات

(۱)

(از جناب سید محمد انوار اللہ صاحب صابر)

ہمارے قدردانوں کو یہ سن کر حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوگی کہ "ترقی" نے ایک ہی سال میں اللہ کی توفیق سے ملک کے نوخیز ادبی ولولوں کو ابھارنے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ ذیل کی پاکیزہ نظم ایک ایسے قابل نوعمر کی ہے، جس کے ہمعصروں سے تو کیا بڑوں سے بھی ایسے مضامین کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی (مدیر)

بے چینی بڑھ گئی ہے دل ناصبور کی — تڑپا رہی ہے یاد کسی رشک حور کی
کہتے ہیں لوگ اس کو علامت غرور کی — خاموشی میری شان ہے طبع غیور کی
گر آہ کی بھی تھی، تو کچھ ایسا گنہ نہ تھا — پھر ہم کو مل رہی ہے سزا کس قصور کی
وہ تنگ خلق ہوں کہ میں جاتا ہوں جس طرف — آتی ہے اس طرف سے صدا دور دور کی
صابر اگرچہ تیرے معاصی ہیں بے شمار — حد بھی نہیں ہے رحمت رب غفور کی

(۲)

از جناب خواجہ جہانگیر علی خاں صاحب آنف انصاری

متوالی آنکھوں والے رفع خمار کر دے
بے خود مجھے بنا دے یا ہوشیار کر دے

ذوق الم طلب ہو دکھ درد ہی میں تڑپوں
قربان اس نظر کے پھر دل فگار کر دے

تار نفس کا نغمہ آواز دوست میں ہو
بے پردہ ساز ہستی اے پردہ دار کر دے

تیغ نگہ کا بسمل کب تک رہے تڑپتا
بس ہو چکا تماشا کرنے کا وار کر دے

قرباں میں اس ادا کے صدقے میں اس نظر کے
دل بے قرار کر دے چشم اشکبار کر دے

دیوانے کو تمہارے کیا جانے کیا ہے ملحوظ
ورنہ لباس ہستی یہ تار تار کر دے

بڑھ بڑھ کے زخم حسرت ناسور بن نہ جائے
یا چارہ ساز ہو جا یا دل فگار کر دے

وحشی کی جامہ زیبی وحشت کے ہاتھ میں ہے
پیوند یا لگا دے یا تار تار کر دے

پتلا ہوں خاک کا میں اتنا شرف ہو مجھ کو
نقش قدم تمہارا پروردگار کر دے

سب دل فریبیاں ہیں اس جان ہی کی خاطر
کیا ہو جو اس کو آنف تم پر نثار کر دے

ذکا حیدرآبادی

ہماری تعریف سے بے نیاز ہیں جن کی نسبت غالب جیسا ادبی شخصیت رکھنے والا ان الفاظ میں،
"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیاد کا نہیں، یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے
اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا ہے پس جب تملق نہیں، مدارا نہیں،
تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف و میل کہوں گا" نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ
اس سے بہتر دیا ہے، قصائد میں انوری کا چربا اٹھایا ہے، مگر طبیعت نے اعجاز ورد کھایا ہے غزل
میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخنور ہمہ داں دیکھا،
نقطلاز معنی آفرین، آفرین، صد آفریں، صد ہزار آفریں" مدح سرا ہے۔
موصوف کے اصناف شاعری پر بحث کرنے کے لئے ایک بسیط فرصت درکار ہے، انشاء اللہ یہ تفصیلی
سوانح میں بیان کئے جائیں گے جو زیر ترتیب ہے۔
فی الحال (قارئین "ترقی" کے ذوق سلیم کی تواضع کے لئے) ایک قطعہ بصورت درخواست شائع کیا جاتا ہے۔

جو نواب سالار جنگ اول کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، آئندہ اور بھی کلام باقساط ہدیہ ہوتا رہے گا۔

ہمارے بدمذاقی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اب تک اس عقیقی شاعر کے کلام کو ایک جا جمع کرنے کا کسی نے بھی ارادہ نہیں کیا، یہ بھی مجبوری ہے کہ بہت کم کلام دستیاب ہو سکا۔ مرحوم کا کلام تو بعض کے حافظوں میں محفوظ ہے، اور ایسے تو بہت ہیں جن کے سینے ان جواہر پاروں کو لے کر یا تو کمین عدم میں جا چھپے یا صبح شام کے منتظر ہیں،

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ خدمت کیونکر ادا ہو سکے گی لیکن اب تک جو کچھ فراہم ہو سکا وہ بھی اگر تلف ہونے سے بچ جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی،

غالب کی وہ درخواست نظروں سے گذری ہوگی جس کا مطلع "اے شہنشاہ آسمان اورنگ ؛ اے جہاندار آفتاب آثار" ہے، اب ذکا کی درخواست ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ شاگرد، اُستاد کی زبان سے بول رہا ہے،

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ذکا کا ممدوح نواب سالار جنگ اول سا علم دوست، جوہر شناس وزیر دکن تھا، جس کے شان میں سیکڑوں غزلیں اور ہزاروں قصائد لکھے گئے ہیں،

(محمد عبدالرزاق بسمل)

اے خداوند کار بندہ نواز — فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی ترے آگے — گر میں چلاؤں یوں زار نزار

شعر و انشا کی قدر اک طرف — ہوں میں چودہ برس کا کار گزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا — کسی صورت سے ملازم سرکار

یہ سنا تھا مزہ غنیمت کا — عز خدمت یہ ہے جہاں مدار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت — جس میں مر رہا ہے ہو بیش قرار

ہے مری ذات میں وہ استعداد — کہ نہیں شیوہ میرا استعذار
کونسا کام جو نہ دوں انجام — کونسا گھاٹ جو نہ اتروں پار

وعدے ہوتے رہے نوازش کے — مگر ایفا کے کچھ نہیں آثار
نخل ماتم نہیں میں ہوں واللہ — کہ نہ ہو میرے کی فصل بہار

شیر قالیں نہیں ہوں میں واللہ — کہ نہ ہو مجھ سے ذوق شکار
اک میں ناکام اپنی قسمت سے — سر بزانو ہو پشت بر دیوار

سیکڑوں کامیاب ہو ہی گئے — کیسے کیسے اجانب و اغیار
فی الحقیقت مقام حیرت ہے — کیا میں سنگ نشان راہ سوار

یعنی سب پہنچ جائیں منزل کو — مرے آگے سے اور کروں شمار
ایسے دردیں بہت ہیں لیکن — مجھ میں تھوڑی ہے طاقت اظہار

تسپہ بھی گر ذرا تغافل ہو — موت آسان ہے زیست دشوار
مرتے مرتے بھی یہ دعا دوں گا — خضر کی عمر تجھ کو دے دادار

ترے ہوتے بلا سے مر جائیں — مجھ سے امیدوار سا ٹھہرا
بخت کا دیکھی تیری لشانی — باادب ہے یہ (آصفی) دربار؟

تبصرہ

نوٹس آن اسلام۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ بلند حوصلہ اور عالی ہمت دل و دماغ جو سیاست، ملک داری میں ہمہ تن وقف اور دن رات مصروف رہتے ہوں، اور جن کو امورات مملکت اتنی مہلت بھی نہ دیتے ہوں کہ اپنے دل و دماغ کو کسی قسم کی راحت و آرام پہنچا سکیں، اپنے مذہب و اخلاق پر بھی مضبوطی سے قایم رہے ہوں، بیشک مسلمانوں کے عروج و اقبال کے زمانے میں ہر مدبر و ذی ہمت ہستی معاش و معاد اور دین و دنیا کا بے نظیر مجموعہ ہوتی تھی، جن کے ایک ہاتھ میں مہات سلطنت ہوتے تھے، اور دوسرے ہاتھ میں علوم و فنون کی کنجیاں ہوتی تھیں، مگر اب خال خال اس قسم کی مجموعہ صفات ہستیاں نظر آتی ہیں، ازانجملہ ایک فرد فرید و یگانہ وحید نواب سر امین جنگ بہادر (مولوی احمد حسین) ایم۔ اے۔ صدر المہام بارگاہ خسروی ہیں، جو باوجود کثرت مہات سلطنت کے علم نوازی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور اکثر ناظرین ترقی کو اپنی تحقیقات و معلومات سے مستفید فرماتے ہیں،

چنانچہ اس کتاب میں جناب معز کے ہونہار اور لایق صاحبزادوں کے لئے جو ولایت میں مقیم تھے، نہایت جامع و مانع اور بہت ہی بلیغ طرز میں چند خطوط ہیں جن کو حاجی محمد حسین صاحب نے جمع کر کے طبع کرا دیا ہے اور اس طرح نسل جدید پر خصوصاً ان نوجوانوں پر جو ولایت میں ہیں، یا ولایت جانے والے ہیں، بیحد احسان کیا ہے، اس لئے کہ ان مکرمت ناموں کا موضوع دینیات و ایمانیات ہے، جناب معز کے اقبال مند صاحبزادوں سے بزمانہ قیام ولایت کسی عیسائی مشنری نے چند مذہبی اور دینی سوالات اس طرز سے پوچھے تھے، جس سے مذہب اسلام میں اشکال و اشتباہ پیدا ہوتا تھا، صاحبزادوں نے بکمال دانشمندی ان سوالات کو اپنے شفیق اور فاضل والد کی خدمت میں بغرض استفسار روانہ کیا، اور جناب معز نے نہایت تفصیل کے ساتھ بدفعات وقتاً فوقتاً نہایت دلنشیں اور سادہ طرز میں صاحبزادوں کو جوابات لکھے ہیں جس میں پوری حقیقت طرازی کے ساتھ مذہب کی حقیقت و اہمیت کو واضح کر کے فیصلہ انھیں پر چھوڑ دیا ہے، فی الحقیقت اس سے بڑھ کر عمدہ طرز صاحبزادوں کے سمجھانے کا دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

خدا جانے نسل جدید کے کتنے لائق نوجوان ہیں جو یہاں سے سادہ صفحہ کے مانند ولایت کو روانہ

کر دئے جاتے، اور، وہاں سے آتے ہیں تو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے مذہب، ملک، قوم، زبان، ادب وغیرہ کے لئے بالکل نااہل ثابت ہوتے ہیں، در اصل ان بیش بہا خطوط کے مجموعہ نے نسل جدید پر جو احسان کیا ہے، اس کا حق شکریہ ادا نہیں ہو سکتا، کیا اچھا ہو اگر اس کتاب کا ملخص اردو میں بھی شائع ہو جائے، تاکہ وہ دانشمند والدین جو اپنے بچوں کو ولایت بھیجنے والے ہیں، اس شمع ہدایت سے مستنیر ہو سکیں، کیونکہ اب تک ہمارے پاس کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جو عازمان ولایت کے لئے حفاظت مذہب کے خیال سے اس پر مغزی اور بلاغت کے ساتھ تیار کی گئی ہو، اور جو ہمارے نوجوانوں کو لامذہبی اور دہریت سے بچا سکے جن لوگوں نے اپنے ہونہار اور بیرسٹر صاحبزادوں کے دردناک عادات کا تجربہ کیا ہے، ان کے لئے تو یہ کتاب ایک نوید تشفی و تسلی ہے، جس سے وہ بہت کچھ آرام قلب حاصل کر سکیں گے۔

اس ضمن میں ہم لندن کے مشہور اور موقر ترین روزنامہ "ٹائمز" کے ضمیمہ ادبی کا کچھ حصہ بھی بجنسہ شائع کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، تاکہ اس کتاب کی اصولی قدر و قیمت جو غیر مسلم طبقے میں ہے وہ بھی بخوبی واضح ہو سکے،

"ٹائمز" اپنی ۵ را پریل ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

مندرجہ عنوان کتاب چند خاص خطوط پر مشتمل ہے، جن کو معزز مصنف نے اپنے بھائی اور بچوں کو، کہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے متعلم تھے بھیجا تھا، وجہ یہ ہوئی کہ ان طلباء نے وہاں سے، یہ سوال کیا تھا کہ ہم کو اسلام کی وقعت حالیہ سے باخبر کیا جائے، سر امین جنگ صاحب موصوف نے بھی اپنے پیشرو سر سید احمد خاں مرحوم اور اپنے معاصر رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی طرح اسلام کے ارتقائے فجائی کی توکیل کی ہے، صاحب موصوف "اسلام" اور "مسلمانی" کی بظاہر ہم معنی لفظوں میں تفریق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ موخر الذکر میں امکان ترقی نہیں ہے، نیز یہ کہ اسلام کی حقیقی دعوت پوری پوری سورۂ فاتحہ شریف ہی میں نہاں ہے، اگر فطرتی اور سادے اصول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام اور عیسائیت باہم غیر متقارن نہیں ہیں، اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر مسیحیت ہی کی توثیق و تکمیل کی ہے، اسلام بوجہ اپنی سادگی اور دین فطرت ہونے کے

دنیا کا بہترین مذہب ہے، قرآن مجید، توحید الٰہی اور اخوت انسانی کی تمجید کرتے ہوئے کسی مزید و مخصوص طرز فلسفہ کو ضروری نہیں سمجھتا، اُس نے عامۃ مسلمین کو اس بارے میں مختار کر دیا ہے کہ جس امر کو وہ ترویج عقل اور عقلاً و قبیح سمجھیں، اس کو اختیار کریں، نیز اسلام اس اعتبار سے بھی بہترین مذہب قرار پاتا ہے کہ وہ بمقابلہ دیگر مذاہب کے جدید علمی امور پر بطرز احسن منطبق ہوتا ہے، مسئلہ ارتقا کو بھی مسلم تبلایا گیا ہے، اور سرامین جنگ صاحب موصوف نے اس بارے میں ہربرٹ اسپنسر سے لے کر سر اولیور لاج تک کے انگریزی خیالات سے استقصا فرمایا ہے، جناب معز نے تبلایا ہے کہ سائنس، فلسفہ اور مذہب میں تصادم ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کائنات کے علت و معلول کی تفصیل انہی تینوں کے امتزاج سے وابستہ ہے، اکثر سائنس اور فلسفہ مذہب سے ملحق نظر آتے ہیں مگر کبھی اُس کے مماثل قرار نہیں پا سکتے، یہ امر کہ حقیقی مفہوم کے اعتبار سے یہ تینوں باہم مربوط ہیں سورۂ فاتحہ کے معانی و مطالب سے بخوبی مستنبط ہوتا ہے کہ جس میں توحید، تحملہ اور اعتدال کے اصول منضبط ہیں۔

سائنس کی حالت یہ ہے کہ وہ اصول سے آغاز کر کے بذریعہ تسلسل ایک نقطۂ وحدت یا اکائی تک پہنچتا ہے لیکن اسلام توحید سے آغاز کر کے بذریعہ تسلسل اصول تک پہنچتا ہے اور یہی ضوابط رفتہ رفتہ ان ہر سہ گانہ مسلمات عمل پر منتج ہوتے ہیں جن کو ہم اتحاد و ایفا، خودداری اور اعتدال سے موسوم کرتے ہیں پس اسلام اور حقیقی اسلام دراصل نفس انسانی کا اپنے ماحول کے ساتھ اور اپنی ذات کا اللہ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ صحیح توافق کا نام ہے۔

کتاب میں متعدد دلچسپ فٹ نوٹ بھی بطور توضیح و تمثیل دیئے گئے ہیں اور جامع کتاب نے مشرجے، سی، ماونی ہاڈی، سی، ایس کا تبصرہ بھی شامل کیا ہے جس سے مسلمانی اور اس کے موجودہ لوازمات کے متعلق چوٹی کے اعتراضات واضح ہو جاتے ہیں۔

(سلسلۂ تصنیف نمبر (۲۲))

اردو کا ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

ترقی

مرتبہ

ابوالمکارم محمد انوار اللہ صدیقی

عام قیمت پانچ روپیہ سالانہ

شمس الاسلام پریس میں چھپ کر

دفتر رسالہ ترقی

اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترقی

جلد ۱ ——— بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۴۲ھ ——— نمبر ۱۲

فہرست مضامین

خدمت ادب

خطوط محب یہ عورتوں اور شریف لڑکیوں کو، فن انشا و خطوط نویسی سکھانے کے لئے، بہترین کتاب ہے اور خارجاً اگر از دیاد قابلیت کے لئے مطالعہ کی جا سکتی ہے تو معنًا بقول اس کی قابل مولفہ افضل النسا خانم صاحبہ کے "میری رائے میں ان خطوط کے پڑھنے سے، عورتوں کے طبقے کو بہت فائدے حاصل ہوں گے، کیونکہ رسم و رواج کی بندشوں کی وجہ سے وہ ایسے عام موقعوں پر جا نہیں سکتی ہیں، جہاں وعظ وغیرہ کے ذریعہ سے، دین کی تعلیم دی جاتی ہے، اور نہ ابھی تک مستورات عورتوں کے لئے کوئی کتابیں ایسی تصنیف کی گئی ہیں، جس سے توحید و آخرت کی واقفیت بآسانی ان کو میسر ہو"۔

یہ کتاب سلیس زبان، اور آسان پیرائے میں، توحید یا وحدانیت کا مخزن ہے، جس کے متعلق لائق مولفہ نے دیباچے میں کیا عمدہ بات لکھی ہے:۔

"علم توحید سب علوم پر مقدم ہے، اگر کوئی بڑے سے بڑا، مولوی، فیلسوف، اور ایم اے بی اے بھی ہو جائے، اور علم توحید نہ جانتا ہو تو، وہ بھی خدا کے پاس غافلین و جاہلیں میں شمار کیا جائے گا"۔

کتاب کا موضوع تو بے شک توحید ہے، مگر پوری کتاب، جو ۳۶ صفحوں میں ختم ہوئی ہے، کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ نہ صرف توحید، بلکہ معاشریات، اخلاقیات، ایمانیات، ادبیات، کے موضوعوں پر بھی بہ وجہ اکمل حاوی ہے غرض اس سے بہتر عورتوں کے لئے کوئی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی، کیا اچھا ہوتا اگر "رقعات محب" بھی جس کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے، ہم دیکھ سکتے، کتاب پر قیمت اور پتہ درج نہیں ہے۔

صلائے عام یہ رسالہ بھی منجملہ اردو کے ان قدیم اور مشہور رسالوں کے ہے، جن سے ہر ادبی کان بے خبر ہی سے ہے، البتہ یہ امر ضرور قابل آفریں ہے، کہ اس کے لائق مدیر جناب ناصر علی خان بہادر نے نہایت وضعداری اور استقلال کے ساتھ، اس یکسانیت اور تسلسل سے اردو کی خدمت کی ہے، کہ اردو رسائل میں شاید ہی کوئی، اس کی ہمسری کرے، ایسے کہنہ مشق پرچے، اور ایسے مشہور وضعدار مدیر کے متعلق کچھ بھی کہنا، آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، البتہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے،

دل ہزاروں کے تیری بھولی ادائیں لیں گی ۔۔۔ حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

شذرات

عالم متغیر کی کوئی شئے، غایت سے خالی نہیں، بشرطیکہ اس کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہو، ورنہ جو شئے بغیر کسی غایت الغایات کے یہاں موجود ہے، وہ عملاً مرتبۂ فنا میں ہے اور اس کا وجود بیکار، نفع تو پہنچا ہی نہیں سکتا، البتہ نقصان پہنچا سکتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ اکثر وہ قابل ہستیاں، اور بہت سے وہ تجاویز، جو نہایت بانفع نہایت مفید، اور نہایت مضبوط و سہل العمل تھے، بغیر کسی کام کو انجام دئے، معدوم ہو گئے، کیونکہ ان کے لئے کوئی مطمع نظر، کوئی مخصوص غایت نہ تھی، یا جس ناکامی کو آپ ہماری جہالت، بدمذاقی، پست ہمتی، کم انتظامی وغیرہ پر محول کرتے ہیں، اس کا باعث در اصل یہ چیزیں نہیں، بلکہ وہی بات ہے، جس طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ محال قطعی ہے کہ کوئی تحریک اور تجویز، اپنا مطمع، اور اپنی غایت کو حقیقی معنوں میں سونچ لینے، اور اپنے دائرۂ عمل پر غور کر لینے کے بعد، ناکام رہ سکے، مگر حیرت اور افسوس ہے، تو یہی کہ تعین والتزام غایت کا صحیح تصور ہی ہمارے تحریکات سے خارج ہے،

خیر اگر دوسری تجاویز اس اعدام غایت کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فنا ہو گئیں، یا باعث بدنامی و ضرر ہوئیں تو چنداں ہرج نہ ہوا، اس لئے کہ خود اپنے مرض کا شکار ہوئیں، لیکن جب سے اردو زبان و ادب کو یہ مرض لگا ہے، اس کی کچھ عجیب حالت ہو گئی ہے، نظم ہے کہ بے تہاہ تختۂ مشقیوں کا شکار ہو رہی ہے، نثر ہے، کہ ہمارے ایجادوں اور اجتہادوں کے اس کا ناک میں دم آ گیا ہے، ناول نویسی کی طرف جھکے، تو سینکڑوں ناول لکھ ڈالے، ہزاروں افسانے لکھ کر ڈال دئے، بیسیوں ترجمے کر ڈلے رسالہ بازی کی طرف توجہ کی تو رطب و یابس، الم غلم، موضوع مہمل، جو کچھ ملا بھر بھر کر شائع کرتے رہے مشاعروں اور گلدستوں پر آئے، تو بقول ایک تازہ وارد ایرانی کے بجز "لیلۃ الواہ واہ" کے اور کوئی نتیجہ نہ پیدا کیا، اور جہاں سے چلے تھے، وہیں رہے، جس رسالے یا دیوان یا تصنیف کو دیکھئے "گلستان معانی" اور "دریا بکنار" ہونے کا مدعی، اور ایک لحاظ سے یہ دعویٰ صحیح بھی ہے، یعنے اگر ہم "زمانہ"، "کاشف"، "مخزن" کو

اور "ہمایوں" کا "ہزار داستان" کو "ترقی" کا "معارف" اور "آئینہ" کا "نگار" کو دے دیں، تو پڑھنے والا کبھی اس دعوے کی تردید کا پہلو نہیں پاسکتا، اس لئے کہ ان ہر بیان اردو میں سے، ہر ایک علمی، ادبی، تاریخی، اقتصادی، معاشی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، روحانی، تعلیمی، ورزشی، قومی، اخباری وغیرہ وغیرہ خدا جھوٹ نہ بلائے، تو ایک درجن سے زائد ہی مقاصد کا حامل ہے، اور مساوات کا مدعی، پھر کیونکر ان میں فرق کیا جاسکتا ہے، اور طرفہ یہ کہ ہر نیا اردو کا خادم عبرت پذیری سے اس قدر بے نیاز ہے، کہ اپنے ماضی ابھرنے والے معاصرین، یا جا بجا جمشید کو آئے دن "فنا فی الادب" ہوتے دیکھتا ہے، مگر مصداق ع "مقصد و مقصود قالب دیدہ ایم"، خود بھی ان کا جنم لینے کے اندھا دھن شوق میں، شہید بے اصولی ہوجاتا ہے۔

شاید ہی کبھی ایسی کثیر اور شدید کوششیں محروم نتائج رہی ہوں، جیسی کہ اردو کی ترقی علم و ادب، اور علوم جدیدہ وغیرہ کی دیکھنے میں آئی ہیں، خدا اس بدمذاقی اور طوفان بے تمیزی سے بچائے کہ ہم تو یہ سمجھتے رہیں، کہ چلتے چلتے نہ معلوم کہاں نکل آئے ہوں گے، اور آنکھ کھول کر جو دیکھیں تو وہیں ہیں، جہاں سے چلے تھے، بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے ہیں، اس کی سب سے بڑی اور اصولی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں، جن کی طرف وفور جوش میں، حامیان اردو کا خیال نہیں جاتا، پہلا، سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہماری کوشش، جو اس سمت میں ہوتی ہے، کوئی غایت نہیں رکھتی، یا یوں کہئے کہ اس قدر غائتیں رکھتی ہے، کہ جن میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوتی۔ اور اس طرح پر "مجسمہ ادب" کا "خواب پریشاں" کے مانند خاتمہ ہوجاتا ہے، بجائے اس ابتری مطامع اگر کوئی مختصر اور مفید غایت مثلاً اصطلاحات علمیہ کی ترویج، یا فنون جدیدہ کی اشاعت، یا مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیاء، یا علم المادیات، یا اردو کے اصول قواعد وغیرہ مقرر کرکے پرچہ نکالا جائے، تو یقیناً وہ اپنی غایت اپنی مختصر زندگی میں پوری کرنے کے علاوہ اپنے "پیکر کاغذی" کو اردو کی خدمت کا اہل بنا سکتا ہے، دوسری وجہ اس کثرت تعبیر کی یہ ہے، کہ باوصف اس قدر غوغائے نظم و نثر کے، ہنوز اردو کے ادب کا کوئی معیار مقرر نہیں ہوا، یا یوں کہئے کہ اس قدر کثرت سے معیار مقرر کرلئے گئے ہیں، کہ ہر رسالہ، اور ہر تصنیف، بجائے خود ایک مخصوص معیار کا مدعی اور علم بردار ہے، اور جا بجا ٹکسالیں بنی ہوئی ہیں، جن سے الفاظ، محاورے

شذرات

عالم متغیر کی کوئی شئے، غایت سے خالی نہیں، بشرطیکہ اس کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہو، ورنہ جو شئے بغیر کسی غایت الغایات کے یہاں موجود ہے، وہ عملاً مرتبۂ فنا میں ہے اور اس کا وجود بیکار، نفع تو پہنچا ہی نہیں سکتا، البتہ نقصان پہنچا سکتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ اکثر وہ قابل ہستیاں، اور بہت سے وہ تجاویز، جو نہایت باموقع نہایت مفید، اور نہایت مضبوط و سہل العمل تھے، بغیر کسی کام کو انجام دئے، معدوم ہو گئے، کیونکہ ان کے لئے کوئی مطمح نظر، کوئی مخصوص غایت نہ تھی، یا جس ناکامی کو آپ ہماری جہالت، بدمذاقی، پست ہمتی، کم انتظامی وغیرہ پر محمول کرتے ہیں، اس کا باعث در اصل یہ چیزیں نہیں، بلکہ وہی بات ہے، جس طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ محال قطعی ہے کہ کوئی تحریک اور تجویز، اپنا مطمح، اور اپنی غایت کو حقیقی معنوں میں سونچ لینے، اور اپنے دائرۂ عمل پر غور کر لینے کے بعد، ناکام رہ سکے، مگر حیرت اور افسوس ہے، تو یہی کہ تعین و التزام غایت کا صحیح تصور ہی ہمارے تحریکات سے خارج ہے،

خیر اگر دوسری تجاویز اس اعدام غایت کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فنا ہو گئیں، یا باعث بدنامی و ضرر ہوئیں تو چنداں ہرج نہ ہوا، اس لئے کہ خود اپنے مرض کا شکار ہوئیں، لیکن جب سے اردو زبان و ادب کو یہ مرض لگا ہے، اس کی کچھ عجیب حالت ہو گئی ہے، نظم ہے کہ پے بہ پے تختہ مشقیتوں کا شکار ہو رہی ہے، نثر ہے، کہ ہمارے ایجادوں اور اجتہادوں کے اس کا ناک میں دم آگیا ہے، ناول نویسی کی طرف جھکے، تو سینکڑوں ناول لکھ ڈالے، ہزاروں افسانے لکھ کر ڈالدئے، بیسیوں ترجمے کر ڈلے، رسالہ بازی کی طرف توجہ کی تو رطب ویابس، الم غلم، موضوع مہمل، جو کچھ ملا بھر بھر کر شائع کرتے رہے، مشاعروں اور گلدستوں پر آئے، تو بقول ایک تازہ وارد ایرانی کے بجز "لیلۃ الواہ واہ" کے اور کوئی نتیجہ نہ پیدا کیا، اور جہاں سے چلے تھے، وہیں رہے، جس رسالے یا دیوان یا تصنیف کو دیکھئے "گلستان بےخزاں" اور "دریا بکنار" ہونے کا مدعی، اور ایک لحاظ سے یہ دعویٰ صحیح بھی ہے، یعنے اگر "مہر زمانہ" کا مثیل "مخزن" کو

اور "ہمایوں" کا "ہزار داستان" کو "ترقی" کا "معارف" اور "آئینہ" کا "نگار" کو دے دیں، تو پڑھنے والا کبھی اس دعوے کی تردید کا پہلو نہیں پا سکتا، اس لئے کہ ان ہر بیان اردو میں سے، ہر ایک علمی، ادبی، تاریخی، اقتصادی، معاشی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، روحانی، تعلیمی، ورزشی، قومی، اخباری، عیرہ وغیرہ خدا جھوٹ نہ بلائے، تو ایک درجن سے زائد ہی مقاصد کا حامل ہے، اور مساوات کا مدعی، پھر کیونکر ان میں فرق کیا جا سکتا ہے، اور طرفہ یہ کہ ہر نیا اردو کا خادم عبرت پذیری سے اس قدر بے نیاز ہے، کہ اپنے ماضی ابھرنے والے معاصرین، یا جا بجا جمشید کو آئے دن "فنا فی الادب" ہوتے دیکھتا ہے، مگر مصداق ع
"ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ایم"، خود بھی ان کا جنم لینے کے اندھا دھن شوق میں، شہید بے اصولی ہو جاتا ہے۔

شاید ہی کبھی ایسی کثیر اور شدید کوششیں محروم نتائج رہی ہوں، جیسی کہ اردو کی ترقی علم و ادب، اور علوم جدیدہ وغیرہ کی دیکھنے میں آئی ہیں، خدا اس بد مذاقی اور طوفان بے تمیزی سے بچائے کہ ہم تو یہ سمجھتے رہیں، کہ چلتے چلتے نہ معلوم کہاں نکل آئے ہوں گے، اور آنکھ کھول کر جو دیکھیں تو وہیں ہیں، جہاں سے چلے تھے، بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے ہیں، اس کی سب سے بڑی اور اصولی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں، جن کی طرف و غور و ضمن میں، حامیان اردو کا خیال نہیں جاتا، پہلا، سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے، کہ ہماری کوشش، جو اس سمت میں ہوتی ہے، کوئی غایت نہیں رکھتی، یا یوں کہئے کہ اس قدر غائتیں رکھتی ہے، کہ جن میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوتی۔ اور اس طرح پر "مجسمہ ادب" کا "خواب پریشاں" کے مانند خاتمہ ہو جاتا ہے، بجائے اس ابتری مطامع اگر کوئی مختصر اور مفید غایت مثلاً اصطلاحات علمیہ کی ترویج، یا فنون جدیدہ کی اشاعت، یا مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیاء، یا علم المادیات، یا اردو کے اصول قواعد وغیرہ مقرر کر کے پرچہ نکالا جائے، تو یقیناً وہ اپنی غایت اپنی مختصر زندگی میں پوری کرنے کے علاوہ اپنے "پیکر کاغذی" کو اردو کی خدمت کا اہل بنا سکتا ہے، دوسری وجہ اس کثرت تعبیر کی یہ ہے، کہ باوصف اس قدر غوغائے نظم و نثر کے، ہنوز اردو کے ادب کا کوئی معیار مقرر نہیں ہوا، یا یوں کہئے کہ اس قدر کثرت سے معیار مقرر کر لئے گئے ہیں، کہ ہر رسالہ، اور ہر تصنیف، بجائے خود ایک مخصوص معیار کا مدعی اور علم بردار ہے، اور جا بجا ٹکسالیں بنی ہوئی ہیں، جن سے الفاظ، محاورے،

اصطلاحات، تخیلات، طرز ہائے ادا وغیرہ ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں، اور کسی کی مجال نہیں، کہ ان ٹکسالوں کی نشان میں، ایک ذرا سی بھی گستاخی، تعریض، وایرا، کی صورت میں پیش کر سکے، اور تنقید تو وہ چیز ہے کہ اردو کے بہت سے لغات و محاورے کی طرح اس نے بھی، اپنے مفہوم کو اپنا ضد بنا کر بالکل معکوس و مسخ کر دیا ہے۔

خدا کی توفیق سے "ترقی" کا جدید سال، ربیع الاول شریف ۱۳۴۲ھ سے شروع ہونے والا ہے اور یہ بدیہی ہے کہ "ترقی" نے اپنے پہلے نمبر، اور بارھویں نمبر کے درمیان، اپنے حلقۂ ناظرین، اور اپنے دائرۂ عمل میں، اصول ارتقا کے بموجب، ایک مخصوص ماحول، اور خاموش فضا کو پیدا کر دیا ہے، پس سال جدید سے ہم اپنی مخصوص غایت کے متعلق، ایک خاص اور اہم تصفیہ بتلانے والے ہیں، جس سے قارئین کرام پر واضح ہو گا کہ "ترقی" کن ارادوں کو دل میں لے کر، عرصۂ ادب میں گامزن ہوا تھا، اور اس کی زندگی کی حقیقی غرض و غایت کیا ہے، قصد تھا کہ اسی سال ہم اپنے ارادوں کا اظہار کر دیں، مگر ڈر ہے کہ مجتہدین ادب ہماری صورت کو کچھ اور معنی نہ پہنا دیں، اور ہماری صدا غیر مانوس ہونے کی وجہ سے کوئی بے ڈھب فتویٰ حاصل نہ کر لے، بہر کیف اب قارئین "ترقی" اور "ترقی" میں کافی ظرف و استعداد خطابت، نیز سماعت کا پیدا ہو گیا ہے، اور اگر خدا نے چاہا تو اپنے مخلص احباب کی ہمت افزائی کے بل پر، انشاء اللہ تعالیٰ، ربیع الاول شریف میں، اپنے ان حقیقی اور بشری، مقاصد کا اعلان کریں گے، جن کا پورا کرنا نہ صرف "ترقی" کا، بلکہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصود ہے، و باللہ التوفیق والمستعان۔

اس نمبر کے ساتھ "ترقی" کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے، ہر چند کہ اس مولود نوزائیدہ کو دائیہ صحافت و طباعت کی بے پناہ شفقتوں کا سامنا کرنا پڑا، جو تا خیر اشاعت کی صورتوں میں عیاں ہوئیں، لیکن ناظرین کرام کی مسیحانہ چشم پوشیوں کی ہمیشہ رہین مدا رہیں، بہر کیف سال بھر میں "ترقی" نے جو کچھ کیا، وہ وہی تھا، جو "ترقی" کی طرح بکثرت معاصرین کرتے چلے آئے ہیں، یعنی علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی، اخلاقی خدمات ممکن ہے، کہ ہمارے احباب کو "ترقی" کی خدمتیں کارآمد نظر آئیں، مگر ہم تو یہ سمجھتے ہیں، کہ دیگر "ادبی" اور مجلسی شاعروں

کی طرح "ترقی" بھی ماہانہ مختلف مضامین کا مجموعہ شائع کرتا رہتا اور بس، حقیقت پوچھئے تو آج تقریباً (۲۰) برس سے مجلسی دنیا میں عملاً بجز اسی قسم کی ادبی خدمت کے اور رہا ہی کیا ہے۔ جس کے کارآمد ہونے پر نظر ڈالی جائے البتہ "ترقی" کی ایک خصوصیت کی طرف، اس طوفان رسالہ نویسی کے اعتبار سے، توجہ دلانا بہت ضروری ہے، یعنے یہ کہ اس کا مقصد ابتدا ہی سے کسی "مخصوص غایت" کا متعین کر لینا رہا ہے، کہ اسی فقدان غایت یا کثرت غایات نے "ترقی" کے متعدد معاصرین کو ناکارہ محض بنا رکھا ہے، اس دو رکیا لہ کو آپ اسی غایت کی تمہید سمجھیں کیونکہ روش عام سے ہٹنے کی جرأت کے لئے مخاطبین میں پہلے ہی سے استعداد سماعت پیدا کر دینا ناگزیر ہے چنانچہ جس غایت کو پیش نظر رکھ کر "ترقی" نے دنیائے مجلات میں قدم رکھنا چاہا تھا، اس کی مختصر تفصیل آپ اسی نمبر میں پائیں گے، اور سال دوم کے آغاز میں اِنشاءَ اللہُ تعالیٰ اس کی مزید تشریح اور منازل عمل پیش کئے جائیں گے،

ناچیز "ترقی" اپنے قدردانوں کی گرانباری احسان سے سر نہیں اٹھا سکتا، جنہوں نے محض اپنے خلوص محبت، اور لطف و کرم کی بارش سے اس کو سینچا، بڑھایا، اور سر سبز رکھا، جنہوں نے دامے، درمے، قلمے سخنے ہر طرح سے اس کی نشو و نمو میں حصہ لیا، جنھوں نے حوصلہ افزائی، اور جرأت آموزی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور جو، سب سے بڑھ کر اردو زبان کا درد اور ادب اردو کا ذوق اپنے قلوب میں رکھنے والے ثابت ہوئے، ان کے معزز و محبوب ناموں کا شمار "ترقی" کے حوصلوں اور امیدوں سے کہیں بڑھ کر ہے، ہاں ان میں سے چند مخصوصین کا اظہار نہ بطور تشکر و اعتراف، کیونکہ بمصداق "من بے زباں کلام یکے را بیاں کنم" یہ ہمارے امکان سے باہر ہے، بلکہ بحیثیت کسب ذوق کر کے "ترقی" کے صفحات کو زینت دیجاتی ہے:-

(۱) نواب سر امین جنگ بہادر صدر المہام بارگاہ خسروی (۲) مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی (۳) مولوی مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب (نواب مرزا یار جنگ) بی اے میر مجلس عدالت العالیہ (۴) مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی رکن دار الترجمہ (۵) ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب ایم اے، ایل ایل۔ ڈی، ناظم صوبہ میدک، (۶) مولوی محمد عظمت اللہ خان صاحب معتمد کمشنر امتحانات (۷) مولوی سید ہاشم علی صاحب ناظم ضلع گلبرگہ (۸) مولوی نصیر احمد صاحب ایم اے، بی۔ ایس۔ سی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ (۹) مولوی میر عباس حسین خاں صاحب ناظم ضلع محبوب نگر

(۱۰) آغا حیدر حسن صاحب ہوم (۱۱) مولوی غلام غوث خاں صاحب ناظم کورٹ (۱۲) مولوی عبدالحمید خاں صاحب ایچ سی ایس ناظم ضلع بیڑ (۱۳) مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مولوی فاضل (۱۴) مولوی سید علی شبیر صاحب (۱۵) مولوی محمد اسد اللہ صاحب صدیقی ناظم اول عدالت فوجداری بلدہ (۱۶) مولوی محمد سعد الدین خان صاحب بی اے بیرسٹر ناظم دوم عدالت فوجداری بلدہ (۱۷) مولانا عبداللہ العمادی صاحب (۱۸) نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز اول تعلقدار اطراف بلدہ (۱۹) مولوی عماد الدین صاحب صدیقی مددگار مال ضلع رائچور (۲۰) قاضی منیر الدین احمد صاحب منصف دیورگ (۲۱) مولوی محمد اسد اللہ صاحب منصف میڑم (۲۲) مولوی سید دباج الدین احمد صاحب بی اے بی ٹی وائس پرنسپل نارمل اسکول (۲۳) مولوی غلام محمد صاحب معتمد انجمن احترام اوراق متبرکہ (۲۴) جناب نیظر حسین صاحب افندی سلمہٗ (۲۵) مولوی محمد الیاس برنی صاحب ایم اے۔

برطانیہ کے نائب السلطنت ہند یعنی ویسرائے بہادر کی تشریف آوری کے ساتھ اہل ملک کے متعدد جذبات کا متعلق ہونا، کوئی تعجب کی بات نہیں، اس وقت سخت ضرورت تھی کہ ملک میں کسی ایسی وفادار وطنی جماعت کا وجود ہوتا، جو غیر سرکاری طور پر، اہم ملکی مسائل کے متعلق، آزادانہ طور پر اہل ملک کے عام احساسات حضور ویسرائے بہادر کے گوش گزار کر سکتی، علی الخصوص اپنے اس قطعۂ ملک، بلکہ جزو ریاست کی بابت، جس کو برار کہتے ہیں، عام اہل ملک کے خواہشات ظاہر کرنے اور حضور ویسرائے بہادر کے ذریعہ سے حضور ملک معظم تک پہنچانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا، مگر افسوس کہ ہمارے پاس کوئی ایسی جماعت نہیں، اور قباحت یہ ہے، کہ ایک خاص سیاسی مسئلہ یعنی ”استرداد برار“ گومگو میں رہ گیا ہے، ہم کہتے ہیں، کہ ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، اور ایک ایسی جماعت سینکڑوں مفید کام انجام دے سکتی ہے، کیا ہمارے ملک کی قابل اور مدبر ہستیاں اس وقت اس طرف توجہ فرمائیں گی؟

جامعۂ عثمانیہ اور بہی خواہان جامعہ کے لئے صد ہزار فخر و مباہات کا موقع ہے، کہ ہمارے آقائے علم پرور، (جس کی ذات ہمایوں کی وساطت گرامی سے ہندوستان کے صدہا تشنہ کامان علم و ہنر سیراب ہوتے، اور جس کے فیض سخا کا ترانہ مشرق سے مغرب تک گایا جا رہا ہے) کی بارگاہ میں، منجانب جامعۂ سلطان العلوم کا

خطاب پیش کئے جانے کی عزت حاصل کی جانے والی ہے، ہم جامعہ کو اس کے اس جدید عزو وقار پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اہل ملک کی خدمت میں عرض کرتے ہیں، کہ اب جبکہ جامعہ کی اس دانشمندانہ پیش کش سے جامعہ کی اہمیت و وقعت اور ذمہ داری بدرجہا بڑھ گئی ہے، ہم کو چاہئے کہ جامعہ کے معاملات داخلی اور انتظامات وغیرہ سے نہایت گہری دلچسپی لیں، اور خوب سمجھ لیں، کہ جامعہ کی ترقی پر، ایک پوری نسل کی بہبودی منحصر ہے، اور اس سے ایک مکمل انتظام کی عزت و آبرو وابستہ ہے، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا کہ ہم نے جامعہ کی یا بالفاظ دیگر اپنی کوتاہیوں سے غفلت کی، اور یکایک ہم کو ہماری اس غفلت کا علم ہوا، تو پھر کوئی بندوبست نہ ہو سکے گا!؟

انجمن ہائے اتحادی (کواپریٹیو سوسائیٹیز) سرکار عالی کی آٹھویں سالانہ رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ملک کے کل طبقات کے لئے، اس نے نہایت قابل تعریف سرگرمی اور مستعدی سے کام کیا ہے، جو بے انتہا فوائد ان انجمنوں کے ذریعے سے ملک وقوم کو پہنچنے والے ہیں، امید ہے کہ اس سے منتفع ہونے میں، اہل ملک قصور نہیں کریں گے، انجمنوں کے ناظم، مولوی عبدالباسط خاں صاحب اس قوت تنظیم و حسن عمل پر قابل مبارکباد ہیں، انھوں نے علاوہ ہر طرح سے ان بدظنیوں اور افواہوں کے دور، اور باطل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے جو اس طریقۂ کار کے متعلق پھیلے ہوئے ہیں، ایک بات، البتہ ایسی نظر آئی، جو قابل تعریض ہونے کے ساتھ ہی ناقابل علاج بھی ہے، یعنے ہمارے ملک کو باوجود دل و دماغ رکھنے کے، انجمن کا کام سیکھنے کے لئے، بیرون دکن جانا پڑا، اور نہ صرف اب جانا پڑا، بلکہ نہیں معلوم ابھی کب تک اس محتاجی اور "باہر سے کام سیکھ کر آنے"، کا مرض ہم میں باقی رہتا ہے، امید تو ہے کہ بہت جلد وہ وسائل اختیار کئے جائیں گے، جن سے ہر شعبۂ انتظام میں "باہر سے کام سیکھ کر آنے" کا انسداد ہو سکے۔

اردو کے بہی خواہ

(از مولوی سید بشارت احمد صاحب رضوی)

اللہ عمر بڑی کرے، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی سادہ اور پاکیزہ صحبتیں جن کو کبھی کبھی نصیب ہوئی ہے، جس ہستی پر ذوق کو ایک لمحہ کے لئے بھی میسر آگئی ہیں مشکل ہی سے اسے فراموش ہو سکتی ہیں، مولانائے موصوف کی بے غرضانہ اور قابلانہ کوششیں جو اردو زبان و ادب کی ترقی بلکہ احیا کے لئے ہوئیں کبھی اردو کی نمک حلال نسلوں کو اپنے بار سے سبکدوش نہیں کر سکتیں، اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی ذات ہمیشہ کے نوخیز ادبی ولولوں کے لئے ایک بیش قیمت مرکز اور یادگار رہنمہ ہوا کی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ کا تذکرہ ہے کہ مولانا کے درویشانہ دولتکدہ پر شاہ جہاں پور سے ایک پختہ مغز زبان اردو کے ادیب تشریف لائے ہوئے تھے، اور روزانہ بعد مغرب نہایت آزاد اور دلچسپ ادبی تذکرے رہا کرتے تھے۔

ایک دن، سادہ میزبانی کے بعد جب حسب معمول احباب جمع ہو چکے، اور محفل ادب گرم ہوئی، تو صاحب موصوف نے ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا، جس سے اردو کی دنیا اور مستور کشاکش ارتقاء پر نہایت دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔

فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے وطن شاہ جہاں پور میں ایک صاحب وارد ہوئے، جن کا وطن اور نام نامی بتانے کی ضرورت نہیں، ان کو اردو زبان و ادب کے ماہر اور شاعر غرا ہونے کا بڑا دعویٰ تھا اور اس دعوے کے ثبوت میں وہ حسب ضروریات موجودہ ہر طرح کے ہتیاروں سے مسلح تھے، یعنی اردو کے قدیم اور موجودہ ادیبوں اور فاضلوں پر طرح طرح کی تنقید و تعریض، اردو کی بے مائگی اور کس مپرسی پر ماتم، اردو کے ایک بہت بڑے مصلح ہونے کا ادعا، طرح طرح کے طلائی تجاویز اور اسی قسم کے شبدوں کی ان کے پاس کمی نہ تھی، میرے لئے تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی، مگر میرے تلامذہ سے ضبط نہ ہو سکا، انھوں نے پہلے تو ان شاعر صاحب کے پاس جا کر بعد منت کہا کہ جو کچھ کرنا ہے، وہ خاموشی سے کیجئے

اور اپنی قابلیت خداداد کو ایسے شعبدوں میں نہ صرف کیجئے، مگر ان حضرت کا زعم اصلاح اس کا کب متحمل تھا، فوراً ایک دنداں شکن جواب کے ذریعہ سے ان کو جھڑک دیا، پھر تو ان لوگوں نے بھی کمر ہمت باندھی اور باہم ایک مخصوص مشورہ کیا۔

ایک دن صبح کو لٹھ لئے گران کے پاس پہنچے اور گزارش کی کہ حضرت آپ اردو کے قدیم اور موجودہ فاضلوں کو تو جانے دیجئے، آئیے پہلے ہماری آپ کی قابلیت کا مقابلہ ہو جائے، فرمائیے آپ کی لیاقت علمی کہاں تک ہے، شعر و سخن کی مشق و معلومات کیا ہے اور علم اردو کے موجودہ مواد میں سے آپ کو کیا کیا مستحضر ہے، جب گفتگو یوں شروع ہوئی تو ان بزرگوار کو اپنے حربے اور تو تیں بیکار سی نظر آئیں، غرضکہ ایک مختصر سوال و جواب کے بعد معلوم ہوا کہ بیچارے نہایت ہی سطحی قابلیت کے آدمی ہیں، بلکہ خود انھوں ہی نے رنگ بے ڈھب اور چتونیں پھری ہوئی، دیکھ کر بصد حسرت تسلیم کر لیا کہ عربی و فارسی کی معمولی تعلیم پا کر میں نے مشق سخن شروع کر دی، مگر ان لوگوں کا شن یہیں پر ختم نہیں ہوتا تھا، ایک کاغذ پر اس غریب سے لکھوا لیا کہ:-

"میں اردو سے بالکل نابلد ہوں اور اردو شاعری اور اردو معلومات سے مجھے مطلق لگاؤ نہیں"

اس تمام کارروائی کے بعد یہ لوگ میرے پاس آئے اور کل واقعہ بیان کیا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ:-

"الحمد للہ ایک "مشین کے ادیب"، اور "متشاعر"، کا مغالطہ تو بوجہ اکمل رفع ہوا، اور اب وہ شاید اپنے کو کچھ کارآمد بنالیں"

حقیقت یہ ہے کہ شاہ جہاں پور کے ادیب صاحب نے اس قسم کے لوگوں کے لئے کیسا اچھا اور جامع و مانع لفظ وضع کیا ہے، بیشک ملک کا یہی جہل مرکب کا حامل طبقہ ہے، جو ایک ہی وقت میں بہت بڑا ادیب، نثار، شاعر، فلسفی، حکیم، نقاد، اڈیٹر، ناول نویس، ماہر سیاست وغیرہ وغیرہ بنا ہوا ہے، ذوق سلیم اور ترقی صحیح کی راہ میں اس **کشین** کے گروہ نے جیسے روڑے اٹکائے ہیں، اس کی نظیر مشکل سے کسی زبان اور ادب میں مل سکتی ہے، تھوڑی سی معمولی لیاقت حاصل کر کے یہ لوگ غریب اور بیکس اردو پر ایسی ایسی زور آزمائیاں کرنے لگتے ہیں، جس کی برداشت کوئی غیور زبان نہیں کر سکتی، اصل میں یہ ساری خرابی اس

معجون مرکب، چیز کی پیدا کی ہوئی ہے، جس کو ہم جدید تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔

اپنے قومی ادب اور قومی اخلاق کو کیا رد کیا جائے کہ اب ہم پر ایک نئی اصلاح کا نہایت ہی گراں بار پڑ گیا، یعنی جدید تعلیمی جرائم کا انسداد ہماری قدیم تہذیب و تعلیم اور اخلاق و معاشرت کیسے ہی فرسودہ اور بقول نسخے "مشرقی" ہوں، ایک مضبوط بنیاد پر قائم اور تفریح و ریاکاری سے پاک تھے اور موجودہ و آئندہ نسلوں کے واسطے ایک نہایت کارآمد نمونہ ہو سکتے تھے، مگر تعلیم نے اس امکان کو بالکل تلف کر دیا جس زمانہ میں عربی و فارسی ادب کی تعلیم و معلومات مایۂ ناز سمجھی جاتی تھی، اور کاملوں اور فاضلوں کا ایک بلند پایہ طبقہ موجود تھا، اس وقت اس قسم کے حضرات کو ابھرنے کی مطلق مجال نہ تھی، اور اس زمانہ کی ادبیت اپنی آبرو ان حضرات کی ہرزہ درائیوں کے مقابلہ میں اچھی طرح سنبھالے ہوئے تھی، کیا اچھا ہوتا اگر یہ افراد چن چن کر راہ راست پر لگائے جاتے، گو یہ ہوتا کہ ان حضرات کا تہیج بے معنی کچھ کشمکش فضول ضرور کرتا، مگر اردو کے مخلص اور سچے خدمت گزار، جن کی بے مثل قابلیتیں آج ایک دوسری ہی جانب متوجہ ہیں۔ اور جو اس وقت مجبور و بے بس ہیں، ان کو پوری طرح ہوش میں لے آتے۔

اس خصوص میں حیدرآباد کے بعض اہل دماغ نے باوجود حضرات مشین کے حملوں کے جس پامردی و استقلال سے اپنی شان اور اردو کی سچی خدمت کو قائم رکھا ہے، اس نے اردو کے حقیقی بہی خواہوں کے دل میں بھی بہت کچھ امیدیں پیدا کر دیں، اور رسالہ "ترقی" تو پہلا رسالہ ہے جس نے ایک اردو رسالے کے سچے مفہوم کو پیش کر دیا ہے، اور واقعی اب "اردو دانوں" کو محسوس ہونے لگا ہے، کہ اس طوفان جرائد و رسالجات میں، سوائے رطب و یابس کے ایک اردو میگزین کی تعریف و حقیقت بالکل مفقود تھی، اگرچہ اس کے صفحوں پر کبھی کبھی ایسے نام بھی نظر آجاتے ہیں، جن کی برجستہ و بے ساختہ تحریر اور اردو پر بے تحاشہ عنایت ذرا کان کھڑے کر دیتی ہے، مثلاً ایک مشہور قطع کا مطلع ہے، "نوائے اقبال، عندلیب گلشن اسلام ہے" اس میں "عندلیب" بلکہ حضرت اقبال کا سر تقطیع سے گرا جا رہا ہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ مشین طبقے کی طبع آزمائیوں سے اب تک اپنا دامن بچائے ہوئے ہے، جس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس طرف ان قابل و پرمغز حضرات کی توجہ بھی ہو چلی ہے، جو مشین کے پرچوں اور اسی قسم کے مضمون نگاروں سے بیزار و متنفر ہو کر خاموش بیٹھ رہے تھے۔

مدت سے تمنا تھی کہ کوئی ایسا وقیع رسالہ نکلتا، جس میں اردو کے فاضلوں کے قلم سے نکلے ہوئے، مضامین دیکھنے میں آتے، اور زبان اردو جو عرصہ دراز سے ایک صحیح راستہ تلاش کرنے میں ناکام رہی اور طرح طرح کے مزخرفات کا تختۂ مشق ہو رہی تھی، ایک حقیقی ترقی کی راہ پر پڑ جاتی، الحمد للہ کہ رسالہ "ترقی" نے بلدۂ حیدرآباد سے نکل کر اس آرزو کو پورا کر دیا۔

راقم الحروف کو ان سطور میں رسالہ "اردو" کی گذشتہ اکتوبر کی اشاعت کے چند معرکتہ الآرا مضامین پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرنا ہے، ان کے متعلق عرصہ سے کچھ لکھنے کا قصد تھا مگر فرصت نہ مل سکی اشاعت مذکورہ میں خاص طور پر شیخ معین الدین انصاری کیمرج کا بے نام مضمون (اردو کی اشاعت و ترقی کے چند تجاویز) اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کا تنقیدی محاکمہ (متعلق اردو رسم الخط) نہایت غیر معمولی طور پر قابلیت اور پختہ مغزی کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اور قطعاً ناظرین کے دماغوں کے ساتھ مقناطیسی سلوک کریں گے، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضامین اس قابل ہیں کہ ان سے نہایت بسیط اور فلسفیانہ طور پر استفادہ کیا جائے اور تعلیمی حیثیت سے اس کے جستہ جستہ مضامین پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔

جناب شیخ صاحب اور جناب خان صاحب کے مضامین کا ادنیٰ سا فیض یہ ہے کہ حسب ذیل مطرات کی طرف بے اختیار دل و دماغ متوجہ ہو جاتے ہیں:-

۱۔ آیا علم اردو پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے کسی خاص قابلیت و معلومات کی بھی ضرورت ہے یا ہر شخص اس دلچسپ و شاعری نما موضوع پر قلم اٹھا سکتا ہے؟

۲۔ اگر کسی مخصوص اہلیت کی ضرورت ہے تو وہ کس قسم کی ہونا چاہئے، معمولی اور سطحی یا غیر معمولی اور عمیق، مغربی یا مشرقی، یا دونوں؟

۳۔ آیا محض شعر گوئی، کسی مقام معروف کا یا کسی بڑی مغربی ڈگری کا انتساب، نیک نیتی، جذبۂ ناگہانی، یا مشق مضمون نگاری وغیرہ اردو کا فاضل بنا سکتی ہیں؟

۴۔ اگر اردو کے عالی قدر قدردان اردو سے بگڑ جائیں تو ان کے منانے کی کیا صورت ہوگی؟ اور بصورت ان کے نہ منتے کے غریب اردو کی زندگی کیونکر کٹے گی؟

راقم الحروف کے خیال میں اب اردو اس قدر درماندہ اور عاجز نہیں رہی ہے کہ اپنے خرق نفس اور خودداری کے لحاظ سے مذکورہ سوالات کو صاف کرڈالنے کی تحریک نہایت آزادی سے نہ چھیڑ سکتی ہو، خصوصاً جبکہ جناب شیخ صاحب موصوف جیسے مسلم الثبوت ادیب اور جناب خان صاحب جیسے مہیب مصلح اس کی سرپرستی پر کربستہ ہو گئے ہوں، جن کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہنوز اردو کی بنیاد ہی نہیں پڑی ہے، اور اس بیکس و منتشر مخلوق کو زبان کہنا ہی ذرا تامل طلب ہے یا کم از کم اس باب میں ماہرین فن کے فتوے کے بغیر آگے قدم بڑھانا مناسب نہیں ہے۔

بیشک اصلاح رسم الخط بہت ضروری چیز ہے مگر جناب مصلح کو پہلے اپنی حسن نیت و قابلیت کی طرف نظر کر لینا چاہئے، ہر آئینہ ساز سکندری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، مگر کیا کیا جائے، کائنات کی کوئی شے بے اصولی کی تابع نہیں ہوا کرتی، لیکن مصلحین اور ناقدین کا دامن اس کلیہ سے پاک ہے!!

کسی زبان کے مسائل اصلاح پر قلم اٹھانے سے پیشتر اگر حسب ذیل امور کم و بیش پیش نظر رہیں تو گمراہی کا بہت کم اندیشہ ہے۔

الف ۔ زبان کی قابلیت، حقیقت اور اس کی فطرت پر کامل غور ہونا چاہئے ۔

ب ۔ زبان کی آئندہ ترقی کا رجحان طبعی کیا کہتا ہے ۔

ج ۔ اس رجحان کی نوعیت کس قسم کی ہے ۔

د ۔ زبان کی عمر کتنی ہے ۔

اول تو اصلاح و تنقید کا خیال پکانے سے پیشتر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی قدرتی افتاد و استعداد کیا ہے، اردو قطعاً ایک بزمی زبان ہے، شعر و سخن اس کی طبیعت میں داخل ہے، جس بات، جس اصلاح، جس اصطلاح میں ادبیت کی ذرا سی بھی بو پائی جاتی ہے، وہ فوراً اردو کے دربار میں قبول کر لی جاتی ہے، اور اس کا جزو بن جاتی ہے، ظاہر ہے کہ اردو میں ان خصوصیات کے ذریعہ سے بجبر اصلاح کرنا جو مادی یا حربی زبانوں (مثلاً السنۂ مغربیہ) کی باعث امتیاز ہیں تقلید جامد کے لحاظ سے بیکار و مہمل ہونے کے علاوہ اپنی روح لسانیت سے بیگانگی نیز غفلت کی علامت ہے، لباس و وضع میں مغربی

فیشن کی تقلید کا ارباب ظرف کے نزدیک ہمیشہ نقالی اور لغویت سمجھی گئی مگر زبان اردو کے خیال اصلاح کی طرح اول اول تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے کامل اجتہاد کے ساتھ بہ ہزار فخر و ناز مغربی فیشن کی نقل اتاری اور اس کا پورا پورا اتباع کرکے ان سچے اہل ذوق کی کچھ پروا نہ کی جو اس عزت پر تقلید کو بچپن اور حماقت کہتے رہے، آج یہ حالت ہے کہ جن خیالات کو لے کر اہل تعلیم جدید نے فیشن کی تقلید کی تھی، ان کا دیوالہ بلکہ جنازہ نکل چکا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ اردو زبان کو بھی یہی منزل درپیش ہے اور گہوارۂ اصلاح کے نام سے بچے پہل پہل کر مغربی کھلونے اس کے منہ میں دے رہے ہیں خدا ان کو عقل دے اور ان کے بے پناہ اجتہاد سے جو ایک بندہ پرورانہ شان سے اپنا ناخواندہ ظل عطوفت اس غریب پر پھیلا دیا کرتا ہے، اس کو محفوظ رکھے، ان کے لئے بے حد ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنی فطرت لسانیہ پر غور کرلیں تاکہ پھر جو اصلاح ان کے دماغ و قلم سے نکلے، وہ اردو کی حقیقی لسانیت کے اندر غرق ہو اور ایسی نہ ہو کہ زبان بیچاری بار بار استفراغ کرکے اسے اگلے۔ اور وہ پھر اس کی خلق میں ٹھونسی جائے زبان کے سچے بہی خواہوں کے لئے ادنیٰ غور اور ذوق لسانی کا صحیح تصور اصلاح و تنقید کو بہت مفید بنا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ دیکھنا چاہئے کہ زبان کی ترقی کا طبعی رجحان کیا ہے، ان کن زبانوں کی طرف اس کا زیادہ میلان ہے، اس کی اصطلاحوں اور اس کی لسانیت کی ترکیب میں کن زبانوں کو زیادہ دخل ہے، اور اپنی ہئیت میں اس نے کہاں کہاں سے زیادہ مدد لی ہے، اردو کی رگ رگ میں السنۂ سامیہ کے خصائص جھلک رہے ہیں، نیز اس کی ہیئت و ترکیب میں فارسی و ہندی پوری طرح سرایت کئے ہوئے ہیں، یہی چیزیں اس کی روح اور اس کا جوہر ہیں، اس صورت میں بہت ضروری ہے کہ جو اصلاح کی جائے، وہ پہلے تعریب، تفریس، تہنید یا اس کے مشابہ صورتوں میں کی جائے اور یہ بھی مد نظر رہے کہ اصلاح، اصلاح زبان کے درجہ سے بڑھ کر تخلیق زبان کے درجہ تک نہ پہنچ جائے، چنانچہ اردو کا وہ دور جس میں اس کی لسانیت نے ایک حد تک اپنے کو متعین و مشخص کیا وہی ہے جب اس کو زیادہ تر عربی و فارسی فاضلوں کی سرپرستی نصیب ہوئی اور مغربیت کا رنگ اس پر نہیں چھایا، ظاہر ہے کہ جب سے نئی روشنی نے اس پر چھاپہ مارا ہے، کسی متین و ثقہ اصلاح کا اضافہ تو

الگ رہا طرح طرح کے فتنے، اور بدعتیں اس میں پیدا ہو گئی ہیں۔

تیسری چیز زبان کے رجحان کی نوعیت ہے، اردو میں یہ نوعیت صاف سامیّت کی طرف زیادہ مائل ہے، یعنی اول تو اس کا رسم خط تمام تر التصاقی ہے، بخلاف آریائی، اور مغربی زبانوں کے جو عموماً افتراقی رسم خط رکھتی ہیں، دوسرے اس کی قرأت کلیۃً سیاقی و سباقی اور موقوف بہ ماحول ہے، جو التصاقی تحریر کا لازمہ ہے، یہ رجحان اس کی فطرت میں داخل ہے، جو کسی طرح اگرچہ سینکڑوں علامتیں لگادی جائیں مٹ یا کم نہیں ہو سکتا۔

چوتھی بات زبان کی عمر ہے، اردو اپنی عمر کے لحاظ سے ہنوز بالکل ہی عالم طفولیت میں ہے اس میں قبل پختگی عمر کے کہ جب وہ اپنی فطرت کو خوب اچھی طرح نمایاں کر دے، مہمل جدتیں کرنا نہایت نادانی ہے، کیونکہ یہ جدتیں پائدار تو ہو نہیں سکتیں، البتہ اس زبردستی سے یہ اندیشہ ضرور پیدا ہو جائیگا کہ آگے چل کر کہیں کثرت اجتہاد سے یہ زبان ایک رجعت انفعالیہ (ری ایکشن) نہ کرے کہ سارا کھیل ہی بگڑ جائے۔

اردو کے مہربان مذکورہ حقایق سے غض بصر کر کے عجب عجب بدعتیں کر رہے ہیں مثال کے طور پر رسم خط ہی کو لے لیجئے، حروف علت نے چند حرکات کے ساتھ مل کر وہ ہنگامۂ عظیم پیدا کیا ہے کہ خود زبان کی کوئی تحقیر و تذلیل اٹھا نہیں رہی ہے، حالانکہ جو باتیں اس خصوص میں دیکھی گئیں ان میں بجز مولوی سید ہاشمی صاحب مدظلہ کی رائے کے کہ، وہ تو اردو کی طبیعت لسانیہ کے موافق ہونے کے لحاظ سے قابل عمل ہے، باقی سب یا تو مہمل ہیں یا طبیعت اردو سے تعارض رکھتی ہیں، اور اسی ضمن میں عبداللہ یوسف علی نامی کسی بزرگ کی نوزائیدہ رائے تو اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی، اور جناب خان صاحب موصوف نے تو اس بارے میں چار پانچ حضرات کی تجاویز کو تحریر کر کے تھوڑی سی رسمی تعریض و تنقید کے بعد ایک پنچایتی جج کی شان سے سب کو ہٹا کر اپنا قطعی و فیصلہ کن محاکمہ کر کے ستم ہی ڈھا دیا ہے، اور لطف یہ ہے، کہ جن لوگوں کی تغلیط یا تخطیہ آپ نے فرمایا ہے، تھوڑا چکر کھا کر بالارادہ آپ بھی ان ہی کے ہم نوا ہو گئے ہیں، کیا ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے، کہ آئندہ سے اردو کے لئے اس قسم کا تہیج مہمل

مشکل سے قابل برداشت ہوگا۔

ایک مسئلہ تو حروف علت کا ہے، جس میں واؤ کے متعلق تین حالتیں بیان کی گئی ہیں معروف مجہول، بفتحہ ماقبل، اور یا کے متعلق چار حالتیں ہیں، معروف، مجہول، بفتحہ ماقبل، مخلوط۔ دوسرا مسئلہ ہائے مخلوط اور نون غنہ کا ہے، یہ دونوں معمولی مسئلے ایسے ہیں، جنھوں نے خان صاحب کے بیش قیمت قوائے قابلیت کا مفت اسراف کرایا ہے، اور پھر بھی ان کے نقطۂ نظر سے اچھی طرح بال کی کھال نہیں نکلی اور عبداللہ یوسف علی صاحب کی تصویب یا سید ہاشمی صاحب مدظلہ کی تغلیط کا حق اچھی طرح ادا نہیں ہوسکا ہے، اس لئے کہ ہنوز واؤ ساکن بعد ساکن یا یائے ساکن بعد ساکن نیز ہائے ساکن بعد ساکن کا مسئلہ ان کی تیز نظروں سے رہ گیا (مثلاً گاؤں چھاؤں، داد، مرو، پیوسی، نیولا وغیرہ کی واو یا تنگنائے، ہائے وائے، سہاے وغیرہ کی یا، یا چھا چھہ کی ہا) اور اگر زیادہ کدو کاوش کی جائے تو اس سے بھی زیادہ لطیفہ خیز اور بےنتیجہ موشگافیاں ہوسکیں گی، جس سے ممکن ہے، کہ کچھ دیر کے لئے دلچسپی اور تفریح ہوجائے، مگر زبان کی حقیقی بہی خواہی کو اس سے کچھ علاقہ نہ ہوگا، ان فروعی امور میں ردوکد کرنے والوں کو یہ موٹی سی بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ رسم خط خصوصاً التصاقی طرز تحریر میں کوئی اضافی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ در اصل تلفظ ہی کی حفاظت و صحت کا دوسرا نام ہے، یعنی التصاقی زبان میں ہر لفظ کا تلفظ بہ اعتبار اپنے موقع و محل کے (نہ بہ لحاظ کثرت اعراب و طرفگی علامات کے) درست صحیح ادا ہونا چاہئے، اور خود تلفظ تو وہ شے ہے جو زبان کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، جیسے جیسے زبان وسیع ہوتی جاتی ہے تلفظات میں بھی تنوع پیدا ہوتا جاتا ہے، اردو میں ہزارہا عربی الفاظ اور فارسی ترکیبیں، ایسی ملیں گی، جن کا تلفظ بہت بعد کو زبان میں داخل ہوا، اور مغربی تلفظات تو ابھی حال ہی میں اردو کو ملے ہیں، جن کا چند برس ادھر تک کہیں پتہ نہ تھا، بعینہ جس طرح پھلوں کے مختلف ذائقے ہوتے ہیں، جن کا اختلاف طبعی کسی طرح مٹایا نہیں جاسکتا، یا جس طرح انسانی صورتیں، طبائع، اور رجحانات اپنی وضع میں متضاد واقع ہوئے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت اس اختلاف کو مٹا نہیں سکتی، اسی طرح زبانیں بھی اپنے مزاج اور اپنی طبیعتیں خواہ وہ کیسی ہی ہوں ناقابل تغیر رکھتی ہیں، اردو زبان نے

بھی ایک طبیعت السنہ سامیہ سے پائی ہے، اور اسی لحاظ سے اردو کے ملفوظات (یا رسم الخط) کو بھی جانچنا چاہیئے۔
زیادہ سے زیادہ جو اصلاح اس میں ہوسکتی ہے، وہ بطور علاج بالمثل یہ ہوسکتی ہے کہ اردو کے طریقۂ ملفوظات
کو وسیع پیمانہ پر رواج دیا جائے۔ السنہ سامیہ خصوصاً وہ زبانیں جن سے اردو کا وجود وابستہ ہے، اپنا
تلفظ زیادہ تر اپنے سیاق و سباق اور ماحول پر منحصر رکھتی ہیں، اردو بھی اسی رفتار پر چل رہی ہے، اور
درحقیقت زبان کی فطری حیثیت مقتضی بھی اسی کی ہے کہ وہ خود ہی اپنے دیکھنے والے کو زبان حال سے
بتلا دے کہ میں یہ کہہ رہی ہوں، چنانچہ السنہ سامیہ کی طرح جس قدر زیادہ کسی زبان میں عمق، وسعت اور
بلاغت ہوگی، اسی قدر وہ پر نفر اور با اصول ہوسکے گی، مغربی زبانوں کو ملاحظہ فرمائیے کہ مثلاً انگریزی
زبان کی آوارگی کا یہ عالم ہے کہ حرکات و نقط اور مخارج و اصوات کے نہ ہونے سے کہ یہی چیزیں زبان کے
حسن و وقار کی جان ہیں، کوئی کلیہ مستقل ہے ہی نہیں، ایک حرف کے لئے متعدد ملفوظات، اور ایک
لفظ کے لئے متعدد حروف، پھر کوئی تلفظ سوائے کثرت استعمال اور مشق و ممارست کے کسی کلیہ کا پابند نہیں
ایک طرف Cut (کٹ) ہے، اور وہی دوسری طرف Put (پٹ) ہے، یا بقول
جناب خان صاحب کے ایک طرف Blood (بلڈ) ہے دوسری طرف Foot (فٹ) ہے
اور تیسری طرف Tooth (ٹوتھ) ہے، اس کے علاوہ ایک اور ستم ہے، جو صاف صاف زبان کے
وحشی اور غیر متمدن ہونے کا ثبوت دے رہا ہے، یعنی چار چار، پانچ پانچ مختلف الصوت حروف
لے کر ایک نئی آواز پیدا کی ہے، اور وہ بھی کہیں کچھ اور کہیں کچھ مثلاً (cious شس) یا (tion
شن) یا (ough او وآف) وغیرہ، بعض الفاظ میں حروف تو موجود، مگر شین کے حضرات
کی طرح ان کی حقیقت ندارد، فرانسیسی زبان میں تو اس قسم کی خلاف وضع فطرت لسانی بدمذاقی بے حد
بڑھی ہوئی ہے، کہ پناہ بخدا، اس پر تعلیم یافتہ طبقہ ہے کہ اپنی اندھی تقلید میں ہر قدم پر اردو کی اصلاح،
مغرب کی مہمل تمثیلات کی بنا پر کرتا نظر آتا ہے، اور ہمارے مہربان خان صاحب تو کیمرج اور اکسفورڈ
کا نام لے کر ایسے شیر پا کام نظر آتے ہیں، کہ بس آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے،
کہ دیکھا اور پتھر کے ہوگئے، بظاہر جناب خان صاحب اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح

کوئی نہ کوئی "ایجاد بندہ" گر گزریں کہ ع

من نہ مانم ایں بماند یادگار

پھر جیسا ہوگا، دیکھا جائے گا، چنانچہ آپ نے اپنی تحریر میں دوسرے اہل الرائے کو گویا سمجھا بجھا کر اور خاموش کرکے، ایک منصف مطلق اور حاکم ناطق کی شان سے مذکورہ حروف علت میں طرح طرح کی علیتیں لگائی ہیں، اور بالواسطہ سید ہاشمی صاحب مدظلہ کے اصول حرکات کو بھی تسلیم فرمایا ہے، جس کی تغلیط پیشتر خود ہی فرما چکے ہیں، وہ علیتیں بس اسی قسم کی ہیں کہ مثلاً فلاں یاء کے نیچے ایک کہنی دیدی جائے یا فلاں واؤ کے اوپر ایک الٹا واو سوار کر دیا جائے، یا فلاں نون کے اوپر ایک چھوٹا سا گولا دھر دیا جائے، الٰہی تیری پناہ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

غضب ہے کہ جناب خان صاحب نے اپنے اصولوں میں اردو کی فطرت لسانی سے بالکل اعراض کرکے طرح طرح سے اس غریب کے گلے پر خنجر رکھ دیا ہے، اور اس کے حلق بلکہ معدہ میں وہ وہ ثقیل غذائیں ٹھونسی ہیں، جن کی خدانخواستہ اگر واقعی پابندی کی گئی تو ایک نہ ایک دن اس کو ضرور استفراغ ہو جائے گا، ہم معذور سمجھے جائیں گے، اگر باادب واجب یہ اندیشہ ظاہر کریں کہ مقلدین مغرب کے "ایجادات بندہ" غریب اردو کو "ویران جزیروں" میں مقید و محدود کرکے کبھی نہ کبھی ضرور اس کا گلا گھونٹ دیں گے، ان حضرات کا گمراہ کن اور اردو کو پوچ و پھر اور حقیر و ہیچ سمجھنے والا مذاق لسانی جہاں تک جلد اردو کی خدمت سے دست کش ہو جائے، وہیں تک اردو کے حق میں بہتر ہوگا، ہم ان کو دل سے دعائیں دیں گے، یہ پہلے انگریزی فرانسیسی اور جرمنی زبانوں کی بے اصولی کو اپنے علامات مہملہ سے مزین کرکے اور طرح طرح کے گولے اور کہنیاں لگا کر ٹھیک کریں، ورنہ یہ خوب سمجھ لیں کہ بس ع

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!!

بہت غنیمت ہوا کہ عربی یا فارسی زبان کی اصلاح پر توجہ نہ فرمائی گئی ورنہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان کا کیا حشر ہوتا، مثال کے طور پر ایک چھوٹا سا شعر لے لیجئے ؎

اشرق البدر علینا   واختفت منه البدور

(طلوع ہوا ہم پر چودھویں رات کا چاند جس کے سامنے تمام چاند ماند ہو گئے)

اس جملے میں لفظ اشرق کے معنی طلوع ہوا ہیں، بشرطیکہ اس کو اشرق بالاعراب پڑھا جائے ورنہ یہی لفظ اشرق (افعل التفضیل) اور اشرق (امر) بھی ہو سکتا ہے، اسی طرح اِختَفَتْ واحد مونث غائب کا صیغہ ہے، مگر ظاہر ہے کہ اور بھی کیا کیا نہیں ہو سکتا، پس جب ان پر اعراب نہ لگائے جائیں، ان کا پڑھنا خطرناک ہے، اور میں تو بحیثیت ایک مغربی مستشرق کے ضرور عرض کردوں گا، کہ اشرق کی پہچان کے لئے اس کے نیچے ایک چھوٹا سا نیم دائرہ (ں) بنا دیا جائے، جس کے پیٹ میں ایک لکیر ہو اور ہم بلا لحاظ احوال ہر ماضی کے صیغے کو اس علامت سے پہچان سکیں مثلاً اشرق یا اکرم وغیرہ، اب اختفت کو لیجئے، اس میں بھی طرح طرح کے بکھیڑے پیدا ہو سکتے ہیں پس میرے خیال ناقص میں تو اس کی تانیث کا اظہار کرنے کے لئے ایک زنانے بالوں والا چھوٹا سا سر اس کے اوپر بنا دینا چاہئے مثلاً (اجتنب) (اختفت) وغیرہ، ان علامتوں میں بڑی خوبی یہ ہے کہ آسان ہونے کے ساتھ مفید بھی ہیں اور پھر کوئی خاص جدت بھی نہیں ہے؟ طوالت مانع ہے، ورنہ میں عرض کرتا کہ عربی زبان اس طرح کے بے شمار نقائص سے بھری ہوئی ہے، بہرحال خوشی کی بات ہے، کہ میں نے ارباب نظر کی توجہ مبذول کرانے کے لئے مشتے نمونہ از خروارے اوپر کچھ اصلاحیں بیان کی ہیں!!

اب میں فارسی کی طرف مڑتا ہوں، ایک مصرعہ ہے ع

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

جس کے معنی صاف ظاہر ہیں، مگر اس کو یوں بھی پڑھ سکتے ہیں (مراد - ردیست - آں - در - دل - اگر - گویم - زبان - سوزد)
(مقصد ردی ہے وہ موتی دل اگر گیند میرا اس طرف سے مارا)
مگر ان معنوں کو کہ (مقصد ردی ہے، وہ موتی دل اگر گیند میرا اس طرف سے مارا) کوئی مفہوم پہنانا، السنہ مغربیہ کے حروف کو جامۂ تلفظ پہنانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، اور پھر اگر کاتب یا کمپوزیٹر صاحب نے بجائے "زبان"، "مزیان" کر دیا اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں تو

اور آفت ہے، اس وقت میرے خیال میں ایک اور تجویز آئی ہے، جس کے مفید ہونے میں کچھ کلام نہیں، یعنی کاتبوں اور کمپوزیٹروں کا بھی ایک باضابطہ اسکول یا کالج قایم کیا جائے، جس میں ماہرین فن ان کا امتحان لے کر سندیں عطا کریں اور ان کے تہجی کتابت سے اردو کو بچائیں، نیز ان کو علامات مختلفہ کے استعمال کی پوری تلقین کی جائے!

افسوس! اگر اردو کے مہربان ذرا تامل سے کام لے کر اردو کی سامیت پر ذرا غور فرما لیا کریں تو اس قسم کی بے نتیجہ زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

اس موقع پر میں 'بیر' کا لفظ بھی داخل بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ بغیر یائے معروف و مجہول یا فتحہ ماقبل کی صراحت کے نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہے، مثلاً ہم اگر کہیں کہ "زید کو عمر کے ساتھ خواہ مخواہ کا بیر ہے" تو نہیں معلوم اس جملہ میں لفظ 'بیر' سے کیا مراد ہے، ممکن ہے کہ یہ 'بیر' (پھل) ہو یا مہابیر والا 'بیر' ہو یا عربی کا بائر ہو یا 'بیر' (ہندی باری) ہو یا 'بیر' (انگریزی لفظ بمعنی، شراب، برہنہ، تحمل کرنا) ہو یا 'بُیر' بالضم لفظ بو بیر کا مخفف ہو، غرضکہ نہ معلوم کیا بھوگ ہے، یہ مشکل کیسے حل ہو، پھر مثال پڑھئے، ادھو یہ بیر بمعنی دشمنی ہے۔

اسی طرح مثلاً یہ جملہ "زید کا بایاں پیر زخمی ہو گیا" اس میں بھی ایک قیامت پنہاں ہے، یعنی لفظ 'پیر' کی چیستاں بوجھنا باقی ہے، خدا جانے یہ 'پیر' (مرشد) ہے، یا پیر (بڈھا) ہے، یا پیر (انگریزی لفظ بمعنی جوڑا یا نواب صاحب) ہے، یا 'پیر' (مصدر پیرنا سے مثلاً تیل پیرنے) ہے یا پیرا (مصدر پیرنا سے مثلاً ندی میں پیرا) ہے، غرض نہ معلوم کیا لفظ ہے، عجب ضیق میں جان ہے، اس پریشان خوابی کو کس کے آگے روئیں اور اس کثرت تعبیر کی کس سے فریاد کریں، اور پھر ابھی کاتب صاحب کا حق باقی ہے، ممکن ہے کہ انھوں نے 'بہیڑ' کا 'بیر' اور پھیر کا 'پیر' کر دیا ہو آیئے آخری کوشش اور کر لیں، آیا یہ 'پیر' بمعنی پاؤں ہے، استغفر اللہ، اگر کوئی علامت مقرر کر دی جاتی تو یہ زحمت نہ ہوتی، مگر کاتب کا کیا علاج؟

حقیقت میں اصلاح اسی کا نام ہے، اور ذوق سلیم ایسے ہی وحیدان عصر کا حصہ ہے،

جب عربی و فارسی ہی قابل اصلاح یا لائق تناسخ ٹھہریں، تو پھر ان کی کمسن اولاد کس شمار قطار میں ہے، دیکھئے ان غریب السنۂ شرقیہ کو وہ مغربی فضلا کب نصیب ہوتے ہیں، جو عربی، فارسی اور اردو کی اصلاح، بلکہ تخلیق کا عمل نیک انجام دے کر ان کو بام ترقی کے چوڑے چکلے زینے دکھلا دیں، ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے، کہ اردو اپنی فطرتی رفتار سے نہایت قابل اطمینان ترقی کر رہی ہے، اور اس چھوٹی سی عمر میں وہاں پہنچ چکی ہے، جہاں اور زبانیں صدیوں میں پہنچتی ہیں، جتنے اسقام و نقائص مغربی زبانوں میں ہیں، ان کا عشر عشیر بھی اردو کے نادان دوست اردو میں نہیں بتلا سکتے، بیشک اور یقیناً یہ زبانیں اگر حربی اور متمول نہ ہوتیں، تو جس طرح انھوں نے عربی سے بہت کچھ سیکھا، اسی طرح ان کو اردو سے بھی بہت کچھ سیکھنا پڑتا، مگر فی الحال تو اردو کے بھولے بھالے بہی خواہوں نے قضیہ برعکس کر رکھا ہے،

ذیل میں ہم ایک معمولی مثال 'اردو دانوں' کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتے ہیں، جو ہر قسم کے 'ایجاد بندہ' سے پاک ہونے کے ساتھ ہی غریب "اہل اردو" کے لئے لسان اردو کے درجہ سے نہیں گرنے پائی ہے اور ہر طرح کی علامت سے "محروم" ہے۔

"افسوس کہ ہماری قوم کا وہ گروہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتا ہے، اپنے قیمتی تہیج کو ہر طرح کی بلند نما پستیوں اور پستی خیز بلندیوں پر مفتون کئے ہوے ہے، اور اسی میں مگن ہے کیا حقیقی غایت زیست کو متعین کرنا بھی اسے نہیں آتا جس سے زیادہ سہل اور کوئی چیز نہیں!!"

اب مجھے اردو اور علوم جدیدہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، اس میں شک نہیں کہ عمل کا تو کیا تذکرہ ہے، ہنوز ترجمے ہی میں اردو بہت پیچھے ہے، مگر اس کی وجہ صاف ظاہر ہے یعنی اہل اردو کا افلاس علمی و مادی نیز السنۂ مغربیہ کی غلامی کا شوق، وضع اصطلاحات کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ مصر، بیروت، افغانستان، ایران اور جاپان وغیرہ میں بھی، کہ یہ ممالک تعلیمی حیثیت سے ایک حد تک خود مختار ہیں، نہایت اہم رہا ہے، اور اسی قدر دشوار بھی، مگر اس کو مشین کے علمائے لسانیات کے ہاتوں میں دے دینا، نہایت خطرناک ہے، اس بارے میں اب تک جو کوششیں کی

وہ قابل تعریف ہیں، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے، کہ یہ اردوئے جدیدہ کی بنیاد رکھی جارہی ہے، اور اردو کی خود داری کبھی اس کو جائز نہ رکھے گی، کہ بجز عربی، فارسی یا ہندی کے اغیار کا تتبع کرے، اور سامیت کی روح کو چھوڑ کر آریائی جسم میں داخل ہوجائے۔

جناب خان صاحب نے اس بحث کو بھی کورا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ ایک ہمہ گیر انداز سے علوم جدید کے وسیع موضوع کو چند جغرافی و لاطینی اسماء کے اندر محصور کرکے، جن کے آگے اصولوں کا گلزار کھلا ہوا ہے دریا بہ کوزہ کا منظر پیش کردیا ہے، اور اصولوں میں خوبی یہ ہے کہ ہر تجویز کے متعلق طرح طرح کی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً Land (لینڈ) کا ترجمہ لاحقہ 'ستان' سے کیا گیا ہے، مثلاً آئرلینڈ سے "آئرستان" اسکاٹ لینڈ سے اسکاٹستان' بچوانالینڈ سے بچوانستان' وغیرہ، مگر اس بارے میں یہ تجویز بھی ہوسکتی ہے، کہ لینڈ کا ترجمہ لاحقہ 'آباد' سے کیا جائے، تو کیا حرج ہے، مثلاً ایرآباد، اسکاٹ آباد وغیرہ یہ لاحقہ (اگر تعریب وغیرہ سے قطع نظر کرلیا جائے تو) زیادہ موزوں ومناسب اور مالوس ثابت ہوگا۔

بہرحال اس قسم کی دل لگی اور ہنسی مذاق کا جو دروازہ اس قسم کی طفلانہ ایجادات سے کھل گیا ہے، اسے بیکار ومہمل سمجھ کر اب میں اصل بحث پر چند امور پیش کرتا ہوں، جو جناب اڈیٹر صاحب کے حسب ارشاد رسم خط وغیرہ کے متعلق ہیں:۔

(۱) یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا بہ لحاظ (ا) اردو طرز تحریر (ب) املام جدیدہ (ج) اوقاف قرأت (د) ہم آواز حروف عربیہ مثلاً ز۔ ظ۔ ذ۔ ض وغیرہ کے اردو زبان میں سنئے نئے قواعد بنانا، مزید پیچیدگیاں تو نہ پیدا کردے گا، جن کی بھول بھلیوں میں زبان اردو اصول درا صول اور اصلاح در اصلاح ہوکر بالکل چوں چوں کا مربہ ہوجاوے۔

(۲) آیا اردو زبان جس رفتار سے اور جس سمت پر ترقی کررہی ہے، اس کے لحاظ سے نیز اردو کے فطری رجحانات لسانی کے اعتبار سے یہ ممکن نہیں ہے، کہ محض کثرت تالیفات علمیہ اور تراجم علوم جدیدہ پر اکتفا کیا جائے کہ صرف یہی چیز آئندہ چل کر خود بخود دریائے لسان کے بہاؤ کو ٹھیک راستے پر لگادے گی جیسا کہ دیگر زبانوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے

(۳) آیا واقعی اردو زبان کو بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے، یا محض اہل اردو کی بے مائگی اور متمول السنہ کا مقابلہ ہم کو خواہ مخواہ اپنی زبان میں وہ نقائص دکھارہا ہے، جن سے من حیث اللسان کوئی بھی موجودہ

زبان پری نہیں ہے، اور جو ترقی زبان میں کسی طرح حائل نہیں ہیں۔

(۴) کائنات لسانی بلحاظ تنازع و ارتقاء بہت کچھ دنیائے سیاست سے اشبہ ہے، اور سیاست کے مہول (اپنی) وسعت و تنوع کی وجہ سے کبھی بھی ایک عالمگیر اور متحدہ صورت میں مدون نہیں رہے ہیں، بلکہ اس باب میں ہمیشہ انفرادی کوششوں ہی نے اجتماعی رنگ اختیار کر لیا ہے، پس کیوں نہ زبان کو بھی اس انفراد و اجتماع کا مزید موقع دیا جائے، جیسا کہ عملاً آج کل ہو رہا ہے، یعنی اردو کے موقت الشیوع رسائل اور مختلف قابلیتوں کے مصنفین وغیرہ سب باوجود ہنگامۂ اصول طرازی مع قواعد نویسی کے منفرداً اپنے ہی مذاق پر کاربند ہو کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہی انفراد آگے چل کر انشاء اللہ اجتماع کی صورت اختیار کر لے گا، اور پھر اصول و ضوابط از خود صورت پذیر ہو جائیں گے۔

(۵) پس کیوں نہ یہ کیا جائے کہ اردو کے دانا یا نادان ہر قسم کے بہی خواہ بجائے باتیں بنانے کے اپنے کو فرداً فرداً خدمت اردو کے لئے وقف کر دیں، اور اردو کی کمسنی پر ترس کھا کر خواہ مخواہ اسے تختۂ مشق نہ بنائیں، کیونکہ بجز افلاس کے عیب کے اور کوئی بات ان میں ایسی نہیں ہے کہ باوجود کم عمری وہ دوسری اکھڑ اور اجڈ زبانوں کے روبرو سرنگوں ہو۔

(۶) میرے خیال میں بقول جناب خان صاحب جہاں دو مجلس مجوزہ میں دوسرے مقامات کے نمایندے (مثلاً تامل اکاڈمی پھلی بندر وغیرہ) بلوائیں گے، وہیں اس کا بھی انتظام ہونا چاہئے کہ مصر و بیروت، ایران و افغانستان اور جاپان کا بھی ایک ایک فاضل بلوایا جائے جن کے بغیر کوئی اصلاح مکمل نہ ہو سکے گی۔

آخر میں میں چند الفاظ عالیجناب شیخ معین الدین صاحب کے فاضلانہ مضمون کے متعلق کہ جن کے نام نامی کے آخر میں کیمرج کا رعب دار، وجیہہ، بلکہ ایک حد تک مہیب لفظ بے ضرورت لگا ہوا ہے عرض کرنا چاہتا ہوں، اصل یہ ہے کہ صاحب مضمون کا عالمانہ مضمون بہت مختصر ہے، اس نوعیت کا مضمون بہت طویل ہو سکتا تھا، علی ہذا تجاویز مختتمہ بھی شمار میں بہت کم ہیں کم از کم ایک درجن تو ہوتے، میں بصد ادب آں موصوف کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جراءت کروں گا، کہ آئندہ جب کبھی وہ اس شغل بیکاری پر قلم اٹھا دیں تو اتنا اختصار کر کے کیمرج کے مشہور عالم نام کو رسوا نہ کریں، میں بھی حضرت موصوف کی ہمنوائی کرتے ہوئے، اردو کے سچے بہی خواہوں کی شناخت کے لئے حسب ذیل حقائق پیش کرتا ہوں، جن کے بغیر اردو کے نمائشی بہی خواہ غالباً "مشین کے ادیب" کہلائے جانے سے شاید ہی بچ سکیں گے۔

(۱) اردو زبان میں تصنیف و تالیف۔ (۲) تراجم کتب علوم جدیدہ۔
(۳) اردو کے پیچھے صرف دماغ و دولت۔ (۴) ترقی اردو کی کوئی اور جاں کاہ اور زحمت طلب کوشش۔
(۵) اردو میں علمی اور سنجیدہ منشی نگاری کا کوئی جدید نمونہ۔

رُباعیاتِ امجد

از مولانا عبداللہ العمادی، رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن

ہم ذیل میں رباعیات جناب امجد صاحب پر مولانا عمادی صاحب کا پرمغز نوٹ درج کرتے ہیں، مولانا نے رباعی کی جو مختصر تاریخ بیان کرکے، اور دریا کو بہت ہی چھوٹے سے کوزہ میں بند کرکے، اس کوزہ کو رباعیات حضرت امجد تک لڑھکایا ہے، تو یہ انہیں کا اور خاص انہیں کا حصہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ امجد صاحب کے آیات کمال میں تصوف اور سیاست بھی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ گویا ساحت قدم سے مطلع حدوث پر طلوع ہوئے ہیں۔ جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ۔

مولانا کے اس مختصر نوٹ نے نہ جانے ہمیں کیا کیا یاد دلا دیا۔ (ترقی)

اسلام میں فارسی شاعری کا آغاز، عربی ادب کا سرانجام تھا، لیکن رباعیاں تو اس وقت کی یادگار ہیں، جب عجمیت کے غالب اثر سے عربوں کا اصلی رنگ بالکل ہی ماند پڑ چلا تھا، بے شبہ رباعی کی ابتدا عربوں ہی سے ہوئی، جسے اس زمانہ میں "دوبیت" کہتے تھے، مگر واقعہ یہ ہے، کہ عربی رباعیوں میں نہ عرب کی حمایت ہے، نہ عجم کی موشگافی، عصر تنزل کی پیداوار ایسی ہی ہوا کرتی ہے، افسردہ ٹہنیوں کے برگ و بار میں نشو و نما کا استمرار آ سکے؟

رباعی کی ترقی عجمی تصوف کی رہین منت ہے، ایران میں حضرت ابو سعید ابو الخیر، شیخ اوحد الدین مراغی، حکیم عمر خیام، سحابی نجفی نے، اور ہندوستان میں "ابھی چند" کے اثر سے سرمد نے سرزمین رباعی کو فلاک الافلاک کا ہمسر بنا دیا، اور جب فارسی کی جگہ اردو نے لی تو میر، انیس و مرزا دبیر کی معجز نمائیوں نے رباعی کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

لیکن اس معراج سخن میں اگر شاہد معنی کو ہر ہفت دیکھنا ہو تو رباعیات امجد کو دیکھئے جن کے جلووں میں

خدا کی شان نظر آتی ہے، اور جس کی حکیمانہ ابداع اس مبدع اعظم کی قدرت کاملہ کا نشان بتاتی ہے۔

وفی کل شیء له آیة تدل علی انه واحد

یہ واحد وحید، فرد فرید، ابوالاعظم مولوی سید احمد حسین صاحب امجد کی آیت کمال ہے، جن کے تلاوت کلام عجب نہیں، اہل حال سجدہ جائز سمجھیں، اور جبیں سجود جناب الٰہی میں عرض خضوع کرے کہ:۔

قائم بعبارت تو کہسار بدشت معروف رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا زحباب سجہ بر کف دارد انگشت شہادت بت ہر خار بدشت

ان رباعیوں میں قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت یا حدیث شریف کے کسی نہ کسی مفہوم کی جانب یک خاص دلاویز و دلنشیں انداز میں ایما ہے، جس میں عجمی تصوف نے اور ہی ذوق پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً آیۂ عرض امانت کا نکتہ ملاحظہ ہو کہ صوفیانہ سخن طرازی نے کیا بات پیدا کر دی ہے:۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

ادعونی استجب لکم کو دیکھئے:۔

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ یہ دست دعا، خدا کا دروازہ ہے

قوم پر آج کل جو حالت قنوط طاری ہے، اس کی ذیل میں کیسی شاعرانہ حکمت نوازی کی ہے:۔

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زباں سے یہ کہتے ہیں وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

تعالیٰ شانہٗ وعز برہانہٗ

تحفۃ العراقین خاقانی کی قیامت خیز تمہید میں ہے:۔

وقت است کہ مرکبان انجم ہم نعل بیفگنند و ہم سم
وقت است کہ ایں چہار حمال بنہند محفۂ مہ و سال

وقت ست کہ وقت بر سر آید سیلاب عدم ز در در آید

اس قیامت کی انتہا رباعیات امجد میں یوں ہوتی ہے :-

وہ تشنہ ہوں کاشہ عز و جل آئے گا اب وقت نہیں ہے، بر محل آئے گا

ضائع ہوگی، نہ پرستی میری اس سنگ سے، لعل بھی نکل آئے گا

سبحان اللہ بحمدہٖ، سبحان اللہ واللہ اکبر

یہ لسان الغیب کی اس شکایت حقیقی کا جواب ہے کہ :-

لعلے از کان مروت بر نیامد سالہاست

تابش خورشید و فیض ابر باراں را چہ شد

آج چھ صدیوں کے بعد شیراز کے اس شکوے کا دکن نے جواب دیا ہے کہ :-

اس سنگ سے لعل بھی نکل آئے گا

ملت کو ایسی ہی رواں بخش تعلیم کی ضرورت ہے کہ علم کے دماغ میں توانائی آئے، اور راہ طلب میں پائے عمل سست نہ ہو جائے۔

لَا تَيْأَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ط

(ترجمہ) خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے وہی لوگ نا امید ہوا کرتے ہیں جو کافر ہیں ۱۲

خواجوے کرمانی

کمال الدین ابوالعطا محمود ابن علی ابن محمود

(پروفیسر براؤن کی کتاب "اے ہسٹری آف پرشین لٹریچر انڈر ٹارٹار ڈومی نین" کے ایک باب کا ترجمہ)

(از مولوی سید خورشید علی صاحب)

تقریباً تمام مشہور و معروف تذکروں مثلاً دولت شاہ، ہفت اقلیم، آتشکدہ، مجمع الفصحا وغیرہ میں خواجوے کرمانی کے حالات درج ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود تفصیلی واقعات زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، جستہ جستہ جو کچھ واقعات ملتے ہیں، وہ بھی اکثر و بیشتر نمایاں طور پر غیر صحیح اور غلط ہیں، ان کتابوں کی تالیف اور ترتیب میں، جو بے احتیاطی برتی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ قابل افسوس ہے، اس بیان کی تائید و ثبوت کے لئے صرف یہ ایک واقعہ کافی ہے، رضا قلی خاں کی شاعرانہ قابلیت و کمالات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان کی حیثیت ایک فرہنگ نویس، اور ایک مورخ کی بھی ہے، باوجود ان صفات کے انھوں نے "مجمع الفصحا" میں بیان کیا ہے، کہ خواجو سلطان ابوسعید خان کے دربار کے، جن کا عہد حکومت سنہ ۷۱۶ھ تا سنہ ۷۳۶ھ مطابق سنہ ۱۳۱۶ء تا سنہ ۱۳۳۵ء ہے، قصیدہ گو شاعر تھے، اس کے ساتھ ہی خواجو کا سال وفات سنہ ۵۰۳ھ مطابق سنہ ۱۱۰۹-۱۰ء تبلایا ہے، ظاہر ہے کہ سنہ ۷۵۳ھ کے عوض یہ ایک صریح غلطی ہے، دولت شاہ نے خواجو کا سال وفات سنہ ۷۴۲ھ مطابق سنہ ۱۳۴۱-۴۲ء تبلایا ہے، اور بیان کیا ہے، کہ وہ کرمان کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور انھوں نے کرمان میں اپنی زندگی کا بہت تھوڑا حصہ بسر کیا، حالانکہ کتاب مذکور کے اسی صفحے میں بعض اشعار نقل کئے گئے ہیں، جو بغداد میں کہے گئے، ان اشعار میں خواجو نے کمال اشتیاق و محبت کے ساتھ اپنے وطن کو اس طرح یاد کیا ہے:-

خوشا باد عنبر نسیم سحر کہ بر خاک کرمانش باشد گزر

خوشا وقت آں مرغ دستاں سرائے کہ دارد دراں بوم ماوا و جائے

زمین تا چہ آمد کہ چرخ بلند | از آں خاکِ پاکم بغربت فگند
به بغداد بهر چه سازم وطن | که نایدبجز دجله در چشم من

ہفت اقلیم کے بیان کے بموجب خواجو نے اپنے سفروں میں اکثر اپنے ہمعصر شعرا، اور علماء سے ملاقات کی، اور تعلقات قائم کئے، نیز وہ مشہور مقدس بزرگ شیخ رکن الدین علاء الدولہ کے مرید ہوئے، دولت شاہ نے اس مقدس بزرگ کے حالات بیان کرکے، اصل ممدوح، یعنی خواجوئے کرمانی کے واقعات زندگی کی قلت کی تلافی کرنی چاہی ہے، ریؤ نے خواجو کے ایک غیر معروف ہمعصر شاعر حید رشیرازی کے چند شعر نقل کئے ہیں، جن میں خواجو کی سخت ہجو کی گئی ہے، اور انہیں "شہر کرمان کے ایک کابلی چوز" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

فصیحی کی "مجمل" میں مجھے خواجو کا کوئی ذکر نہ مل سکا۔ حمد اللہ مستوفی قزوینی نے تاریخ گزیدہ میں جو ۷۳۰ھ مطابق ۱۳۳۰ء میں مرتب ہوی ہے، خواجو کے مختصر حالات درج کئے ہیں، ایک نظم بھی ان حالات کے ساتھ شامل کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود ان کی زندگی میں خواجو کی بہار ایران میں کافی شہرت تھی، مجالس المومنین میں بھی خواجو کا ذکر ہے، اسلام کے فرقہ شیعی کے باکمال نامور لوں کی تفصیلی سوانح عمریوں پر یہ کتاب مشتمل ہے، لیکن ان خاص حالات کے بارے میں صرف دولت شاہ کی نقل کردینے سے زیادہ کچھ نہیں کیا گیا ہے۔

ایرانی شعراء کے حالات زندگی قلمبند کرنے کا قابل اطمینان طریقہ یہی ہو سکتا ہے، کہ خود ان کی تصانیف سے جو کچھ واقعات فراہم ہو سکیں، ان کو جمع کرلیا جائے، قدیم قلمی نسخوں سے کام لیا جانا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ جدید مطبوعہ نسخے بمشکل قابل اعتماد ہیں، یہی ایک عام اصول قرار دیا جا سکتا ہے، فردوسی، نظامی، انوری اور خاقانی وغیرہ اکثر قدیم شعراء کے متعلق اسی طریقے پر عمل کیا گیا ہے، اس بارے میں خواجو اپنے اکثر ہمعصروں سے زیادہ خوش نصیب ہیں، چنانچہ اب سے بہت پہلے ۱۸۴۵ عیسوی میں ڈاکٹر فریزوان ہارڈمن نے خواجو کی ایک مختصر سوانح عمری شائع کی، اس کتاب میں دولت شاہ کے مضمون کو نقل یا ترجمہ کردینے کے بعد ڈاکٹر فریزر نے خواجو کے خمسہ یا پانچ بڑی مثنویوں کے ایک قلمی نسخہ کے متعلق مختصر

حالات لکھے ہیں، اور ان چند کار آمد واقعات کا اندراج کیا ہے، جو خواجو کے اس کلام سے نیز دیوان سے اخذ ہو سکے ہیں، ان حالات کا نیز ان مزید واقعات کا خلاصہ جو ریؤ نے قلمبند کئے ہیں ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ خواجو نے خود اپنی نظم "نوروز و گل" میں بیان کیا ہے، ان کی تاریخ ولادت ۱۵ شوال ۶۷۹ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۲۸۱ء ہے، خواجو نے اپنی شاعری کی ابتدا یزد میں مظفری شاہزادگان میں سے ایک کے دربار سے وابستہ ہو کر کی، غالباً یہ شہزادہ مبارز الدین محمد ہے، جو بانی خاندان ہے، بعد ازاں خواجو کا شیراز میں شیخ ابو اسحٰق کے دربار سے بھی تعلق رہا، بعض قصائد سے جو وان ارڈمن نے نقل کئے ہیں، خواجو کا شروان شاہ، اور قزل ارسلان کے دربار سے بھی تعلق رکھنا ظاہر ہوتا ہے، ان قصائد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے، کہ خواجو نے کچھ ایام بغداد میں بھی بسر کئے ہیں، غرض یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ خواجو نے ایران کے بہت بڑے حصہ میں گشت لگائی ہے، اور اس شاعر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے اکثر و بیشتر معاصر شعرا کی طرح یہ کسی خاص دربار یا خاندان کا شاعر تھا۔

خواجو کی تصانیف میں پانچ مثنویاں جن پر خمسہ مشتمل ہے، اور ایک دیوان ہے، خمسہ کی کوئی جلد کیمبرج میں موجود نہیں ہے لیکن برٹش میوزیم میں ایک نہایت عمدہ نسخہ ہے، جو ۷۹۸ھ مطابق ۱۳۹۶ء میں لکھا گیا تھا، دیوان میں بعض مذہبی اور زیادہ تر مدحیہ قصائد، غزلیات، مقطعات، رباعیات وغیرہ ہیں، میرے پاس دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں، ایک تو بالکل جدید ہے، اور دوسرا تقریباً بیس سال قبل "فیاض بخش لائبریری" کے نیلام میں خرید اگیا تھا، یہ نسخہ شیراز کے "درویش حافظ" کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور سنہ کتابت ۷۹۹ھ مطابق ۹۴-۱۳۹۳ء ہے، یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حافظ وہ مشہور شاعر اعظم نہیں ہیں جو اس سے ایک صدی پیشتر وفات پا چکے تھے، آخر الذکر نسخے کے ایک سابق مالک نے ان اشعار کو جو اس میں درج ہیں چار ہزار شمار کیا ہے، وہ پانچ مثنویاں جن پر خمسہ مشتمل ہے، حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نوروز و گل۔ وان ارڈمن نے اس کا ایک مختصر خلاصہ کیا ہے، اور اس مثنوی کے اشعار کا شمارہ ۲۶۱۵ بیان کیا ہے۔

(۲) ہمائے ہمایوں۔ یہ مثنوی بظاہر سلطان ابو سعید (مدت حکومت ۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۵ء) یا ان کے وزیر غیاث الدین محمد کے نام پر لکھی گئی ہے، اس کے ۴۴۰۳ شعر ہیں یا ہونگے

بیان کے بموجب یہ مثنوی ۷۳۲ھ مطابق ۳۲-۱۳۳۱ء میں بہ مقام بغداد لکھی گئی ہے۔

(۳) کمال نامہ۔ یہ مثنوی ۷۴۲ھ مطابق ۱۳۴۲ء کی تصنیف ہے، اور شاہ فارس شیخ ابو اسحٰق کے نام پر لکھی گئی ہے، اس کے دو ہی سال قبل یہ سلطان سریرآرائے سلطنت ہوا تھا۔

(۴) روضۃ الانوار۔ یہ عارفانہ مثنوی متذکرۂ صدر مثنوی کے ایک سال بعد فارس کے مشہور بزرگ شیخ ابو اسحٰق ابراہیم کے مزار پر تصنیف ہوئی ہے۔

(۵) ایک اور مثنوی ہے، جو تصوف میں ہے، اس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا ہے۔

بظاہر یہ پورا خمسہ تقلید ہے، مولانا نظامی گنجوی کے مشہور و معروف خمسہ کی، بہرحال خواجو کا خمسہ ۷۴۴ھ مطابق ۴۴-۱۳۴۳ء میں اختتام کو پہنچا۔

اگرچہ خواجو کو بہت شہرت حاصل ہوئی، لیکن ان کی غزلیات میں مجھے کوئی نمایاں خوبی یا کمال نظر نہیں آیا، تقریباً ۵، غزلیں میری نظر سے گزر چکی ہیں، بہرحال ذیل میں ایک اچھا نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

گذر زما کہ خاطر ما در وفائے تست　　دل برامید وعدہ و جاں در وفائے تست

سہل ست اگر رضائے تو ترک رضائے ماست　　مقصود ما ز دنیا و عقبیٰ رضائے تست

زیں پس چو سر فدائے قضائے تو کردہ ایم　　مارا مراں ز پیش کہ دل در قضائے تست

گردن بہ بندمی نہم و سر بہ بندگی　　خواہی بہ بخش و خواہ بکش رائے رائے تست

آزاد گشت از ہمہ آں کو غلام تست　　بیگانہ شد ز خویش کسے کآشنائے تست

اے در دلم عزیز تر از جان کہ در تن ست　　جانے کہ در تن ست مرا از برائے تست

ایں خستہ دل کہ دعوئے عشق تو می کند　　سوگند راستش بقدِ دلربائے تست

خواجو کہ رفت در سر جور و جفائے تو　　جانش ہنوز بر سر مہر و وفائے تست

غزلیات اور متذکرۂ بالا مثنویوں کے علاوہ خواجو کے کئی ترکیب بند، ایک یا دو قطعات اور چند رباعیات ہیں، ان ہی رباعیات میں وہ رباعی بھی شامل ہے، جس میں فاختہ کی کوکو کا مضمون باندھا گیا ہے، عام طور پر یہ رباعی عمر خیام کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

ذیل کا مستزاد نزاکت سے خالی نہیں ہے :-

کس نیست کہ گوید زمن آں ترک خطا را گر رفت خطائی
باز آے کہ داریم توقع بتو ما را با وعدہ وفائی
منداز بنام من دل سوختہ فلفل برآتش رخسار
کافتادم از آں دانۂ مشکین تو یارا در دام بلائی
امروز منم چوں خم ابروئے تو در شہر مانند ہلالی
تا دیدہ ام آں صورت انگشت نما را انگشت نمائی
باز آے کہ سر در قدمت بازم و جاں را در پائے سمندت
چوں من نہ دہد دست من بے سروپا را جز نعل بہائی
در شہر شما قاعدہ باشد کہ نہ پرسند احوال غریباں
آخر چہ زیاں مملکت حسن شما را از بے سروپائی
تا چند مخالف زنی اے مطرب خوشگوئے از پردۂ عشاق
بنواز زمانی من بے برگ و نوا را از بانگ نوائی
زیں بیش نہاں چند تواں داشتن آخر در دل غم ہجراں
دانم کہ سرایت کند ایں درد نگارا یک روز بجائی
در ظلمت اسکندرم از حسرت لعلت مانندۂ خواجو
لیکن چہ کنم چوں نہ بود مملکت دارا درخورد گدائی

یہ چند نمونے غالباً اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ، خواجو کا کلام اگرچہ نزاکت اور خوشس آیندگی سے خالی نہیں ہے، لیکن اس میں کسی نمایاں خصوصیت یا کمال کی ضرور کمی ہے۔

فلسفۂ حرکت

(از نظیر حسین صاحب افندی)

ہم نہایت مسرت و تہنیت کے ساتھ نظیر حسین صاحب افندی سلمہ اللہ کا یہ پہلا مضمون شائع کرتے ہیں، سلمہ موصوف ڈاکٹر محمد حسین صاحب افندی مرحوم کے ہونہار فرزند ہیں بمصداق الولد سر لابیہ اپنے والد مرحوم کے ملکوتی اور غیر فانی صفات سے اس کم سنی ہی میں متصف ہیں، امید ہے کہ صاحب موصوف آئندہ بھی "ترقی" کو اپنے مضامین سے مشرف فرماتے رہیں گے۔ (ترقی)

حرکت کا جو مشہور و متعارف مفہوم ہے، وہ کچھ محتاج بیان نہیں، یعنی خاموش نہ بیٹھنا، بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا، مگر جس طرح ہر موضوع و مبحث کے لئے، اس کی تنگی و وسعت کے لحاظ سے عموماً تین منزلیں ہوا کرتی ہیں، ابتدائی، وسطی، انتہائی، یا علمی اصطلاح میں وجیز، وسیط، بسیط، اسی طرح موجودہ زمانہ کے تنازع للبقاء و کشمکش ارتقا کی کوششوں اور منافست و مسابقت کے ہیجان نے، ہر اصطلاح کے لئے بھی مختلف اور وسیع مفہوم پیدا کر دیئے ہیں، جو اس تنازع کے علمی اور تعرفی پہلو کو پوری قوت کے ساتھ نمایاں کر کے عملی رخ کو پیش کر دیتے ہیں، اور علمی و عملی امکانات کے واضح ہو جانے کے بعد اس کو مادیات کے قالب میں ڈھال کر اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے حرکت کی عام تعریف جسے اس کی منزل وجیزہ کے تحت میں رکھا جا سکتا ہے، وہی ہے جو بیان ہوئی، اور اس کے معنوں کے لحاظ سے گو اس کو بہت کچھ وسعت دی جا سکتی ہے مگر یہ تمام وسعت محض اس کے علمی و تعارفی حیثیتوں تک محدود رہے گی، خواہ ہم یہ کہیں کہ حرکت جوش و ہیجان کو کہتے ہیں، ہلچل کا دوسرا نام ہے، عدم سکوت کی تعریف ہے، شورش کی مترادف ہے، خاموشی کی متضاد ہے یا وہ

شئے ہے، جو شدت کی صورت میں تحیل بہ آتش ہو جاتی ہے، یا اس کو کچھ اور پہلوؤں سے بھی وسعت دیں، مگر وہ اپنی قومی منزل سے اس وقت ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی، جب تک وہ اپنے عملی حدود میں نہ در آئے۔

اس وقت "حرکت" کے معروف معنوں سے ہٹ کر ہمیں یہ بتانا پڑے گا، کہ "حرکت" کہتے ہیں، ہنگامہ خیزیٔ و عدم جمود کو، حقوق شناسی و حقوق طلبی کے جذبہ کو، قومی وطنی وقار کے کامل احساس کو، خودداری و خود شناسی کے حصول کو، وطنی و نسلی مدافعت کو، اور سب سے بڑھ کر مذہبی و اجتماعی بیداری کو اور اپنے قوا کی حفاظت کے ذرائع کو، یہ اس کی منزل وسیطہ ہے، جو اس کے عملی فوائد و امکانات کو واضح کرتی ہے، اور ساتھ ہی اس کے علمی حدود و تعریفات سے بالکل مستغنی ہے، اگرچہ قدیم علمی وضعداروں کے لئے یہ علمی و عملی تفریق محض ایک ظرافت یا مہملیت ثابت ہوگی، مگر مغرب کی مادہ پرستی نے جہاں مشرق کو فاعلی و انفعالی حیثیت سے بہت کچھ سبق دیا ہے، وہاں بکثرت ایسی باتیں بھی بتادی ہیں، جو قومی حیات کے لئے ناگزیر ہیں، ہم نے شخصی و انفرادی ترقی کے لئے مغربی ذرائع سے بہت کام لیا، اور بہت کچھ باقی بھی ہے، مگر یہ بھی مسلّمہ ہے، کہ شخصی و انفرادی ترقی کے لئے مشرق، مغرب کا اتنا زیادہ محتاج بھی نہ تھا، کہ بغیر اس کی مدد یا نظیر کے آگے بڑھ ہی نہ سکتا۔ جیسا کہ اہل بصیرت پر رفتہ رفتہ روشن ہوتا جاتا ہے، لیکن شخصی منفعتوں سے قطع نظر کرکے اجتماعی و قومی لحاظ سے جو امور ترقی و تنازع للبقا کی بنا پر مغرب سے حاصل کئے گئے، وہ بالکل ایک نئی چیز ہیں، اور بیشک وہی ایک ایسا تجربہ ہے، جس کو مغربی تعلیمات کا نقد و صریح نتیجہ کہا جا سکتا ہے، اور جس سے مشرق اب تک کلیتاً محروم تھا۔

اسی لحاظ سے ہمیں "حرکت" کے عملی فوائد کو اس کے علمی اعتبارات سے بالکل جدا کرنا ضروری ہو گیا ہے، اس لئے کہ یہی وہ خط ہے، جہاں مشرق کی کمزوری اور مغرب کی قوت ان دونوں کی سرحدیں ملتی ہیں، اور جس "نقد و صریح" سبق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اس کی بنیاد بھی اسی نکتہ سے پڑتی ہے، یعنی مغرب نے ہر شئے کی عملی اور مادی قوت کو دریافت کرنا چاہا، اور محض علمی صورت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم صرف ان علوم و اصطلاحات کو جو اپنی ہیئات قدیمہ کے اعتبار سے نہایت محدود و فرسودہ اور بیکار پڑے ہوئے تھے، ایک مستقل اور عملی فن کی صورتوں میں پاتے ہیں، اور ان سے طرح طرح کے فوائد اٹھاتے ہیں، جس کا سبب صرف یہی ہے، کہ سینکڑوں علوم و اصطلاحات جو ہنوز اپنی منزل وجیزہ سے آگے نہیں بڑھے تھے، مغرب کی عنایت سے انہوں نے

اپنی منزل وسیط میں قدم رکھا، اور مختلف ذرائع سے اپنے میں وہ قوت پیدا کرلی، جو ہم بالتفصیل "حرکت" کی منزل بسیط کی ضمن میں بیان کرتے ہیں۔

عموماً یورپ نے جن علوم وفنون کو مادیت کے قالب میں لیا اُن کی منزل بسیط کا نقطۂ آغاز مختلف ایجادات، اختراعات، کارخانوں، مجلسوں، کلبوں وغیرہ کی شکلوں میں نمودار ہوتا ہے، اور مشرق کے پاس جو کچھ پہنچا ہے، وہ زیادہ تر اسی ترتیب کے ساتھ، یعنی "حرکت" نے اپنی علمی منزل سے گزر کر عملی حدود میں قدم رکھا اس کے بعد جب تمام عملی امکانات واضح ہوگئے، تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور عملیت کے میدان میں اگر وہ کرشمے دکھائے جنہوں نے خشکی، تری اور ہوا کو ہمارے قبضہ میں کردیا، یہ حرکت کی منزل بسیط ہی کا تو نتیجہ ہے، کہ آج ہم مختلف اقوام میں سبقت و ترقی کی باہمی کشمکش کو انتہائی حد پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں، اور مختلف علوم وفنون اور ایجادات، واختراعات کی وہ کثرت ہوگئی ہے، اور ہوتی جاتی ہے، کہ اب اندیشہ ہو چلا ہے، کہ حرکت کی منزل بسیط کی بھی ایک خاص حد قائم کرنا پڑے گی، جس کے آگے کے اعمال وحرکات دنیائے مابعد الحرکت کے تابع ہوگئے۔

بہرکیف لفظ حرکت سے جو مفہوم اور تخیلہ متعین ومتصور ہو جایا کرتا تھا، آج وہ بالکل متغائر ہوگیا ہے، اور زمانۂ جدید کے علم المادیات کی رو سے یہ لازمی ہوگیا ہے، کہ جس طرح مختلف عام اور معمولی الفاظ کو علوم وفنون کے دائرے میں لاکر بالکل مخصوص وممتاز تعریف سے معروف کرنا پڑتا ہے، اسی طرح اس اصطلاح کو بھی ایک خاص تعریف کے ساتھ مصطلح کیا جائے "نقطہ اور خط" معمولی اور متعارف الفاظ ہیں مگر فنی حیثیت سے ان لفظوں نے اقلیدس میں اپنے کو بہت کچھ ایک مخصوص تعریف کا پابند کرلیا ہے، اسی طرح ہر فن کے متعلق ہم کو بکثرت ایسی اصطلاحات ملیں گے، جو روزمرہ کے الفاظ تو ضرور ہیں، مگر ایک خاص دائرے میں آکر ایک خاص معنی پیدا کر چکے ہیں، یہ صورت ہمیشہ سے قائم ہے، اور ہمیشہ پیدا ہوتی ہے، بلکہ مغرب کی حرکت نے اپنے شدید تنازع سے بکثرت جدید علوم بھی پیدا کردئے، جن کا اب تک پتہ بھی نہ تھا، اور جو حال ہی میں مع اپنے تمام مدارج علمیہ کے عالم وجود میں آکر مدون ہوئے ہیں، مدارج سے ہماری مراد وہی اصطلاحات اور منتشر نظریات وکلیات ہیں، جن پر علوم کی بنیاد وتمدین قائم کی جاتی ہے، آئندہ کسی مضمون میں ہم ناظرین کرام کو بتلائیں گے، کہ بہت سے جدید علوم یورپ کی حرکت نے ایسے پیدا کردئے ہیں، جو اپنی حیثیت میں مستقل ہیں اور جنہوں نے بکثرت معمولی الفاظ رائجہ کو مخصوص

اصطلاحات کے ساتھ محدود کر دیا ہے، فی الحال ہم مثلاً علم الطیران ("ایرانا ٹمکس") یا علم القعر (سب میرین) کو لے سکتے ہیں جنھوں نے سینکڑوں لفظوں کے بالکل جدید تصورات قائم کر دئے، اسی طرح موجودہ نسل ہندوستان کو چاہئے، کہ وہ حرکت کی ماہیت جدیدہ سے بھی اچھی طرح واقف ہو کر، اس کے مالہ و ماعلیہ پر خوب حاوی ہو جائے اس لئے کہ یہی علم المادیات کی بسم اللہ ہے، اور اگر اس کی طرف سے غفلت کی گئی، تو پھر ہم کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے یا یوں کہئے کہ اپنی کسی ترقی کو لے کر اقوام موجودہ کو صدائے مقابلہ نہیں دے سکتے۔

حرکت کی اس مختصر سی تفصیل کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے دیگر اغراض و نتائج اور علامات و وجوہ کیا ہیں، جن کے ذریعہ سے ہم اپنے میں "حرکت" کے مفید وجود کو شناخت کر سکیں، یا اگر اسی سے محروم ہیں، اور نقلی حرکت کو اصلی حرکت سمجھے ہوئے ہیں، تو اس غلطی یا نقصان کا تدارک کر سکیں۔

اس موقع پر اس مغالطہ کا ازالہ بھی ہو جانا چاہئے، کہ حرکت کسی خاص قطعۂ ارض، یا کسی خاص فرقہ و مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر ذی حس اس سے منتفع ہو سکتا ہے، گو یہ ضرور ہے، کہ اس کا موجد یورپ ہے، اور اس لحاظ سے یہ ایک خاص مادی اصطلاح ہو کر رہ گئی ہے، اور ایک حد تک یورپ ہی کے نسل و رنگ کے ساتھ مخصوص کی جا سکتی ہے، مگر یورپ نے "حرکت" کو نہایت غیر معتدل آزادی دے رکھی ہے، جس کی وجہ سے وہاں کا اخلاق، معاشرت اور تمدن سب مصنوعی تہذیب کے طرف مائل ہیں، اور یورپ کو انحطاط کی طرف لا رہے ہیں، برخلاف اس کے ایشیا میں جہاں کہیں "حرکت" نے خفیف سا بھی جلوہ دکھلایا ہے، وہاں روحانیت نے فوراً اسے معتدل بنا دیا ہے، خصوصاً مسلم اقوام کے لئے جن کا مذہبی نظام ایسا زبردست اور آہنین ہے، کہ کسی خارجی اثر سے متاثر نہیں ہو سکتا، یہ حرکت ایک برکت ثابت ہوئی ہے، اور مذہب نے اس کی اصلاح و تعدیل کر کے نہایت قوی تعمیری پہلو کو اس میں مضمر کر دیا ہے، چنانچہ اس وقت ایشیا میں جتنے مسلم اقوام ہیں، علی قدر مراتب سب ہی اس حرکت سے متاثر ہو چکے اور یورپ بالکل متحیر ہو رہا ہے، کہ ہمارے ہی علم المادیات سے "حرکت" کو مسلمانوں نے اخذ کیا ہے، مگر جہاں یورپ میں تخریب کا باعث ہو رہی ہے، اور ہونے والی ہے، وہاں وہی چیز مسلمانوں کے لئے تعمیر و ترقی کا موجب ہے، بلکہ حال کے واقعات نے تو یہاں تک ثابت کر دینا چاہا ہے، کہ اگر "حرکت یورپ" اور "حرکت اسلام" کا مقابلہ ہو تو اول الذکر کو نہایت شدید شکست اٹھانا پڑے گی، بہر حال یہ ایک دوسرا موضوع ہے، ہم کو کہنا یہ تھا، کہ حرکت کسی سے مخصوص نہیں ہے، اور عہد موجودہ میں اس سے فائدہ اٹھانا ناگزیر ہے، اب ہم اصلی بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

حجاز کے فرنگی سیاح

از مولوی سید علی شبیر صاحب شبیر مسٹریسم حیدرآباد ہائی کورٹ

گذشتہ سے پیوستہ

جدے کے قہوہ خانوں کے ذکر میں برکہارٹ لکھتا ہے۔

"ایک دکان پر یہاں حشیش پینے والوں کا جمگھٹ رہتا ہے، یہ گانجے کے پھول کو تمباکو میں ملاکر بناتے ہیں، اس میں کچھ نشہ ہوجاتا ہے، غریب آدمی چلم میں بھر کر دم لگاتے ہیں، اور امیر معجون میں اسے استعمال کرتے ہیں، حشیش کی معجون کا مہذب نام بسط[1] ہے، اور اس کے بیچنے والے کو بسطی کہتے ہیں"۔

افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے سیاحوں نے بھی جدے کے متعلق بعض کروہات کا ذکر کیا ہے، مگر جو مقام کہ چھاؤنی ہوتا ہے، اور جہاں مختلف سلطنتوں کے سفیر رہتے ہیں اور انواع و اقسام کے لوگ جہاں آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں اگر اس سے بھی بڑھ کر عیب پائے جائیں، تو حیرت کی بات نہیں ہے، مگر حجاز کا شہر اور باب المکہ ہونے کی حیثیت سے جدے میں اس قسم کے منظر بہت ہی مکروہ معلوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اہل حجاز کو توفیق خیر عطا کرے۔

احرام[2] کی نسبت برکہارٹ لکھتا ہے:۔

"جاڑے ہوں یا گرمی احرام دونوں موسموں میں تکلیف دہ اور مضر صحت ہے خصوصاً شامی حاجی جو اونی کے موٹے کپڑے پہننے کے عادی ہیں، اس وقت وہ بھی اپنے اونی کپڑے کئی دن کے لئے اتار دیتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کا جوش مذہبی اس قدر بڑھا ہوا ہے، کہ وہ خواہ کتنی ہی"

---

[1] بسط سے مراد انبساط و خوشی پیدا کرنے والی شئے ۱۲ [2] احرام کے لغوی معنی حرم میں داخل ہونے کے ہیں، شرعی اصطلاح میں ان دو چادروں کو کہتے ہیں، جو حاجی حدود حرم میں داخل ہونے سے قبل ایک بطور تہہ بند باندھ لیتے ہیں، اور ایک اوڑھ لیتے ہیں، اور بعض حلال چیزیں مثلاً سیئے ہوئے کپڑے پہننا، ٹوپی اوڑھنا، عمامہ باندھنا، عطر لگانا، حجامت بنوانا وغیرہ اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں، حج ختم ہونے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے، اور معمولی لباس پہن لیا جاتا ہے، غرض اس سے یہ ہے کہ امیر و غریب سب ایک ہی لباس میں ننگے سر خدا کے دربار میں قیدیوں اور گنہگاروں کی طرح حاضر ہو کر گناہوں سے معافی مانگیں، اور فقر و دولت کی کوئی تمیز اس وقت باقی نہ رہے۔

مہینے قبل کے میں آئیں، وہ عہد کر لیتے ہیں، کہ جب تک حج ختم نہ ہو جائے، ہمیشہ احرام ہی باندھے رہیں گے، اور اس طرح مہینوں تک وہ اسی باریک لباس میں رہتے ہیں۔"

احرام کے مضر صحت ہونے کے متعلق کسی مسلمان حاجی نے ذکر نہیں کیا، بات یہ ہے کہ جوش عقیدت میں کوئی تکلیف، تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔

آنحضرت صلعم کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد جناب ابی طالب کی نسبت مکے والوں کو جو عقیدت ہے، اس کے متعلق برکہارٹ لکھتا ہے:۔

"مکے والے ابی طالب کو اپنے شہر کا سرپرست سمجھتے ہیں، اور بہت آدمی وہاں ایسے ہیں، کہ خدا کی قسم توڑ ڈالنا، ایک بات سمجھتے ہیں، مگر حضرت ابوطالب کی جھوٹی قسم کھانے سے ڈرتے ہیں یہ لوگ پردیسیوں کو دھوکا دینے کے لئے، بیت اللہ اور کعبے کی قسم کھا لیتے ہیں، لیکن ابوطالب کی قسم سے یہ سمجھتے ہیں، کہ ان پر پھٹکار ہو جائے گی۔"

بیت اللہ کی معجز نما وسعت کی نسبت برکہارٹ نے حسب ذیل ریمارک کیا ہے:۔

"مکے میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے، اور یہ ایک حدیث پر مبنی ہے، کہ بیت اللہ میں خواہ کتنے ہی مسلمان آ جائیں سب سما سکتے ہیں، حتیٰ کہ ایک ہی وقت میں تمام دنیا کے مسلمان اس میں داخل ہو جائیں، تو ان سب کو نماز کے لئے یہاں جگہ مل سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد میں پینتیس ۳۵ ہزار سے زائد آدمی نہیں سما سکتے؛ اور مجھے یقین ہے کہ بڑے سے بڑے حج میں بھی مسجد کبھی آدھی بھی نہیں بھرتی، جمعہ کے دن بہت سے مکے والے خلاف شرع اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لیتے ہیں، اور بہت سے حاجی بھی اس کی تقلید کرتے ہیں، میں نے بیت اللہ میں دس ہزار سے زیادہ آدمی کبھی ایک مرتبہ میں شمار نہیں کئے۔"

بیت اللہ کی وسعت کا ذکر قریب قریب ہر مسلمان سیاح نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے، لیکن حاجی عبدالرحیم صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنگلور نے جس وضاحت سے اس معجزے کا ذکر اپنے سفرنامہ "سفر حرمین الشریفین" میں کیا ہے، ایسا کسی اور کتاب میں دیکھنے میں نہیں آیا، اس جگہ اس کی نقل درج کرنا بے محل نہ ہوگا، اور چونکہ حاجی صاحب ممکنہ بندوبست

پیمائش کے ایک اعلیٰ عہدہ دار ہیں، اس لئے ان کی رائے بحیثیت ماہر فن ایک خاص وقعت رکھتی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"از روئے پیمائش حرم شریف میں تیس ہزار آدمیوں کی جائے ہے، اس سے زیادہ ہرگز نہیں یہ بھی میرے جانب سے کچھ زائد ہی ہے، اس میں لاکھوں آدمیوں کا سما جانا، اور جائے کی تنگی کا شکوہ نہ ہونا، زندہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے، اس سال بروایت مختلفہ چھ اور دس لاکھ کے درمیان حاجیوں کی تعداد رہی، اگر اس کا نصف کر لیا جائے تو آٹھ لاکھ نفوس ہونے، اگر اس کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں تو اور کچھ کم کر دیجئے، آخر نوبت پانچ لاکھ سے تو ہرگز کم پر نہ آئے گی ان پانچ لاکھ حاجیوں میں سے ذوالحجہ کے پہلے جمعہ کو تقریباً تین لاکھ حاجی مکہ معظمہ میں داخل ہو چکے تھے، اب ذرا جائے غور ہے، کہ کون ایسا شخص ہوگا کہ اس قدر دور و دراز سفر کے بعد کعبۃ اللہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا نہ چاہے گا، فیصلہ یہی ہوگا، کہ سب لوگ ضرور جمعہ کی نماز حرم میں پڑھیں گے، معزز حاضرین آپ خود ہی خیال کریں، کہ وہاں تو جگہ صرف تیس ہزار کی ہے، یہ تین لاکھ کا مجمع کیسے سما سکے گا، اللہ اکبر کیسا زندہ معجزہ ہے، کیا کوئی فرد یہ کہہ سکتا ہے، کہ میں نے نماز جمعہ کے لئے حرم میں جانا چاہا مگر جگہ نہ ملی واپس ہو گیا"۔

بیت اللہ میں ناشائستہ حرکات کے متعلق برکہارٹ نے جو ریمارک کیا ہے، اگرچہ اس کی تصدیق تو کسی مسلمان کے سفرنامے سے نہیں ہوتی، تاہم سخت عبرت ناک ہے:-

"حرم میں لڑکے کھیلتے ہیں، اور مزدور سامان کے گٹھے اسی میں ہو کر لیجاتے ہیں، تاکہ ایک محلے سے دوسرے محلہ کو پاس کے راستے سے نکل جائیں، ان باتوں میں مکے کی مسجد دوسرے اسلامی ملکوں کی مسجدوں سے مشابہ ہے، لیکن بہ نسبت دوسری مسجدوں کے بیت اللہ میں ناشائستہ اور مخرب حرکات زیادہ خصوصیت کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں، اور لطف یہ ہے، کہ ایسی حرکتیں چھپا چوری بھی نہیں کی جاتیں، بلکہ کھلے خزانے، اکثر ایسا ہوا ہے، کہ جو مکروہ باتیں دیکھ کر مجھے طیش آگیا، دوسرے لوگ ان پر صرف ہنس دئے، یا خفیف سی سرزنش کر دی"۔

خوجے جو بیت اللہ کی خدمت کے لئے مامور ہیں، ان کے ذکر میں برکہارٹ لکھتا ہے کہ:-

"اگرچہ یہ بات تعجب خیز ہے، مگر سب جوان خوجوں کی حبشی لونڈیوں کے ساتھ شادیاں بھی کر دی جاتی ہیں"
مطوفوں کی شکایت سے اگرچہ تمام مسلمان حاجیوں کے سفرنامے بھرے پڑے ہیں، مگر ان کے متعلق ایک فرنگی کی رائے بھی ملاحظہ ہو:۔

"مکے کے سب سے زیادہ بے غیرت اور کمینے باشندے مطوفی کا پیشہ کرتے ہیں، حج کے دنوں میں مطوفوں کی بڑی مانگ ہوتی ہے، یہ لوگ حاجیوں کو طواف کراتے ہیں، دعائیں پڑھاتے ہیں، مقدس مقامات کی زیارت کراتے ہیں، اور شہر میں ہر قسم کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، لیکن ان کی بدمعاشیوں کے باعث جس قدر ان سے ایذا پہنچتی ہے، اس کا پاسنگ بھی فائدہ نہیں پہنچتا، یہ لوگ صبح سے شام تک حاجیوں کے کمرے کا محاصرہ کئے رہتے ہیں، جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اس سے روپیہ اٹھواتے ہیں، جس میں ان کا بھی حصہ لگتا ہے، حاجیوں سے روپیہ اٹھوانے کا یہ کوئی موقع نہیں چھوڑتے، افسوس ان غریب جاہل ترکوں پر ہے، جو کسی تجارتی معاملہ میں ان کو اپنا مترجم مقرر کر لیتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا پیشہ زائرین سے روپیہ وصول کرنا ہوتا ہے، ان کے اخلاق عموماً ایسے ہی بگڑ جاتے ہیں، خواہ وہ بیت المقدس کے عیسائی پادری ہوں، یا بنارس و الٰہ آباد کے ہندو پانڈے، یا اجمیر شریف کے مجاور۔

اہل مکہ کی شراب نوشی کے متعلق برکہارٹ نے یہ زہر اگلا ہے:۔

"اس متبرک شہر کا تقدس اور قرآن شریف کے سنجیدہ احکام مکے والوں کو شراب پینے سے، اور ان تمام بیہودگیوں سے، جو شراب نوشی کا لازمی نتیجہ ہیں، روک نہیں سکتے، ہندوستانی بیڑا عرق کے پیپے کے پیپے بھر کر لاتا ہے، اور یہ شراب شکر، اور دارچینی کا ست ملا کر دارچینی کے عرق کے نام سے بیچی جاتی ہے، مکے اور جدے کے شریف بڑے بڑے سوداگر، علما اور تمام معززین، اسی عرق کے پینے کے عادی ہیں، اس کی نسبت وہ اپنا دل سمجھانے کے لئے یہ کہتے ہیں، کہ نہ یہ برانڈی ہے، اور نہ شراب انگوری، اس وجہ سے مذہباً حرام نہیں ہے، جو لوگ غریب ہیں، اور ایسی مہنگی چیز نہیں خرید سکتے، وہ بھی ایک قسم کا نشہ اور عرق پیتے ہیں، جو کشمش کو"

"ابال کر بنایا جاتا ہے، اور طائف سے آتا ہے، ادنیٰ قسم کے لوگ بوزہ[1] پیتے ہیں۔"

جس زمانہ میں برکہارٹ نے سفر حجاز کیا ہے، اس وقت خدیو محمد علی پاشا وہابیوں کی شورش فرو کرنے کے لئے، وہاں گئے ہوئے تھے، اور مصری فوجیں مکۂ معظمہ اور دوسرے مقامات پر پڑی ہوئی تھیں اس لئے کیا عجب ہے کہ مصری سپاہی جو اہل یورپ کی طرح مہذب ہو چلے ہیں، شراب خواری بھی، اپنے ساتھ وہاں لے گئے ہوں۔

مکے والوں کی عادات ناشائستہ کے متعلق برکہارٹ نے مندرجہ ذیل تمسخر ناک ریمارک کیا ہے مسلمان سیاحوں کے سفرنامے، اس کی صراحت سے بالکل ساکت ہیں، لیکن اگر یہ سچ ہے تو اہل مکہ ڈوب مریں، اور اس بات کی سخت ضرورت ہے، کہ غازیان اسلام کی شمشیر آبدار ایسے نجس وجودوں سے اس ارض مقدس کو پاک کرے ہمارے ہندوستانی حاجی، جو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں حج کے لئے جاتے ہیں، ان کا فرض صرف اسی قدر نہیں ہے، کہ حج کیا، اور چلے آئے، بلکہ ان کا فرض اولین یہ ہے، کہ خلاف شرع امور کا قلع و قمع کرنے کے لئے ہر قسم کی کوشش عمل میں لائیں، اور حجاز مقدس میں ایک زبردست محکمۂ احتساب قائم کرانے کے لئے سعی بلیغ کریں، ہم کو یقین ہے کہ برکہارٹ کا بیان اہل مکہ پر ایک سخت حملہ ہے، جس کا ثبوت کسی مسلمان کی تحریر سے نہیں ملتا، مگر کیا اچھا ہو کہ ہمارے مقدس مقامات خفیف ترین برائیوں سے بھی پاک ہو جائیں، اور وہاں کے باشندوں کے اخلاق، اسلامی احکام کا نمونہ ہوں، برکہارٹ لکھتا ہے:۔

"اور خرچوں کے ساتھ حبشی لونڈیوں کے خریدنے کا بھی خرچ ہے، جن کو یہاں کے مرد رکھتے ہیں، اور پھر بازاری عورتوں کے پیچھے بھی روپیہ اڑایا جاتا ہے، جن کے ہاں اکثر آدمی آیا جایا کرتے ہیں، بڑی بڑی رقمیں ان خواہشات نفسانی میں اور بھی خرچ کی جاتی ہیں، جو اس سے بھی زیادہ بری اور گھٹی ہوئی ہیں، لیکن بدقسمتی سے وہ حجاز کے شہروں میں بھی ویسی ہی رائج ہیں، جیسی کہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں دیکھی جاتی ہیں، یہ پیشتر دکھایا جا چکا ہے، کہ خود مکے کی مسجد جو مذہب اسلام کا مقدس مرکز ہے، تقریباً عام طور پر روزانہ فحش ترین حرکتوں سے ناپاک ہوتی رہتی ہے، جس کو یہاں کوئی بے حرمتی نہیں خیال کیا جاتا، مختلف قسم کے لڑکوں کو یہاں کے لوگ ترغیب دلاتے ہیں، اور ان کے

---

[1] بوزہ ایک ادنیٰ درجے کی شراب ہے، جو چانول یا جو سے تیار کی جاتی ہے ۱۲

والدین بھی ایسے کمینے ہیں، کہ روپے کی خاطر ان کی جانب سے چشم پوشی کرتے ہیں"۔

اہل مکہ کی مذہبی پابندی کے متعلق برکہارٹ لکھتا ہے:۔

"بہت سے مکے والے خصوصاً وہ لوگ جن کو حاجیوں سے روپیہ پیدا کرنے کا کچھ تعلق نہیں ہے، وہ اپنے تئیں مذہب کا زیادہ پابند بھی نہیں ظاہر کرتے، اور اپنے عقائد میں بہت کمزور ہیں، وہ اس بات کو کافی سمجھتے ہیں، کہ وہ مکے والے ہیں، یوں تو آیتیں اور حدیثیں ان کی زبان پر ہیں، مگر ان پر عمل نہیں کرتے، وہ یہ خیال کرتے ہیں، کہ مذہب کی پابندی پردیسیوں پر واجب ہے، جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ مکے آتے ہیں، بدویوں کی طرح بہت سے آدمی نماز بھی گنڈے دار پڑھتے ہیں، اور بعض بالکل پڑھتے ہی نہیں جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو شہر میں ہو واجب ہے، مگر اس روز بیت اللہ خصوصاً پردیسی مسلمانوں سے بھرا رہتا ہے، اور مکے والے بہت سے اپنے دکانوں پر بیٹھے حقہ پیتے رہتے ہیں، یہ لوگ خیرات بھی کبھی نہیں دیتے، ان کا مقولہ ہے، کہ خدا نے ان کو اس شہر میں خیرات لینے کے لئے پیدا کیا ہے، نہ کہ دینے کے واسطے، یہ لوگ سنت کی پیروی کرتے ہیں، لیکن بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں میں مثلاً مونچھیں کترائے ہیں، اور داڑھی بڑھاتے ہیں، اسی طرح عمامہ کا سرا بھی پیچھے چھوڑتے ہیں، ہر روز آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں ہمیشہ ہاتھ میں مسواک رکھتے ہیں، بات بات پر قال اللہ اور قال الرسول کہتے رہتے ہیں مگر اس کا لحاظ نہیں کرتے، کہ یہ نصیحتیں اطوار درست کرنے کے لئے کی گئی ہیں، نہ کہ محض زبان سے کہہ دینے کے لئے"۔

برکہارٹ کے زمانہ میں حجاز میں طاعون بھی پھیلا تھا، جس سے جدہ و مکہ و ینبوع متاثر ہوا تھا، اور صرف مدینہ منورہ اس بلا سے محفوظ رہا تھا۔ طاعون کے واقعات جو برکہارٹ نے اپنے سفرنامے میں درج کئے ہیں، ان سے ہندوستانی طاعون کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، اس کے واقعات میں سے صرف ایک واقعہ بہ خیال دلچسپی درج کیا جاتا ہے:۔

"۱۸۰۵ء میں جب حجاز میں طاعون پھیلا تھا، اور اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، تو قاضی جدہ،
اور جدے کے بہت سے علماء حاکم جدہ کے پاس گئے، اور اس ہوا چکی کو توڑ ڈالنے کے لئے
کہا، جو چند یونانی عیسائیوں نے قاہرہ سے لاکر خدیو محمد علی پاشا کی اجازت سے دروازے سے
باہر کہیں بنائی تھی، ان لوگوں کو یقین تھا، کہ عیسائیوں نے اس مقدس زمین میں جو یہ
بدعت پھیلائی ہے، اس کے باعث ان پر خدا کی لاٹھی پڑ رہی ہے[1]۔"

خطبۂ عرفات کے موقعہ پر برکہارٹ نے حاجیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ
بعض مردود ایسے موثر وقت میں بھی اپنی حرامزادگیوں سے باز نہیں رہتے:۔

"حاجیوں کے جم غفیر سے چاروں طرف کھڑے احرام کے پلو سر پر ہلا رہے تھے، اور
ان کے لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کے نعروں سے زمین آسمان گونج رہے تھے، بعض حاجی
جو زیادہ تر پردیسی تھے، چیخ چیخ کر رو رہے تھے، اپنے سینے کوٹ رہے تھے، آنسوؤں سے
اپنے منہ دھو رہے تھے، اور خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے بعض
آنکھوں میں آنسو بھرے عاقبت کی فکر میں خاموش کھڑے تھے، بہت سے حجازی، اور
سپاہی باتیں اور مذاق بھی کر رہے تھے، اور جس وقت دوسرے حاجی احرام ہلاتے تھے
یہ بڑے زور سے اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتے تھے گویا اس رسم کی ہنسی اڑا رہے تھے، پیچھے
پہاڑی پر میں نے عربوں اور سپاہیوں کی کئی پارٹیاں دیکھیں، جو چپکے چپکے ناریل
پی رہے تھے، ہمارے نزدیک ہی ایک قافلے میں ایک رنڈی بیٹھی قہوہ بیچ رہی تھی،
جس کے ملاقاتی زور کے قہقہوں اور بیہودہ حرکتوں سے دوسروں کی عبادت میں
بھی خلل ڈال رہے تھے۔"

ایک نئی رسم جس کا ذکر برکہارٹ نے کیا ہے، وہ خدام کعبہ کا صداقت نامہ ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"بہ نسبت اس وقت کے خادم کعبہ کا لقب اگلے زمانہ میں زیادہ باوقعت سمجھا جاتا
تھا، اور بڑے بڑے آدمی اپنے نام کے ساتھ فخریہ اس خطاب کو استعمال کیا کرتے تھے،

[1] ہندوستان کے جاہلوں میں بھی طاعون کی نسبت اکثر جگہ یہ خیال تھا کہ انگریز پھیلا رہے ہیں، اور ڈاکٹروں وغیرہ کے ذریعے سے کچھ

"اب کوئی ساٹھ روپیہ خرچ کرنے سے یہ خطاب مل سکتا ہے، اس رقم کے داخل کر دینے کے بعد خریدار کو ایک صداقت نامہ مل جاتا ہے، جس پر قاضی و شریف کے دستخط ہوتے ہیں اور یہ ایک معمولی بات ہے کہ عیسائی کو بھی خادم کعبہ کہلانے کی اجازت حاصل ہو جاتی ہے، یہ عزت خصوصاً یونانی جزیروں کے باشندے حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ جب کبھی ان کو بحری مسلمان قزاق گرفتار کر لیتے ہیں، تو اس صداقت نامہ کے دکھا دینے سے متعصب سے متعصب مسلمان بھی ان کی عزت کرنے لگتے ہیں۔"

مدینہ منورہ کے حالات میں حجرۂ شریف کے ذکر میں برکھارٹ لکھتا ہے:۔

"اس حجرے کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دو سب سے قدیم دوستوں اور جانشینوں یعنی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبریں ہیں، جہاں تک مجھے معلوم ہوا، ان قبروں پر قیمتی غلاف پڑے رہتے ہیں، مورخ لکھتا ہے، کہ یہ قبریں گہرے گڑھے ہیں، اور وہ تابوت جس میں آنحضرت کا جسد اطہر دفن ہے، چاندی سے منڈھا ہوا ہے، اور اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک لوح لگی ہے، جس پر بسم اللہ اور اللھم صل علیہ کندہ ہے"۔

برکھارٹ کے مذکورۂ بالا بیان کا بڑا حصہ غلط ہے، اور برکھارٹ کی عربی دانی و تحقیق کے اعتبار سے ایسی لغو تحریر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے، اور جیسا کہ پیشتر عرض کیا جا چکا ہے، یہ سفرنامہ برکھارٹ کے مرتب کرنے والوں کی تحریف معلوم ہوتی ہے، ان قبروں پر کوئی غلاف نہیں ڈالے جاتے، حجرۂ شریف سینکڑوں برس سے سب طرف سے بند چلا آ رہا ہے، اس کے اندر نہ کوئی داخل ہو سکتا ہے اور نہ قبروں پر غلاف ڈالے جا سکتے ہیں، مورخ جس سے سید سمہودی مورخ مدینہ مراد ہیں، ان کا یہ بیان نہیں ہے کہ قبریں گہرے گڑھے ہیں، اور آنحضرت صلعم تابوت میں دفن بھی نہیں ہیں، جس صندوق کو تابوت سمجھ لیا گیا ہے، وہ ایک آبنوسی صندوق تھا، جو حجرۂ شریف کے باہر جالی کے اندر گیلری میں مواجہ شریفہ یعنی آنحضرت کے سرہانے کی شناخت کے لئے رکھا ہوا تھا، اور زائرین اس صندوق کے مقابل کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھا کرتے تھے، سنگ مرمر کا کتبہ اسی صندوق میں نصب تھا، حجرۂ شریف و قبور و صندوق کی مفصل کیفیت علامہ السید سمہودی وغیرہ نہایت وضاحت کے ساتھ ہم

کپتان برٹن کے ذکر میں آئندہ لکھیں گے، جس نے برکھارٹ کے مذکورۂ بالا بیان پر استدلال کرکے آنحضرت صلعم کی قبر مبارک کو ایک فرضی قبر ظاہر کیا ہے۔

حاجی محمد عرف گیووانی فناٹی

(۵)

برکھارٹ کے بعد یورپین سیاح جس نے مکۂ معظمہ کا سفر کیا، وہ حاجی محمد عرف گیووانی فناٹی اٹلی کے شہر فرارہ[1] کا رہنے والا تھا، پادری کا عہدہ پانے کی غرض سے فناٹی کو اولاً اس کے والدین نے مذہبی تعلیم شروع کرائی، اور جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے، ایک عرصہ تک وہ کلیسائے روم کے پادریوں کی نمائشی و رسمی تربیت پاتا رہا، آخر اسے مذہب عیسوی سے ایسی نفرت ہوگئی، کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر سنہ ۱۸۰۵ء میں وہ اٹلی کی فوج میں ملازم ہوگیا، اور کچھ دن بعد فناٹی اور پندرہ آدمی فوجی ملازمت ترک کرکے دین حق کی تلاش میں ترکوں کے صوبۂ البانیہ[2] کو روانہ ہوئے وہاں شہر انتواری[3] میں پہنچ کر ایک مسجد میں اترے، یہاں اس خیال سے کہ یہ کفار کی فوج سے بھاگے ہوئے ہیں حاکم شہر نے ان کی بہت آؤبھگت کی، اور یہ سب کے سب بعد تحقیق مسلمان ہوگئے، فناٹی کا نام محمد رکھا گیا، اور ایک ترکی فوجی افسر کی حقہ برداری کی خدمت پر یہ ملازم ہوگیا، کچھ روز بعد اس نے ملازمت ترک کرکے بجائے حقے کی نے کے کلہاڑی ہاتھ میں لی، اور لکڑہارے کا کام کرنے لگا، مارچ سنہ ۱۸۰۹ء میں کوئی جرم سرزد ہونے کی وجہ سے وہ یہاں سے مصر بھاگ گیا، اور قاہرہ پہنچ کر محمد علی[4] پاشا کے البانی باڈی گارڈ میں شریک ہوگیا، جس زمانہ میں پاشائے موصوف

---

[1] فرارہ - اٹلی کا مستقر صوبہ اور قدیم شہر ہے، اس کی فصیل کوئی بارہ سو برس سے قائم ہے، یہاں کے کئی گرجے، یونیورسٹی، اور کتب خانہ مشہور ہے، آبادی روبہ تنزل ہے تخمیناً چالیس ہزار کی مردم شماری ہے ۱۲ [2] البانیہ سلطنت ترکی کا ایک مشہور کوہستانی صوبہ تھا، جسے دول یورپ نے چند سال ہوئے ترکوں کے قبضہ سے نکال کر ایک علحدہ عیسائی ریاست قائم کردی یہاں کی آبادی پندرہ سولہ لاکھ ہے جس میں پانچ لاکھ مسلمان اور باقی عیسائی ہیں، جن کی خاطر یہاں عیسائی حکمراں کی ضرورت ہوئی، یہاں ایک جنگجو مسلمان قوم ارنوٹ زیادہ آباد ہے ۱۲
[3] انتواری صوبہ البانیا کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کی آبادی کوئی بیس ہزار ہے ۱۲ [4] محمد علی پاشا موجودہ خاندان خدیویہ مصر کا بانی سنہ ۱۷۶۹ء میں قصبہ قوالا واقع رومیلیا صوبہ البانیا میں پیدا ہوا تھا، اولاً یہ ترکی فوج میں بھرتی ہوا، پھر سنہ ۱۷۹۹ء میں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں اپنے سپاہیوں کا دستہ اکٹھا کرکے مصر میں سلطان کی طرف سے لڑکر داد شجاعت دی اور بڑھتے بڑھتے سنہ ۱۸۰۵ء میں مصر کا گورنر ہوگیا یہ بڑا بہادر و مدبر تھا، مملوک سلاطین مصر کے پسماندہ امراء و رؤساء جو ہمیشہ ترکی سلطنت کو دق کیا کرتے تھے، ان کو یکم مارچ سنہ ۱۸۱۱ء کو دھوکے سے قلعہ قاہرہ میں بلاکر سب کا قتل عام کردیا، چار سو تیس آدمیوں میں سے صرف ایک مملوک امین بے اپنے گھوڑے کو قلعہ کی عالیشان دیوار پر سے پھاند کر گولیوں کی بوچھاڑ میں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا، وہابیوں جنہوں نے سنہ ۱۸۰۳ء میں مکہ فتح کرلیا تھا، اور چھ سات برس سے حجاز میں

مصر صعید[5] میں مملوکوں[6] سے جنگ کر رہا تھا، فنائی بھی اس میں شریک تھا، اور جب قاہرہ کے قلعہ میں مملوکوں کا قتل عام ہوا ہے، تو اس میں بھی اس نے حصہ لیا تھا، اور کستی بے[7] کی روپیوں سے بھری ہوئی زین، اور ایک لونڈی مع زیور ونقدی اس کے ہاتھ بھی لوٹ میں آئی تھی، اس لونڈی کے ساتھ اس نے عقد کر لیا، اور چھ مہینے تک اس فوج کے ساتھ جو توسون[8] پاشا خلف محمد علی پاشا کے زیر کمان وہابیوں سے مقابلہ کے لئے مکہ معظمہ پر چڑھائی کرنے والی تھی، قاہرہ میں ٹھہرا رہا، ایک دن اس کے ہاں چور آپڑے اور اس نے بندوق چلائی، جس کی گولی غلطی سے اس کے بیم باشی (سارجنٹ) کے لگ گئی، جو اس وقت اندھیرے میں نماز پڑھ رہا تھا، اور وہ اسی وقت ٹھنڈا ہو کر رہ گیا، یہ معاملہ اس کے ہر دلعزیز کمانڈر انچیف توسون پاشا کے سامنے پیش کیا گیا، اور اس نے اپنے پاس سے کئی ہزار پیاسٹر[9] مقتول کے ورثا کو بطور خوں بہا کے دے دئیے، ۶ اکتوبر ۱۸۱۱ء کو یہ فوج سوئز روانہ ہوئی، اور یہاں سے اٹھارہ جہازوں میں سوار ہو کر بندرگاہ ینبوع پہنچی، فتح ینبوع میں حاجی محمد بھی شریک تھا، وہ حدیدہ[10] کی لڑائی میں بھی موجود تھا، جہاں آٹھ ہزار ترکوں کو قبیلہ بنی حرب کے پچیس ہزار عربوں اور وہابیوں کے مقابلے میں شکست فاش ہوئی تھی، اس موقع پر وہ بال بال بچ گیا تھا، اس کے بعد وہ بعارضہ وجع مفاصل بیمار ہو کر قاہرہ لوٹ گیا، اوائل ۱۸۱۴ء میں جب محمد علی پاشا کی فتوحات حجاز کی خبریں قاہرہ میں پہنچیں تو حاجی محمد البانیا کی کمکی فوج میں بھرتی ہو کر براہ سوئز جدہ و ینبوع پہنچا، اور قنفذہ کے محاصرے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو سلطنت الملکی بجا رہے تھے ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا نے ان پر چڑھائی کی اور مختلف مقامات پر ان کو شکست دے کر ۱۸۱۶ء میں عرب کی فتوحات ختم کیں، محمد علی پاشا کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم واقعہ شام کا حملہ تھا جو ۱۸۳۲ء میں اس کے فرزند ابراہیم پاشا نے کیا اور ترکوں کو شکست دیکر شام کا ملک فتح کر لیا، اس کے بعد بعض شرائط کی بنا پر مصر کی حکومت اپنے خاندان کے لئے مخصوص کرالی، چنانچہ موجودہ خدیو مصر بھی اسی خاندان کے رکن ہیں ۱۸۴۸ء میں محمد علی پاشا نے بوجہ ضعف و ناتوانی عزلت اختیار کر لی اور اپنے لڑکے ابراہیم پاشا کو خدیو مقرر کیا ۲ اگست ۱۸۴۹ء میں محمد علی پاشا کا انتقال ہوا۔ [5] مصر صعید مصر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو دریائے نیل کے چڑھاؤ کی طرف واقع ہے [6] نومسلم فرنگی غلاموں کو مملوک کہتے تھے۔ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے آخری جانشین ملک صالح ایوب نجم الدین نے سنہ ۱۲۳۰ء میں نومسلم فرنگی غلاموں کا ایک رسالہ باڈی گارڈ مرتب کیا تھا۔ ملک صالح کی وفات کے بعد ۱۲۴۹ء میں اس رسالے کا افسر ملک معز الدین ایبک مصر کا سلطان ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا تخت نشین ہوا، اور اس طرح ڈھائی سو برس سے زائد عرصہ تک مملوکوں کی بادشاہت مصر میں رہی ۱۵۱۷ء میں ان سلاطین کا خاتمہ ہو گیا اور ملک مصر سلطان سلیم اول سلطان ترکی کے قبضہ میں آگیا رہے سہے مملوکوں کا خاتمہ ۱۸۱۱ء میں قتل عام کر کے محمد علی پاشا نے کر دیا، یہ مملوک چونکہ سرکیشیا یا چرکیسیا کے رہنے والے تھے، اس لئے ان کو چرکسی سلاطین بھی کہتے ہیں [7] بے ایک ترکی خطاب ہے، مملوک سلاطین و امرا کو بے کہا کرتے تھے [8] توسون پاشا محمد علی پاشا کا منجھلا لڑکا تھا، یہ بڑا فیاض بہادر اور نیک دل تھا، وہابیوں کے مقابلہ میں جو مصری بحری فوج گئی تھی، اس کا امیر البحر تھا اور مدینہ منورہ اسی نے وہابیوں سے واپس لیا [9] پیاسٹر ایک مصری سکہ ہے جو ڈھائی تین آنہ کا ہوتا ہے [10] حدیدہ ینبوع سے چالیس پینتالیس میل مشرق کی طرف زمین عیاش کے پاس ایک سرسبز آبادی

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

ع میں مدد کی، جس وقت وہابیوں نے ترکوں سے قنفذہ دوبارہ فتح کیا ہے، اس وقت یہ وہیں تھا، لیکن مجبو
ی ہو جانے کے باعث، اور کچھ عربوں کی اذیت اور اپنے افسر کی ناراضگی کے سبب سے اس نے نوکری
دی، اور مکہ چلا گیا، وہاں پھر اس نے خدیو محمد علی پاشاہ کی کسی فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا، اور چونکہ
ملک اس کی رسائی مشکل تھی، اس لئے اس نے یہ تدبیر نکالی کہ ترکی زبان میں ایک درخواست لکھ کر بیت اللہ کے
ایک مکان کے دروازہ پر پاشا کی سواری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا، آخر چہ روز بعد پاشا سے اس کی ملاقات
، پاشا نے جنگ قنفذہ کے مفصل حالات قلمبند کرنے کے لئے اس کو حکم دیا، اور اس کو پانسو پیاستر نقد اور
ت کی فوج میں کوئی عہدہ عنایت کیا، حج کے بعد فناٹی طائف کو چلا گیا، وہ جنگ طرابہ میں بھی موجود تھا،
ن توسون پاشا کو سخت شکست ہوئی تھی، اور اس کی یون فوج کا صفایا ہو گیا تھا، ۱۰ر جنوری ۱۸۱۵ء کو
لی پاشا نے جب بیس ہزار وہابیوں پر جو فیصل بن سعد کی زیر کمان تھے، بمقام بصیل زبردست فتح
ل کی تھی، فناٹی اس میں شریک تھا، اس لڑائی کے ذکر میں اس نے محمد علی پاشا کی تصویر خوب کھینچی ہے،
یرانا فاتح موت و فتح کی قسم کھا کر ایک قالین پر بیٹھا ہوا ہے، اور اس کے چاروں طرف دشمنوں کے
وں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، پاشا نے ایک ایک وہابی کے سر کے لئے پندرہ پندرہ روپیہ انعام مقرر کیا تھا،
جہ تھی، کہ اس کے گرد سروں کے انبار لگے تھے، مدینۂ منورہ میں باب عنبریہ کے پاس ایک مینار ہے جسے
لرؤس یعنی سروں کا مینار کہتے ہیں، یہ وہابیوں کے سروں کو بجائے اینٹ، پتھر کے چن کر بنایا گیا ہے، او یہاں
ملک کے حالات چونکہ فناٹی نے ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے لکھے ہیں، اس لئے وہ ایک خاص دلچسپی رکھتے
، جنگ کے بعد فناٹی قاہرہ چلا گیا، اور مصر صعید و شام و حلب و کردستان[۱] و بنایتہ[۲] و صنعاء[۳]

وہ گذشتہ) اور چھوٹی سی بستی ہے، یہاں بعض ضروری خورد و نوش کی اشیا ملجاتی ہیں، جدیدہ کو الخیف بھی کہتے ہیں،
سے مراد کی گھاٹی ہے، جو گاؤں ڈھلواں پہاڑ کے دامن میں آباد ہوتا ہے، اس کو بالعموم خیف کہتے ہیں ۱۸۱۳ء میں
، ہزار بدویوں اور وہابیوں نے اٹھ ہزار ترکوں کو جو حسین بے کے ماتحت تھے شکست دی تھی، ۱۲

[۱] کردستان اس علاقہ کو کہتے ہیں، جو دریائے دجلہ کے شمال اور آرمینیا کے جنوب میں واقع ہے، یہاں کے باشندے
کہلاتے ہیں، نہایت قوی بہادر اور جنگجو مسلمان ہیں، یہاں حکومت ترکوں کی ہے ۱۲ [۲] شمالی عرب کا ایک شہر ہے
[۳] صنعاء ملک توبہ واقع افریقہ کا ایک شہر ہے، جو کسی زمانہ میں ایک طاقتور خود مختار ریاست کا پایۂ تخت تھا، لیکن
، ویران حالت میں ہے، آبادی تخمیناً بارہ ہزار ہے، حکومت مصر کی ہے ۱۲

ڈنگولہ[1] کی سیر کی، چونکہ عرصہ دراز تک اس کو لکھنے کی ضرورت نہ پڑی تھی، اس وجہ سے وہ لکھنا بھول گیا تھا، یورپ واپس ہو کر لندن میں اس نے کئی آدمیوں کو جو زبان اطالیہ سے واقف تھے، بول بول کر اپنے حالات سفر لکھوائے تھے، اس کا سفرنامہ اول زبان اطالیہ میں شائع ہوا تھا، پھر ۱۸۲۸ء میں جان ولیم نکس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور جب کبھی ضرورت ہوئی، تو خود فناٹی سے بھی حالات و واقعات دریافت کئے، اور یہ ترجمہ ۱۸۲۰ء میں جان مرے ساکن البر میرل اسٹریٹ لندن نے چھپوایا، فناٹی چونکہ صدق دل سے مسلمان ہو گیا تھا، اس وجہ سے یورپین اس کے سفرنامے کو غیر مستند سمجھتے ہیں، مسٹر نکس مترجم سفرنامہ فناٹی کے بار بار ملازمت ترک کرنے کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں، فناٹی کے دیوانہ ہونے کے ثبوت میں ہم اس کا حسب ذیل بیان پیش کرتے ہیں، جو اس نے شہر مکہ کی تعریف میں لکھا ہے :-

"شہر میں داخل ہو کر جو کچھ میں نے دیکھا، اس سے میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا، یہ شہر نہ کچھ برا ہے، نہ کچھ خوبصورت ہے، تاہم اس میں کوئی بات ایسی ہے، جو دل میں ایک قسم کا خوف پیدا کرتی ہے، جس وقت میں مکہ پہنچا، دوپہر کا وقت تھا، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اور میناروں پر سے موذن کی صدائے اکبر کے سوا اور کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی"۔

مکہ معظمہ پہنچ کر کسی مسلمان کے دل پر جو اثر ہونا چاہئے، اس کا ایک شمہ فناٹی نے ظاہر کیا ہے شاید عیسائیوں کے دلوں پر بیت المقدس میں داخلہ سے اس قسم کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو گا جب ہی مسٹر نکس نے فقرہ مذکورہ بالا کو فناٹی کے جنون کے ثبوت میں پیش کیا ہے، مسٹر موصوف فناٹی کو دیوانہ ثابت کرنے کے لئے، اگر صرف اتنا کہہ دیتے، کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا تو غالباً ان کے ہم خیال لوگوں کے اطمینان کے لئے بالکل کافی ہوتا، محبت کا کوچہ ہے، اس سے اہل یورپ اکثر نابلد ہیں ؎

دشت وفا کی راہیں اہل وفا سے پوچھو　　کیا جانیں شیخ صاحب بلا نئے آدمی ہیں

---

[1] ڈنگولہ ملک نوبہ کا ایک شہر ہے جو قاہرہ سے (۵۰۷) میل جانب جنوب دریائے نیل کے بائیں کنارہ پر آباد ہے ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۶ء کی لڑائیوں میں جو انگریزی فوج اور مہدی سوڈانی کے درمیان ہوئی تھیں، ڈنگولہ بڑا رزم گاہ بنا ہوا تھا، ۱۸۸۶ء میں یہاں سے انگریزی فوج تخلیہ کر کے مراجعت کر گئی تھی، اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں مصری حکومت نے واپس لے لیا، یہاں کی آبادی

اب ہم فنائی کے سفرنامے سے بعض ایسے واقعات یہاں درج کرتے ہیں، جو دوسرے سفرناموں میں نہیں دیکھے گئے، اور جو غالباً اسی زمانہ میں رائج ہوں گے۔

فنائی لکھتا ہے :-

"بہت سے حاجی پورے شہر مکہ کا طواف کرتے ہیں، یہ لوگ پہلے شہر کے باہر دروازہ پر چلے جاتے ہیں، اور ایک مذہبی افسر کے روبرو اپنے معمولی کپڑے اتار کر احرام باندھ لیتے ہیں، اور پھر نہایت تیز قدمی سے بلکہ کسی قدر بھاگتے ہوئے شہر کے ایک گوشے پر پہنچتے ہیں، ایک مطوف بھی ان کے ساتھ ساتھ اسی رفتار سے چلتا رہتا ہے، اور خاص خاص موقعوں پر ان کو خاص خاص دعائیں پڑھاتا جاتا ہے، شہر کے ہر کونے پر حجام بیٹھے رہتے ہیں، جو عجیب پھرتی کے ساتھ حاجیوں کا سر جھکا کر پاؤ سر مونڈ دیتے ہیں، اس کے بعد حاجی پھر چلنا شروع کرتے ہیں، اور دوسرے تیسرے کونوں پر اسی طرح پاؤ پاؤ سر منڈاتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ شہر کے چوتھے کونے پر پہنچ جاتے ہیں، تو سارے سر کی حجامت ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد حاجی اپنا معمولی لباس پہن لیتے ہیں، اور یہ عبادت پوری ہو جاتی ہے"

ممکن ہے کہ فنائی نے عمرہ[1] اور صفا[2] و مروہ[3] کے درمیان دوڑنے کی تفصیل بیان کی ہو جو نامکمل و مبہم یا شاید اس زمانے میں بعض حاجی سارے شہر کا بھی طواف کرتے ہوں۔

---

[1] ایام حج کے سوا دوسرے دنوں میں مناسک حج ادا کرنے کو عمرہ کہتے ہیں، رمضان میں عمرہ کی بہت فضیلت ہے زمانۂ حج میں عمرہ ۱۳ ذی الحجہ کے بعد سے شروع کیا جاتا ہے، اس سے قبل نہیں کرتے، اور عموماً ۱۴ ارہ ذی الحجہ کو مقام تنعیم میں جاکر جو مکۂ معظمہ سے ڈیڑھ کوس ہے اور جہاں مسجد عائشہؓ ہے، احرام باندھتے ہیں، اور طواف و سعی کرکے حجامت بنوا لیتے ہیں اور احرام کھول دیتے ہیں ۱۲

[2] صفا کے معنی بڑا سخت پتھر ہیں، کوہ صفا بیت اللہ کے جنوب و مشرق کی طرف کوئی سو گز ہے، یہ حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑی تھیں، اس کی یادگار میں حاجی بھی ان دونوں پہاڑیوں کے بیچ میں کوئی پچاس قدم دوڑتے ہیں جسے اصطلاح شرعی میں سعی کہتے ہیں، صفا سے شروع کرکے مروہ تک سات مرتبہ دوڑا جاتا ہے، صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا تک ایک پھیرا ہوتا ہے، سعی عموماً صبح کے وقت زیارت کعبہ کے بعد کی جاتی ہے، اس کی تشریح پیشتر بھی حاشیہ میں مختصراً کی جا چکی ہے،

[3] مروہ کے معنی سفید سخت پتھر کے ہیں، جس میں سے شرارے نکلتے ہوں، یہ بھی بیت اللہ کے شرقی جانب ایک پہاڑ ہے، صفا و مروہ کے درمیان (۴۹۴) گز کا فاصلہ ہے ۱۲

بیت اللہ کے کبوتروں کے ذکر میں فناٹی لکھتا ہے :-

"بہت سے حاجی ان کبوتروں[1] کو دانہ ڈالنے کے لئے دور دراز ملکوں سے اناج اپنے ساتھ لاتے ہیں، ممکن ہے کہ قحط کے زمانے میں جبکہ مکہ معظمہ میں اناج نہ ملتا ہوگا، یا بطور منت کے بعض حاجی اپنے ساتھ دانہ لاتے ہوں، ورنہ فناٹی سے ایک سال قبل ۱۸۱۱ء میں، جب برکھارٹ مکہ گیا تھا، اس وقت مکہ شریف کے دروازوں پر کبوتروں کو ڈالنے کے لئے، جوار بیچنے والی عورتیں بیٹھی تھیں، اور حاجی اُن سے خرید کر کے کبوتروں کو دانہ ڈالتے تھے، اس زمانہ میں بھی غریب عورتیں چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں دانہ لئے بیت اللہ کے دروازوں پر بیٹھی رہا کرتی ہیں، اور اکثر دو دو آنہ میں کئی کئی طشتریاں دیتی ہیں۔

حضرت ابراہیم کو جس جگہ شیطان نظر پڑا تھا، اس مقام پر کنکریاں پھینکنے کے لئے، رسم رمی الجمرات[2] جو حاجی ادا کرتے ہیں، اس کے واسطے مقام مزدلفہ و منٰی[3] سے کنکریاں چن کر لاتے ہیں، فناٹی کہتا ہے کہ بعض حاجی زاید ثواب حاصل کرنے کے خیال سے اپنے وطن سے یہ کنکریاں لاتے ہیں، فناٹی کے زمانہ میں حاجیوں کے نام بھی درج رجسٹر کئے جاتے تھے، اور ایک خاص اہلکار اسی کام کے واسطے مقرر تھا، اس زمانہ میں حاجیوں کی تعداد کثیر کے باعث یہ طریقہ باقی نہیں رہا، ممکن ہے کہ جنگ کی وجہ فناٹی کے وقت میں احتیاطاً حاجیوں کے نام لکھے جاتے ہوں، زمانۂ قدیم میں کچھ رقم ادا کرنے پر حاجیوں کو شریف مکہ کی جانب سے

---

[1] بیت اللہ میں ہزارہا کبوتر ہیں، حاجی ان کو جو یا گیہوں ڈال دیتے ہیں، یہ خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگایا کرتے ہیں، مگر خانۂ کعبہ پر نہ بیٹھتے ہیں اور نہ اس پر بیٹ کرتے ہیں، ورنہ غلاف کعبہ بھی ایک دن میں سفید ہو جاتا، عام طور پر یہ کعبہ کا معجزہ خیال کیا جاتا ہے، برٹن اس کے متعلق کہتا ہے کہ، کعبے کی چھت میں کوئی ایسی حکمت ہے، جس کی وجہ سے کبوتر خانۂ کعبہ پر بیٹھ کر بیٹ نہیں کرتے، عوام الناس ان کبوتروں کو اس کبوتر کی نسل کہتے ہیں، جس نے ہجرت کے وقت آنحضرت صلعم کے پوشیدہ ہونے کے غار میں انڈے دئے تھے۔ [2] رمی الجمرات مرکب ہے رمی اور جمرات سے، رمی کے معنی پھینکنے کے ہیں، جمرات جمع ہے جمرہ کی جس کے معنی کنکر ہیں، رمی الجمرات کنکریاں پھینکنا، منٰے سے جب حضرت ابراہیم مناسک حج ادا کرنے کے لئے عرفات جا رہے تھے، تو شیطان نے تین مقامات پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالنا چاہا تھا جس پر آپ نے اس کو بھگانے کے لئے چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکی تھیں، منٰے کے بازار میں ان مقامات کی شناخت کے لئے تین برجیاں بنی ہوئی ہیں جن کو جمرۃ الاولیٰ، جمرۃ الاوسط، اور جمرۃ العقبیٰ کہتے ہیں، عوام الناس ان کو بڑا شیطان منجھلا شیطان اور چھوٹا شیطان کہتے ہیں،

صداقت نامۂ حج بھی مل جاتا تھا، اب یہ رسم اٹھ گئی۔

جبلِ نور[1] کے ذکر میں فنائی لکھتا ہے :۔

"اس پہاڑ پر حاجی چڑھتے ہیں، اور آیات قرآنی و دعائیں پڑھتے ہوئے، اچھلتے کودتے ہیں"

زمانۂ حال کے سیاحوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا ہے، برٹن جو ۱۸۵۳ء کے حج میں شریک تھا کہتا ہے کہ بعض وجوہ سے میں جبلِ نور پر چڑھ نہ سکا اس وجہ سے اس رسم کے متعلق جس کا فنائی نے ذکر کیا ہے، کچھ نہیں کہہ سکتا فنائی کے زمانے میں خانۂ کعبہ سال میں ایک مرتبہ کھلتا تھا، داخلی کعبہ کے متعلق ہم پٹس کے حالات میں کسی قدر تفصیل سے لکھ آئے ہیں، فنائی لکھتا ہے :۔

"اگرچہ خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کی کوئی ممانعت نہیں ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت کم حاجی اندر جانے کی جرأت کرتے ہیں، حالانکہ یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ خانۂ کعبہ میں داخل ہو کر توبہ کرنے سے عمر بھر کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، لیکن اندر داخل نہ ہونے کی وجوہ غالباً وہ اقرار و عہد ہیں جو حاجیوں کو کرنے پڑتے ہیں، یعنی جو شخص کعبہ میں داخل ہوتا ہے، اس کو قسم کھانی پڑتی ہے، کہ کسی قسم کے نفع کا کاروبار تجارت اور بیع بیوپار نہ کرے گا، ہر تکلیف و نقصان پر صبر کرتا رہے گا، ہر قسم کے گناہوں سے بچتا رہے گا، اور کسی ناپاک و نجس چیز کو ہاتھ نہ لگائے گا"

فنائی کا یہ بیان واللہ اعلم کن مسلمانوں کی زبانی سنا ہوا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) رسم ابراہیمی کو تازہ رکھنے کے لئے حاجی بھی اخسأ الشیطان سر ضا الرحمٰن بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر جنیے برابر چھوٹے کنکر مارتے رہتے ہیں، دسویں ذی الحجہ کو صرف بڑی بڑی پر سات کنکر پھینکتے ہیں، اور ۱۱، ۱۲ کو تینوں شیطانوں کو سات سات کنکریاں پھینکتے ہیں، اس طرح کل (۴۹) کنکریاں پھینکی جاتی ہیں، رمی الجمرات بعد زوال ہوتا ہے، بعض جاہل ان شیطانوں کو جوتے سے بھی مارتے ہیں، کنکریاں وادی مزدلفہ سے (جو منیٰ سے کچھ فاصلہ پر ہے) چن لی جاتی ہیں ۱۲ [2] مزدلفہ کی توضیح پیشتر حاشیہ میں کی جا چکی ہے ۱۲ [3] منٰے کی توضیح سابق میں کی جا چکی ہے ۱۲ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[1] جبل نور مکہ معظمہ میں ایک بہت بلند پہاڑ ہے، اس پر جناب سرورِ کائنات کا شق الصدر ہوا تھا، اس کو غار حرا بھی کہتے ہیں آنحضرت قبل بعثت یہاں عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے، سورۂ اقرا یہیں نازل ہوئی ہے ۱۲ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس قسم کی خلاف عقل شرائط کے پابند ہونے کی تعلیم نہیں دیتا، اور اسلام نے معافی و توبہ کے لیے بھی یہاں تک ڈھیل دے رکھی ہے۔ (رباعی)

بازآ، بازآ، ہر آنچہ ہستی، بازآ گرکافر و گبر و بت پرستی، بازآ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست صد بار، اگر توبہ شکستی، بازآ

ممکن ہے، کہ فنائی نے رومیوں کے کلیسا میں داخلہ کی شرائط پہ شرائط داخلی کعبہ کا قیاس کر لیا ہو، بالفرض اگر ان فرضی شرائط کو صحیح بھی مان لیا جائے، تو بھی یہ بہت سخت اور ناممکن و ناقابل عمل نہیں معلوم ہوتیں، مسلمانوں میں ہزاروں آدمی ایسے نکل سکتے ہیں، جو ان شرطوں کی پابندی کرنے کو تیار ہو جائیں، مگر اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، اور دخلی کعبہ کے لیے کوئی شرط نہیں ہے، .... اب رہی یہ بات کہ حاجی کم تعداد میں کیوں داخل ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم گنہگاروں کے ناپاک قدم اس قابل نہیں ہیں، کہ کعبۂ مکرمہ کے اندر پہنچائے جائیں، اسی وجہ سے بعض حاجی جو دس دس بارہ بارہ مرتبہ حج سے مشرف ہو جاتے ہیں، وہ ایک مرتبہ بھی خانۂ کعبہ میں داخل نہیں ہوتے، علاوہ ازیں داخلی کعبہ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک خاص، جس میں فی کس دو تین روپیہ دے کر داخل ہو سکتے ہیں، دوسری داخلی عام، جس میں بلا کسی فیس کے داخل ہوتے ہیں، بعض حاجی داخلی خاص میں روپیہ دینا گناہ سمجھتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں، کہ خدا کے گھر میں رشوت دے کر داخل ہونا، موجب ثواب نہیں ہو سکتا، اور داخلی عام میں چونکہ بڑا لپہ ڈپی، اور دھکا پیلی ہوتی ہے، اور کچل کر مر جانے کا خوف ہوتا ہے، اس لیے بہت سے حاجی حطیم[1] میں نماز پڑھ لیتے ہیں، جس کا ثواب مثل نماز اندرون خانۂ کعبہ کے ہے، پھر بھی ہزاروں اچھے برے آدمی خانۂ کعبہ کے اندر پہنچ ہی جاتے ہیں فقط

---

[1] حطیم کے لغوی معنی ٹوٹا ہوا، کعبہ کے رکن شامی و عراقی کے باہر کوئی ۶ ½ گز کے فاصلہ پہ قد آدم ایک دیوار نصف دائرہ کی شکل میں ہے، اسی کو حطیم کہتے ہیں، اس کے اندر دو رکعت نماز نفل پڑھتے ہیں، جس کا ثواب مثل داخلی کعبہ اور نماز اندرون کعبہ کے ہے ۱۲

ابیلارڈ اور ہیلاتیس

از مولوی محمد سعدالدین خاں صاحب بی اے بیرسٹر

(یہ فرانس کے ایک سچی محبت کی تاریخی داستان ہے، جو ۱۱۰۰ء میں گزری ہے، فدائیان الفت پیرس کے ایک مقبرہ میں ہمیشہ کے لئے آسودہ ہیں، اور ذیل کے خطوط، زمانہ فراق کے بیبیتوں کی تفسیر ہیں،

واقعہ یہ ہے ''ابیلارڈ'' اپنے عصر کے قابل ترین ہستیوں میں ہے، اور ہیلاتیس دنیائے حسن کی ملکہ اور ایک پرتنعم خاندان کی نازپروردہ لڑکی ہے، محبت کی کشش کہیے یا حسن کا جذبہ مقناطیسی، ابیلارڈ، اس کے پڑھانے کی خدمت پر متقرر ہوتا ہے، لیکن غریب کو کیا خبر تھی کہ، طفل نادانم و اول سبق است، خود مکتب عشق میں زانوئے ادب تہ کرتا ہے، کیونکہ محبت جب کبھی آئی ہے، تو بے نقاب آئی ہے، نقاب کی بندشوں سے اس کو کبھی سروکار نہیں رہا، اور یہاں کوئی تاجرانہ معاملہ تو نہ تھا، کہ دام کا جھگڑا پیدا ہوتا، کیونکہ اس تجارتی منڈی کا سودا ہے آخر اکثر و بیشتر جانوں کی قربانی ہے ''ہیلاتیس'' کے چچا کو جو اس کا نگراں ہے، اس کی خبر ہوتی ہے، اور ظالم چچا پر کچھ ایسا قہر تم گذرتا ہے، کہ ابیلارڈ، کو جان کے لالے پڑجاتے ہیں، اور وہ کہیں چلا جاتا ہے ہیلاتیس فراق یار کی اذیتوں سے گھبرا کر خود بھی معاشرتی جلسوں کو الوداع کہہ کر راہبانہ زندگی اختیار کرلیتی ہے، اور (نن) بن جاتی ہے،

یہ مکتوبات اب تک برٹش میوزیم میں بجنسہ محفوظ ہیں اور ایک عالم پروانہ وار ان کی زیارت کو آتا ہے، اور خراج میں چند آنسو اور درد ایک آہ پیش کر جاتا ہے،

میں نے اپنے قیام یورپ میں ان مکتوبات کی زیارت کی ہے، اگرچہ یورپ تو قریب قریب ان سوختہ بختوں کے افسانہ غم سے واقف ہے بہت ممکن ہے کہ ہندوستان ان حسین خطوط کے

کے سبب ان سے دلسوزی کرے)

مجھے یہ دیکھنے سے کس قدر حیرت ہوئی، کہ تمہارا پورا خط دل شکن بدبختی کے فسانے سے بھرا ہے، زمانۂ دراز میرے زخموں کو بند کرنے کو چاہئے تھا، لیکن تمہارے خط نے زخم ہرے کر دئے، دیکھو میں تمہاری منت کرتی ہوں، تم نے کس قدر پریشان حال مجھے بنا دیا ہے دنیا میں میرے لئے کسی قسم کی راحت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تم ہی میرے لئے باعث شادمانی ہو، نامہربان نہ ہو، میں تھوڑی سی راحت تم سے بھیک مانگتی ہوں، اور تم مجھے دے سکتے ہو، مجھے اپنے پورے حالات معلوم کراؤ، شاید میری آہ وزاری تمہاری تکلیف کو کم کر دے، جب تم مجھے لکھو گے، میں جانوں گی، کہ تمہارے دل میں میری یاد باقی ہے اور یہ بات میرے لئے باعث شادمانی ہوگی، میرے کمرے میں تمہاری تصویر ہے اور جب کبھی وہاں سے گزرتی ہوں تو اس کو اک تمنا بھری نظر سے دیکھنے کے لئے کھڑی رہ جاتی ہوں، دیکھو ایک تصویر سے مجھے اس قدر راحت ہوتی ہے جو صرف تمہارا عکس ہے، پھر تمہارے خط سے کیوں نہ خوشی ہو، ہم کو آپس میں لکھنا چاہئے میں مطمئن ہوں گی تم میرے شوہر ہو اور تم دیکھو گے، کہ میں اپنے آپ کو تمہاری بی بی لکھوں گی، میری قسمت میں ابھی وہ خوشی نہیں ہے کہ میں تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں، اس لئے اس کے بدلے میں صرف تمہارے خطوط ہی میرے لئے باعث اطمینان ہوں گے، میں تمہارے پاک خیالات کو پڑھوں گی، ان کو ہمیشہ اپنے ساتھ جان کی طرح رکھوں گی، اور ہر خط آنکھوں سے لگاؤں گی، چوموں گی، اگر تم نہ لکھو کہ تم مجھے دل سے پیار کرتے ہو تو میں کسی صورت سے زندہ نہیں رہ سکتی جب تم مجھے لکھو گے، تو تم اپنی بی بی کو لکھو گے، عقد نے ایسی خط و کتابت کو جائز بنا دیا ہے، تو تم کیوں نہیں مجھے مطمئن کرتے ہو میں صرف اپنے تمام عہدوں ہی سے پابند نہیں ہوں، بلکہ میرے لئے میرے چچا کا خوف ہے، لیکن تمہیں تو کچھ وجہ نہیں، جو تم ڈرو، تم ہی میری بدبختی کا باعث ہوئے ہو، اس لئے تم میری راحت کا سبب بنو، تم بھولے نہیں ہو، کیونکہ عاشق کبھی بھولتے نہیں، کہ کبھی خوشی سے پورا دن تمہارے ساتھ گزارتی تھی، اور جب کبھی تم باہر ہوتے تو، میں اپنے آپ کو ہر ایک سے جدا کر کے تم کو خط لکھتی تھی، جب تک میرا خط تمہیں نہیں پہنچتا تھا، میں کس قدر بے چین و بے قرار رہتی تھی، پیام بر کو پانے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس رام کہانی سے شاید تم گھبراؤ، لیکن میرے جذبات کی کوئی تھاہ نہیں ہے، کیونکہ میں اس سے بھی زیادہ دکھ اٹھا چکی ہوں، میں نے اپنے سے نفرت کی ہے، تاکہ صرف تم ہی سے محبت کروں، میں خود کو برباد کرنے کے لئے، اس قید خانہ (ننزی)[1] میں اس لئے آئی، کہ تم کو آرام سے رہنے دوں، یاد رکھو! صرف اس ہی دل میں یہ جذبات گھر کرتے ہیں، جو پاک محبت کے شعلہ سے منور ہو ناپاک دل میں ایسے خیالات آتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں، میں تم کو دنیا کی ہر ایک چیز سے زیادہ چاہتی ہوں، اور اپنی زندگی کے آخری دم تک اسی طرح چاہوں گی، گو بی بی کا نام دنیا کی نظر میں معزز ضرور ہے، لیکن معشوق کے لفظ میں زیادہ جادو ہے،

---

[1] رہبان کا مسکن جو تارک عورتوں کے لئے مخصوص ہو ۱۲

یہ میری شومئی قسمت تھی کہ میں ایسے ظالم خاندان میں پیدا ہوئی، جن کی دشمنی نے میری مطمئن زندگی کو خاک میں ملا دیا، اگر وہ نیک مزاج ہوتے، تو میں کیوں نہ اپنے پیارے شوہر کے ساتھ خوش خوش رہتی، ہائے وہ کیسے بے رحم ہیں، کہ تم کو قتل کرنے پر ایک بدمعاش کو ابھارا، اس وقت میں کہاں تھی، اپنے پیارے کو بچانے میں مجھے کس قدر فخر ہوتا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میں تمہاری نگہبانی کرتی، آہ، یہ جذبات کی روانی مجھے کہاں کہاں لے جا رہی ہے، اب شورش محبت چھا رہی ہے اور حیا زبان کو روک رہی ہے میں ان عورتوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہوں، جو اپنے تئیں خدا سے بیاہی ہوئی سمجھتی ہیں، لیکن ان میں صرف ایک میں ہی ہوں، جو انسان سے بیاہی گئی ہوں، میں ان لوگوں میں رہتی ہوں، جو صلیب کے پشتیبان ہیں، لیکن میں صرف ایک ہی ہوں، جو انسانی جذبات کی بندی ہوں، میں ایک نن ہو کر بھی ابلیلارڈ پر فدا ہوں، اگر میں عشرت پسند ہوتی، تو کیا مجھے اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں کچھ دیر تھی، میری عمر بائیس سال سے زیادہ نہ تھی، یہ صرف تمہارے ہی لئے تھا، کہ میں نے اپنے حسن و جوانی کو تم پر سے قربان کر دیا، اور اس کے بدلے میں مضطرب گھنٹے، اور فرقت کی کٹھن راتیں گزارتی ہوں، آہ! مجھے نہ چھوڑو، مجھے نہ بھولو، میری محبت اور وفا کو یاد کرو، اور مجھے اپنی لطیف الفت کا اہل سمجھو، یاد رکھو میں تمہیں دل سے پیار کرتی ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کوشش کرتی ہوں، کہ تمہارا خیال صفحۂ دل سے مٹا دوں، ہائے یہ کس قدر خوفناک خیال ہے، میں مارے خوف کے کانپتی ہوں، اور میرا دل مجھ سے نفرت کرتا ہے، اس وقت میرا دل بھر آیا ہے، اور ہاتھ کانپ رہا ہے، معاف کرنا، یہ میرے آنسو ہیں، جو خط کو تر کر رہے ہیں۔ خدا حافظ

غزل

از جناب حکیم ست گرو پرشاد صاحب تہبر

حشر میں تائید پر ہے، رحمت باری مری
پاک بازی سے بھی بڑھ کر ہے گنہگاری مری

ضعف سے اظہار درد دل بھی کر سکتا نہیں
وہ سمجھتے ہیں، ابھی باقی ہے خودداری مری

دے دیا ہوش و قرار و صبر نے یکسر جواب
بیکسی ہاں! ایک تو کرتی ہے غمخواری مری

مورد جور و ستم ہوں میں مگر کیا کم ہے یہ
ان کی دلچسپی کا باعث ہے دلآزاری مری

پوچھنے والا شب غم کوئی اے رہبر نہیں
یاس ہے، بالیں پہ اک کرنے کو غمخواری مری

تنویر صبح

از حضرت جنون صدیقی

ہم نہایت مسرت کے ساتھ حضرت جنون کا پاکیزہ اور ستھرا کلام "ترقی" کے زیب صفحات کرتے ہیں، اہل نظر دیکھیں گے، کہ کس لطافت و خوبی کے ساتھ سحر خیزی کی فطری دلفریبیاں دکھلائی ہیں، اور لطف یہ کہ نہ مرغ پر چھری چلانے کی نوبت آئی ہے، اور نہ موذن کو برا بھلا کہنے کی ضرورت پڑی ہے (ترقی)

رنگِ شفق کی پریاں، جلوے دکھا رہی ہیں
باد سحر سے کلیاں کچھ مسکرا رہی ہیں

او مست خواب نوشیں، اٹھ، دیکھ، کیا سماں ہے
فردوس کی ہوائیں تجھ کو جگا رہی ہیں

جاگ، اور دل میں بھر لے ذوق خدا پرستی
غرق نیاز ہو جا، او مست ناز ہستی

مستی میں جھوم کر گر، خاک عبودیت پر
مست الست بن جا، اے مایہ دار مستی

رقصاں ہے ذرہ ذرہ، آہنگ پر خوشی کے
شعلے بھڑک رہے ہیں، ہر سمت روشنی کے

انوار معرفت کے، ساغر چھلک رہے ہیں
پردے اٹھے ہوئے ہیں، اسرار سرمدی کے

لہرا رہا ہے سبزہ، اشجار جھومتے ہیں
جیسے شراب پی کر، مے خوار جھومتے ہیں

سرمست ہیں عنادل، کیا کیف بے خودی ہے
اک پھول دیکھتے ہیں، سو بار جھومتے ہیں

عکس شفق سے ہر شے گلنار ہو رہی ہے
شبنم کے چھینٹے کھا کر، بیدار ہو رہی ہے

انگڑائی لے رہے ہیں، باد سحر کے جھونکے
شب بھر کی سوئی دنیا، ہشیار ہو رہی ہے

اک ساغر طلائی گردش میں آ رہا ہے
اک شعلۂ مجسم لرزش میں آ رہا ہے

ذروں میں ہے تبسم، تاروں میں ہے تلاطم
اک نور کا سمندر جنبش میں آ رہا ہے

طائر چہک رہے ہیں، گلشن مہک رہے ہیں
پچھلے پہر کے تارے کچھ کچھ جھپک رہے ہیں

اٹھ، ان تجلیوں سے سینہ کو جگمگا لے
دریا و کوہ و صحرا سارے جھلک رہے ہیں

ایمان تازہ و تر ہوتا ہے اس فضا سے
دھو لے یہ ظلمت دل، نور خدا نما سے

صورت پہ مٹنے والے معنی پہ بھی نظر کر
اے شمع بزم فانی، اب لو لگا خدا سے

کس زندگی پہ غافل ہے غرور ہو رہا ہے — بے ہوش کرنے والا ہر نغمۂ فنا ہے

عبرت کا ہے تماشا، ارض و سما کی ہستی — پانی سطح پر یہ خیمہ حباب کا ہے

چشمک یہ برق کی ہے کلیوں کا ہے تبسم — جنبش سراب کی ہے، اور بحر کا طلاطم

اہل خرد نہ پوچھیں راز جہاں جنوں سے — دھوکے میں وہ پڑا ہے، دل کا ہے سب توہم

تضمین غزلیات حضرت جامی رح

(از مولوی سید احمد حسین صاحب امجد)

ہر چند پر ذلیل و ناسزائیم — سرگشتۂ کوچۂ وفائیم

پیش تو بصد امید آئیم — تو بادشہی و ما گدائیم

دامن مفشاں کہ مبتلائیم

ہر چند تباہ روزگاریم — چوں زلف بتاں سیہ کاریم

ما اقتیان دلفگاریم — تا داغ غلامی تو داریم

ہر جا کہ رویم بادشائیم

ہستی ہے ہماری ہم کو معلوم — ظلمت میں ہوا ہے نور معدوم

شاید چمک اٹھے اپنا مقسوم — از طوق سگاں مدار محروم

گر خلعت خاص را نشائیم

منظور اگر ہے اپنی تسخیر — چل راہ رضا میں تن بتقدیر

امجد نہ ہو عبد حق میں تقصیر — جامی بہ جفا وجہ زخو گیر

دانی کہ نہ در خور وفائیم

―――(٥)―――

حق کی قربانی

از مولوی قاضی نیر الدین احمد صاحب نیر

شیخ موسیٰ تھا قاضی کشمیر — آسمان نہم کا بدر منیر

مدعی اس کا تھا محمد بٹ — سخت ظالم وزیر بے تدبیر

شاہ دستور مصر تھے گویا — عہد موسیٰؑ کے پادشاہ وزیر

چاہتے تھے کہ کلمۂ طیب — ہو اضافہ کے ساتھ عالمگیر

تھا اضافہ خلاف سنت کے — اور سنت تھی خارج از کشمیر

اہل سنت تھے عاجز و مغلوک — منتشر بے پناہ و بے توقیر

شہر کی مسجد اس زمانہ میں — پائی قاضی کے ہاتھ سے تعمیر

تھا فدائے حق و خلیل خدا — اور جویائے فضل و لطف قدیر

کام تھا، اس کا خدمت مذہب — فیضیاب اس سے تھے صغیر و کبیر

کی حکومت نے اس سے فرمائش — لکھئے فتویٰ کہ وہ دلیل و حقیر

ہو زمانہ میں بدعت تازہ — کلمہ اس سے ہو اضافہ پذیر

سنتے ہی اس کو رد کیا فوراً — اور یوں بولا وہ قاضی کشمیر

”میں مقلد ہوں کام ہے میرا — اتباع سنن بلا تقصیر“

بات یہ سخت ناگوار ہوئی — شر کے درپے ہوئے، فوراً شریر

حیف اک تہمت بغاوت پر | دی گئی اس کو قتل کی تعزیر
دم سے ہاتھی کے باندھ کر پھر قتل | شہر میں اس کی کی گئی تشہیر
لاش جب گھر کے سامنے آئی | سامنے آئی اس کی مادر پیر
نہ تو وہ روئی اور نہ چلائی | بلکہ درگاہ رب میں کی تکبیر
کہ یہ عالم تھا باعمل نکلا | راہ حق میں ہوا شہید و شہیر
ڈھانک دے عیب اس کے یا مولا | تھا وجود اس کا عزت کشمیر
بعد اس کے زمانہ جب پلٹا | نہ وہ خامہ رہا، نہ وہ تحریر
رہ گیا نام اہل ہمت کا | مٹ گئے سینکڑوں ہی خوش تقدیر

رحمت حق بما در و فسر رند

فاتحہ خیر از عقیدت منیر

غزلیات

(۱)

از مولوی محمد اصغر صاحب بیرسٹر

ان کے انداز دلربائی سے | عمر بھر ہم ہے فدائی سے
ہم نے کی توبہ پارسائی سے | بڑے جھگڑے بڑی لڑائی سے
آئے دن روز کی جدائی سے | باز ہم آئے آشنائی سے
اسی کافر صنم پرستی میں | دشمنی ہو گئی خدائی سے
اک قیامت بپا ہے محشر میں | ان کو مطلب ہے خود نمائی سے
حور ہو یا کہ ہو شراب طہور | کہیں ملتی ہے جبہ سائی سے
عشق میں ساتھ ہے آٹھ پہر | بے وفائی سے بے وفائی ہے

مل گیا ہم کو میکدہ اصغر

چشم مئیگوں کی رہنمائی سے

---

(۲)

از مولوی سید ندیم الحسن صاحب تاثیر موہانی

دل پریشاں ہو گیا زلف پریشاں دیکھ کر | سنگ دل کو دیکھ کر اور سنگ لرزاں دیکھ کر
داور محشر ہے جب یہ جور پنہاں دیکھ کر | یعنی شکوؤں پر مرے ان کو پشیماں دیکھ کر
دے سزا یارب خطا عشق کے انداز سے | جوش رحمت ہے لیکن فرق عصیاں دیکھ کر
ہاتھ پھر بڑھنے لگے ہیں جیب و داماں کی طرف | پاؤں پھیلائے جنوں نے پھر بیاباں دیکھ کر
گھر سے نکلے تھے کہ کچھ سمجھائیں دیوانے کو وہ | ہو گئے ساکت مجھے بتیاب و حیراں دیکھ کر
ہوش ناصح کے ہے گم دم بخود بس رہ گیا | چاک داماں دیکھ کر پھر چاک گریباں دیکھ کر
خون عاشق نے کیا آخر پشیماں جفا | ایک ٹھنڈی سانس لی گور غریباں دیکھ کر
گردش تقدیر کو الفت ہے مجھ آوارہ سے | چرخ کو اک انس ہے شوریدہ ساماں دیکھ کر
جھنجھلا کر داور محشر سے یوں کہہ اٹھے | کھو دیا اس کم بخت نے خود اپنا ایماں دیکھ کر
رحمت و عفو و شفاعت یہ سب مغفرت مجھے | حشر میں تکنے لگے آلودہ داماں دیکھ کر

غم وہ دے یارب کہ جس کا تو ہی اک غمخوار ہو

درد دے تاثیر کو لیکن نہ درماں دیکھ کر

تخمیس غزل قیصر

از حضرت ساقی

مبارک ساعت صبح ازل کا پر فضا دن ہے — شب گیسوئے شہ ہے درمیاں، کیا خوشنما دن ہے،
تجلی ریز بخت آصف ہفتم ہے، یا دن ہے — عجب پرنور آئیں ہیں، عجب عشرت فزود دن ہے،
ہر اک شب قدر کی شب ہے ہر اک دن عیش کا دن ہے

تجاوز کر چکا ہے، حد سے گو پیر فلک کا سن — ق — مگر اس نے بھی کم دیکھے ہیں ایسا عہد ایسے دن
ثنائے بذل شہ حلقہ بگوشوں سے نہیں ممکن — نہ دیکھا ہم نے عثمان غنیؓ کے عہد کو، لیکن
یہ دن دیکھا تو سمجھا وہ بھی اک دیکھا ہوا دن ہے،

رہے، یارب، ہمیشہ دور عثمانی حکومت کا — سمی جامع القرآن مورد ہو عطوفت کا
عیاں ہے، رمز تجھ پر اول اور آخر کی نسبت کا — وہ پہلا روز تھا، خلاق عالم تیری رحمت کا
تو یہ بھی بخشش و بذل و عطا کا دوسرا دن ہے،

دیا نخل تمنا نے ثمر صد شکر بوتے ہی — مجھے پایا ہے، میری بیخودی نے خود کو کھوتے ہی،
ملی امید کی شب دولت بیدار سوتے ہی — مٹی ظلمت شہ والا کے رونق بخش ہوتے ہی
کھلی جب آنکھ تو دیکھا کہ پھر نکلا ہوا دن ہے

ثنا ہو کس زباں سے وصف کیونکر ہو رقم تیرا — دعا گویان دولت بھرتے ہیں ہر وقت دم تیرا
سریر سلطنت پر جب سے آیا ہے، قدم تیرا — کرم کرتے ہوئے تھکتا نہیں دست کرم تیرا
ترے بذل و عطا کا واقعی ہر دن نیا دن ہے،

دوبالا رونق گلشن ہے، ساقی کے ترانے سے — چمن میں سبزہ بیگانہ بھی ہے اک ٹھکانے سے
بہ رنگ بوئے گل برباد ہوں میں اک زمانے سے — نہ پلٹا غیر بھی محروم آج اس آستانے سے
تو پھر اپنوں کے حق میں اس سے بہتر کونسا دن ہے،

جہاں میں جب تلک خورشید خاور ہو ضیا گستر — رہے چتر شہی پر سایہ افگن رحمت داور
فزوں ہو عمر و اقبال شہ عثمان دین پرور — ہزاروں سال کا دور ترقی ہو پئے قیصر
ہر اک دن عیش و عشرت کا ہو جیسا آج کا دن ہے،